پاکستان کی سیاسی تاریخ 5

مُسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء

زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب: حسن جعفر زیدی



ادارہ مطالعۂ تاریخ

پاکستان کی سیاسی تاریخ

جلد 5

مُسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء

(1849ء - 1947ء)

زاہد چودھری

تکمیل و ترتیب:

حسن جعفر زیدی

ادارہ مطالعہ تاریخ

ایڈیشن دوم

ISBN 978-969-9806-27-8

ناشر: ادارہ مطالعہ تاریخ: 66-H/2، واپڈا ٹاؤن، لاہور

Ph: + 92(0)42-35182835, **Fax:** + 92(0)42-35183166
E-mails: hjzaidi@gmail.com
khalidmehboob@tehqeeq.org
Website: www.tehqeeq.org

مطبع: شرکت پرنٹنگ پریس، نسبت روڈ، لاہور

سال اشاعت: 2013ء

قیمت: 550/- روپے

قیمت بیرون ملک: $ 30/-

فہرست

دیباچہ ایڈیشن دوم

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں شروع دن سے پنجاب کو ایک غالب کلیدی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ تھی اور ہے کہ اسٹیبلشمنٹ میں سب سے غالب حصہ پنجاب کے پاس تھا اور ہے۔ چنانچہ ریاست کی تمام داخلی اور خارجی پالیسیوں پر گہری چھاپ پنجاب نے لگائی ہے۔ خواہ یہ 71ء سے پہلے کا متحدہ پاکستان ہو یا بعد کا، بار بار مارشل لاء کا نفاذ ہو یا سویلین حکومتوں کی محدود جمہوریت، آئین سازی میں تاخیر ہو یا آئین کی بار بار معطلی، ''نفاذ اسلام'' اور ''نظریہ پاکستان'' کے نام پر دوسرے صوبوں پر فوج کشی کی جا رہی ہو یا وہاں کی قیادت کو شہادت دی جا رہی ہو، جہاد کو افغانستان میں درآمد کیا جا رہا ہو یا کشمیر میں، ملک کی دفاعی پالیسی ہو یا خارجہ پالیسی، تعلیمی پالیسی ہو یا معاشی پالیسی، ثقافتی پالیسی ہو یا قومی زبان کا معاملہ، فیصلہ کن قوت جن ریاستی اداروں کے پاس ہوتی ہے وہاں پنجاب کو سب سے زیادہ غالب حیثیت حاصل رہی ہے۔

پنجاب کا یہ کردار جس تاریخی پس منظر میں وقوع پذیر ہوا اس کی جڑیں تاریخ کے اس اہم دور میں پیوست ہیں جو برطانوی عہد (1947-1849ء) کہلاتا ہے۔ انگریزوں نے اپنی سلطنت کو درپیش شمال سے خطرہ کے دفاع کے لئے پنجاب کو ایک خود کفیل فوجی چھاونی بنانے کی خاطر قبضہ میں لیا تھا۔ دنیا کا سب سے بڑا نہری نظام وضع کر کے اسے خوراک میں خود کفیل کر دیا گیا۔ نیا زرعی پیداواری نظام، نو دولتیہ جاگیرداری پیداواری رشتوں پر مبنی تھا جو انتہائی رجعت پسند ہوتے ہیں۔ مزید یہ کہ اس کا سارا انتظامی ڈھانچہ عسکریت پر مبنی تھا۔ صنعت و حرفت اور تجارت بہت کم تھی۔ سیاسی آزادیاں باقی ہندوستان کے مقابلے میں محدود تھیں۔ آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی جو ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی لحاظ سے پس ماندہ تھے۔ تاریخ سے ورثہ میں ہندو۔ مسلم اور سکھ۔ مسلم کمیونل تنازعہ پہلے سے موجود

تھا۔ مسلمان زیادہ تر زراعت سے وابستہ تھے یا فوج میں تھے۔ ان کے علاوہ انگریز نے وفادار مسلمان جاگیردار اشرافیہ بھی پیدا کی تھی۔

آج کے تناظر میں ''مسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء'' ایک ایسا مطالعہ ہے جس سے ''پنجابی طالبان''، ''لشکر جھنگوی'' اور ''سپاہ صحابہ'' جیسی دہشت گرد فرقہ وارانہ تنظیموں کا پنجاب میں پرورش پانا سمجھ میں آسکتا ہے۔ یہ کتاب اُن تاریخی عوامل کا احاطہ کرتی ہے جن کی وجہ سے پنجاب قیام پاکستان سے پہلے ہی بہت سی مذہبی تحریکوں اور جماعتوں کا گڑھ بن گیا تھا۔ تحریک خلافت، مجلس احرار، خاکسار تنظیم، جمیعت المشائخ، جماعت اسلامی اور جماعت احمدیہ قابل ذکر ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد جماعت اسلامی ضلع گورداسپور کی تحصیل پٹھانکوٹ سے اپنا مرکز منتقل کر کے لاہور لے آئی جبکہ جماعت احمدیہ نے بھی اپنا مرکز ضلع گورداسپور کے قصبہ قادیان سے پنجاب کے نئے قصبہ ربوہ میں منتقل کر دیا۔ پنجاب کے اُبھرتے ہوئے درمیانہ طبقہ، صنعتکار، تاجر اور آڑھتیوں نے ان تنظیموں کی پرورش کی۔

یہ کتاب پنجاب میں جاگیرداروں اور گدی نشینوں کے اہم سیاسی کردار کے تاریخی پس منظر کو سمجھنے میں بھی مدد دیتی ہے۔ قیام پاکستان کے 65 سال گزرنے کے بعد بھی پنجاب کی سیاست میں جاگیرداروں کے گٹھ جوڑ، سیاسی وابستگیوں اور وفاداریوں کی راتوں رات تبدیلی اور ہارس ٹریڈنگ کے سیاسی کلچر میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔

22 برس قبل، جب یہ کتاب شائع ہوئی تھی، آج اس کے مطالعہ کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس ایڈیشن کی اشاعت تک اس موضوع پر کوئی کتاب ایسی نہیں آئی جو اس موضوع کا احاطہ کرتی ہو۔ اس لیئے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا جارہا ہے۔ آج کی صورت حال میں اُٹھائے گئے بہت سے سوالات کا جواب حاصل کرنے کے لیئے یہ کتاب ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

31/مارچ، 2013ء

حسن جعفر زیدی

لاہور

دیباچہ ایڈیشن اوّل

پاکستان کی سیاسی تاریخ کے سلسلے کی پانچویں جلد پیش خدمت ہے۔ اس سے پیشتر چوتھی جلد میں جن تضادات کا احاطہ کیا گیا ہے اُن میں جناح۔ لیاقت تضاد اور پنجابی۔ مہاجر تضاد شامل تھے جو قیام پاکستان کے فوراً بعد رونما ہوئے۔ پنجابی شاونسٹوں اور مہاجر شاونسٹوں کے مابین تضاد بالآخر ملک کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خان کے قتل پر منتج ہوا۔ پنجابی شاونزم کا مظاہرہ پاکستان کے دوسرے صوبوں میں آباد قومیتوں کے خلاف بھی ہوا۔ لیکن اس کی تفصیل میں جانے سے پیشتر یہ جائزہ لینا ضروری ہے کہ قیام پاکستان سے قبل پنجاب کی سیاست کس ڈگر پر چل رہی تھی اور وہ کونسا تاریخی پس منظر تھا جس کے نتیجے میں قیام پاکستان کے بعد پنجابی شاونزم کا جن بوتل سے باہر آ گیا اور پھر کبھی اسے بوتل میں بند نہ کیا جا سکا جبکہ اس کی بدولت ملک بھی دولخت ہوا۔ زیر نظر جلد اسی تاریخی پس منظر کا احاطہ کرتی ہے۔

یہ سوالات عام طور پر اٹھائے جاتے ہیں کہ سندھ، سرحد، بلوچستان اور بنگال کی نسبت پنجاب میں رجعت پسندی کے رجحان کو نسبتاً زیادہ فروغ کیوں حاصل ہوا ہے؟ پنجابی مسلمانوں نے اپنی ماں بولی کے ساتھ غداری کر کے اُردو کا پرچم کیوں بلند کر رکھا ہے؟ کیا وہ یہ سب کچھ کسی قربانی کے جذبے سے کر رہے ہیں یا وہ اس ملک پر اپنی سیاسی و اقتصادی بالادستی قائم کرنے اور اسے استحکام دینے کی خاطر ''نظریہ پاکستان'' اور ''اُردو'' کے علمبردار بن گئے ہیں؟ اور اگر ایسا ہے تو پھر اس کے پس پشت ان کی محرومیوں کی ایک داستان ضرور موجود ہے اور یہ مسلم پنجاب کے اس سیاسی ارتقاء میں مضمر ہے جس کی بیشتر منازل اس ایک صدی میں طے کی گئیں جو برطانوی عہد یعنی 1849ء۔ 1947ء پر محیط ہے۔

پاکستان کی سیاست میں پنجاب کے کردار کو سمجھنے کے لئے قیام پاکستان سے فوری پہلے کی اس صدی کا تجزیاتی مطالعہ اس لئے بھی بے حد اہم ہے کہ موجودہ پنجاب کے مختلف طبقوں کا

جنم اسی دور میں ہوا۔قرون وسطیٰ کا سیاسی، معاشی و معاشرتی نظام جو کئی صدیوں سے اس خطے میں رائج تھا، اس صدی کے دوران ایک نو آبادیاتی نظام میں ڈھل گیا۔ پرانے اداروں اور طبقوں کی جگہ نئے ادارے اور طبقے وجود میں آ گئے۔ پرانے جاگیرداری نظام کی جگہ ایک بالکل مختلف نظام نے لے لی جسے برطانوی استعمار نے اپنے مفادات کے پیش نظر وضع کیا تھا۔آج پنجاب میں جو جاگیردار خاندان موجود ہیں، وہ اسی دور کی پیداوار ہیں۔قرون وسطیٰ میں درمیانہ طبقہ نہ ہونے کے برابر ہوتا تھا لیکن نو آبادیاتی ڈھانچہ اپنے ساتھ یورپی صنعتی انقلاب کے اثرات بھی لے کر آیا۔ چنانچہ اسی صدی کے دوران پنجاب میں درمیانہ طبقہ کی نمود ہوئی۔ اس کے ہمراہ تھوڑا بہت صنعتی و غیر صنعتی مزدور طبقہ بھی وجود میں آیا۔کسان اگرچہ پرانا طبقہ تھا لیکن پرانے جاگیرداری نظام کی جگہ نئے جاگیرداری نظام میں اُس کے اور جاگیردار کے تعلقات یکسر بدل گئے تھے۔

تبدیلی کے اس سارے عمل میں وہ فرقہ وارانہ تضادات جن کی جڑیں قرون وسطیٰ میں تھیں، بدستور جاری و ساری رہے۔ البتہ مختلف فرقوں کے مابین ناہمواری کے نئے حوالے متعین ہو گئے اور یہ تضادات زیادہ گہرے ہوتے چلے گئے۔ تاریخ پنجاب کی اس عہد ساز صدی میں سیاست، معیشت اور معاشرت غرضیکہ ہر میدان میں ہندو۔مسلم تضاد ہمہ وقت حاوی رہا۔اس کے علاوہ سکھ۔مسلم تضاد کے مظاہرے بھی ہوتے رہے۔ پنجاب کے مسلمانوں کی علیحدہ تعلیمی اور سیاسی تحریکیں ان ہی تضادات کی بدولت وجود میں آئی تھیں۔انیسویں صدی کے اواخر میں انجمن حمایت اسلام اور دوسری مسلم تنظیموں نے مسلمانوں کے لئے سکول اور کالج کھولے اور مسلمانوں میں بھی درمیانے طبقے کی نشوونما ہونے لگی جبکہ ہندوؤں اور سکھوں میں یہ طبقہ کافی پہلے وجود میں آ گیا تھا اور مسلم درمیانے طبقے کے ارتقاء کے عمل کو روکنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔

پنجاب میں زوال پذیر جاگیرداروں کی سیاسی دھڑے بندیوں، محلاتی سازشوں اور اندرون خانہ گھٹیا سودا بازی اور نوزائیدہ درمیانہ و سرمایہ دار طبقوں کی صوبائی عصبیت، مفاد پرستی، خود غرضی، کوتاہ اندیشی اور فلک بوس سیاسی و معاشرتی عزائم کا تاریخی پس منظر یہ تھا کہ برطانوی سامراج نے اس صوبہ پر تقریباً ایک سو سالہ اقتدار کے دوران اپنی فوجی حکمت عملی کے تحت یہاں کے عوام کو سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی لحاظ سے پس ماندہ رکھا تھا۔اس نے ایک طرف تو ''چیفس آف پنجاب'' کی ایک بہت بڑی کھیپ پیدا کی تھی جو ہر آڑے وقت میں اس کی ہر طرح امداد و اعانت

کرتے تھے اور دوسری طرف اس نے نئے نہری نظام اور آبادکاری کے ذریعے متوسط درجہ کے آسودہ حال مالکان اراضی کے ایک ایسے طبقے کو جنم دیا تھا جو نہ صرف صوبہ میں امن وامان قائم رکھنے کے لئے ''گراں قدر'' خدمات سرانجام دیتا تھا بلکہ اندرونی و بیرونی فوجی مہمات کے لئے افرادی قوت بھی مہیا کرتا تھا۔

چونکہ صوبہ کی معیشت بالارادہ زرعی رکھی گئی تھی۔اس لئے یہاں بڑے پیمانے پر شہری درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کی نشوونما نہیں ہوئی تھی۔ان طبقوں کے جو تھوڑے بہت عناصر سرکاری ملازمتوں، درآمدی اشیائے صرف کی خوردہ فروشی اور زرعی اجناس و چمڑے وغیرہ کے چھوٹے کاروبار کی بنا پر وجود میں آئے تھے ان کی بہت بھاری اکثریت (تقریباً 90 فیصد) غیر مسلموں پر مشتمل تھی۔پہلی اور دوسری عالمگیر جنگوں میں کچھ ٹھیکیداروں نے تھوڑا بہت مال بنایا تھا لیکن اس مال سے صوبہ میں کوئی صنعت کاری نہیں ہوئی تھی۔یہاں تک کہ پارچہ بافی کی صنعت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔صوبہ کی ساری کپاس احمد آباد اور لنکا شائر چلی جاتی تھی۔

بایں ہمہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں اس صوبہ کے مشرقی اور وسطی حصوں میں جہاں آبادی کی اکثریت تھی، وسیع وعریض نہری نظام قائم ہونے کی باعث یہ صوبہ برصغیر میں خوشحال ترین صوبہ بن گیا تھا۔یہاں ولایتی وجاپانی لٹھا پہننے والے ''سفید پوشوں'' کی خاصی بڑی تعداد تھی اور عورتوں کے لئے مصنوعی ریشمی کپڑے کی سب سے زیادہ کھپت بھی یہیں ہوتی تھی۔برصغیر میں ہر طرح کی اشیائے صرف کے لئے اس صوبہ سے اچھی منڈی اور کوئی نہیں تھی بلکہ پنجاب کی منڈی ایشیا بھر میں بہترین تصور کی جاتی تھی۔اگرچہ اس کی یہ قابل رشک حیثیت محض کپاس، چاول اور گندم کی فصلوں اور کسی حد تک فوجی بھرتی کے طفیل تھی۔اس کی کوئی ٹھوس و ترقی پذیر صنعتی بنیاد نہیں تھی اور کوئی صنعتی بنیاد نہ ہونے کے باعث یہاں کے عوام الناس برصغیر کے مشرقی، وسطی اور جنوبی علاقوں کے عوام الناس کے مقابلے میں سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی لحاظ سے زیادہ پسماندہ تھے۔بالخصوص پنجابی مسلمانوں کی ان شعبوں میں پسماندگی بہت نمایاں تھی۔چونکہ ان کو تاریخی وجوہ کی بنا پر تجارت وصنعت میں دلچسپی نہیں تھی، اس لئے وہ اپنی سیاسی، معاشرتی اور تعلیمی ترقی میں دلچسپی لینے کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔اگر وہ تعلیم حاصل کرتے تھے تو محض سرکاری ملازمتوں کے حصول کے لئے۔وہ زمانے کے تقاضوں میں

بنیادی تبدیلی آنے کے باوجود اپنے اس دیرینہ رویئے سے انحراف نہیں کر سکے۔

پنجاب میں مسلم درمیانہ طبقے کی سیاست کا آغاز بیسویں صدی کے اوائل میں ہوا۔ مسلم درمیانہ طبقہ چونکہ تعداد میں بہت کم تھا اور اس کا ہندو اور سکھ درمیانے طبقے کے ساتھ تضاد تھا اس لئے اسے اپنی بقا کی سیاسی جنگ کے لئے مسلم جاگیرداروں کا دست نگر ہونا پڑا۔ شہری تعلیم یافتہ سر فضل حسین کو مسلم جاگیرداروں کی سیاسی تنظیم کرنا پڑی۔ اُس نے یونینسٹ پارٹی کے پلیٹ فارم سے مسلم مفادات کے لئے گراں قدر جدوجہد کی۔ یہی کام سر محمد شفیع اور ملک برکت علی وغیرہ نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کیا۔ اس دوران مسلم درمیانہ طبقہ اپنی سیاسی، تعلیمی و معاشرتی پسماندگی کی وجہ سے مذہبی جماعتوں کی جذباتی تحریکوں کے پیچھے بھی لگا۔ اُن میں تحریک خلافت، مجلس احرار اور خاکسار تنظیم قابل ذکر ہیں۔ اسی مسلم درمیانہ طبقہ کی ترجمانی کے لئے ایک دردمند عظیم شاعر اقبال بھی کھڑا نظر آتا ہے جو ایک جانب ملاؤں کے سخت خلاف ہے تو دوسری طرف مسلمانوں کو یورپی جدت فکر سے آراستہ ہو کر مسلم احیاء کا پیغام بھی دیتا ہے۔ وہ اجتہاد اور اسلامی قانون سازی کا اختیار مسلمانوں کی منتخب اسمبلی کو دیتا ہے۔ وہ سود پر پابندی عائد نہیں کرتا۔ اُس نے شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے لئے ایک بڑے صوبے کی تشکیل کا مطالبہ کیا جس میں پنجاب کے مسلم اکثریتی علاقے، سندھ، سرحد اور بلوچستان کو ضم کرنے کی تجویز رکھی گئی تھی۔ اس تجویز کے مطابق یہ مسلم صوبہ متحدہ ہندوستان کے ماتحت تھا جبکہ متحدہ ہند کی مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے 33 فیصد نشستوں کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ بعدازاں پنجابی شاونسٹوں نے اسے علامہ اقبال کے ''تصور پاکستان'' کا نام دے دیا۔

زیر نظر جلد نے اس سلسلے کی گزشتہ جلدوں کی طرح جہاں ہماری سیاسی تاریخ کے بعض پوشیدہ گوشوں کو بے نقاب کیا ہے وہاں علمی بد دیانتی پر مبنی فسانہ طرازیوں کا پردہ بھی چاک کیا ہے۔ ان میں پاکستان کے ایک سیاستدان عبدالولی خان کی جانب سے 1940ء کی مسلم لیگ کی قرارداد لاہور کے بارے میں پھیلائی گئی غلط فہمی بھی شامل ہے جس کا دستاویزات کی مدد سے ہمیشہ کے لئے ازالہ کر دیا گیا ہے۔ ''نظریۂ پاکستان'' کی علمبردار جماعت اسلامی کی پنجاب میں تاسیس کا پس منظر اور پاکستان اور قائداعظم کے خلاف اس کی زہریلی مہم کا احوال بھی بیان کیا گیا ہے۔

ماضی کی طرح اس جلد کی تیاری میں بھی خالد محبوب میرے دوش بدوش سرگرم رہے۔

بعض حوالہ جات کی تلاش، پروف ریڈنگ اور اشاریہ کی تیاری اُن کی کاوش کے مرہون منت ہیں۔حسب سابق ڈاکٹر مبشر حسن صاحب کی شفقت بھی ہر لمحہ حاصل رہی۔سمیع اللہ ظفر کا دست تعاون بھی ہمہ وقت شامل حال رہا۔ان کے علاوہ جن بہی خواہوں اور سر پرستوں کی جانب سے مجھے مسلسل شفقت، محبت اور حوصلہ ملتا رہا۔ اُن میں صدیق دُرّانی صاحب، میاں دلاور محمود صاحب، صفدر علی قریشی صاحب، شیخ منظور حسین صاحب، محمد اورنگ زیب صاحب، خورشید عالم صاحب، حسین نقی صاحب، اطہر ندیم صاحب، مہدی حسن صاحب اور قمر عباس صاحب شامل ہیں۔ان سب احباب کی ہمت افزائی کی بدولت ہی تحقیق وتالیف کا یہ منصوبہ کامیابی کے مراحل سر کر رہا ہے۔

مصطفیٰ وحید نے اپنی علالت کے باوجود اس کاوش کو طباعت واشاعت کے مراحل سے گزارنے کے لئے جس جذبہ بے اختیار شوق کا مظاہرہ کیا ہے، وہ اُن جیسے عالی ہمت انسان ہی کا حصہ ہے۔یہی جذبہ اور خلوص آصف جاوید اور نعیم احسن کی جانب سے دیکھنے میں آیا جو اُن کے ادارہ کے روح رواں ہیں۔

اس جلد کے تحقیقی مواد کے حصول کے لئے جن لائبریریوں کے عملے نے بھرپور تعاون کیا اُن میں انڈیا آفس لائبریری اینڈ ریکارڈز لندن، پنجاب پبلک لائبریری لاہور، قائد اعظم لائبریری لاہور، پنجاب یونیورسٹی لائبریری لاہور، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری لاہور اور اقبال اکادمی لاہور شامل ہیں۔

گزشتہ چار جلدوں کو عوامی سطح پر بھی اور علمی حلقوں میں بھی جس سنجیدگی کے ساتھ پڑھا گیا اور ان سے اپنے حالات کے تجزیے کے لئے استفادہ کیا گیا اور کیا جا رہا ہے اُس پر قارئین کا بے حد ممنون ہوں اور انہی سے حوصلہ پا کر اگلی کاوش پیش کرنے کی ہمت کر رہا ہوں۔اس میں اگر کچھ خامیاں رہ گئی ہوں تو اسے میری کوتاہی سمجھیے، انہیں آئندہ دور کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔

8 رجولائی 1991ء

حسن جعفر زیدی لاہور

مُسلم پنجاب کا سیاسی ارتقاء

(1849ء - 1947ء)

باب: 1

پنجاب پر برطانوی قبضہ کے محرکات اور اثرات

پنجاب پر برطانوی قبضے کا بین الاقوامی پس منظر

برطانوی سامراج نے 44-1842ء میں سندھ کے علاقے پر اور 49-1845ء میں پنجاب و سرحد کے علاقے پر محض اپنی فوجی حکمت عملی کے تحت قبضہ کیا تھا۔ ان کارروائیوں کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی نے کلکتہ، مدراس، بمبئی اور الہ آباد کی پریزیڈنسیوں کے جن علاقوں پر گزشتہ ایک سو سال کے دوران مقامی حکمرانوں اور فرانسیسی سامراج کے ساتھ طویل کشمکش کے بعد قبضہ کیا تھا، انہیں روسی سامراج کے توسیع پسندانہ پنجوں سے محفوظ رکھا جائے۔ 1812ء میں نپولین کی فیصلہ کن شکست کے بعد روس کے کئی جرنیلوں نے ہندوستان پر حملے کے منصوبے بنائے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وسطی ایشیا سے ہندوستان کی جانب با آسانی پیش قدمی ہو سکتی ہے۔

جب تک رنجیت سنگھ زندہ رہا اس وقت تک کلکتہ میں جو انگریزی حکومت کا دارالحکومت تھا، کمپنی کے کارپردازان کا خیال تھا کہ سکھوں کی اس طاقتور سلطنت کی امداد و حمایت سے ایران اور افغانستان کو روس کی دستبرد سے بچایا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اسی خیال کے تحت 1838ء میں رنجیت سنگھ کے ساتھ مل کر افغانستان پر حملہ کیا تھا۔ اس حملے کی فوری وجہ یہ تھی کہ کمپنی کے گورنر جنرل آک لینڈ (Auckland) کو 1836ء میں تہران میں مقیم برطانوی سفیر سے اطلاعات ملی تھیں کہ ایران نے روس کی شہ پر افغانستان کے علاقہ ہرات پر قبضہ کر لیا ہے اور ایران کی یہ کارروائی دراصل روس کی جانب سے ہندوستان پر حملہ کرنے کی پہلی چال کی حیثیت رکھتی ہے 1837ء میں آک لینڈ نے اپنے ایک ماہر سفارت کار کیپٹن الیگزینڈر برنز (Alexander Burnes) کو افغانستان کے ساتھ تجارتی معاہدے کرنے اور قریبی سفارتی تعلقات قائم کرنے کے لئے کابل

بھیجا لیکن برنز وہاں سے ناکام و نامراد لوٹا۔ اس کی رپورٹ یہ تھی کہ قندھار پر حکمران بارک زئی سرداروں نے رنجیت سنگھ کے خلاف روسیوں کی امداد طلب کی ہے۔ انہوں نے روسیوں کی ہدایت کے مطابق ایران سے معاہدہ کرلیا ہے اور یہ کہ تہران میں برطانوی سفیر کی بے عزتی کی گئی ہے۔ اُدھر کابل کے امیر دوست محمد خان کا مطالبہ یہ تھا کہ جو طاقت اسے رنجیت سنگھ سے پشاور لے کر دے گی وہ اس کا ساتھ دے گا۔ چونکہ روسیوں نے یہ وعدہ کرلیا تھا اور برنز نے ایسا کرنے سے معذوری ظاہر کی تھی اس لئے دوست محمد خان اعلانیہ طور پر روس کا حلیف بن گیا تھا۔ چنانچہ 1838ء میں آک لینڈ، رنجیت سنگھ اور افغانستان کے معزول بادشاہ شاہ شجاع کے درمیان لاہور میں ایک سہ طرفی معاہدہ ہوا جس کے نتیجے میں تینوں کی فوجوں نے ایک ساتھ افغانستان پر حملہ کر دیا۔ اپریل 1839ء میں ان فوجوں نے قندھار فتح کرلیا۔ دوست محمد خان کابل سے فرار ہو کر ہندوکش پہنچ گیا اور برطانوی فوج کسی لڑائی کے بغیر کابل میں داخل ہوگئی۔

جون 1839ء میں رنجیت سنگھ کا انتقال ہو گیا تو انگریزوں اور روسیوں کے درمیان طاقت کا توازن یکایک پھر روسیوں کے حق میں ہو گیا۔ اسی سال روسی جرنیل پیروسکی (Perovski) وسطی ایشیا میں فتوحات حاصل کرتے ہوئے خیوا تک پہنچ گیا تو اس کی رائے یہ تھی کہ یہ کامیابی ''ہندوستان کو ہلانے'' کی جانب پہلے قدم کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کی یہ رائے کوئی دیوانے کا خواب نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد اس حقیقت پر تھی کہ رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد سکھ سلطنت میں خونریز طوائف الملوکی کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اگرچہ ان حالات میں امیر دوست محمد خان نے 1840ء میں بخارا سے کابل واپس آکر انگریزوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے لیکن اس کے اگلے ہی سال یعنی 1841ء کی سردی کے موسم میں کابل میں انگریزوں کی فوج کے خلاف زبردست عوامی بغاوت ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں انگریزوں کو وہاں سے فرار ہونا پڑا لیکن پندرہ ہزار کی اس فوج میں سے صرف ایک شخص زندہ پشاور پہنچ سکا۔ باقی سارے راستے میں یا تو چھاپہ ماروں کے ہاتھوں مارے گئے یا انتہائی سردی اور بھوک کا شکار ہو گئے۔ اس پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ کو برطرف کر دیا گیا اور اس کی جگہ لارڈ ایلن برو (Ellenborough) کا تقرر ہوا جبکہ کابل میں دوست محمد خان کے بیٹے اکبر خان نے تخت پر قبضہ کر کے انگریزوں کے مسلط کردہ بادشاہ شاہ شجاع کو قتل کر دیا تھا۔ ایلن برو نے اپنے عہدے کا

چارج لینے کے فوراً ہی بعد اگست 1842ء میں قندھار اور جلال آباد میں مقیم اپنی فوجوں کو مختلف اطراف سے کابل پر حملہ کرنے کی ہدایت کی۔ اس لڑائی میں اکبر خان کو شکست ہوئی اور کابل پھر انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا۔ انہوں نے انتقاماً شہر کو تباہ و برباد کر دیا اور پھر وہ براستہ درہ خیبر پنجاب میں واپس آ گئے۔ فیروز پور میں سکھوں کے ایک کمانڈر انچیف نے ان کی بہت آؤ بھگت کی۔

پہلی افغان جنگ میں ناکامی کے بعد برطانوی سامراج نے سندھ اور بولان کے علاقے کو براہ راست اپنی تحویل میں لینے کا فیصلہ کر لیا تھا کیونکہ 1838ء میں افغانستان پر پہلا حملہ اسی راستے سے ہوا تھا اور اس بنا پر فوجی حکمت عملی کے لحاظ سے یہ علاقہ بہت اہم تھا۔ سندھ کے میروں نے تو زیادہ مزاحمت نہیں کی البتہ وہاں کے بلوچوں نے جوانمردی سے انگریزوں کا مقابلہ کیا لیکن آخر کار 1844ء میں انہیں فیصلہ کن شکست ہوگئی اور وادئ سندھ کا زیریں علاقہ برطانوی سلطنت کی بمبئی پریذیڈنسی کا ایک حصہ بن گیا۔ تاہم اسی سال لارڈ ایلن برو کو برطرف کر دیا گیا اور اس کی جگہ لارڈ ہنری ہارڈنگ (Henry Harding) کا تقرر ہو گیا۔ نومبر 1845ء میں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان پہلی جنگ ہوئی جو فیروز پور، لدھیانہ اور سبھراؤں کی لڑائیوں کے بعد فروری 1846ء میں انگریزوں کی فتح پر اختتام پذیر ہوئی۔ 10ر فروری 1846ء کو قصور میں سکھوں کے نوعمر راجہ دلیپ سنگھ نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ایک معاہدے کے تحت بیاس اور ستلج تک کا علاقہ انگریزوں کی تحویل میں چلا گیا۔ لاہور کے سکھ دربار میں انگریز ریذیڈنٹ کا تقرر ہوا اور 15 لاکھ پونڈ تاوان مقرر ہوا۔ 20ر فروری کو انگریزوں کی فوج ہارڈنگ کی زیر سرکردگی فاتحانہ طریقے سے لاہور میں داخل ہوئی۔ چونکہ دلیپ سنگھ کا خزانہ بالکل خالی تھا اس لئے اس کے وزیر اعظم گلاب سنگھ نے 15 لاکھ پونڈ تاوان کی ادائیگی کی۔ چنانچہ اس کے عوض اسے وادئ کشمیر کا علاقہ دے دیا گیا۔

مارچ 1848ء میں ہنری ہارڈنگ واپس انگلستان چلا گیا اور اس کی جگہ لارڈ ڈلہوزی (Dalhousie) کا تقرر ہوا۔ 15ر اگست 1848ء کو ڈلہوزی نے لندن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف کنٹرول کے صدر سر جان ہوب ہاؤس (John Hobhouse) کے نام ایک خط میں یہ تجویز پیش کی کہ سکھوں کی سلطنت کا بقیہ علاقہ بھی لے لینا چاہیے کیونکہ ''لاہور میں مقیم انگریز ریذیڈنٹ نے اسے سازش کی اطلاع دی تھی۔'' یہ مبینہ سازش رانی جنداں نے کابل کے بادشاہ

اور چیفس آف پنجاب کے ساتھ مل کر کی تھی اور اس کا مقصد انگریزوں کو پورے شمالی ہندوستان سے باہر نکالنا تھا۔ ڈلہوزی کا خیال تھا کہ اب یہ سکھ سلطنت افغانستان اور ہندوستان کے درمیان ''بفرسٹیٹ'' کا کام نہیں دے سکتی۔ چنانچہ ستمبر 1848ء میں سکھوں اور انگریزوں کے درمیان ملتان میں مڈبھیڑ ہوئی تو سکھوں نے افغانستان کے حکمران امیر دوست محمد خان سے فوجی اتحاد کر لیا۔ متعدد چھوٹی بڑی لڑائیوں کے بعد 20رفروری 1849ء کو گجرات میں فیصلہ کن لڑائی ہوئی جس میں برطانوی سامراج فتح یاب ہوا اور سکھوں کی سلطنت صفحۂ ہستی سے مٹ گئی۔ دوست محمد خان کی جو گھوڑ سوار فوج سکھوں کی امداد کے لئے گجرات آئی تھی وہ فرار ہو کر واپس چلی گئی۔ 12رمارچ 1849ء کو سکھوں کے جنرل شیر سنگھ نے ہتھیار ڈال دیئے اور 29رمارچ کو مہاراجہ دلیپ سنگھ نے لاہور میں منعقدہ دربار میں شکست تسلیم کر لی اور اس طرح پورا پنجاب وسرحد برطانوی سلطنت کا حصہ بن گیا۔ جبکہ اُدھر روسی سامراج دریائے ڈینیوب کے گردونواح میں اور وسطی ایشیا میں ترکوں کے متعدد علاقوں پر قابض ہو چکا تھا اور برطانیہ میں تقریباً سارے مکاتب فکر کے ارکان اس امکان سے آگاہ ہو چکے تھے کہ روس اپنی سلطنت کی افغانستان، ایران اور چین میں توسیع کر کے ہندوستان کے گھیراؤ کا حقیقی خطرہ پیدا کر سکتا ہے۔

ان حالات میں کمپنی نے پنجاب کے نئے مقبوضات کا نظم ونسق چلانے کے لئے ایک سہ رکنی بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کا تقرر کیا جس کا سربراہ ایک فوجی جرنیل ہنری لارنس (Henry Lawrence) تھا۔ یہ شخص سکھوں کی شجاعت وبہادری کا قائل تھا اور ان کے انفرادی واجتماعی کردار کو پسند کرتا تھا۔ اسے سکھوں کے کردار کی خصوصیات سے آگاہی تھی کیونکہ وہ لاہور دربار میں نوعمر راجہ دلیپ سنگھ کی جانب سے کاروبار حکومت کی نگرانی کر چکا تھا بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کا دوسرا رکن اس کا چھوٹا بھائی جان لارنس (John Lawrence) تھا۔ وہ کمپنی کی سول سروس کا رکن تھا اور اسے شمال مغربی صوبوں یعنی یو۔پی میں اور جالندھر کے دوآبہ میں بندوبست اراضی کے کام کا خاصا تجربہ تھا۔ تیسرا رکن چارلس مینسل (Charles Mansell) تھا جو مالیاتی امور کا ماہر تھا۔ صوبہ کو سات کمشنریوں میں تقسیم کیا گیا تھا اور ان کمشنریوں کے 27 اضلاع تھے۔ ان کا انتظام کمشنر، ڈپٹی کمشنر، اسسٹنٹ کمشنر اور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کرتے تھے۔ چونکہ اس سارے علاقے کو محض فوجی حکمت عملی کے تحت زیر تحویل لیا گیا تھا اس لئے اس کی حیثیت ایک سرحدی صوبہ کی تھی

اوراس کی انتظامیہ فوجی طرز کی تھی۔ تقریباً سارے افسر فوجی تھے جنہیں پنجاب کمیشن کے ارکان کہا جاتا تھا۔ ان کا اولین فرض یہ تھا کہ وہ روسی سامراج کی توسیع پسندانہ کاروائیوں کے پیش نظر اس علاقے میں سختی کے ساتھ امن وامان قائم رکھیں۔ انہیں اس مقصد کے لئے 60 ہزار فوج اور پندرہ ہزار پولیس دی گئی تھی۔ اس فوج اور پولیس کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ سکھوں کے علاوہ مسلمانوں اور ہندوؤں کی مقامی آبادی کے جذبۂ حریت کو جس طرح چاہیں کچل دیں اور انگریزوں کی حکومت کا ایسا دبدبہ قائم کریں کہ کسی اور کو سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو۔ چنانچہ ایک باقاعدہ مہم کے ذریعے سکھوں کے مسلح جتھوں کے علاوہ ساری مقامی آبادی کو بے ہتھیار کردیا گیا۔ اس مہم کے دوران 25 جاگیرداروں کی جاگیریں ضبط کر لی گئیں کیونکہ انہوں نے سکھوں کے ساتھ دونوں جنگوں کے دوران انگریزوں کی مخالفت کی تھی۔ ان میں متعدد جاگیرداروں کو ان کے گھروں میں نظر بند رکھا گیا اور کئی دوسروں کو پنجاب سے بیدخل کر کے کلکتہ اور الہ آباد میں مقید کر دیا گیا۔ چنانچہ سکھوں کے حوصلے اتنے پست ہوئے کہ 1850ء میں مہاراجہ دلیپ سنگھ نے عیسائی مذہب قبول کرلیا۔ جو جاگیرداران جنگوں میں غیر جانبدار تھے انہیں ان کی پیش کردہ دستاویزات کی بنیاد پر نئی گرانٹیں دی گئیں اور اس طرح انہیں نئے حکمرانوں کے وفادار رہنے کی ترغیب دی گئی۔ یہ کام چند ہی سالوں میں بڑی آسانی اور خوش اسلوبی سے مکمل ہوگیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس وقت تک صنعتی معاشرے کے انگریز فوجی وسول افسروں کو ہندوستان کا نظم ونسق چلانے کا وسیع تجربہ حاصل ہو چکا تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس علاقے کی آبادی رنجیت سنگھ کی موت کے بعد خونریز طوائف الملوکی اور لاقانونیت سے بہت تنگ آئی ہوئی تھی۔ جب لوگوں نے انگریزوں کی انتظامیہ کی اعلیٰ معیار کی کارکردگی دیکھی تو انہوں نے نئے حکمرانوں کو خوش آمدید کہا اور ان کی بلا تامل امداد وحمایت کی۔ انگریزوں کی آمد سے قبل بے لگام سکھا شاہی نے عوام الناس کی زندگی کو اجیرن کر رکھا تھا۔

نیا بندوبستِ اراضی اور ساہوکار کی قوت میں اضافہ

جب صوبہ میں انگریزوں کی فوجی انتظامیہ نے امن وامان نافذ کر کے اپنا اقتدار مستحکم کرلیا تو بورڈ آف ایڈمنسٹریشن نے بندوبست اراضی کی طرف توجہ کی۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کی طرح پنجاب میں بھی انگریزوں کی آمد سے قبل زمین کی نجی ملکیت کا تصور نہیں تھا۔

سکھوں نے مغلوں کے نظام اراضی کو برقرار رکھا تھا اور وہ یہ تھا کہ زمین کا کوئی رقبہ کسی ایک شخص کی ملکیت نہیں ہوتا تھا بلکہ گاؤں کا پورا معاشرہ ساری زمین کا مالک تصور کیا جاتا تھا۔ لہٰذا کسی کسان کو کبھی بیدخلی کا خطرہ لاحق نہیں ہوتا تھا اور کوئی انتقال اراضی گاؤں کے سارے لوگوں کی مرضی کے بغیر نہیں ہوسکتا تھا۔ ایس۔ ایم۔ اکرام نے تھور برن، ڈارلنگ اور ستیہ رائے کے حوالے سے لکھا ہے کہ پنجاب میں ''کسان'' ''نجی حقوق''، ''جائیداد''، ''دولت کی قوت خرید'' اور ''قرقی و فروخت'' کے تصور سے بالکل ناآشنا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آتا تھا کہ کوئی شخص اسے اس کی زیر کاشت زمین سے محروم کرسکتا ہے۔ چونکہ قرضے کی کوئی قانونی ضمانت نہیں ہوتی تھی اور ساہوکار کسی صورت مقروض کسان کی زمین حاصل نہیں کرسکتا تھا اس لئے کسان قرضے کی ادائیگی صرف اس وقت کرتا تھا جبکہ اس کے پاس فالتو پیسہ ہوتا تھا۔ کوئی آڑھتی یا دلال نہیں ہوتے تھے اور بنیا گاؤں کے لوگوں کی اجتماعی قوت اور حکومت کی عدم مداخلت کے باعث بالکل بے بس ہوتا تھا۔ ساہوکار اپنے قرضے کی وصولی کے لئے حکومت کے کاردار کی بجائے اپنے اثر و رسوخ پر اعتماد کرتا تھا۔ کسی جاگیردار یا زمیندار کو بھی کسی رقبۂ اراضی پر مالکانہ حقوق حاصل نہیں ہوتے تھے۔ اسے صرف اپنے مخصوص علاقے میں مالیہ وصول کرنے کا اختیار ہوتا تھا جس کا ایک حصہ وہ سرکاری خزانے میں جمع کراتا تھا اور ایک حصہ اپنے پاس رکھتا تھا جو ان خدمات کا عوضانہ تصور کیا جاتا تھا جو وہ اپنے علاقے میں امن و امان قائم رکھنے اور بعض دوسرے سرکاری معاملات طے کرنے کے لئے سرانجام دیتا تھا۔ لیکن 1850ء کے بعد ہنری لارنس نے اس دیرینہ نظام اراضی میں بعض بنیادی تبدیلیاں کردیں۔ ایک نمایاں تبدیلی یہ تھی کہ ساہوکار کے قرضہ کی دستاویز کو قانونی تقدس بخش دیا گیا اور اسے بعض شرائط کے تحت زمین رہن میں لینے اور خریدنے کا حق حاصل ہوگیا۔ اس طرح ہر گاؤں میں ساہوکار کی بالادستی قائم ہوگئی اور گاؤں والوں کی اجتماعی قوت میں کمی آ گئی۔''[1] تاہم پنجاب کے بورڈ آف ایڈمنسٹریشن نے بندوبست اراضی کے لئے جو طریقہ اختیار کیا وہ اس طریقے سے مختلف تھا جو 1793ء میں لارڈ کارنوالس (Cornwallis) نے بنگال میں نافذ کیا تھا۔ فرق یہ تھا کہ پنجاب میں بندوبست مستقل نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کی 15 سے 30 سال تک کی معیاد مقرر کی گئی تھی۔ اگرچہ اس عرصے کے لئے مالیہ کی شرح سکھوں کی مقرر کردہ شرح سے بظاہر 5 سے لے کر 50 فیصد تک کم تھی لیکن کسانوں کو شکایت ہوتی تھی کہ ان سے مالیہ کی وصولی میں بڑی سختی کی جاتی ہے۔

انگریزوں کی قائم کردہ حکومت، فوجی حکومت تھی

1853ء میں سہ رکنی بورڈ آف ایڈمنسٹریشن ختم کر دیا گیا اور سر جان لارنس صوبہ کا پہلا چیف کمشنر مقرر ہوا۔ اس شخص کو انتہائی فوجی اہمیت کے حامل اس سرحدی صوبے میں اتنے زیادہ اختیارات دیئے گئے تھے کہ یہ عملاً یہاں کا آمر مطلق تھا۔ اس نے اپنے زیر تحویل علاقے میں جو انتظامیہ تشکیل کی اس پر برطانوی پارلیمنٹ کے 1773ء کے ریگولیٹنگ ایکٹ کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ اس سرحدی صوبہ کو عملاً سرزمین بے آئین قرار دیا گیا تھا۔ سر جان لارنس اور اس کے ماتحت حکام ان قوانین وقواعد کے پابند نہیں تھے جو قبل ازیں کلکتہ، مدراس، بمبئی اور الہ آباد کی پریذیڈنسیوں میں نافذ ہو چکے تھے۔ لارنس کے ماتحت فوج اور پولیس میں بہت اضافہ کر دیا گیا تھا تا کہ چوری چکاری، ٹھگی، رسہ گیری اور ڈاکہ زنی کی وارداتوں کا سد باب کر کے مکمل امن وامان قائم کیا جائے۔ اس نے اپنے ڈپٹی کمشنروں کو اتنے اختیارات دیئے تھے کہ وہ عملاً اپنے ضلع کے مطلق العنان بادشاہ تھے۔ ڈپٹی کمشنر بیک وقت ضلع کی انتظامیہ کا سربراہ بھی تھا اور جج بھی تھا۔ ریونیو کلکٹر بھی تھا اور پولیس کا انچارج بھی تھا۔ وہ سفارتکار بھی تھا اور پادری بھی تھا۔ مزید برآں اسے جنگلات، صحت، تعلیم، زراعت اور آبپاشی کے محکموں پر کلی اختیارات حاصل تھے۔ عوام الناس مالیہ کی معافی، زرعی قرضوں کی گرانٹ، سکولوں اور ہسپتالوں کی تعمیر اور دوسرے بے شمار کاموں کے لئے صرف ڈپٹی کمشنر کی نظر عنایت پر انحصار کرتے تھے اور یہ ڈپٹی کمشنر بالعموم فوجی افسر ہوتا تھا۔

پنجاب میں اس قسم کی استبدادی انتظامیہ قائم کرنے کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں بین الاقوامی سطح پر کچھ ایسے واقعات ہو رہے تھے جن کے پیش نظر انگریزوں کو اپنی سلطنت کی ''سونے کی چڑیا'' کی مستقبل کے بارے میں لاحق شدہ خطرہ بڑھ گیا تھا۔ جب 1853ء میں پنجاب میں سر جان لارنس کی آمریت قائم ہوئی تھی تو اس سے قبل روس کے زار نکولس اوّل نے برطانوی سفیر کے ساتھ بات چیت کے دوران ترکوں کی سلطنت عثمانیہ کو ''یورپ کا مرد بیمار'' قرار دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ''ہمارے بازوؤں پر ایک مرد بیمار پڑا ہے۔ یہ بہت ہی بیمار ہے اور اس امر کا امکان ہے کہ یہ یکا یک ہمارے بازوؤں پر دم توڑ دے'' اور پھر 19 اپریل 1853ء کو ترکی میں مقیم روسی سفیر پرنس الیگزینڈر مینشی کوف (Alexander Menchikoff) نے سلطان عبدالحمید کو

یہ الٹی میٹم دیا تھا کہ اگر سلطنت عثمانیہ میں عیسائیوں پر ''مظالم'' فوری طور پر بند نہ کئے گئے تو روس اپنے ہم مذہبوں کے تحفظ کے لئے کوئی کاروائی کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ جب مئی میں سلطان نے یہ الٹی میٹم مسترد کر دیا تو زار نکولس اوّل (Nicholas I) نے دریائے ڈینیوب کے گرد و نواح میں ترکوں کے علاقوں پر قبضہ کرنے کا حکم صادر کر دیا۔ اگر چہ ان دنوں برطانیہ اور فرانس میں ایسے عناصر موجود تھے جو وسطی ایشیا میں روسی سلطنت کی توسیع کا خیر مقدم کرتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح مسیحیت کی تبلیغ کے مواقع مہیا ہو جائیں گے تاہم ان دونوں ملکوں کی حکومتیں روس کی روز افزوں توسیع پسندی کو اپنے عالمی مفادات کے لئے خطرناک تصور کرتی تھیں۔ چنانچہ ان دونوں نے ایک طرف تو روس کے خلاف ترکی کی امداد کرنے کا فیصلہ کیا اور دوسری طرف اپنی غیر ملکی نوآبادیات کے دفاع کو مضبوط کرنے کے لئے مناسب کاروائیاں کیں۔ 13 رجون 1853ء کو انگریزوں کا بحری بیڑہ درہ دانیال میں پہنچ گیا اور اس سے اگلے دن فرانسیسی بیڑہ بھی اس کے ساتھ جاملا۔ اس کاروائی کا مقصد یہ تھا کہ یہ سمندری راستہ ان کی غیر ملکی نوآبادیات کی جانب آمدورفت کے لئے کھلا رہے۔ 2 رجولائی کو روس نے ترکی کے ڈینیوبی صوبوں پر حملہ کر دیا اور 4 را کتوبر 1853ء کو برطانوی اور روسی فوجوں کے درمیان کریمیا کی جنگ شروع ہوگئی۔ چنانچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت نے پنجاب کے سرحدی صوبے میں سرجان لارنس کی استبدادی حکومت کی تقویت کے لئے مزید فوج یہاں بھیج دی۔ ان دنوں پورے برصغیر میں انگریزوں کی 12 ڈویژن فوج تھی جس میں سے 4 ڈویژن فوج صرف پنجاب میں متعین کی گئی جبکہ 27 اضلاع کے ڈپٹی کمشنر بھی فوجی افسر تھے۔

12 رمارچ 1854ء کو برطانیہ اور فرانس نے ترکی کے ساتھ فوجی معاہدہ کیا اور پھر انہوں نے روس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ جس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ روس کے ایک جرنیل ڈولگورکی (Dolgoruki) نے اسی سال جنگ کریمیا کے بعد ہندوستان پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ یہ جنگ 25 رفروری 1856ء کو ختم ہوئی جبکہ ترکی کی علاقائی سالمیت کو تسلیم کر لیا گیا۔ 15 راپریل 1856ء کو برطانیہ، فرانس اور آسٹریا نے ترکی کے ساتھ ایک اور معاہدہ کیا جس کے ماتحت انہوں نے ترکی کو اس کی آزادی و سالمیت کی ضمانت دی۔ اسی سال ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ کیننگ (Canning) نے ایران کے خلاف اعلان جنگ کر دیا کیونکہ تہران

میں برطانوی سفیر کی ''بے عزتی'' کی گئی تھی اور ایران نے ہرات پر قبضہ کر لیا تھا۔ 1857ء کے اوائل میں برطانیہ اور ایران کے درمیان لڑائی ہوئی جس میں ایران کو بری طرح شکست ہوئی۔ اس کے بعد ہرات کا علاقہ ہمیشہ کے لئے افغانستان کے حوالے کر دیا گیا۔ اس سے قبل پنجاب کے بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کے پہلے سربراہ ہنری لارنس نے افغانستان کے امیر دوست محمد سے مصالحت کر لی تھی۔ اس طرح ہندوستان کی جانب روس کی پیش قدمی کا وقتی طور پر سدباب ہو گیا۔ پنجاب کی حکومت نے اس مقصد کے لئے 1849ء سے لے کر 1856ء تک شمال مغربی علاقے کے حریت پسند قبائلیوں کے خلاف 12 مرتبہ فوجی کارروائی کی تھی اور پشاور، راولپنڈی، ملتان، سیالکوٹ، میاں میر (لاہور) اور کوہاٹ میں چھاؤنیاں تعمیر کی تھیں۔ اس دوران متعدد سول تعمیراتی کاموں کے علاوہ صوبہ کے عوام کی معاشرتی اصلاح کے لئے بھی کچھ کارروائیاں ہوئی تھیں۔ مثلاً جالندھر ڈویژن اور صوبہ کے بعض دوسرے علاقوں میں بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی ہلاک کر دینے کی ظالمانہ رسم کے انسداد کے لئے وسیع پیمانے پر مہم چلائی گئی تھی۔ یہ رسم زیادہ تر سکھوں میں بیدیوں کے ایک اور فرقہ میں پائی جاتی تھی جنہیں ''کڑی مار'' کہا جاتا تھا لیکن صوبہ کے ہندو اور مسلمان بھی اس وحشیانہ رسم سے مبرا نہیں تھے۔ چنانچہ اس کے مکمل انسداد کے لئے چھ سال کا عرصہ لگا تھا۔

مئی 1857ء میں میرٹھ میں برطانوی سامراج کے خلاف پہلی جنگ آزادی جسے انگریز غدر کا نام دیتے ہیں کا آغاز ہوا تو اس کے اثرات پنجاب کے سرحدی صوبے پر بھی پڑے۔ انبالہ، جالندھر، پھلوار، فیروز پور، ملتان، کوہاٹ اور بعض دوسرے شہروں میں گڑبڑ ہوئی لیکن سرجان لارنس کی انتظامیہ نے جلد ہی اس پر قابو پا لیا۔ بہت سے ہندو، سکھ اور مسلمان جاگیرداروں نے اس سلسلے میں انگریزوں کی ''گراں قدر'' خدمات سرانجام دیں چنانچہ بعد ازاں ان وفادار ''چیفس'' کو بڑی فیاضی کے ساتھ انعام واکرام سے نوازا گیا۔ جون 1858ء میں یہ ''بغاوت'' ختم ہوئی تو برطانوی پارلیمنٹ نے ''انڈیا ایکٹ'' منظور کیا جس کے تحت حکومت برطانیہ نے براہ راست ہندوستان کا نظم ونسق سنبھال لیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کو اس ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا گیا۔ ایک وزیر ہند مقرر کیا گیا جس کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ اس امر کی نگرانی کرے گا کہ ہندوستان کا کاروبار حکومت برطانوی پارلیمنٹ کے منظور کردہ قوانین اور ضوابط کے مطابق چلایا جائے۔

1861ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے پہلا انڈین کونسلز ایکٹ منظور کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ گورنر جنرل اور صوبائی گورنروں کی امداد کے لئے قانون ساز کونسلیں مقرر کی جائیں۔ چنانچہ اسی سال کلکتہ میں گورنر جنرل اور مدراس اور بمبئی میں گورنروں کی کونسلوں کا تقرر ہو گیا۔ بنگال کے صوبائی گورنر کے لئے 1863ء میں کونسل کی تشکیل ہوئی اور یو۔ پی میں یہ مشاورتی قانون ساز ادارہ 1866ء میں بنا لیکن پنجاب کے سرحدی صوبے کو اس آئینی رعایت سے محروم رکھا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ برطانوی سامراج نے ایران اور افغانستان پر اپنی بالادستی قائم کر کے ہندوستان کی جانب روسی سامراج کی پیش قدمی کا سدباب کر دیا تھا لیکن یہ خطرہ ابھی پوری طرح ٹلا نہیں تھا۔ روسیوں کے لئے سنکیانگ کا راستہ ابھی تک کھلا تھا۔ انگریزوں نے چین کے اس صوبے میں 1863ء میں ایک مقامی جاگیردار یعقوب بے کی وساطت سے ایک ''آزاد بفر سٹیٹ'' قائم کرنے کی کوشش کی تھی مگر حکومت چین نے روس کی امداد سے اس کوشش کو ناکام بنا دیا تھا۔ مزید برآں جنگ آزادی یا ''غدر'' کے دوران باغی عوام اور مقامی حکمرانوں نے روسی امداد کی توقع کی تھی۔''[2] لہٰذا پنجاب پر ایک آمر مطلق لیفٹیننٹ گورنر کی استبدادی حکومت قائم رہی اور دہلی کا علاقہ بھی اس صوبہ میں شامل کر دیا گیا۔

پنجاب میں صوبائی حکومت کی انتظامیہ کسی قانون، ضابطے اور قاعدے کی پابند نہیں تھی۔ اس کا واحد مقصد یہ تھا کہ اس سرحدی صوبہ میں بہر قیمت امن و امان قائم رکھا جائے اور کچھ اس طرح کا نظام اراضی رائج کیا جائے کہ کسانوں میں کوئی بے چینی نہ پھیلنے پائے۔ دیہاتی علاقوں میں پٹواریوں، گرداوروں، نمبرداروں، ذیلداروں، سفید پوشوں، تھانیداروں اور تحصیل داروں وغیرہ پر مشتمل ایسے انتظامی ڈھانچے کی تعمیر کی جائے کہ کسانوں میں بدامنی کا امکان پیدا نہ ہونے پائے۔ فوجی ڈپٹی کمشنروں کو یہ ہدایت تھی کہ وہ خود گھوڑے پر اپنے ضلع کے سارے علاقوں کا دورہ کرتے رہیں اور اس طرح امن و امان کی صورت حال پر گہری نظر رکھیں۔ پنجاب کی یہ حکومت اس قدر استبدادی تھی کہ سرسید احمد خان نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ریٹائر ہونے کے بعد اپنے آبائی شہر دہلی میں رہائش اختیار نہیں کریں گے۔ انہوں نے اپنی سائنٹیفک سوسائٹی اور سکول کے لئے بھی علی گڑھ کا انتخاب محض اس لئے کیا تھا کہ یہ قصبہ پنجاب کی حکومت کے ماتحت نہیں تھا۔ الطاف حسین حالی لکھتے ہیں کہ سرسید احمد خان ماضی و حال کی ایسی شخصی حکومتوں کی سخت مذمت کیا

کرتے تھے۔ جو کسی قانون وضابطہ کی پابند نہیں ہوتی تھیں۔'' سر سید کی یہ باتیں صرف زبانی ہی نہ تھیں بلکہ غدر کے بعد انہوں نے اس بات کا عملی ثبوت بھی دیا تھا کہ جہاں انتظام ملک کا قانون پر نہیں بلکہ زیادہ تر حکام کی زبان پر ہو وہاں رہنا وہ ہرگز پسند نہ کرتے تھے کیونکہ غدر کے بعد جبکہ قسمت دہلی صوبہ شمال مغربی (یو۔پی) سے نکال کر صوبہ پنجاب کے ساتھ ملحق کی گئی، انہوں نے دہلی کی سکونت فوراً ترک کر دی اور اپنے تمام بڑے بڑے کاموں کا مرکز علی گڑھ کو قرار دیا۔ یہاں تک کہ 1866ء میں جبکہ سر ڈونلڈ میکلوڈ صاحب (Donald Macleod) لیفٹیننٹ گورنر صوبہ پنجاب نے دہلی میں دربار کیا جس میں سر سید کو بھی علی گڑھ سے بلایا گیا تھا تو سر سید سے پرائیویٹ ملاقات کے وقت صاحب ممدوح نے اس بات کی سخت شکایت کی کہ تم نے سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ میں جا کر قائم کی اور اپنے قدیم وطن دہلی کو اس کے فوائد سے محروم رکھا۔ سر سید نے کہا کہ میں پنجاب گورنمنٹ کو جیسی کہ وہ اب ہے ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ کا نمونہ سمجھتا ہوں اور اس لئے جبکہ قسمت دہلی پنجاب میں شامل ہوگئی میں دہلی میں رہنا پسند نہیں کرتا۔ اس کے قریب قریب انہوں نے 1869ء میں ڈی فٹز پیٹرک صاحب (D Fitzpatrick) سے، جو دہلی میں ڈپٹی کمشنر رہ چکے تھے اور آخر کو پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر ہوئے، انگلستان جاتے ہوئے جہاز میں تقریر کی تھی جس کا ذکر انہوں نے اپنے سفر نامے میں کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ ایک دن پنجاب کے انتظام کی بھلائی برائی کا ذکر آ گیا میں نے کہا ہاں ایک ڈسپاٹک گورنمنٹ ہے اور بلاشبہ سکھوں کی عملداری سے ہزار درجہ بہتر ہے لیکن شاید پنجاب کے لوگ اس سے خوش ہوں کیونکہ ان کو آگ (یعنی سکھوں کی علمداری) میں سے نکال کر دھوپ میں بٹھا دیا گیا ہے۔ مگر ہم لوگ اس کو پسند نہیں کرتے۔ جہاں تک مجھ کو معلوم ہے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ غدر میں جہاں اور سزائیں اہل دہلی اور اس کے متعلق اضلاع کو دی گئیں منجملہ ان سزاؤں کے ایک یہ بھی سزا ہے کہ دہلی اور اس کے متعلق اضلاع میں پنجابی انتظام کیا گیا اور بے قانونی ملک بنا دیا گیا۔'' اس کے بعد وہ سفر نامے میں لکھتے ہیں کہ ''حقیقت میں اب وہ زمانہ نہیں رہا جس میں ڈسپاٹک گورنمنٹ کو لوگ پسند کرتے تھے اور نہ اب وہ بھلائیاں ہیں جو ہزاروں برائیوں کے ساتھ اگلے زمانے کی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ملی ہوئی تھیں اور جن سے ان برائیوں کا علاج ہوتا تھا۔ چورگ زن کہ جراح ومرہم نہ ہست۔ اب اس کا ہونا کسی ڈسپاٹک گورنمنٹ میں ممکن نہیں ہے۔ جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہندوستان

میں بجائے کانسٹیٹیوشنل گورنمنٹ کے، ڈسپاٹک گورنمنٹ، جیسی کہ قدیم سے تھی زیادہ تر مفید ہو گی، وہ نہایت غلطی میں ہیں۔"[3]

جب جنوری 1868ء میں لارڈ ڈربی (Derby) کی جگہ بنجمن ڈسرائیلی (Benjamin Disraeli) برطانیہ کا وزیر اعظم بنا تو پنجاب کی حکومت کی سخت گیری میں اور بھی اضافہ ہو گیا کیونکہ اس کی فارورڈ پالیسی کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستان کو روس کی دستبرد سے بچانے کے لئے نہ صرف برصغیر کے شمال مغربی سرحدی علاقوں میں باغیانہ سیاسی رجحانات کا سد باب کیا جائے بلکہ ان سرحدی علاقوں میں آگے بڑھ کر دفاعی مورچے بنائے جائیں۔ اگرچہ اسی سال شمالی علاقے میں سید احمد بریلوی کے پیروکاروں کی تحریک جہاد ختم ہو گئی تھی کیونکہ انگریزوں نے اس تحریک کا قلع قمع کرنے کے لئے 16 مرتبہ فوجی کاروائی کی تھی لیکن روسیوں نے سمرقند پر قبضہ کر لیا تھا اور اس سے اگلے سال یعنی 1869ء میں انہوں نے ترکستان پر اپنی حکمرانی قائم کر لی تھی۔

1870ء میں انگریزوں نے بالآخر ہندوستان میں اپنی اینٹی مسلم پالیسی میں تبدیلی کی کیونکہ اس وقت تک کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں ہندوؤں کا ایک ایسا بورژوا طبقہ وجود میں آ گیا تھا جو نہ صرف زیادہ اعلیٰ ملازمتوں کا مطالبہ کرتا تھا بلکہ سیاسی حقوق کی بھی اپیلیں کرتا تھا۔ حکومت برطانیہ کی منظوری سے وائسرائے لارڈ میو (Mayo) کی جانب سے حکومت ہند کی پالیسی میں اس تبدیلی کا مقصد یہ تھا کہ شکست خوردہ اور پست حوصلہ مسلمانوں کی قدرے سرپرستی کی جائے تاکہ ہندوؤں کے روز افزوں عزائم کا سیاسی طور پر سد باب ہو سکے۔ تاہم پنجاب کی مسلم اکثریت اس نئی پالیسی کی افادیت سے محروم رہی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حکومت ہند اس صوبہ کے مسلمانوں کو کوئی خاص رعایت دے کر سکھوں کو ناراض کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ سکھوں نے نہ صرف غدر کے زمانے میں انگریز کی مؤثر امداد کی تھی بلکہ اب بھی وہ ان کی مقامی فوج میں اہم عنصر کی حیثیت رکھتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اس صوبہ میں مطلوبہ معاشرتی اور تعلیمی سہولتیں مہیا کر کے ایسی سیاسی بیداری کا سامان مہیا نہیں کرنا چاہتے تھے جو بالآخر خطرناک ثابت ہو سکتی تھی۔

روسیوں نے 1870ء میں وسطی ایشیا میں اپنا اقتدار مستحکم کر کے سنکیانگ میں دخل اندازی شروع کر دی تھی۔ اس صوبہ میں چین کی مرکزی حکومت کا کبھی مؤثر کنٹرول نہیں رہا تھا اور اس کا اس سے رابطہ روس کے علاقے سے گزر کر ہوتا تھا۔ چونکہ اس صوبہ کی معیشت کا زیادہ تر

انحصار روس کے ساتھ تجارت پر تھا اس لئے روسی فرمانرواؤں نے پہلے تو سنکیانگ میں تجارتی مراعات حاصل کیں اور پھر انہوں نے یہاں سیاسی مراعات کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ جس کے نتیجے میں روس اور برطانیہ کے مفادات میں تصادم ہونا ناگزیر تھا۔ روس نے مشرق وسطیٰ اور شمالی چین میں جو پالیسی اختیار کر رکھی تھی اس سے صاف ظاہر ہو گیا تھا کہ اس کی نظریں خلیج فارس، بحیرہ عرب اور چینی ترکستان پر لگی ہوئی ہیں۔ وہ بحیرہ عرب میں گرم پانی کی بندرگاہ کے لئے ترستا تھا۔ اسی زمانے میں یعنی پہلے 1865ء میں اور پھر 1870ء میں ریاست جموں وکشمیر کے مہاراجہ رنبیر سنگھ نے برطانیہ کے خلاف روسی زار کی امداد حاصل کرنے کے لئے اپنے وفود تاشقند بھیجے تھے۔[4] اگست 1873ء میں روس نے خیوا اور بخارا پر اپنا اقتدار اعلیٰ قائم کر لیا تھا اور جنوری 1874ء میں اس نے جبری بھرتی کا قانون نافذ کر دیا تھا۔ کیونکہ اسے اب یقین ہو گیا تھا کہ ''یورپ کا مرد بیمار'' یعنی ترکوں کی سلطنت عثمانیہ اس کے بازوؤں پر دم توڑنے ہی والا ہے۔ اس کا یہ یقین بے بنیاد نہیں تھا کیونکہ بیرونی قرضوں کے باعث ترکی کی معیشت بالکل تباہ ہو چکی تھی چنانچہ آٹھ دس ماہ بعد یعنی دسمبر 1874ء میں یہ سلطنت دیوالیہ ہو گئی تھی۔

1877ء میں پنجاب میں کچھ بورژوا سیاسی سرگرمی کا آغاز ہوا جب بنگال کے ایک لیڈر سریندر ناتھ بینرجی نے یہاں آ کر لاہور انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی جبکہ روس بلقان کی جنگ میں مصروف ہو گیا تھا۔ ایک بنگالی کی جانب سے پنجاب میں آ کر اس قسم کی کارروائی کرنے کا پس منظر یہ تھا کہ چونکہ پنجاب تعلیمی لحاظ سے بہت پسماندہ تھا اس لئے یہاں کی چھوٹی بڑی ملازمتوں میں بنگالیوں کو خاصی نمائندگی حاصل تھی اور وکالت کے پیشہ پر بھی بنگالیوں کی اجارہ داری تھی۔ لیکن یہ لاہور انڈین ایسوسی ایشن زیادہ دیر تک نہ چل سکی۔ 1885ء میں یہاں انڈین نیشنل کانگرس کی شاخ قائم ہوئی لیکن آٹھ دس سال تک اس کی حیثیت دانشوروں کے محض ایک تفریحی کلب سے زیادہ نہیں تھی۔ البتہ اس دوران دیانند سرسوتی کی زیر قیادت 1875ء میں ہندوؤں کی احیائی تحریک آریہ سماج شروع ہوئی تھی جس نے 1889ء تک خاصا فروغ حاصل کر لیا تھا۔

1892ء میں ایک اور انڈین کونسلز ایکٹ کے تحت گورنر جنرل اور گورنروں کی کونسلوں کے ارکان کی تعداد میں اضافہ کیا گیا اور یہ قرار دیا گیا کہ ان کونسلوں کی مخصوص نشستوں کے لئے پبلک ایسوسی ایشنوں، میونسپل کمیٹیوں اور دوسرے پبلک اداروں کے ذریعے بالواسطہ انتخاب ہو

گا۔لیکن پنجاب میں اس وقت بھی کسی قسم کی آئینی اصلاحات کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ روس 1891ء میں ہندوستان کی سرحد کے نزدیک پامیر کے علاقے میں پہنچ چکا تھا۔ البتہ 1897ء میں پنجاب پر پہلی مرتبہ ''مہربانی'' کی گئی اور صوبائی گورنر کے لئے 9 نامزد ارکان کی ایک کونسل مقرر کی گئی۔ اس نامزد کونسل کی حیثیت محض مشاورتی اور نمائشی تھی کیونکہ کوئی تعزیری قانون گورنر جنرل اور وزیر ہند کی پیشگی منظوری کے بغیر اس کے روبرو پیش نہیں کیا جاسکتا تھا اور جب یہ کونسل کوئی غیر تعزیری قانون منظور کرتی تھی تو اس کا اس وقت تک نفاذ نہیں ہوسکتا تھا جب تک لیفٹیننٹ گورنر اور گورنر جنرل اس کی منظوری نہیں دے دیتے تھے۔

ساہوکارہ نظام اور ہندو۔ مسلم تضاد میں شدت

جب اس کونسل نے 1900ء میں قانون انتقال اراضی منظور کیا تو شہری ہندو لیڈروں نے زبردست احتجاج کیا کیونکہ اس قانون کا مقصد چھوٹے کاشتکاروں کو ہندو ساہوکاروں کی دستبرد سے بچانا تھا۔ اس قانون کے ذریعے غیر زراعت پیشہ افراد کو زرعی زمین خریدنے کی ممانعت کردی گئی تھی بالفاظ دیگر اب ساہوکار اپنے قرضے کی وصولی کے لئے کسی مقروض کاشتکار کی زمین حاصل نہیں کرسکتے تھے۔ اس قانون کی بنیاد بنگال سول سروس کے ایک انگریز افسر تھوربرن (Thorburn) کی ایک طویل رپورٹ پر تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ''پنجاب ایک زرعی صوبہ ہے۔ یہ ایسے مالک کسانوں کی سرزمین ہے جن کی بھاری اکثریت ہر سال ساہوکاروں کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑی جارہی ہے۔ ہم نے یہاں قانون اور انتظامیہ کا جو نظام قائم کیا ہے اس کی وجہ سے زمین کی ملکیت رفتہ رفتہ اپنے قدرتی مالکوں یعنی کاشت کاروں کے ہاتھوں سے نکل کر چالاک لیکن اثر ورسوخ سے تہی ہندو ساہوکاروں اور تاجروں کے پاس جارہی ہے۔ اگر بروقت قانون اور انتظامیہ کے اس نظام کی اصلاح نہ کی گئی تو یہ امر ملک پر ہماری گرفت کے استحکام کو بالآخر خطرے میں ڈال دے گا۔ یہ خطرہ پنجاب کے مغربی علاقوں میں وسطی اور مشرقی علاقوں کے مقابلے میں زیادہ ہوگا کیونکہ مغربی پنجاب میں ساری دیہاتی آبادی طاقتور مسلمان قبیلوں پر مشتمل ہے۔ لہٰذا مفادات کی بنا پر پیدا شدہ تضاد مذہبی تضاد کی صورت اختیار کرلے گا۔ مشرقی یورپ میں یہودیوں سے جو نفرت کی جاتی ہے اور انہیں جو اذیت پہنچائی جاتی ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ

کامیاب اجنبی ہیں اور ایک پرانے عالمی مذہب کے علمبردار ہیں اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ معاشی میدان میں کامیاب ہیں۔ مغربی پنجاب کے بنیوں کی بھی یہی حالت ہے۔ ان کے خلاف نفرت کی وجہ صرف یہی نہیں کہ وہ ایک خدا کو ماننے والے کاشتکاروں کی زبوں حالی پر پھلتے پھولتے ہیں بلکہ وہ مدافعت کار ہیں اور اگر وہ بت پرست نہیں ہیں تو ایک سے زیادہ خداؤں کو مانتے ہیں...... اورنگ زیب کے عہد میں اس کی مذہبی تبلیغ اس قدر زوردار تھی کہ مشرقی پنجاب کے بہت سے ہندو مسلمان ہوگئے تھے۔ لیکن ان کی یہ تبدیلئ مذہب کبھی بھی مخلصانہ نہیں تھی۔ آج بھی ان پر ہندو ازم کی گرفت اتنی مضبوط ہے کہ وہ بقول شخصے دونوں مذاہب سے فوائد اٹھاتے ہیں لیکن کسی مذہب کے لئے کوئی تکلیف نہیں اٹھاتے۔ کہا جاتا ہے کہ 1857ء کے غدر کے بعد ان کا عقیدہ نسبتاً پختہ ہوگیا ہے۔ پورے پنجاب کے بارے میں عمومی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اکثریت کا مذہب اقلیت میں الگ تھلگ رہنے کی رجحان کو کم کرتا ہے۔ اگر لاہور کو مرکز تصور کیا جائے تو اس کے مشرقی علاقے کے مسلمانوں کا عقیدہ لچکدار ہے اور مغربی علاقوں کے مسلمان اپنے مذہبی عقیدے میں زیادہ پختہ ہیں۔ تاہم ہمیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اسلام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ مسلمان جتنا جاہل ہوگا اتنی ہی آسانی سے اس کی مذہبی عصبیت کے پوشیدہ جذبہ کو اکسایا جاسکتا ہے...... مزید برآں نہ صرف سارے پنجاب میں بلکہ سارے عالم اسلام میں گزشتہ چند سالوں سے احیائی تحریک زور پکڑ رہی ہے۔ اس کی ابتدا شہروں کے تعلیم یافتہ طبقوں سے ہوئی تھی اور رفتہ رفتہ دیہاتی علاقوں میں بھی اس کا اثر بڑھ رہا ہے۔ مسلمانوں میں بیداری کی اس تحریک کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہیے۔ اس کی ابتدا خامیوں کے شعور اور ان میں اصلاح کرنے کے عزم کی بنا پر نہیں ہوتی۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنی اکثریت اور متحدہ نصب العین کے پیش نظر متحد ہوکر مساوی رعایت حاصل کریں...... دیہاتی علاقوں میں مسلمان کسانوں کی سالانہ آمدنی کا 80 فیصد حصہ قرضوں کی ادائیگی میں چلا جاتا ہے۔ ہندو کسانوں کی آبادی 40 فیصد ہے لیکن ان میں سے صرف 20 فیصد مقروض ہیں۔ ہندو کسانوں کی سالانہ آمدنی کے 20 فیصد حصہ سے ان کے قرضوں کی ادائیگی ہوجاتی ہے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے قرضوں میں اس فرق کی وجہ ان دونوں کی عادات میں مضمر ہے۔ مسلمان بہت فضول خرچ ہیں لیکن ہندو ان کے بالکل برعکس ہیں۔ مسلمان تقریباً سارے ان پڑھ ہیں۔ ہندو کم وبیش سارے تعلیم یافتہ ہیں۔ ہندو عام طور پر

ایسی کاروائیوں سے گریز کرتے ہیں جو انہیں فوجداری قانون کی زد میں لاسکتی ہیں جبکہ تقریباً ساری جرائم پیشہ آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔لہٰذا ان پر اخراجات کا یہ زائد بوجھ پڑتا ہے حالانکہ ان کی آمدنی کا ذریعہ صرف کاشتکاری ہوتا ہے۔جو ہندو زمین کے مالک ہیں اور اس پر کاشت کرتے ہیں وہ ہمیشہ اپنی کاشتکاری کے ساتھ ساتھ ساہوکاری اور تجارت بھی کرتے ہیں۔ ہندو قرضے کے عوض زمین حاصل کرتے ہیں اور مسلمان قرضہ لے کر زمین خریدتے ہیں...... سابقہ حکومتوں کے ماتحت گاؤں کے بنیا کی حیثیت کاشتکار کے دوست اور ملازم کی ہوتی تھی اور وہ بڑی انکساری سے اس کے اچھے برے دنوں میں اس کا ساتھ دیتا تھا۔اب چونکہ دونوں کے مفادات متصادم ہیں اس لئے ان کا پرانا اتحاد ٹوٹ گیا ہے۔سابقہ ملازم اب جلدی سے آقا بننے کا متمنی ہے۔اس میں یہودیوں اور یونانیوں کی ساری صفات پیدا ہوگئی ہیں اور اسے زمین کا مالک بننے کا بھی حق حاصل ہے۔سابقہ حکومتوں کے ماتحت قابل کاشت زمین کا انتقال عملاً غیر زراعت پیشہ لوگوں کے نام نہیں ہوسکتا تھا۔قرضہ کی بطور حق وصولی نہیں ہوسکتی تھی۔اس کی ادائیگی محض اخلاقی ذمہ داری کے طور پر کی جاتی تھی...... برطانوی راج کے قیام کے بعد ہمارے نافذ کردہ دیوانی قوانین کو بہت تقدس مل گیا ہے۔ایک مقروض شخص اپنے قرض خواہ کے سامنے اپنے آخری پیسے تک ذمہ دار ہے۔قانون کی نظر میں دونوں برابر ہیں۔سچی بات ہے کہ پیسے کے معاملے میں ایک کسان بہت سادہ لوح ہوتا ہے۔اس کے برعکس ایک ساہوکار بہت عیار اور چالاک تاجر ہوتا ہے جو ہر وقت اپنے فائدے کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔مفادات کے اس تصادم کی وجہ سے سول افسروں پر بہت جلد یہ حقیقت واضح ہوگئی کہ برطانوی ''انصاف'' نے ''عوام'' کو عملی طور پر مٹھی بھر ساہوکاروں اور دکانداروں کا غلام بنا دیا ہے۔سول افسروں کو یہ بھی پتہ چل گیا کہ سیاسی بدامنی کے زمانے میں مالکوں اور مرتہنوں کا یہ نیا طبقہ اگر ہمارے لئے کمزوری کا باعث نہیں ہوگا تو یہ امن بحال کرنے میں اپنا اثر و رسوخ بھی استعمال نہیں کرسکے گا......گزشتہ بیس سال کی تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان کسان کوتاہ اندیش اور بہت دیر تک مصائب برداشت کرنے والا جانور رہے۔جب تک اس کے پاس زمین رہتی ہے اور اسے حقیقی افلاس کا احساس نہیں ہوتا تو وہ کسی نہ کسی طرح دن گزارتا رہتا ہے اور اسے اس بات کا خیال نہیں آتا کہ اس پر قرضہ کا بوجھ بڑھ رہا ہے تاآنکہ موت اسے جنت میں پہنچا دیتی ہے۔پنجاب میں ہمارے راج کے پہلے عشرے

میں اگرچہ کسانوں کے قرضوں میں خاصا اضافہ ہوگیا تھا لیکن غیر زراعت پیشہ لوگوں کے نام زمین کا انتقال زیادہ نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ 58-1857ء کے غدر میں پنجاب کے کسان ہمارے وفادار رہے تھے اور دیہاتی علاقوں میں بدامنی نہیں ہوئی تھی...... ہندوؤں کی دوتہائی آبادی شہروں میں رہتی ہے۔ دیہاتی آبادی کا تناسب 91 فیصد ہے جس میں سے 92 فیصد مسلمان ہے...... مسلمان کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ ایک خدا کے وجود کے بارے میں اپنے عقیدے کا اعلان کر دیتا ہے تو اس کا فرض پورا ہوجاتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کا کام ہے کہ وہ اس کی نگہبانی کرے اور جب اس کا پیٹ خالی ہوتا ہے تو وہ اس کا ذمہ دار حکومت کو ٹھہراتا ہے اور وہ اپنے سوا باقی ہر ایک سے غیر مطمئن ہوتا ہے۔"[5]

مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور انجمن حمایت اسلام

1897ء کے ایکٹ کے تحت پنجاب میں نو رکنی مشاورتی قانون ساز کونسل کی تشکیل کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک اس صوبہ میں جدید تعلیم سے آراستہ افراد کی خاصی تعداد پیدا ہو گئی تھی اگرچہ ان میں 90 فیصد سے زیادہ غیر مسلم تھے۔ برصغیر کے دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کی طرح پنجاب کے مسلمان بھی جدید تعلیم سے متنفر تھے اور وہ ہر نئے علم اور ہر نئی چیز کو بدعت تصور کرتے تھے۔ انہوں نے کلکتہ، مدراس، بمبئی اور الہ آباد کی پریذیڈنسیوں کے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی سے کچھ نہیں سیکھا تھا۔ 1869ء میں لاہور گورنمنٹ کالج قائم ہوا تو مسلمانوں نے اس ادارے میں اپنے بچوں کو بھیجنے سے حتی الامکان گریز کیا حالانکہ اس کے قیام کے لئے چندہ جمع کرنے والوں میں لاہور کا مسلمان تحصیلدار خان بہادر برکت علی خان پیش پیش تھا۔ پنجابی مسلمانوں کے جدید تعلیم میں دلچسپی نہ لینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی بہت بھاری اکثریت زراعت پیشہ تھی اور انہیں اپنے اس پیشہ میں تعلیم کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی جبکہ بڑے بڑے مسلمان جاگیردار طبقاتی وجہ سے علم دشمن تھے۔ وہ اپنے علاقے میں کوئی سکول نہیں کھلنے دیتے تھے۔ 1882ء میں پنجاب یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا تو پھر بھی مسلمانوں میں جدید اعلیٰ تعلیم کا کوئی خاص جذبہ پیدا نہ ہوا جبکہ صوبہ کی 30 فیصد ہندو اقلیت اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی۔ 95-1894ء میں گورنمنٹ کالج میں طالب علموں کی تعداد 246 تھی جن میں بہت

بھاری اکثریت ہندوؤں کی تھی حالانکہ ہندوؤں کی اعلیٰ تعلیم کے لئے آریہ سماج کے زیر اہتمام 1889ء میں ایک ڈی۔اے۔وی کالج بھی کھل چکا تھا جس میں مسلمان طالب علموں کا داخلہ تقریباً ممنوع تھا۔ آریہ سماج کی احیائی سرگرمیوں کے باعث صوبہ میں تاریخی ہندو۔مسلم تضاد میں اتنی شدت پیدا ہو چکی تھی کہ 1883ء سے لے کر 1891ء تک گائے ذبیحہ کے تنازعے نے پندرہ مرتبہ بڑے فرقہ وارانہ فسادات کی صورت اختیار کی تھی۔

آریہ سماجیوں کے برعکس سکھوں کا ایک وسیع المشرب عنصر سردار دیال سنگھ کی زیر قیادت پسماندہ مسلمانوں کے بارے میں رواداری کا مظاہرہ کرتا تھا۔ چنانچہ جب سرسید احمد خان 1873ء میں خان بہادر برکت علی خان کی دعوت پر لاہور آئے تھے تو دیال سنگھ نے علی گڑھ کالج کے لئے فراخدلی سے چندہ دیا تھا اور بعد میں جب اس کی زیر نگرانی دیال سنگھ کالج اور دیال سنگھ لائبریری کا قیام عمل میں آیا تھا تو اس نے ان کے دروازے بھی مسلمان طالب علموں کے لئے بند نہیں کئے تھے۔ دریں اثنا لاہور کے درمیانہ طبقہ کے بعض مسلمان معززین سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک سے متاثر ہو کر 1884ء میں ایک انجمن حمایتِ اسلام قائم کر چکے تھے جس کا بنیادی مقصد پنجابی مسلمانوں میں جدید تعلیم کو فروغ دینا تھا۔ اس سے پہلے 1869ء میں خان بہادر برکت علی خان کی زیر نگرانی جو انجمن اسلامیہ بنی تھی اس کا اولین مقصد بادشاہی مسجد کی دیکھ بھال کرنا تھا کیونکہ سکھوں نے اپنے دورِ اقتدار میں اس وسیع و عریض مسجد کو اصطبل اور بارود خانے کے طور پر استعمال کر کے اس کی حالت بہت خراب کر دی تھی۔ یہ انجمن اسلامیہ دراصل مسلمان امراء کی تنظیم تھی جو بعد میں علی گڑھ کالج کے لئے چندہ دینے کے علاوہ غریب مسلمان طلبا کو وظیفے بھی دیتی تھی۔ اس کے برعکس 1884ء کی انجمن حمایتِ اسلام درمیانہ طبقہ کی جماعت تھی جس کا روحِ رواں ایک شخص خلیفہ حمید الدین تھا۔ اس کے ارکان آریہ سماجیوں کی مسلم دشمن سرگرمیوں سے بہت پریشان رہتے تھے اور ان کی خواہش و کوشش تھی کہ پنجاب کے مسلمان نوجوان جدید تعلیم حاصل کر کے مسلمانوں کے حقوق و مفادات کا تحفظ کرنے کے قابل ہو جائیں۔ اس انجمن نے 1886ء میں کرائے کے ایک مکان میں مدرسۃ المسلمین (مدرسہ حمیدیہ) کی بنیاد رکھی۔ 1888ء میں یہ پرائمری مدرسہ مڈل سکول بن گیا۔ 1889ء میں اس مڈل سکول نے ہائی سکول کا درجہ حاصل کر لیا اور 1892ء میں اس نے اسلامیہ کالج کی حیثیت اختیار کر لی۔ یہ انجمن ایک عوامی تنظیم تھی

اوراس کے تعلیمی اخراجات کی تکمیل بھی عوامی چندے سے ہوتی تھی۔اس بنا پر اس انجمن کو پنجاب میں مسلمانوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کی ماں کہا جاسکتا تھا۔ بعد میں امرتسر، گجرات، گورداسپور اور بعض دوسرے شہروں میں مسلمانوں کے جو تعلیمی ادارے وجود میں آئے وہ دراصل اسی انجمن حمایتِ اسلام کی کامیابی کی پیداوار تھے۔اس انجمن نے 1884ء سے لے کر 1947ء تک پنجاب کے مسلمانوں کی جو تعلیمی خدمات سرانجام دی تھیں ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہوگی۔ پنجابی مسلمانوں کے بہت سے سیاسی قائدین بشمول ڈاکٹر سر محمد اقبال، سر محمد شفیع اور سر فضل حسین اسی انجمن کے پلیٹ فارم سے میدان سیاست میں آئے تھے۔ان قائدین نے سیاسی امور میں عملی طور پر دلچسپی لینے کی ابتدا صوبہ میں 1897ء کے انڈین کونسلز ایکٹ کے نفاذ کے بعد کی تھی۔

نہری نظام کی ترقی اور مسلم درمیانہ طبقہ کی نمود

پنجاب میں مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کی نمود میں پانچ دریاؤں کے اس نہری نظام کا بہت بڑا حصہ ہے جس کی دیکھ بھال، تعمیر وترقی اور توسیع کا کام انگریزوں نے 1849ء میں عنان اقتدار سنبھالنے کے فوراً ہی بعد شروع کر دیا تھا۔انگریزوں کی آمد سے پہلے پنجاب کا صوبہ سرسبز و شاداب نہیں تھا۔ یہاں پانچ دریاؤں میں پانی کی نعمت کی فروانی تھی لیکن دقیانوسی جاگیرداری نظام اس پانی کے وسیع پیمانہ پر استعمال کے راستے میں حائل تھا۔مغربی پنجاب میں مختلف باروں کے علاقوں میں آب پاشی کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر زمین بے برگ وگیاہ تھی۔آبادی بھی خال خال تھی اور یہاں زیادہ تر خانہ بدوش چرواہوں کے قبیلے آباد تھے جنہیں بعد میں سرکاری اور غیر سرکاری طور پر ''جرائم پیشہ'' اور ''جانگلی'' کے ''خطابات'' دیئے گئے تھے۔لیفٹیننٹ کرنل آبرے اوبرائن (Aubery O Brien) کے مہیا کردہ اعداد وشمار کے مطابق وسطی پنجاب میں ایک سیلابی نہر گورداسپور، امرتسر اور لاہور کے اضلاع کی تقریباً 50 ہزار ایکڑ اراضی سیراب کرتی تھی۔ستلج اور چناب کی سیلابی نہروں سے 20 ہزار ایکڑ، دریائے سندھ کی سیلابی نہروں سے ایک لاکھ ایکڑ اور مغربی جمنا سے تقریباً تین لاکھ ایکڑ رقبہ سیراب ہوتا تھا۔گویا دریاؤں کے پانی سے مستفید ہونے والا کل زیر کاشت رقبہ صرف 1470000 ایکڑ تھا۔آب پاشی صرف مئی سے اکتوبر کے درمیان ہوتی کیونکہ سردی کے موسم میں جب دریاؤں کے پانی کی سطح کم ہو جاتی تھی تو یہ

بہترین نہریں خشک ہو جاتی تھیں۔ پانچ چھ ماہ کی آب پاشی کے نتیجے میں صرف ایک ہی فصل ہوتی تھی جس سے کسان بمشکل سارا سال گزارا کرتے تھے۔ جب کبھی خشک سالی ہوتی تھی تو قحط پڑ جاتا تھا۔ 1849ء کے بعد لارنس برادران نے سرحدی صوبے کے کسانوں کو مطمئن رکھنے کی پالیسی کے تحت پہلے تو سیلابی نہروں کی مرمت کا کام کیا۔ چنانچہ جب ڈیرہ غازی خان اور مظفر گڑھ کے اضلاع میں سندھ اور چناب کی 21 سیلابی نہروں کے دیرینہ نظام کی مرمت مکمل ہوئی تو زیر کاشت رقبہ میں پانچ چھ گنا اضافہ ہو گیا۔ 1870ء میں ان سیلابی نہروں سے سیراب ہونے والی اراضی کا رقبہ 578000 ایکڑ تھا۔ اسی سال جہلم کی پانچ سیلابی نہریں زیر استعمال آئیں تو 233 میل لمبی نہروں کے اس نظام سے ضلع شاہ پور میں 743000 ایکڑ رقبہ سیراب ہونے لگا۔ ان سرکاری نہروں کے علاوہ ضلع شاہ پور میں چند پرائیویٹ نہریں بھی تھیں۔ جن سے 453873 ایکڑ رقبہ میں کاشت ہوتی تھی۔ راوی کی نہر اپر باری دوآب، جس کی تعمیر 1633ء میں مغل بادشاہ شاہجہان کے ایک انجینئر علی مردان خان نے کی تھی، کی مرمت و توسیع کا کام بھی لارنس برادران کے زمانہ میں کیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ اس نہر کی توسیع کر کے ماجھے کے علاقے میں ایسے مذہبی سکھوں کو آباد کیا جائے جن کا رجحان جرائم اور بغاوت کی طرف ہوتا تھا۔ 1859ء میں مین لائن اور لاہور برانچ پر مشتمل نہر اپر باری دوآب کھولی گئی لیکن اس میں چند نقائص کے باعث بند کرنا پڑا۔ پھر اس کی تعمیر نو کے بعد 1873ء میں اسے کھولا گیا تو اس سے ماجھے کا وسیع علاقہ زیر کاشت آ گیا۔ 1886ء میں ضلع ملتان میں سدھنائی نہر کا نیم دوامی نظام قائم کیا گیا اور اس طرح 304000 ایکڑ نیا رقبہ زیر کاشت آ گیا۔ 1887ء میں دریائے چناب میں خانکی کے مقام پر ایک بند کی تعمیر شروع کی گئی اور اس کے مکمل ہونے کے بعد 1893ء میں نہر لوئر چناب کھول دی گئی۔ اس طرح گوجرانوالہ، شیخوپورہ، لائل پور (فیصل آباد) اور جھنگ کے اضلاع میں رچنا دوآب کا زیریں علاقہ سیراب ہو گیا۔ اس نہر کا انتظام اتنا کامیاب ثابت ہوا کہ اس سے تقریباً 25 لاکھ ایکڑ رقبہ پر تقریباً سارا سال کاشت ہونے لگی۔ اس میں سے 1650000 ایکڑ رقبہ میں ربیع کی فصل بوئی جاتی تھی۔

اس پس منظر میں جب 1897ء میں پنجاب میں انڈین کونسلز ایکٹ کا نفاذ ہوا تو اس نہری نظام کی کامیابی بہت نمایاں ہو چکی تھی۔ صوبہ کے جنوبی اور وسطی علاقوں میں خاصی خوشحالی

آ چکی تھی اور مغربی علاقوں کے ریگستان بھی گل و گلزار بننے لگے تھے کیونکہ صوبائی حکومت ان ریگستانی علاقوں میں کئی نئی بستیاں آباد کرنے کی سکیموں پر کامیابی سے عمل کر چکی تھی۔ پہلی سدھنائی کالونی سکیم 88-1886ء میں مکمل ہوئی۔ دوسری سہاگ۔ یاٹرا کالونی سکیم بھی 88-1886ء اور تیسری لوئر چناب کالونی سکیم 96-1892ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی اور پھر 1897ء میں چونیاں کالونی سکیم کا آغاز ہوگیا۔ ان سکیموں کے تحت بیابانوں میں آبادی کے لئے جو پالیسی اختیار کی گئی اس کے نتیجہ میں متوسط درجہ کے مالکان اراضی کا ایک ایسا بڑا طبقہ پیدا ہوگیا جس نے بعد ازاں پنجاب میں برطانوی سامراج کے نظام حکومت کی ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت اختیار کر لی۔ بظاہر ان سکیموں کا پہلا مقصد تو یہ تھا کہ مشرقی اور وسطی پنجاب کے علاقہ میں آبادی کے دباؤ کو کم کیا جائے کیونکہ خطرہ تھا کہ اگر اس گنجان آباد علاقے کی آبادی میں اضافہ ہوتا رہا تو یہ علاقہ بدامنی اور بغاوت کا مرکز بن جائے گا۔ چنانچہ مشرقی اور وسطی پنجاب کے کاشتکاروں کا ایک معتد بہ حصہ نقل مکانی کر کے مغربی پنجاب کے کالونی اضلاع میں آباد ہوگیا اور متوسط درجے کا زمیندار بن گیا۔ دوسرا مقصد یہ تھا کہ لنکا شائر کے کارخانوں کے لئے کپاس کی ضرورت تھی اور پنجاب میں نیا علاقہ زیر کاشت لانے سے اس ضرورت کو پورا کیا جا سکتا تھا۔ ان سکیموں کے تحت غریب کسانوں کو بالعموم ایک مربعہ یعنی 125 ایکڑ زمین دی گئی۔ شاہ پور میں ہر کسان کو 150 ایکڑ دیئے گئے لیکن اس پر شرط یہ تھی کہ وہ سرکاری ضروریات کے لئے گھوڑی پالے گا۔ درمیانہ طبقہ کے کسانوں کو ہر ضلع میں دو مربع یعنی 150 ایکڑ دیئے گئے بعض لوگوں کو تین مربعے بھی دیئے گئے اور اس کے ساتھ انہیں ''چودھری'' کا غیر رسمی خطاب بھی ملا اور بڑے زمینداروں کو 6 سے لے کر 20 مربعے تک اراضی ملی۔ ان بڑے زمینداروں کو سروس گرانٹ کے تحت گھوڑی پال مربعے بھی دیئے گئے۔ اس کے علاوہ نذرانہ گرانٹس بھی دی گئیں۔ نذرانہ سکیم کے تحت 8 روپے فی ایکڑ کے حساب سے دو مربعے ایسے سرکاری ملازموں کو دیئے جاتے تھے جو اپنے سرکاری فرائض وفاداری اور خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے تھے یا ایسی قابل قدر خدمات سرانجام دے کر ریٹائر ہو چکے تھے۔ اپر جہلم میں نذرانہ گرانٹ کی شرح 4 روپے فی ایکڑ اور کل رقبہ 4 مربع مقرر کیا گیا تھا۔ سابق فوجیوں اور ایسے تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی دو ایک مربع فی کس کے حساب سے دیئے گئے جو شہروں کی بجائے دیہات میں رہ کر زراعت کو اپنا ذریعۂ روزگار بنانے کے خواہاں ہوتے تھے۔ ان سارے گرانٹیوں پر دو

شرائط کی پابندی لازمی تھی۔ اول یہ کہ وہ علاقہ میں جرائم کے سدباب اوران کی تفتیش کے لئے پولیس کی ہرممکن امداد کریں گے اور دوئم یہ کہ وہ ہر حالت میں حکومت کے وفادار رہیں گے اور اگر کبھی ان کے علاقے میں کسی قسم کی بدامنی ہوئی تو وہ ارباب حکومت کی عملی طور پر امداد کریں گے۔ ان کی اس قسم کی خدمات کے بارے میں مقامی حکام کا فیصلہ قطعی ہوگا۔ اگر کسی گرانٹی نے بوقت ضرورت مقامی حکام کی مطلوبہ امداد وحمایت کرنے میں کوئی پس وپیش کیا تو اس کی گرانٹ فوراً منسوخ کردی جائے گی اور مقامی حکام کے اس فیصلے کے خلاف کوئی اپیل نہیں ہوسکے گی۔

پنجاب میں برطانوی سامراج کی اس پالیسی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان دنوں برطانیہ کے صنعتی معاشرے کے چھوٹے بڑے سامراجی کارندے کس قدر دانشمند اور دور اندیش ہوتے تھے۔ ان کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ صوبہ برطانوی سامراج کی عالمگیر سلطنت کا ''بازوئے شمشیرزن'' بن گیا۔ یہاں بڑے اور درمیانہ طبقہ کے خوشحال زمینداروں کا ایک پٹھوطبقہ پیدا ہوگیا جو اپنے بیرونی آقاؤں کی ہر قسم کی خدمت کے لئے ہمہ وقت آمادہ رہتا تھا۔ یہ طبقہ تومند بے زمین کسانوں کو انگریزوں کی فوج میں بھرتی کرانے کے لئے کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا تھا اور اپنی وفاداری کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ ان چھوٹے بڑے گرانٹیوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے 80-1878ء کی دوسری افغان جنگ میں انگریزوں کی بھرپور امداد کی تھی۔ پنجابی عوام کے سیاسی لحاظ سے پسماندہ رہنے کی بڑی وجہ اسی طبقے کی سامراج نوازی میں مضمر تھی۔ درمیانہ طبقہ کے گرانٹیوں میں جالندھر اور لاہور ڈویژن کے مسلمانوں کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ انہی آسودہ حال مسلمانوں کی اولاد نے بیسویں صدی میں تعلیم حاصل کی۔ ان تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سے کچھ تو کسی نہ کسی طرح سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے لیکن ان میں سے بیشتر بے روزگار ہی رہے۔ انہیں نہ تو کوئی سرکاری ملازمت ملتی تھی اور نہ ہی تجارت وصنعت کے شعبوں میں ان کے لئے کوئی گنجائش تھی۔ اگرچہ یہ مسلمان تعلیم یافتہ عناصر شہروں میں رہتے تھے لیکن ان کی زمین کے ساتھ وابستگی کے باعث ان کا دنیاوی نقطۂ نگاہ جاگیردارانہ اور رجعت پسندانہ ہوتا تھا۔ یہ صرف جاگیردار کو ہی اپنا روائتی لیڈر مانتے تھے اور اسی کی دقیانوسی تہذیب وثقافت کو مذہب کا لبادہ پہنا کر بہترین تصور کرتے تھے۔ ان کے برعکس پنجابی ہندوؤں کے تعلیم یافتہ عناصر کا دنیاوی نقطۂ نگاہ بورژوا اور ترقی پسندانہ تھا کیونکہ ان میں بیشتر

کا تجارت یا صنعت سے تعلق تھا اور ان کی زرعی زمین سے وابستگی نہ ہونے کے برابر تھی۔ چھوٹی بڑی سرکاری ملازمتوں پر بھی انہی کا غلبہ تھا۔

1901ء میں جب نہر لوئر جہلم کی تعمیر ہوئی تو ضلع شاہ پور کے علاوہ گجرات اور جھنگ کے اضلاع میں بھی آبادکاری کی سکیموں کے تحت سکھوں کے علاوہ درمیانہ طبقہ کے مسلمان کاشتکاروں کو بھی مزید گرانٹیں ملیں اور اس طرح پنجابی مسلمانوں کی رجعت پسندیت اور سیاسی پسماندگی میں اور بھی گہرائی آ گئی جبکہ برطانوی سامراج کے وفاداروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ جب اسی سال لارڈ کرزن (Curzon) نے شمال مغربی سرحدی علاقے کو صوبہ پنجاب سے الگ کر کے اسے چیف کمشنر کا علاقہ بنا دیا تو اس پر صرف ہندوؤں نے زبردست احتجاج کیا۔ پنجاب کے مسلمان جاگیرداروں اور درمیانہ طبقہ کے خوش حال مالکان اراضی کی جانب سے کوئی صدائے احتجاج بلند نہ ہوئی حالانکہ دریائے سندھ کے اس پار کا علاقہ صوبہ پنجاب سے الگ ہونے کی وجہ سے صوبہ کے مسلمانوں کی اکثریتی حیثیت میں بہت کمی آ گئی تھی اور ہندوؤں اور سکھوں کی سیاسی اہمیت میں اضافہ ہو گیا تھا۔

باب: 2

پنجاب میں مسلم سیاست کا آغاز

پنجاب مسلم لیگ کا قیام اور اس کی پہلی دھڑے بندی

30/نومبر 1907ء کو ضلع لاہور کے ایک جاگیردار میاں شاہ دین نے اپنی زیر صدارت پنجاب مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ جس کے اغراض و مقاصد یہ تھے کہ "(1) مسلمانان پنجاب کے پولیٹیکل حقوق کی ترقی اور بہبود کی حفاظت کرنا اور انہیں ترقی دینا اور مسلمانوں میں محبت قوم و وطن کی روح پھیلانا۔ (2) مسلمانانِ ہندوستان کے تمام فرقوں نیز مسلمانوں اور اس ملک کی غیر مسلم اقوام کے درمیان رشتہ اتحاد و اخوت قائم رکھنا اور بڑھانا۔ (3) مسلمانان ہندوستان کی ترقی اور بہبود کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ اور دیگر شاخوں سے مل کر کام کرنا۔ (4) مسلمانوں کے درمیان برٹش گورنمنٹ کی نسبت سچی وفاداری کا خیال قائم رکھنا اور بڑھانا۔ ملک معظم کی رعایا سے ہندوستان کے متعلق قوانین و احکام کی نسبت مسلمانوں کے خیالات کا اظہار کرنا۔" اس مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری شاہ دین کا ایک رشتہ کا بھائی میاں محمد شفیع تھا۔ چونکہ پنجاب مسلم لیگ کے نام کی ایک جماعت کچھ عرصہ قبل گورداسپور کے ایک شخص فضل حسین کی زیر قیادت قائم ہو چکی تھی اس لئے فوراً ہی ان دونوں تنظیموں میں سیاسی رقابت شروع ہو گئی۔ جب شاہ دین کو جلد ہی پنجاب چیف کورٹ کا جج مقرر ہونے کے باعث مسلم لیگ سے مستعفی ہونا پڑا تو مسلمانان پنجاب کی قیادت کے لئے میاں محمد شفیع اور میاں فضل حسین میں رسہ کشی شروع ہو گئی۔

میاں فضل حسین بٹالہ ضلع گورداسپور کا رہنے والا تھا۔ اس کے آباؤ اجداد سکھوں کے عہد اقتدار میں ممتاز حیثیت کے حامل تھے اور ان کی یہ حیثیت انگریزوں کی آمد کے بعد بھی قائم رہی تھی چنانچہ اس کا والد خان بہادر میاں حسین بخش ڈسٹرکٹ جج کے عہدے سے ریٹائر ہوا تھا۔

فضل حسین نے 1893ء میں گورداسپور کے ہائی سکول سے میٹرک اور 1897ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔اے پاس کیا تھا۔بی۔اے میں ڈاکٹر اقبال کا ہم جماعت تھا۔1898ء میں فضل حسین انگلستان چلا گیا جہاں وہ دو مرتبہ آئی۔سی۔ایس کے امتحان میں شریک ہوا لیکن ناکام رہا۔آخر کیمبرج سے بی۔اے کر کے اور لندن سے بیرسٹری کی سند لے کر 1901ء میں واپس ہندوستان آ گیا۔1901ء سے 1905ء تک اس نے سیالکوٹ میں پریکٹس کی اور 1905ء میں لاہور آ گیا۔ جہاں اس کی سیاسی زندگی کا آغاز کانگرس کے رکن کی حیثیت سے ہوا۔وہ اسی سال انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا ممبر بنا اور پھر اسلامیہ کالج کمیٹی کا سیکرٹری ہو گیا۔1907ء میں اس نے میاں محمد شفیع کے مقابلے میں اپنی الگ مسلم لیگ بنائی اور اسی سال یونیورسٹی کا فیلو مقرر ہو گیا۔میاں محمد شفیع سے اس کا تضاد سراسر طبقاتی تھا۔شفیع خاندانی جاگیردار تھا اور فضل حسین ازسرتاپا شہری بورژوا تھا۔ان دونوں کے درمیان تضاد کے منظر عام پر آنے کی وجہ یہ تھی کہ برصغیر میں عنقریب نئی آئینی اصلاحات ہونے والی تھیں اور خیال یہ تھا کہ اس مرتبہ صوبہ پنجاب بھی ان اصلاحات سے مستفید ہوگا کیونکہ لارڈ کرزن نے 1901ء میں ہی پنجاب کے ''بارود خانے'' یعنی شمال مغربی سرحدی علاقے کو الگ کر کے وہاں الگ انتظامیہ قائم کر دی تھی۔تاہم 1908ء میں علی گڑھ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تو مرکزی قیادت کی کوشش سے ان دونوں پنجابی رہنماؤں میں وقتی طور پر مصالحت ہوگئی جبکہ دونوں ہی صوبائی لیگ کے مجلس عاملہ کے 24 ارکان کے ناموں پر متفق ہو گئے۔میاں محمد شفیع اس متحدہ مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری رہا اور میاں فضل حسین جائنٹ سیکرٹری بن گیا۔

1905ء میں ابھرتی یورپی طاقت روس کی جاپان کے ہاتھوں عبرت ناک شکست کے چار سال بعد یعنی 1909ء میں منٹو۔مارلے (Minto-Morely) سفارشات کے مطابق نیا انڈین کونسلز ایکٹ منظور ہوا تو اس کے تحت بھی پنجاب سے بدستور سوتیلی ماں کا سا سلوک کیا گیا۔ آسام کی طرح پنجاب کونسل کے ارکان کی تعداد بھی 30 مقرر کی گئی حالانکہ ان دنوں پنجاب کی آبادی دو کروڑ تھی اور آسام کی آبادی صرف 70 لاکھ تھی۔ پنجاب کی کونسل میں منتخب ارکان کا تناسب 19 فیصد تھا جبکہ مغربی بنگال میں ان کا تناسب 53 فیصد بمبئی، مدراس اور مشرقی بنگال میں 48 فیصد اور یو۔پی میں 42 فیصد تھا۔پنجاب سے اس بدسلوکی کی پہلی وجہ تو وہی تھی کہ یہ صوبہ روس

کی سرحد کے نزدیک تھا لہٰذا یہاں فراخدلانہ سیاسی اصلاحات سامراجی مفادات کے منافی تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یہاں کے چھوٹے بڑے مالکان اراضی کا طبقہ اس قدر وفادار اور عافیت کوش تھا کہ اسے زیادہ سیاسی اصلاحات دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ہندوؤں کا شہری درمیانہ طبقہ لالہ لاجپت رائے وغیرہ کی زیر قیادت سیاسی حقوق کا مطالبہ کرتا تھا مگر انگریز ان کے شور شرابے کی زیادہ پرواہ نہیں کرتے تھے کیونکہ انہیں زمینداروں کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔

اس انڈین کونسلز ایکٹ میں طریقۂ انتخاب کا کوئی ذکر نہیں تھا لیکن اس کے تحت جو قواعد مرتب کئے گئے ان میں مسلم لیگ کا یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ انتخابات جداگانہ نیابت کے اصول کے تحت ہوں گے۔ اس طریقۂ انتخاب کا پہلا جواز یہ بیان کیا گیا تھا کہ چونکہ برصغیر کے مسلمان سیاسی و معاشی لحاظ سے بہت پسماندہ ہیں اس لئے اگر مخلوط طریقہ انتخاب اختیار کیا گیا تو کونسلوں میں ان کی مناسب نمائندگی نہیں ہوگی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شمالی ہندوستان میں دیانند سرسوتی کی آریہ سماج، مہاراشٹر میں بال گنگا دھر تلک اور بنگال میں سوامی ویوک آنند کی ہندو احیائی تحریکوں کی بنا پر مسلمانوں میں بجا طور پر ہندو غلبہ کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اگر انہیں جداگانہ سیاسی حقوق نہ ملے تو ان کا سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی وجود ختم ہو جائے گا اور تیسری وجہ یہ تھی کہ برطانوی سامراج نے 1870ء میں دیرینہ ہندو۔ مسلم تضاد سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسے پتہ چل گیا تھا کہ اگر اس نے مسلمانوں کو ہر لحاظ سے کچلنے کی پالیسی جاری رکھی تو ہندوؤں کے ابھرتے ہوئے بورژوا طبقے کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی مطالبات میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے گا۔ برطانوی سامراج نے ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی پر عمل کی ابتدا دراصل 1870ء سے شروع کر دی تھی جبکہ وائسرائے لارڈ میو نے ایک سول سرونٹ ولیم ہنٹر (William Hunter) کو برصغیر کے مسلمانوں کے حالات کا جائزہ لینے کی ہدایت کی تھی۔ اسی زمانے میں بعض دوسرے سرکردہ انگریزوں مثلاً سر رچرڈ ٹیمپل (Richard Tempel) سر جان سٹریچے (John Strachey) اور ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ گریگری (W.W. Gregory) نے بھی یہ رائے ظاہر کی تھی کہ برصغیر کے مسلمان غیر وفادار نہیں ہیں۔ ماضی میں کچھ ہوا ہے اب اسے بھول جانا چاہیے اور بھول جانے کا طریقہ یہی تھا کہ ہندوؤں کے بورژوا طبقے کی بے صبری اور کوتاہ اندیشی نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تاریخی تضاد کی جس خلیج کو وسیع کر دیا تھا اسے

مسلمانوں کی قدرے حمایت کر کے اور بھی وسیع کیا جائے۔ یہ فرقہ وارانہ تضاد برطانوی سامراج کی پیداوار نہیں تھا۔ یہ کشیدگی پہلے سے موجود تھی۔ برطانوی سامراج نے اس سے فائدہ اٹھایا اور اسے بطور عالمی سامراجی قوت کے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو اتنے بڑے برصغیر پر اتنی دیر تک حکومت کیسے کر سکتے تھے۔

دسمبر 1909ء میں 30 رکنی پنجاب کونسل کے چھ ارکان کا میونسپل کمیٹیوں کے ذریعے انتخاب ہوا تو تینوں مسلمان امیدوار مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہو گئے۔ یہ کونسل دسمبر 1912ء تک قائم رہی۔ اس تین سال کے عرصے میں کلکتہ اور بمبئی کی پریزیڈنسیوں میں بہت ہنگامے ہوئے کیونکہ ہندوؤں کے بورژوا طبقہ نے بال گنگا دھر تلک کی زیر قیادت اس مقصد کے لئے پر تشدد ایجی ٹیشن کی تھی کہ بنگال کی تقسیم کے فیصلہ کو منسوخ کیا جائے اور مزید سیاسی حقوق دیئے جائیں۔ یہ ایجی ٹیشن سودیشی تحریک کے نام سے مشہور ہے جو دسمبر 1911ء میں کامیابی سے ہمکنار ہوئی تھی جبکہ برطانیہ کے شہنشاہ نے دہلی میں دربار کے موقع پر بنگال کی تقسیم کے فیصلے کو منسوخ کر دیا تھا اور دہلی کو صوبہ پنجاب سے الگ کر کے ہندوستان کا دارالحکومت کلکتہ سے یہاں منتقل کر دیا تھا۔ بین الاقوامی سطح پر نہ صرف اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کر کے سلطنت عثمانیہ پر کاری ضرب لگائی تھی بلکہ اکتوبر 1912ء میں بلقان کی جنگ شروع ہونے کے بعد ''یورپ کا یہ مردِ بیمار'' جاں بلب ہو گیا تھا۔

پنجاب کے مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کے تعلیم یافتہ عناصر ان اندرونی و بیرونی واقعات سے بہت متاثر ہوئے لیکن وہ اپنی سیاسی، معاشرتی اور معاشی پسماندگی کے باعث برطانوی سامراج کے خلاف کوئی مؤثر تحریک نہ شروع کر سکے۔ ان کی سیاسی پسماندگی کتنی زیادہ تھی اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب اوائل دسمبر 1912ء میں چونیاں میونسپلٹی کے 8 غیر سرکاری ارکان کا انتخاب ہوا تو ان میں صرف ایک مسلمان کامیاب ہو سکا۔ باقی ساتوں ہندو تھے حالانکہ اس قصبہ کی 50 فیصد سے زائد آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ چار سرکاری ارکان بھی ہندو تھے کیونکہ تحصیل دار لالہ دیس راج تھا۔ سب ڈویژنل آفیسر لبھو رام تھا۔ تھانیدار بھی ہندو تھا اور ڈاکٹر بھی ہندو۔ گویا بارہ سرکاری و غیر سرکاری ارکان پر مشتمل اس میونسپلٹی میں صرف ایک مسلمان تھا۔ اسی مہینے میں نئی پنجاب کونسل کی بھی تشکیل ہوئی جو نو سرکاری اور پندرہ

غیر سرکاری ارکان پر مشتمل تھی۔ غیر سرکاری ارکان میں پانچ ہندو، پانچ مسلمان، تین سکھ اور دو انگریز تھے۔ اس طرح غیر سرکاری اکثریت کا نصف سے زیادہ حصہ ہندوؤں اور سکھوں پر مشتمل تھا جن کی مجموعی آبادی 43 فیصد سے زیادہ نہیں تھی۔ مسلمانوں کی آبادی 55 فیصد تھی لیکن انہیں غیر سرکاری عنصر کا ایک تہائی یعنی 15 میں سے 5 ممبران کا حصہ ملا تھا۔ مسلم ارکان میں صرف ایک منتخب شدہ تھا اور چار سرکاری نامزدگی سے مقرر ہوئے تھے تاہم یہ پانچوں صوبائی مسلم لیگ کے عہدیدار تھے۔[1]

یہ کونسل جولائی 1916ء تک قائم رہی جس کے دوران لاہور میں مسلمانوں کے ''پیسہ اخبار'' کو یہ شکایت رہی کہ مسلمان ارکان کو کونسل کے اجلاس میں کوئی سوال یا استفسار کرنے کی توفیق نہیں ہوتی تھی جبکہ ہندو ارکان بے شمار سوالات کر کے اپنی ہستی کا ثبوت دیتے تھے۔ البتہ یہ مسلمان ارکان میاں محمد شفیع کی زیر قیادت کونسل سے باہر سلطنت عثمانیہ کے بارے میں پنجابی مسلمانوں کے جوش کو ٹھنڈا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے کیونکہ ان کی رائے میں اس نامناسب جوش کی وجہ سے مسلمانوں کی سیاسی، تعلیمی، تمدنی اور ہرفنی ترقی پر گہرا اثر پڑتا تھا۔ میاں فضل حسین اس گروہ میں شامل نہیں تھا کیونکہ وہ 1913ء میں پنجاب کانگرس کا صدر منتخب ہو گیا تھا۔

سکھوں کی ''غدر پارٹی''

اس کونسل کی میعاد کے دوران پنجاب میں سکھوں کی پر تشدد احیائی تحریک نے بہت زور پکڑا اور اس وجہ سے دہشت گردی کی بہت سی وارداتیں ہوئیں۔ اس تحریک کی ابتدا نومبر 1913ء میں امریکہ کے شہر سان فرانسسکو میں ہوئی تھی جہاں سکھ آباد کاروں نے ایک شخص ہردیال کی زیر قیادت سکھ اقتدار کے احیاء کے لئے ایک ایسوسی ایشن قائم کی تھی۔ اس ایسوسی ایشن نے ''غدر'' کے نام سے ایک جریدہ شائع کرنا شروع کیا جو اس قدر مقبول ہوا کہ ایسوسی ایشن کی رکنیت تھوڑے ہی عرصے میں پانچ ہزار تک پہنچ گئی اور یہ غدر پارٹی کے نام سے مشہور ہو گئی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں اس پارٹی کی شاخیں جنوب مشرقی ایشیا کے متعدد ممالک میں قائم ہو گئیں جو ہردیال کے اس پیغام کی تشہیر کرتی تھیں کہ انگریزوں کی جرمنی کے ساتھ جنگ شروع ہونے والی ہے اس لئے سب کو واپس ہندوستان پہنچ کر انقلاب برپا کرنا چاہیے۔ حکومت امریکہ نے اس

پروپیگنڈا کی بنا پر مارچ 1914ء میں ہردیال کو گرفتار کر کے ہندوستان بھیج دیا۔ لیکن وہ ضمانت پر رہا ہونے کے بعد یہاں سے فرار ہو کر سوئٹزرلینڈ چلا گیا۔

مئی 1914ء میں 351 سکھ اور 21 پنجابی مسلمان کینیڈا سے براستہ ہانگ کانگ، شنگھائی اور ٹوکیو واپس کلکتہ پہنچے۔ وہ بہت برہم تھے کیونکہ کینیڈا کی حکومت نے نسل پرستی کی پالیسی کی بنا پر انہیں وہاں آباد ہونے کی اجازت نہیں دی تھی۔ جب وہ بندرگاہ پر اترے تو حکومت ہند نے انہیں ایک اسپیشل ریلوے گاڑی کے ذریعے پنجاب پہنچانے کا انتظام کیا ہوا تھا۔ مگر تقریباً 300 سکھوں نے مقامی حکام کے اس انتظام کی پابندی کرنے سے انکار کر دیا اور انہوں نے کلکتہ شہر کی طرف مارچ شروع کر دیا۔ راستہ میں ان کا پولیس سے تصادم ہوا جس میں 18 سکھ مارے گئے اور باقی منتشر ہو کر پنجاب کے مختلف علاقوں میں پھیل گئے۔ ان کی صوبہ میں آمد سے غدر پارٹی کو بہت تقویت ملی جس کی رکنیت پہلے ہی آٹھ ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ اس پارٹی نے پہلی جنگ عظیم کے دوران متعدد پرتشدد کارروائیاں کیں۔ چنانچہ بہت سے دہشت پسند سکھوں کو گرفتار کر کے ان کے خلاف مقدمے چلائے گئے۔ 18 کو پھانسی کی سزا دی گئی اور بہت سوں کو عمر قید کی سزائیں ملیں۔

پنجاب میں سکھوں کی اس پارٹی کی دو اڑھائی سال کی ''انقلابی'' سرگرمیوں کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہونے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس پارٹی کا دائرہ اثر صرف سکھوں تک محدود رہا۔ اسے ہندوؤں اور مسلمانوں کی عملی امداد و حمایت حاصل نہیں تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ جنگ کے باعث بے روزگاری میں خاصی کمی ہو گئی تھی۔ بہت سے نوجوان فوج میں بھرتی ہو گئے تھے اور بہت سوں کو چھوٹے بڑے ٹھیکیداروں کے پاس ملازمتیں مل گئی تھیں۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ حکومت پنجاب نے اس عرصے میں ایک ایسا سہ نہری پراجیکٹ مکمل کیا جس سے صوبہ کی زراعت کو اتنا فائدہ پہنچا کہ یہ نہری نظام عجوبۂ عالم میں شمار ہونے لگا۔ اس نظام کے تحت پہلی بار تین دریاؤں یعنی جہلم، چناب اور راوی کے پانی کو مشترکہ طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ اس طرح نہ صرف پنجاب کا مزید وسیع علاقہ زیر کاشت آ گیا بلکہ ستلج اور بیاس کے پانی کو سردی کے موسم میں ستلج کے مشرقی علاقوں کو سیراب کرنے کے لئے بچا لیا گیا۔ 1912ء میں مرالہ کے مقام سے نہر اپر چناب نکالی گئی جو گوجرانوالہ اور شیخوپورہ کی تقریباً 50 ہزار ایکڑ زمین کو سیراب کرنے کے بعد دریائے راوی میں جا گرتی تھی۔ 1913ء میں بلوکی کے مقام سے نہر لوئر باری دوآب نکالی گئی جس سے

منٹگمری اور ملتان میں گنجی بار کا دس لاکھ 25 ہزار ایکڑ رقبہ زیر کاشت آ گیا۔ 1915ء میں منگلا کے مقام سے نہر اپر جہلم نکالی گئی۔ 62 میل لمبی یہ نہر انجینئرنگ کا شہکار تصور کی جاتی تھی۔ یہ ضلع گجرات کے کچھ علاقوں کو سیراب کرنے کے بعد خانکی سے ذرا اوپر دریائے چناب میں جا گرتی تھی پھر اس کا پانی نہر لوئر چناب کو مل جاتا تھا جو نہ صرف دریائے راوی میں پانی کی کمی کو پورا کرتی تھی بلکہ اس سے تقریباً 334000 ایکڑ علاقہ سیراب ہوتا تھا۔ اس سے ربیع کی فصل کے لئے آب پاشی خریف سے زیادہ ہوتی تھی۔ اس نہری نظام کی وجہ سے شیخوپورہ، لائل پور، جھنگ، ملتان اور منٹگمری کے اضلاع میں وسطی اضلاع کے ہزاروں کاشت کاروں کو بطور گرانٹ زمینیں دی گئیں۔ اس طرح خوشحال درمیانہ طبقہ کے مالکان اراضی کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا۔ صوبہ کی زرعی معیشت نے خوب ترقی کی۔ برطانوی سامراج کا بازوئے شمشیرزن مضبوط سے مضبوط تر ہو گیا اور جگہ جگہ انگریزی راج کی برکتوں کے گیت سنائی دینے لگے۔

سر فضل حسین کی کامیابی

جولائی 1916ء میں 1909ء کے ایکٹ کے تحت پنجاب کونسل کی تیسری مرتبہ تشکیل ہوئی تو فضل حسین یونیورسٹی کے حلقہ سے ہندوؤں اور سکھوں کی سخت مخالفت کے باوجود بلا مقابلہ منتخب ہو گیا کیونکہ اس کے مخالف امیدوار ہرنام سنگھ کے کاغذات نامزدگی آئینی سقم کی بنا پر مسترد کر دیئے گئے تھے۔ اس انتخاب کے بعد جب دسمبر 1916ء میں لکھنؤ میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان معاہدہ ہوا تو فضل حسین اس میں شریک تھا اور اس نے جناح کے اس مؤقف کی تائید کی تھی کہ چونکہ کانگرس نے جداگانہ طریقہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا ہے اس لئے پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریتی حیثیت کو کم کر کے غیر مسلموں کو ان کی آبادی سے زیادہ نمائندگی دینے میں کوئی حرج نہیں ہوگا۔ لیکن سر میاں محمد شفیع کے لئے یہ اصول قابل قبول نہیں تھا چنانچہ بطور احتجاج مسلم لیگ سے مستعفی ہو گیا اور پنجاب مسلم لیگ کلیۃً میاں فضل حسین اور ان کے رفقاء کے قبضہ میں چلی گئی۔ اب فضل حسین پنجاب کانگرس کا صدر اور پنجاب مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری تھا اور اس حیثیت سے صوبہ میں اس کا سیاسی مقام بہت بلند ہو گیا تھا، 1908ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کی قیادت نے علی گڑھ میں میاں محمد شفیع اور میاں فضل حسین میں جو مصالحت کرائی تھی اس میں فریقین

کا خلوص شامل نہیں تھا، لیکن دونوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش جاری رہی تھی۔ حتیٰ کہ 1916ء میں پنجاب کونسل کی تشکیل سے دو ایک ماہ قبل صوبہ لیگ پھر دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور دسمبر 1916ء میں محمد علی جناح اور فضل حسین کے درمیان اتحاد و اتفاق کے باعث سر شفیع کے دھڑے کا عملاً خاتمہ ہو گیا تھا۔ قبل ازیں جنگ عظیم کے دوران جب نومبر 1916ء میں مکہ کے حکمران شریف حسین نے ترکوں کے خلاف بغاوت کی تھی تو فضل حسین کی زیر صدارت ایک پبلک جلسہ میں اس کی مذمت کی گئی تھی۔ جنوری 1919ء میں جنگ عظیم کے اختتام پر فضل حسین نے ترکوں کی کھلم کھلا حمایت کی تھی اور ستمبر 1919ء کے بعد تحریک خلافت کے ابتدائی مراحل میں اس نے بعض بڑے بڑے پبلک جلسوں کی صدارت بھی کی تھی۔ وہ رولٹ قوانین کی مذمت کرنے میں پیش پیش تھا جبکہ جناح نے ان قوانین کے خلاف 28 ر مارچ کو بطور احتجاج مرکزی لیجسلیٹو کونسل سے استعفیٰ دے دیا تھا۔

سانحہ جلیانوالہ باغ اور پنجاب میں پہلا مارشل لاء

رولٹ قوانین دراصل دو امتناعی قوانین بعنوان انڈین کریمینل لاء امنڈمنٹ ایکٹ اور انڈین کریمینل لاء ایمرجنسی پاورا ایکٹ تھے جو مرکزی لیجسلیٹو کونسل نے مارچ 1919ء میں ایک انگریز جج سر ڈزنی رولٹ (Disney Rowlatt) کی زیر صدارت قائم کردہ ایک کمیٹی کی سفارشات کے مطابق منظور کئے تھے۔ ان کا مقصد ان پر تشدد یا انقلابی کارروائیوں کا سد باب کرنا تھا جو پہلی جنگ عظیم کے دوران بنگال، پنجاب اور برصغیر کے دوسرے علاقوں میں وسیع پیمانے پر شروع ہو گئی تھیں۔ ان قوانین کے تحت بیوروکریسی کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ کوئی وجہ بتائے بغیر کسی بھی شخص کو نظر بند کر سکتی ہے اور کسی بھی اخبار کی اشاعت پر پابندی عائد کر سکتی ہے۔ ان استبدادی قوانین کی ضرورت محسوس ہونے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ 1916ء میں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان لکھنؤ پیکٹ کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد و یگانگت کی پر جوش فضا پیدا ہو گئی تھی کیونکہ جنگ میں برطانیہ اور دوسری مغربی طاقتوں کے ہاتھوں ترکوں کی پے در پے شکستوں کے باعث برصغیر کے مسلمان برطانوی سامراج کے خلاف ہر پر تشدد کارروائی میں حصہ لینے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ یہ فرقہ وارانہ اتحاد برطانوی حکومت کے لئے فی الحقیقت زبردست

خطرے کا حامل تھا۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ نومبر 1917ء میں روس میں عظیم پرولتاری انقلاب کے بعد انگریزوں کو ہندوستان کے خلاف روس کے عزائم کے بارے میں بہت زیادہ خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اب روس کمیونزم کا سرخ لباس پہن کر پہلے سے زیادہ خطرناک ہو گیا ہے۔ 23/نومبر 1918ء کو دہلی کے خیری برادران نے ماسکو میں لینن سے ملاقات کر کے انگریزوں کے خلاف سوویت یونین کی امداد طلب کی تھی اور انہوں نے بعد میں 5/دسمبر کو سوویت یونین میں آل رشین سنٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کو بھی خطاب کیا تھا۔ [2] چوتھی وجہ یہ تھی کہ افغانستان نے 20/فروری کو انگریزوں کی بالادستی کا طوق اتار کر اپنی مکمل آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ ایسے موقع پر انگریزوں کے لئے برصغیر میں ہر قسم کی بدامنی کو سختی سے کچلنا ضروری تھا۔

جب فروری میں رولٹ کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی تو گاندھی نے احمد آباد میں ایک حلف نامہ تیار کیا جس میں یہ عہد کیا گیا تھا کہ ہم مجوزہ قوانین کی بذریعہ ستیہ گرہ مزاحمت کریں گے۔ 24/فروری تک 25 سرکردہ کانگرسی لیڈروں نے اس حلف نامہ پر دستخط کر دیئے اور یوم احتجاج منانے کے لئے 30/مارچ کی تاریخ مقرر ہوئی۔ بعد میں یہ تاریخ 6/اپریل تک بڑھا دی گئی لیکن دہلی میں پہلے اعلان کے مطابق ہی 30/مارچ کو ایک جلوس نکلا جس پر پولیس نے گولی چلا دی لیکن شہر کے لوگوں کا جذبہ احتجاج ختم نہ ہوا اور اگلے دن حکیم اجمل خان اور سوامی شردھانند کی زیر قیادت جلوس نکلا۔ جب سوامی شردھانند نے انگریز فوجیوں کے سامنے سینہ تان کر یہ کہا کہ مجھ پر گولی چلاؤ تو مسلمان اس کی اس جرأت و بہادری سے اس قدر متاثر ہوئے کہ وہ اسے جامع مسجد میں لے گئے اور وہاں اس نے منبر پر کھڑے ہو کر حاضرین کو خطاب کیا۔ لاہور اور وسطی پنجاب کے متعدد دوسرے شہروں میں بھی پہلے 30/مارچ کو اور پھر 6/اپریل کو احتجاجی ہڑتال اور جلسے ہوئے۔ 9/اپریل کو ہندوؤں کا ایک تہوار تھا۔ اس موقع پر پھر ہڑتال ہوئی اور جلوس نکالے گئے۔ لاہور میں مسلمانوں نے بھی گاندھی جی کی جے اور ہندو۔مسلم اتحاد کی جے کے نعرے لگائے اور تاریخ میں پہلی مرتبہ کئی ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک ہی برتن میں پانی پی کر اور ایک ہی برتن میں حلوہ پوری کھا کر ہندو۔مسلم اتحاد کے فقید المثال مظاہرے کیے۔ اس پر گاندھی کو متھرا (ضلع گوڑگاؤں) کے نزدیک پڑل کے ریلوے سٹیشن پر گرفتار کر لیا گیا جبکہ وہ ایک پبلک جلسے میں شرکت کے لئے امرتسر آ رہا تھا۔ گاندھی کو تو وہاں سے بمبئی لے جا کر چھوڑ دیا گیا لیکن اس سے

اگلے دن 10 اپریل کو لاہور میں اس کا سخت ردعمل ہوا۔ فوراً دکانیں بند ہو گئیں اور لوگ بازاروں میں جمع ہو گئے۔ انارکلی میں ایک مجمع نے جلوس کی صورت اختیار کر لی جسے ہائی کورٹ کے نزدیک گولی چلا کر منتشر کیا گیا۔ اس کے بعد لوہاری دروازے میں گولی چلی اور اگلے دن شاہی مسجد جمعہ کی نماز کے وقت انسانوں سے بھر گئی۔ نماز کے بعد حاضرین کو خطاب کرنے والوں میں ہندو لیڈر بھی شامل تھے۔ مسجد سے نکلنے والوں نے پھر جلوس کی صورت اختیار کر لی۔ لیکن یہ جلوس پرامن منتشر ہو گیا لیکن شہر کے کوتوال کی رپورٹ یہ تھی کہ بلوائیوں نے ''ڈنڈا فوج'' قائم کر لی ہے اور حالات بہت خطرناک ہیں۔ 12 اپریل کو شہر میں دہشت پھیلانے کے لئے فوج کی گشت ہوئی اور جگہ جگہ فوجی چوکیاں قائم کر دی گئیں۔ شاہی مسجد کے نزدیک ایک فوجی چوکی کے پاس تماشائیوں کا ہجوم ہوا تو اسے منتشر کرنے کے لئے پھر گولی چلا دی گئی۔ اس کے بعد پورے شہر میں ہڑتال رہی اور صورت حال انتہائی کشیدہ ہو گئی۔

9 اپریل کو گاندھی کی گرفتاری کے بعد 10 اپریل کو امرتسر میں لاہور سے بھی زیادہ ہنگامہ ہوا جبکہ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی گرفتاری کے بعد پورے شہر میں فوراً ہی ہڑتال ہو گئی اور بہت سے لوگ اپنے لیڈروں کو رہا کرانے کے لئے جلوس کی صورت میں ڈپٹی کمشنر کے بنگلہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستہ میں پولیس نے اس جلوس کو روکا اور اسے منتشر کرنے کے لئے گولی چلا دی۔ اس پر جب مظاہرین منتشر ہو کر واپس آئے تو انہوں نے نیشنل بنک اور الائیڈ بنک کی عمارتوں کو آگ لگا دی اور ان بنکوں کے چار یورپین افسروں کو ہلاک کر دیا۔ مظاہرین نے ٹاؤن ہال اور بعض دوسری عمارتوں کو بھی نذر آتش کر دیا، ٹیلی گراف کی تاریں توڑ دیں اور ایک گلی میں ایک عیسائی مشنری عورت مس شروڈ کو بھی ہلاک کر دیا۔ 11 اپریل کو امرتسر کے بہت سے سرکردہ افراد کو گرفتار کر لیا گیا اور جلسوں اور جلوسوں پر پابندی عائد کر دی گئی۔ تاہم 13 اپریل کو سکھوں کے بیساکھی کے تہوار کے موقع پر شہر کے مشہور جلیانوالہ باغ میں ایک احتجاجی جلسہ ہوا جس میں تقریباً 20 ہزار لوگوں نے شرکت کی۔ اس باغ کے چاروں طرف دیوار تھی اور اس میں آمد و رفت کا راستہ ایک ہی تھا۔ جب اس جلسہ میں ایک شخص ہنس راج تقریر کر رہا تھا تو یکا یک ایریا کمانڈر جنرل ڈائر (Dyer) پچاس انگریز اور ایک سو ہندوستانی فوجیوں کے ہمراہ وہاں آ پہنچا۔ اس نے آتے ہی کوئی وارننگ دیئے بغیر گولی چلا دی۔ مسلسل دس منٹ تک 1650

گولیاں چلائی گئیں اور یہ سلسلہ اس وقت ختم ہوا جب کسی فوجی کے پاس کوئی گولی باقی نہیں رہی تھی۔ سرکاری تحقیقات کے مطابق اس وحشیانہ فائرنگ سے 379افراد ہلاک اور 1200 زخمی ہوئے۔ کانگرس کی تحقیقاتی کمیٹی کا اندازہ تھا کہ مرنے والوں کی تعداد ایک ہزار سے کم نہیں تھی اور سیوا سمتی کا کہنا تھا کہ اس نے 500لاشیں شمار کی تھیں۔

ڈاکٹر عاشق بٹالوی کی رائے یہ ہے کہ جلیانوالہ باغ کا یہ حادثۂ خونیں صرف جنرل ڈائر کی شوریدہ سری یا فرعونیت کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ اس کے لئے لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل او ڈوائر (Michael O Dwyer) ذمہ دار تھا جس نے مئی 1913ء سے مئی 1919ء تک پنجاب پر حکومت کی۔ اس کی حکومت کا ''سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ اس صوبے کی تعلیم یافتہ جماعت کو ایسا کچل کر رکھ دے کہ وہ سر نہ اٹھا سکے۔ اوڈوائر کا خیال تھا کہ پنجاب کے تعلیم یافتہ لوگ جن میں مسلمان ہندو اور سکھ سبھی شامل تھے صبح وشام انگریزی حکومت کے خلاف سازشیں کرتے ہیں۔ اخبارات میں انگریزوں کا تختہ الٹ دینے والے مضامین چھپتے ہیں۔ کالجوں کے پروفیسر، سکولوں کے مدرس، عدالتوں کے وکلا اور جرائد اور رسائل کے ایڈیٹر باہم مل کر ایسی انجمنیں بناتے ہیں جن میں برطانوی اقتدار کو ختم کرنے کی تجویزیں سوچی جاتی ہیں۔ اس قسم کے بے سروپا اور دور از کار اوہام نے بڑھتے بڑھتے اسے اس قدر مضطرب کر دیا اور پریشان کر دیا تھا کہ وہ پنجاب میں کسی معمولی اور بےضرر سی آئینی تحریک کو بھی برداشت نہ کرسکتا تھا۔''[3]

لیکن امریکی مؤرّخ پروفیسر نارمن براؤن نے اس حادثہ کے پس منظر کا جو تجزیہ کیا ہے وہ عاشق بٹالوی کی رائے سے بہتر ہے۔ براؤن اس حادثہ کی ذمہ داری صرف ایک فرقہ پر نہیں ڈالتا۔ وہ لکھتا ہے کہ ''بلاشبہ ان دنوں تیسری افغان جنگ شروع ہو جانے کی وجہ سے پنجاب کی صورت حال فوجی نقطۂ نگاہ سے خطرناک تھی کیونکہ یہ صوبہ سرحدی درّوں کے نزدیک واقع تھا۔ جنرل ڈائر کا دعویٰ یہ تھا کہ ''صرف ایک ہجوم کو منتشر کرنے کا سوال نہیں تھا بلکہ فوجی نقطۂ نگاہ سے نہ صرف اس جلسہ کے حاضرین پر بلکہ پورے پنجاب میں کافی اخلاقی دباؤ پیدا کرنا مقصود تھا۔ لہٰذا سختی کے نامناسب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔'' براؤن مزید لکھتا ہے کہ ''اس میں کوئی شک نہیں کہ اس واقعہ سے بہت اخلاقی دباؤ پیدا ہوا لیکن یہ وہ اخلاقی دباؤ نہیں تھا جو جنرل ڈائر پیدا کرنا چاہتا تھا...... اگر کسی ایک واقعہ نے انگریزوں کے ہندوستان میں رہنے کے امکان کو ختم

کیا تھا تو وہ امرتسر کا واقعہ تھا۔ اس واقعہ کے بعد ہندوستان گاندھی کی زیر قیادت مکمل آزادی کی طرف گامزن ہو گیا۔"[4] سر ظفر اللہ خان لکھتا ہے کہ "اسی سال دسمبر میں کانگرس کا سالانہ اجلاس بڑی دھوم دھام سے امرتسر میں ہوا۔ برطانوی عملداری ہندوستان میں 28 سال بعد جا کر ختم ہوئی لیکن 1919ء کے واقعات نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کی کیفیت اب چراغ سحری کی ہے۔"[5]

جلیاں والے باغ کے سانحے کے بعد امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ اور پنجاب کے متعدد دوسرے شہروں میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا جس کا مقصد نہ صرف عوام الناس میں دہشت پھیلانا تھا بلکہ ان کی تذلیل کرنا بھی تھا۔ سر ظفر اللہ خان کے بیان کے مطابق "یہ مارشل لاء اتنا سخت تھا کہ ایک شہر سے دوسرے شہر تک جانے پر بھی کڑی پابندی عائد کی گئی تھی۔ ہر بات کے لئے مارشل لاء کے افسروں سے پاس حاصل کرنا ضروری ہو گیا تھا...... امرتسر میں جنرل ڈائر نے یہ حکم بھی دیا تھا کہ جس بازار میں مس شروڈ کو قتل کیا گیا تھا وہاں سے جو ہندوستانی گزرے وہ ہاتھ پاؤں پر رینگتا ہوا گزرے۔ یہ حکم اس بازار کے رہنے والوں پر حاوی تھا جو اپنے مکانوں سے نکلتے وقت اور واپس آتے وقت اس حکم کی پابندی پر مجبور تھے اور اس ذلت و رسوائی کو برداشت کرنے کے بغیر انہیں کوئی چارہ نہیں تھا۔ برطانوی استبداد سے ہندوستان کو آزادی تو 28 سال بعد حاصل ہوئی لیکن اس میں شک نہیں کہ 1919ء کے مارشل لاء اور خصوصاً جنرل ڈائر کی وحشیانہ کاروائیوں نے ہندوستان سے برطانوی راج کی صف لپیٹ دی۔ مارشل لاء کے دوران جو نہایت ذلت آمیز امتیاز گورے اور کالے کے درمیان کیا گیا وہ ہندوستانی دلوں پر ایک نہ مٹنے والا نقش چھوڑ گیا۔ بیشک ہنٹر کمیشن نے اپنی رپورٹ اور سفارشوں سے ہندوستانیوں کے زخمی اور آزردہ دلوں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی لیکن بے سود۔ اب ہندوستانی برطانیہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم رکھنے اور نبھانے کے لئے تیار تو تھے لیکن آزادی اور مساوات کی سطح پر نہ کہ غلامی اور محکومی کی بنا پر...... مارشل لاء کے ماتحت ایک حکم یہ جاری ہوا کہ سب ہندوستانی اپنی موٹریں اور گاڑیاں مارشل لاء کے محکمے کے سپرد کر دیں۔ یہ حکم بھی ایک امتیازی حکم تھا اور تمیز کی بنا افسر اور رعایا نہیں تھی۔ اگر محض حاکم اور محکوم میں تمیز کی جاتی تو اس حکم میں پھر بھی سختی کا پہلو تو قائم رہتا لیکن تذلیل اور تحقیر کا پہلو نمایاں نہ ہوتا۔ یہ حکم بھی صرف ہندوستانیوں پر حاوی تھا۔ یورپین اور اینگلو انڈین اس سے مستثنیٰ تھے۔ مثلاً ایک ہندوستانی ڈپٹی کمشنر یا کمشنر تو مجبور تھا کہ اپنی موٹر یا اپنی گاڑی حوالے کر دے اور

کرائے کے تانگے پر دفتر جائے لیکن اس کے دفتر کا اینگلو انڈین سپرنٹنڈنٹ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر جہاں چاہتا جا سکتا تھا۔ سر شادی لال جو ان دنوں چیف کورٹ کے جج تھے اور بعد میں ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہوئے، اپنی موٹر گاڑی میں بیٹھ کر مارشل لاء کے افسر اعلیٰ کرنل جانسن کے دفتر میں گئے جو پنجاب کلب میں قائم کیا گیا تھا اور کرنل جانسن سے کہا کہ میں عدالت کا جج ہوں اور مجھے اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے موٹر کی ضرورت ہے مجھے اس حکم سے مستثنٰی کیا جائے۔ کرنل جانسن نے کہا کہ مجھے کسی کی ضرورت سے غرض نہیں میرا مقصد امن کا قیام ہے۔ اس غرض کے حصول کے لئے پیش آمدہ حالات میں ضروری ہے کہ سب موٹر گاڑیاں اور گھوڑا گاڑیاں حوالے کی جائیں۔ آپ اپنی گاڑی لے آئے ہیں اب اسے حوالے کر دیں۔ سر شادی لال صاحب نے کہا بہت اچھا۔ میں عدالت میں پہنچ کر گاڑی بھیج دونگا۔ کرنل جانسن نے کہا گاڑی تو اب یہیں رہے گی۔ آپ جیسے چاہیں عدالت چلے جائیں...... ایک اور طریقہ سیاسی دباؤ کا اور قومی قیادت کو حکومت کی نظروں میں معتوب کرنے کا یہ اختیار کیا گیا کہ جن شخصیتوں کو حکومت مشتبہ شمار کرتی تھی ان کے مکانوں کی دیواروں پر لکڑی کے تختے آویزاں کئے گئے جن پر مارشل لاء کے احکامات اطلاع عام کے لئے چپکائے جاتے۔ ان تختوں اور اعلانوں کی حفاظت صاحب مکان کے ذمے ہوتی۔ اگر شرارتاً بھی کوئی شخص ان تختوں اور اعلانوں کو نقصان پہنچاتا تو صاحب مکان مستوجب تعزیر گردانا جاتا۔ دن کے وقت تو بھلا صاحب مکان بورڈ کے پاس کوئی پہرہ دار مقرر کر دیتا لیکن رات کے اندھیرے میں اس فرض سے سرخروئی حاصل کرنا مشکل امر تھا۔ میاں فضل حسین صاحب کے بنگلے کے باہر یہ بورڈ لگا ہوا تھا۔ انہوں نے تو یہ ترکیب کر لی کہ بورڈ اس طریق سے آویزاں کیا جائے کہ جب چاہیں دونوں طرف کی رسیوں کو کھینچ کر بورڈ کو زمین سے 9-10 فٹ کی بلندی تک اوپر کھینچ لیا جائے۔ دن بھر تو بورڈ اتنی بلندی پر لٹکا رہتا کہ گزرنے والا اگر چاہے تو اعلانات کو آسانی سے پڑھ سکے اور غروب آفتاب کے بعد اسے بلند کر دیا جائے...... نقل و حرکت پر پابندی اتنی کڑی ہو گئی کہ بغیر اشد ضرورت کے کوئی شخص سفر پر آمادہ نہ ہوتا۔ مجھے ایک دن لاہور سے ڈسکہ جانے کی ضرورت پیش آ گئی۔ پاس حاصل کیا۔ گوجرانوالہ تک ریل کا سفر تھا پھر سڑک کا۔ اگرچہ گوجرانوالہ شہر میں داخل ہونے کی ضرورت نہیں تھی لیکن سٹیشن سے آتے اور جاتے سول سٹیشن سے گزرنا لازم تھا اور وہاں پاس دکھانا اور اجازت حاصل کرنا ضروری تھا۔ واپسی پر میں

مارشل لاء کے دفتر میں گیا۔ مارشل لاء افسر انگریز فوجی افسر تھا۔ بنگلے کے برآمدے کے پہلو میں اس کا دفتر تھا چند مرد اور عورتیں اپنے پاس پر تصدیقی مہر حاصل کرنے کے منتظر تھے۔ مئی کا مہینہ تھا۔ دوپہر کا وقت تھا۔ گرمی کی شدت تھی۔ باری آنے پر میں اندر گیا۔ فوجی افسر نے کوئی حیل و حجت نہ کی، جو کچھ ضروری تھا خاموشی سے کر کے پاس واپس میرے حوالے کر دیا۔ اگرچہ میں تین سال انگلستان میں رہ چکا تھا۔ پھر بھی یہ امر میری طبیعت پر بہت شاق گزرا کہ وہ نوجوان افسر جو بظاہر شریف الطبع معلوم ہوتا تھا کرسی پر بالکل ننگا بیٹھا ہوا تھا۔ صرف کپڑے کا ایک ٹکڑا پانی میں بھیگا ہوا ناف کے نیچے رکھ لیا تھا۔ اسی حالت میں مرد بھی اس کے سامنے پیش ہو رہے تھے اور مستورات بھی۔"[6]

مارشل لاء کے قواعد کی خلاف ورزی پر فوراً سرسری کارروائی ہو کر کوڑے یا جرمانہ یا قید کی سزا دے دی جاتی تھی۔ دو افراد کو اکٹھے کسی سڑک پر چلنے کی اجازت نہیں تھی۔ طلبا کو حکم تھا کہ وہ ہر روز چار مرتبہ مارشل لاء کے متعلقہ دفتر میں رپورٹ کریں۔ اس طرح انتہائی گرمی کے موسم میں روزانہ انہیں تقریباً انیس میل سفر کرنا پڑتا تھا۔ ایک دن سناتن دھرم کالج کی دیوار پر چسپاں کردہ نوٹس کسی شخص نے اتار دیا تو اس کالج کے سارے طلبا اور اساتذہ کو فوجی نگرانی میں قلعہ میں لے جایا گیا۔ جہاں انہیں تین دن تک نظر بند رکھ کر ان سے نہایت ظالمانہ سلوک کیا گیا۔ مارشل لاء کی مبینہ خلاف ورزی کرنے والے کو درخت سے باندھ کر کوڑے لگائے جاتے تھے تاکہ سب کو عبرت ہو۔ لاہور کے نزدیک ایک گاؤں میں ایک مسلمان گھرانے میں شادی تھی۔ چونکہ یہ اجتماع مارشل لاء کے حکم کے منافی تھا اس لئے دولہا اور مولوی سمیت سارے براتیوں اور مہمانوں کو گرفتار کر کے انہیں سرعام کوڑے لگائے گئے...... قصور میں ایک انگریز مارشل لاء افسر نے دہشت پھیلانے کے لئے انتہائی بہیمانہ طریقے اختیار کئے۔ اس کے حکم کے تحت ایک برات کو طوائفوں کی موجودگی میں کوڑے لگائے گئے۔ وہ زمین پر ماتھا بھی رگڑواتا تھا...... وہ قیدیوں کو ننگا کر کے انہیں ٹیلی گراف کے کھمبے کے ساتھ بندھواتا تھا اور پھر سرعام کوڑے لگواتا تھا۔ اس نے قصبہ کی ساری آبادی کی شناختی پریڈ کرائی تھی اور پھر 150 افراد کو ایک پنجرے میں بند کر کے ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر رکھ دیا تھا۔ چونکہ گوجرانوالہ کے لوگوں نے ریلوے سٹیشن، ڈسٹرکٹ کورٹ، پلوں، تحصیل آفس اور بعض دوسری سرکاری عمارتوں کو نذر آتش کر دیا تھا اس لئے اس شہر

پر ہوائی جہاز کے ذریعے بمباری کی گئی۔ چونکہ یہ بمباری اندھا دھند کی گئی تھی اس لئے اس سے بہت سے بے گناہ لوگ ہلاک ہوئے۔ ایک کھیت میں 20 کسان کام کر رہے تھے، انہیں مشین گن سے بھون دیا گیا۔ شہر کے ہر شخص کے لئے لازم تھا کہ وہ جب کسی انگریز افسر کو دیکھے تو وہ اپنی بائیسکل یا تانگے وغیرہ سے اتر کر اسے سلام کرے۔ جو کسی وجہ سے ایسا کرنے میں ناکام رہتے تھے انہیں سرعام کوڑے لگائے جاتے تھے۔ مارشل لاء کمیشن نے 149 افراد کو مجرم قرار دیا۔ ان میں سے 22 کو موت کی سزا دی گئی، 108 کو عمر قید اور باقی 19 کو لمبے لمبے عرصے کی قید کی سزائیں سنائی گئیں۔ شیخوپورہ میں پرائمری سکولوں کے بچوں کو مجبور کیا جاتا تھا کہ وہ ہر روز تین مرتبہ برطانیہ کے جھنڈے یونین جیک کو سلامی دیں۔ ان بچوں سے اس موقع پر بار بار یہ کہلوایا جاتا تھا کہ ''میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں کبھی کوئی جرم نہیں کروں گا۔ میں توبہ کرتا ہوں۔ میں توبہ کرتا ہوں۔ میں توبہ کرتا ہوں۔''[7]

پنجابی عوام کی بے مثال قربانیاں اور گاندھی کی موقع پرستی

گاندھی نے 21رجولائی 1919ء کو اینٹی رولٹ ایکٹ تحریک معطل کر دی۔ پھر جب دسمبر میں امرتسر میں آل انڈیا کانگرس کا سالانہ اجلاس ہوا تو اس کے اصرار پر اس مضمون کی قرارداد منظور کی گئی کہ ''اپریل کے مہینے میں پنجاب اور گجرات کے بعض علاقوں میں ہجوم نے برافروختگی کی حالت میں جو زیادتیاں کی ہیں ہمیں ان پر افسوس ہے اور ہم ان کی مذمت کرتے ہیں''۔[8] اس قرارداد میں برطانوی سامراج اور مارشل لاء حکام کے مظالم یا زیادتیوں کا کوئی ذکر نہیں تھا اور نہ ہی اس میں امرتسر، لاہور، گوجرانوالہ، شیخوپورہ، قصور اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں عوام سے کئے گئے انتہائی ذلت آمیز سلوک کا کوئی تذکرہ تھا۔ یہ گاندھی کی بورژوا موقع پرستی، مصلحت اندیشی اور منافقت کی بہترین مثال تھی۔ وہ احمد آباد اور بمبئی کے ایسے ہندو بورژوا طبقے کا نمائندہ تھا جو برطانوی سامراج سے زیادہ ٹکر نہیں لینا چاہتا تھا۔ بلکہ بلیک میلنگ اور گفت وشنید کے ذریعے محض رعایات حاصل کرنے کا متمنی تھا۔

پنجاب کے عوام نے گاندھی کی جاری کردہ اینٹی رولٹ ایکٹ تحریک میں بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا تھا۔ انہوں نے ہر قسم کی فرقہ واریت سے بالاتر ہو کر برطانوی سامراج کے

ہاتھوں ایسے مظالم برداشت کئے تھے کہ 1857ء کے بعد کی برصغیر کی تاریخ میں ان کی کوئی مثال نہیں ملتی تھی۔ پنجابی عوام کی جانب سے سامراج دشمنی کے بے مثال مظاہرے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ پہلی جنگ عظیم کے دوران افراط زر کے باعث ضروریات زندگی کی قیمتوں میں بہت اضافہ ہو گیا تھا اور جنگ کے خاتمہ پر بے روزگاری بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ حتیٰ کہ جو لوگ فوج سے فارغ ہو کر اپنے گھروں کو واپس آئے تھے ان کے لئے بھی کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا۔ پنجاب سے تقریباً چار لاکھ جوان فوج میں بھرتی کئے گئے تھے اور جنگی قرضوں کے طور پر کروڑوں روپے کی وصولی کی گئی تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد انہیں اس مصیبت سے نجات ملے گی مگر جب نومبر 1919ء میں جنگ ختم ہوئی تو ان کی زندگیاں پہلے سے زیادہ دشوار ہو گئیں۔ جنگ کے باعث ضروریات زندگی اور روزمرہ کے استعمال کی اشیائے صرف کی قیمتوں میں بہت اضافہ ہو گیا تھا اور اس بنا پر درمیانہ طبقہ اور محدود ذرائع آمدنی رکھنے والے لوگوں پر بہت بوجھ پڑ گیا تھا۔ محدود آمدنی والے جن لوگوں پر کاری ضرب لگی تھی ان میں محکمہ ریلوے کے چھوٹے ملازمین بھی شامل تھے۔ ان میں بہت بے چینی پائی جاتی تھی۔ آمدورفت کی سہولتوں اور درآمدی و برآمدی اشیاء کی کمی کی وجہ سے بڑی مشکلات پیدا ہو گئی تھیں۔ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ اور پریس ایکٹ کے تحت عوام کی شہری آزادیاں سلب کر لی گئی تھیں لہٰذا وہ اپنی مشکلات کا اظہار کرنے سے بھی قاصر تھے۔ 1918ء میں خشک سالی کے باعث وسیع پیمانے پر قحط پڑ گیا تھا اور پھر انفلوئنزا اور دوسرے وبائی امراض کے باعث بے شمار اموات واقع ہوئی تھیں۔ نئے انکم ٹیکس نے اور اس ٹیکس کی وصولی کے نئے طریقوں نے اور کاروبار میں بے جا سرکاری مداخلت نے تجارتی حلقوں میں بڑی بے چینی پیدا کر رکھی تھی۔ مزید برآں جنگ کے دوران قومی آزادی کے بارے میں عوام کے نظریات میں بنیادی تبدیلی پیدا ہو چکی تھی اور عوام میں یہ امید پید ہو گئی تھی کہ ہندوستان بہت جلد آزاد ہو جائے گا۔ اس امید کی بنیاد وزیر ہند ای۔ ایس۔ مانٹیگو (E.S. Montagu) کے 20 راگست 1917ء کے اعلان پر تھی جس میں پہلی مرتبہ ہندوستان کے ساتھ یہ حتمی وعدہ کیا گیا تھا کہ ''اس ملک میں برطانوی پالیسی کا مقصد بتدریج ایسی خودمختار حکومت قائم کرنا ہے جو مکمل طور پر ہندوستان کے نمائندوں کے سامنے جوابدہ ہوگی۔'' اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا گیا تھا کہ ذمہ دار حکومت کی پہلی قسط کے طور پر ایک نیا آئین جنگ کے فوراً بعد نافذ کر دیا جائے گا۔''[9]

پنجابی مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف بے پناہ نفرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حکومت برطانیہ نے اس جنگ میں خلافت عثمانیہ کاقطعی خاتمہ کرنے میں سب سے بڑا کردار ادا کیا تھا۔ برطانوی سامراج نے نہ صرف سلطنت عثمانیہ کے پرخچے اڑا دیئے تھے بلکہ اس نے عربوں کے ساتھ جو وعدے کئے تھے ان کی خلاف ورزی کر کے مشرق وسطیٰ میں اپنی ایک نئی سلطنت قائم کر لی تھی۔ عاشق بٹالوی کے بیان کے مطابق اپریل 1919ء میں پنجاب کے آگ وخون میں غلطاں ہونے کا ایک اور پس منظر یہ تھا کہ جنگ کے دوران جنگی فنڈ اور فوجی بھرتی کے لئے ہر ممکن تشدد اور ہر نوع کا جبر روا رکھا گیا تھا۔ لیفٹیننٹ گورنر اوڈوائر کا یک ایک نادر شاہی حکم جاری کر دیتا تھا کہ فلاں فلاں ضلع یا فلاں فلاں گاؤں سے اتنے جوان فوراً مہیا کئے جائیں۔ یہ حکم صادر ہوتے ہی صوبے کی پوری حکومت کے پرزے حرکت میں آ جاتے تھے۔ ضلع کا ڈپٹی کمشنر افسر مال کے سر پر، افسر مال تحصیلدار کے سر پر اور تحصیلدار نمبردار کے سر پر تلوار لے کر کھڑا ہو جاتا تھا کہ جوانوں کی مطلوبہ تعداد جہاں سے بن پڑے اور جس طرح ممکن ہو مہیا کی جائے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ پورے گاؤں کو سرکاری اہلکار نرغے میں لے لیتے تھے اور ساری آبادی کو گھروں سے نکال کر قطار میں کھڑا کر دیا جاتا تھا۔ جس جوان کی طرف سرکار کی انگلی اٹھ جاتی تھی اسے پابجولاں ضلع کے صدر مقام میں بھیج دیا جاتا تھا اور وہ رضا کارانہ طور پر بھرتی کیا ہوا رنگروٹ تصور ہوتا تھا۔ حکومت کے اس جابرانہ طرز عمل سے پنجاب میں ملتان، مظفر گڑھ، گوجرانوالہ، کرنال، شاہ پور، جھنگ اور دوسرے متعدد اضلاع میں بے شمار فسادات ہوئے۔ دیہات کے باشندوں نے مشتعل ہو کر بھرتی کرنے والے افسروں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ بڑے بڑے بلوے ہونے شروع ہو گئے اور بعض جگہ گاؤں کی پوری آبادی کو گرفتار کر کے عدالتوں میں پیش کر دینا پڑا...... جونہی خبر اڑتی کہ بھرتی کا افسر آ رہا ہے گاؤں کے لوگ ڈر کے مارے گھروں اور کھیتوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔ کئی مرتبہ سرکاری افسر گھروں کو لوٹ لیتے اور فصلوں کو تباہ کر دیتے تھے...... دیہات کے معززین کی جان عذاب میں آئی ہوئی تھی۔ نمبرداروں اور ذیلداروں پر آئے دن سرکار کا تازیانہ برستا تھا کہ اور رنگروٹ لاؤ۔ جن نمبرداروں سے کسی قسم کی معذوری کا اظہار ہوا، ان کی نمبرداریاں ضبط کر لی گئیں۔ پولیس حفظ امن میں ان لوگوں کا بے دریغ چالان کر دیتی تھی اور مجسٹریٹ ضمانت لینے کی بجائے انہیں فوراً حوالات میں بند کر دیتے تھے اور جب تک وہ بدبخت رنگروٹوں کی بھرتی کا وعدہ

نہ کرتے انہیں رہا نہیں کیا جاتا تھا...... ضلع شاہ پور میں جب فساد ہوا اور گاؤں کی آبادی نے بھرتی کے افسروں پر قاتلانہ حملے شروع کئے تو بے شمار لوگوں پر مقدمات چلائے گئے۔ عدالتی کاروائی کے دوران عجیب وغریب باتوں کا انکشاف ہوا۔ مثلاً یہ کہ جب عوام بخوشی بھرتی ہونے سے انکار کر دیتے تھے تو گاؤں کے تمام باشندوں کو گھروں سے باہر کھڑا کر کے مردوں کو عورتوں کے سامنے برہنہ کر دیا جاتا تھا۔ جس کنبے میں تین یا چار بھائی تھے ان میں سے زبردستی دو بھائیوں کو بھرتی کر لیا جاتا تھا۔ عورتوں کو خاوندوں سے جدا کر کے کسی اور مقام پر بھیج دیا جاتا تھا اور جب تک ان کے خاوند خود بھرتی ہونے یا اپنے عزیزوں کو بھرتی کرانے پر رضامند نہیں ہوتے تھے عورتوں کو گھر جانے کی اجازت نہیں ملتی تھی...... انہی دنوں لاہور، امرتسر اور جالندھر میں بڑے بڑے جلسے منعقد ہو رہے تھے جہاں مسلم لیگ اور کانگرس کی متحدہ سکیم کی حمایت میں قراردادیں منظور کی جاتی تھیں۔ ان جلسوں میں بعض مقررین نے بھرتی کے تشدد آمیز طریقوں پر بھی اظہار خیال کیا اور دیہاتی آبادی پر تہہ در تہہ مظالم پر سے پردے اٹھائے۔"[10]

مانٹیگو۔ چیمسفورڈ اصلاحات

پنجاب میں اپریل سے لے کر جولائی 1919ء تک آگ وخون کے سیلاب کا نتیجہ یہ نکلا کہ دسمبر 1919ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ان آئینی اصلاحات کی ایک قانون کی صورت میں منظوری دے دی جن کا وزیر ہند مانٹیگو نے 20/اگست 1917ء کو وعدہ کیا تھا اور جن کے بارے میں اس نے 18-1917ء میں وائسرائے چیمسفورڈ (Chemford) کے ساتھ مل کر ہندوستان کے مختلف علاقوں کے مقامی لیڈروں سے تبادلۂ خیال کیا تھا۔ ان آئینی اصلاحات کی چند نمایاں خصوصیات یہ تھیں کہ "(1) مرکزی اسمبلی اور صوبائی اسمبلیوں میں ہر جگہ سرکاری اور نامزد ممبروں کے لئے بھی نشستیں مخصوص کی گئی تھیں لیکن پہلی مرتبہ ہر اسمبلی میں سرکاری بلاک کے مقابلے میں منتخب شدہ ممبروں کی واضح اکثریت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ (2) جہاں تک مرکزی اسمبلی کا تعلق تھا اسے حکومت پر کوئی کنٹرول نہیں دیا گیا تھا۔ حکومت کے تمام اختیارات گورنر جنرل اور اس کی ایگزیکٹو کونسل کے لئے محفوظ کر دیئے گئے تھے۔ حکومت پر اسمبلی کے فیصلوں کو ماننے کی پابندی نہ تھی اور اسے اسمبلی کے ووٹ کے ذریعے سے برطرف نہیں کیا جاسکتا تھا۔ (3) صوبوں میں

''ذمہ دار حکومت'' قائم کرنے کی جانب ایک ادھورا قدم اٹھایا گیا تھا۔صوبائی کابینہ کی ساخت یہ تجویز کی گئی تھی کہ اس میں منتخب شدہ اور اسمبلی کے سامنے جوابدہ وزیر بھی شامل ہوں گے اور ایسے ایگزیکٹو کونسلر بھی شامل ہوں گے جو حسب سابق صرف گورنر کو اور اس کے ذریعے گورنر جنرل اور وزیر ہند کو جوابدہ ہوں گے۔ کچھ محکمے (محکمہ جات منتقلہ) وزیروں کے سپرد کر دیئے جائیں گے اور کچھ محکمے (محکمہ جات غیر منتقلہ) ایگزیکٹو کونسلروں کی تحویل میں رہیں گے۔(4) دس سال بعد اس تجربے کے نتائج کا جائزہ لینے اور آئندہ ضروری ترامیم پر غور کرنے کے لئے ایک شاہی کمیشن مقرر کیا جائے گا۔''

23ر دسمبر 1919ء کو ان اصلاحات کا اعلان کیا گیا تو اس کے تقریباً ایک ہفتہ بعد امرتسر میں کانگرس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقد ہوئے اور ان کے ساتھ ہی ستمبر 1919ء میں قائم شدہ مرکزی خلافت کمیٹی کا بھی اجلاس ہوا۔ جناح نے کانگرس اور مسلم لیگ دونوں ہی جماعتوں کے جلسوں میں شرکت کی تھی جبکہ گاندھی صرف کانگرس کے اجلاس میں شریک ہوا تھا۔ کانگرس کے اجلاس کا فیصلہ یہ تھا کہ نئے مجوزہ آئین کو زیر عمل لانا چاہیے اور اس مقصد کے لئے حکومت سے تعاون کرنا چاہیے لیکن مسلم لیگ کے اجلاس کی قرار داد ویسی ہی تھی جیسی کہ نومبر 1919ء میں خلافت کانفرنس نے دہلی میں منظور کی تھی یعنی یہ کہ ''حکومت برطانیہ سے عدم تعاون کیا جائے گا۔''[11] محمد علی جناح مسلم لیگ کے ان عناصر میں شامل تھے جن کا خیال تھا کہ نئی اصلاحات کو قبول کر کے جہاں تک ممکن ہو سکے فائدہ اٹھانا چاہیے اور آئندہ ترقی کے لئے جدوجہد جاری رکھنی چاہیے۔ کانگرس کے اعتدال پسند گروپ نے بھی سرتیج بہادر سپرو کی زیر قیادت اس مقصد کے لئے لبرل کانفرنس کے نام سے ایک الگ ادارہ قائم کر لیا تھا۔

پہلی صوبائی وزارت۔فضل حسین اور لالہ ہرکشن لال

پنجاب میں میاں فضل حسین اور اس کا گروپ بھی نئی صوبائی کونسل میں داخل ہونے کے حق میں تھا حالانکہ وہ ان دنوں ایک آزاد خیال اور ترقی پسند بورژوا لیڈر کی حیثیت سے مشہور تھا اور اس وجہ سے لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر کا منظور نظر نہیں تھا۔ وہ صوبائی مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری اور صوبائی کانگرس کا صدر تھا۔اس نے میثاق لکھنؤ پر پنجاب کے مسلمانوں کے نمائندے

کی حیثیت سے دستخط کئے تھے جبکہ اس کا صوبائی سیاسی حریف میاں محمد شفیع اس معاہدے کے خلاف تھا۔ اس نے کانگرس اور لیگ کی متحدہ سکیم کو مقبول بنانے اور پنجاب کی رائے عامہ کو بیدار کرنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ اس نے اکتوبر 1917ء میں پنجاب پروانشل کانفرنس کے پانچویں سالانہ اجلاس کی صدارت کی تھی اور وہ انجمن حمایت اسلام، پنجاب یونیورسٹی اور ہائی کورٹ کے مقتدر ترین ارکان میں شمار ہوتا تھا۔

میاں فضل حسین کی جانب سے نئی اصلاحات قبول کرنے کی بظاہر ایک وجہ یہ تھی کہ اسے اس امر کا امکان نظر آتا تھا کہ وہ مقابلتاً بااختیار نئی کونسل میں اپنی قابلیت کے جوہر دکھا سکے گا۔ جبکہ اس سے پہلے کی بے اختیار کونسلوں میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اگرچہ وہ 1916ء سے لے کر 1919ء تک 1909ء کے ایکٹ کے تحت قائم شدہ کونسل کا رکن رہا تھا لیکن وہ اس بنا پر کوئی خاص نام پیدا نہیں کر سکا تھا کہ ارکان کونسل کے پاس کوئی اختیار نہیں تھا۔ فیروز خان نون کے بیان کے مطابق ''1910ء سے 1919ء تک پنجاب میں لیفٹیننٹ گورنر کی عملداری تھی جن کی مدد کے لئے درجن بھر افراد کی ایک چھوٹی سی مشاورتی کونسل قائم تھی۔ یہ کونسل ملک کے انتہائی وفادار اور خوشحال طبقوں کے معمر لوگوں پر مشتمل تھی جنہوں نے سلطنت برطانیہ کی سیاسی و انتظامی خدمات انجام دی تھیں اور جن کی کوئی سیاسی وابستگی نہ تھی۔ ان کا انتخاب اس لئے نہیں کیا جاتا تھا کہ وہ کوئی خوش گفتار مقرر ہوتے تھے یا انہوں نے یونیورسٹی کی بڑی بڑی ڈگریاں حاصل کی ہوئی تھیں بلکہ ان کے انتخاب یا نامزدگی کا تمام تر معیار یہ تھا کہ وہ عقل سلیم کے مالک ہوتے تھے اور وہ اسے ملک کے مسائل و معاملات میں استعمال کرنے کی اہلیت رکھتے تھے۔ یہ لوگ بڑے خوشحال و باحیثیت ہوتے تھے اور جو لوگ انگریز حکام تک رسائی کے خواہش مند ہوتے یہ ان کی مدد کیا کرتے تھے۔ یہ معززین یونیورسٹی کے گریجوایٹ نوجوانوں کو بطور سیکرٹری ملازم رکھ لیتے تھے جن کے فرائض میں اپنے آقاؤں کی تقریریں لکھنا بھی شامل ہوتا تھا۔ کونسل کے ان معزز ارکان کو جب ایجنڈے کے کسی خاص مسئلے پر اظہار رائے کی دعوت دی جاتی تھی تو وہ اپنے سیکرٹری کی لکھی ہوئی تقریر سنا دیا کرتے تھے۔ ایک بار مجھے کسی نے بتایا کہ لاہور میں میرے ایک رشتہ دار رکن سر عمر حیات ٹوانہ نے جو اپنی تقریر ساتھ لانا بھول گئے تھے پاس بیٹھے ہوئے دوسرے رکن رائے بہادر رام سرن داس کی تقریر کا مسودہ اٹھایا اور اسے فر فر پڑھ کر سنا دیا۔ رام سرن داس بہت سٹپٹائے

لیکن تحمل سے کام لیا اور جب ان کی باری آئی اور لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر نے انہیں اظہار خیال کی دعوت دی تو انہوں نے کہا کہ مجھے اپنے دوست سے کامل اتفاق ہے جنہوں نے ابھی ابھی تقریر ختم کی ہے۔ کونسل کے تمام ارکان آپس میں گہرے دوست تھے اور مکمل ہم آہنگی کے ساتھ کام کرتے تھے۔ یہ دراصل حکومت برطانیہ کے ساتھ وفاداری کا مشترکہ جذبہ تھا جس نے انہیں متحد کر رکھا تھا۔ ایک غیر ملکی حکمران کی خدمت گزاری میں کسی کو ذلت محسوس نہیں ہوتی تھی۔'' 12

میرٹھ کے جاگیردار نواب سر محمد یامین خان کی طرح سرگودھا کے جاگیردار ملک سر فیروز خان نون میں بھی یہ خوبی ہے کہ یہ اپنی اور اپنے آباؤ اجداد کی سامراج نوازی اور عوام دشمنی پر الفاظ کے ہیر پھیر سے کوئی خاص پردہ نہیں ڈالتا۔ تاہم اس نے یہ نہیں بتایا کہ اس کے آباؤ اجداد اور صوبائی کونسل کے ارکان کے آباؤ اجداد نے انگریز حکمرانوں کی کس قسم کی خدمات سرانجام دی تھیں یا انہوں نے برصغیر میں برطانوی اقتدار کو مستحکم کرنے میں کیا کردار ادا کیا تھا۔

1920ء میں پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے نئے انتخابات ہوئے تو اس سے بہت پہلے 26 رمئی 1919ء کو صوبہ کا آمر مطلق لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر اپنے عہدہ سے سبکدوش کیا جا چکا تھا اور اس کی جگہ سر ایڈورڈ میکلیگن گورنر مقرر ہوا تھا۔ یہ انتخابات بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر نہیں ہوئے تھے بلکہ محدود بنیاد پر حق رائے دہندگی دیا گیا تھا۔ تاہم اس میں ایک وسیع انتخابی حلقہ مقرر کیا گیا تھا۔ ہر وہ شخص جو بڑا زمیندار تھا یا چھوٹا مالک اراضی تھا یعنی اوسطاً پانچ ایکڑ رقبہ کا مالک تھا اور اسی طرح وہ تمام لوگ بھی رائے دہی کے مجاز تھے جن کے اپنے مکان تھے اور ان کے کرایہ کی مالیت دو روپے ماہانہ تھی۔ ان چھوٹے بڑے مالکان جائیداد کے لئے تعلیم یافتہ ہونے کی پابندی نہیں تھی۔ ان انتخابات کے بعد جو نئی کونسل وجود میں آئی اس میں 23 سرکاری اور غیر سرکاری نامزد ارکان اور 71 منتخب ارکان تھے۔ انتخاب شدہ ممبروں میں 35 مسلمان، 15 سکھ اور 21 ہندو تھے۔ 35 مسلمانوں میں سے 5 شہری اور 30 دیہاتی حلقوں میں سے آئے تھے۔ گویا 5 تعلیم یافتہ شہری درمیانہ طبقہ کے تھے اور 30 غیر تعلیم یافتہ یا نیم تعلیم یافتہ جاگیردار تھے۔ ان دنوں پنجابی مسلمانوں کی طبقاتی تقسیم کچھ اسی تناسب سے تھی۔ یہ شہری اور دیہاتی ارکان کونسل کسی نوع کی سیاسی جماعت، کسی قسم کے سیاسی نظام یا کسی انداز کے سیاسی پروگرام کے تحت منتخب نہیں ہوئے تھے حالانکہ اس زمانے میں کانگرس، مسلم لیگ، ہندو مہاسبھا، خلافت کمیٹی اور بعض دوسری

سیاسی جماعتیں کم از کم شہری علاقوں میں خاصی بارسوخ تھیں۔ ان ارکان کونسل میں سے ہر شخص صرف اپنی ذات کا ذمہ دار تھا۔ دیہاتی حلقوں کے منتخب ہونے والے ممبر اچھے خوش حال اور بڑے بڑے زمیندار تھے جو زیادہ تر حکومت اور اپنی برادریوں کی تائید وحمایت سے منتخب ہوئے تھے۔

کونسل کی تشکیل کے بعد صوبائی گورنر سر میکلیگن نے حکومت برطانیہ کی عافیت پسندی اور صلح کیشی کی نئی پالیسی کے تحت مسلمانوں میں سے میاں فضل حسین کو وزیر منتخب کیا اور ہندوؤں میں سے لالہ ہرکشن لال کو وزارت میں شامل کیا۔ یہ دونوں شہروں کے بورژوا طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ عاشق حسین بٹالوی کے بیان کے مطابق میاں فضل حسین خاندان، وطنیت، طول قیام، روزگار، تعلیم و تربیت، بودو باش، عادات و اطوار، معیشت و معاشرت، تعلقات و مراسم غرضیکہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو سے دیہاتی نہیں بلکہ شہری تھا۔ وہ 16 را پریل 1919ء کو شملہ گیا تھا تا کہ مرکزی حکومت کو پنجاب کے معاملات میں مداخلت کرنے کی ترغیب دے۔ صوبائی حکومت نے اس کی گرفتاری کے احکام جاری کر دیئے تھے لیکن حکومت ہند کی مداخلت کی وجہ سے یہ واپس لے لئے گئے تھے۔ وہ انڈین نیشنل کانگرس کا ممبر تھا لیکن جب کانگرس نے ترک موالات اور کونسلوں کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا تو اس جماعت سے مستعفی ہو گیا اور پھر اس نے پنجاب لیجسلیٹو کونسل کا انتخاب لڑا جس میں وہ کامیاب ہو گیا۔

لالہ ہرکشن لال کیمبرج کا فارغ التحصیل بیرسٹر تھا لیکن چند سال کی پریکٹس کے بعد اس نے وکالت ترک کر کے صنعت و حرفت کا پیشہ اختیار کر لیا تھا اور اب اس پیشے میں وہ ہندوستان کے کامیاب ترین آدمیوں میں شمار ہوتا تھا۔ اس نے بھارت انشورنس کمپنی کے نام سے پنجاب میں پہلا دیسی بینک قائم کیا تھا۔ لاہور الیکٹرک سپلائی کمپنی قائم کر کے لاہور کو پہلی مرتبہ برقی روشنی سے منور کیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ بے شمار کارخانوں، صنعتی اداروں اور اجارہ داریوں کا اور درآمد و برآمد کرنے والی تجارتی فرموں کا مالک تھا۔ سیاسیات میں بھی اس کا پایہ بہت بلند تھا۔ 1909ء میں جب انڈین نیشنل کانگرس کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا تو ہرکشن لال مجلس استقبالیہ کا صدر تھا۔ 1918ء میں وہ انگلستان جانے والے کانگرسی وفد کا رکن تھا۔ مارشل لاء میں اس کو حبس دوام کی سزا ملی تھی اور اس کی تمام جائیداد جس کی مجموعی مالیت ایک کروڑ روپے کے لگ بھگ تھی ضبط کئے جانے کا حکم صادر ہوا تھا۔ دسمبر 1920ء میں گاندھی اور موتی لال نہرو نے اسے ترک موالات

پر آمادہ کرنا چاہا لیکن انجام کار اس نے کونسل میں داخل ہو کر وزارت قبول کر لینے کا فیصلہ کیا۔"[13]

ظفر اللہ خان لکھتا ہے کہ "مجھے بطور وکیل مارشل لاء کے تحت قائم کردہ ٹریبونل کی کاروائی کے دوران لالہ ہرکشن لال کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔ جس کے نتیجے میں میرے دل میں ان کی بڑی عزت قائم ہوگئی۔ باقی ملزمان کے ساتھ وہ بھی عدالت میں لائے جاتے۔ خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ جاتے، جیب سے کتاب نکال کر پڑھنا شروع کر دیتے۔ عدالت کی کاروائی کی طرف قطعاً متوجہ نہ ہوتے نہ کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار کرتے۔ کاروائی ختم ہونے پر باقی ملزمان کے ساتھ اٹھ کر چلے جاتے۔ ان کے چہرے پر کسی وقت بھی کوئی آثارِ پریشانی یا ملال دیکھنے میں نہ آتے۔ جہاں تک آپ کا تعلق تھا ایسے معلوم ہوتا کہ عدالت کی تمام کاروائی ایک کھیل ہے جس میں انہیں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں اور وہ اسے تضیع اوقات تصور کرتے تھے۔"[14]

سید نور احمد کا بیان ہے کہ "ہنٹر کمیشن کے روبرو سرکاری افسروں پر جرح کرنے والے وکلا کی کمیٹی کا دفتر اس زمانے کی "صنعت کاری کے بادشاہ" لالہ ہرکشن لال کی کوٹھی میں قائم تھا۔ یہ کوٹھی اب فاطمہ جناح میڈیکل کالج کی صورت میں تبدیل ہو چکی ہے۔ یہیں جرح کا وہ گولہ بارود تیار ہوتا تھا جس سے مسلح ہو کر کمیشن کے ہندوستانی ممبر سرکاری گواہوں پر تابڑ توڑ جرح کرتے تھے۔ اس سلسلے میں پنجاب کے شہریوں کا مقدمہ لڑنے کے لئے تمام خرچ لالہ ہرکشن نے ادا کیا۔ وہ خود مارشل لاء کے قیدی رہے اور مارشل لاء ٹریبونل سے پھانسی کی سزا پانے کے بعد عام معافی کے تحت رہا ہوئے تھے۔"[15]

ان دونوں منتخب وزرا یعنی فضل حسین اور ہرکشن لال کے علاوہ دو ایگزیکٹو کونسلر تھے۔ ایک آئی۔سی۔ایس کا سب سے سینئر انگریز اور دوسرا سر سندر سنگھ مجیٹھیہ جسے کابینہ میں سکھوں کو نمائندگی دینے کی غرض سے نامزد کیا گیا تھا۔

گورنر میکلیگن کی طرف سے میاں فضل حسین اور لالہ ہرکشن لال کو نئے آئین کے تحت صوبائی وزارت میں شامل کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ایسے حالات میں جبکہ کانگرس اور خلافت کمیٹی کی ترک موالات کی تحریک نے آگ لگا رکھی تھی شہری عوام کے اشتعال پذیر سیاسی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے ان دونوں سے بہتر آدمی نہیں مل سکتے تھے۔ یہ دونوں وزیر قابلیت، مستقل مزاجی، سیاسی فہم و فراست اور کردار کی مضبوطی کے لحاظ سے صوبے کا بہترین انتخاب

تھے۔ دونوں کی سیاسی تربیت کانگرس کے گہوارے میں ہوئی تھی اور دونوں نے سراسر ذاتی کوشش اور محنت سے دنیوی عروج حاصل کیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ صوبہ کے مسلم اور غیر مسلم جاگیرداروں میں سے جو ارکان کونسل منتخب ہوئے تھے ان میں سے تعلیم یافتہ ارکان کی تعداد بہت ہی کم تھی۔ میاں شاہنواز اور ملک فیروز خان نون جیسے جو دو چار تعلیم یافتہ جاگیردار کونسل کے رکن منتخب ہوئے تھے، ان کے نامہ اعمال میں سیاسیات کا خانہ بالکل خالی تھا۔ میاں شاہ دین کا 1918ء میں انتقال ہو چکا تھا اور میاں محمد شفیع جولائی 1919ء میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر بن چکا تھا۔ عاشق حسین بٹالوی لکھتا ہے کہ ''پنجاب کونسل کے دیہاتی مسلمان ممبروں کو اس وقت یہ راز معلوم نہیں تھا کہ وزارت سازی کی اصل طاقت ان کے ہاتھ میں ہے۔ ان میں سے اکثر انگریزی نہیں جانتے تھے۔ سیاسیات میں ان کا منبع علم بہ منزلہ صفر تھا۔ سرکار کا ہوا ان کے دل و دماغ پر ہر وقت چھایا رہتا تھا۔ صوبہ کا گورنر تو بڑی چیز ہے ضلع کا ڈپٹی کمشنر ان کا کعبہ مقصود اور قبلۂ حاجات تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ لاٹ صاحب بہادر نے اظہار خوشنودی فرما کر میاں فضل حسین کے سر پر تاج وزارت رکھ دیا ہے تو انہوں نے پوری عقیدت سے اس آستانۂ عالیہ پر اپنی جبین نیاز جھکا دی۔''[16] اس طرح جنوری 1921ء میں پنجاب میں جو پہلی قدرے بااختیار وزارت بنی وہ سراسر شہری بورژوا تھی جو جاگیرداروں کے ساتھ طبقاتی تضاد کی حامل تھی۔ تاہم جاگیردار فی الوقت اس کے اطاعت گزار تھے۔

اس بورژوا وزارت کی تشکیل برطانوی سامراج کے اس وقت کے مفاد کے مطابق ہوئی تھی۔ 1919ء کے مارشل لاء کے بعد صوبہ کے شہروں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کو وقتی طور پر مطمئن کرنا ضروری تھا لیکن بعض فرعون مزاج انگریز افسروں کو یہ تبدیلیٔ حالات پسند نہ آئی اور وہ مستعفی ہو کر چلے گئے۔ ان میں دو آدمی زیادہ نمایاں تھے۔ ایک چیف سیکرٹری جے۔ پی۔ ٹامسن اور دوسرا ہائی کورٹ کا جج ہنری جونز۔ یہ دونوں اٹھارہویں صدی کی سامراجی ذہنیت کے حامل تھے۔ ان کے لئے اپنے طور پر دیسی وزیروں کا وجود قابل برداشت نہیں تھا۔ فیروز خان نون لکھتا ہے کہ ''برطانوی حکومت کا انحصار بنیادی طور پر ڈپٹی کمشنر پر تھا۔ بالخصوص 1900ء سے 1920ء تک کے زمانہ میں جسے میں برطانوی اقتدار کا دور شباب کہوں گا، ڈپٹی کمشنر اپنے ضلع میں ایک چھوٹا سا بادشاہ ہوتا تھا۔ جب وہ گھوڑا لے کر دورے پر نکلتا تو علاقہ کے معززین اپنے اپنے

گھوڑوں پر سوار دوسرے علاقے کی سرحد تک اس کے پیچھے پیچھے چلتے تھے..... کسی آدمی کو اگر ڈپٹی کمشنر کے ساتھ چلنے کی اجازت ملتی تو یہ گویا اس کے لئے عین سعادت ہوتی تھی۔ ورنہ کسی شخص کو یہ مجال نہ تھی کہ ڈپٹی کمشنر کے ہمرکاب دورے پر نکلے۔ ضلع کے بڑے لوگ ڈپٹی کمشنر کے اردلی کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے تا کہ جب وہ ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کے لئے جائیں تو ان کے ساتھ عزت کا سلوک کیا جائے..... اس زمانہ میں لاہور کا چیف سیکرٹری بہت بڑی شخصیت ہوتا تھا وہ تمام ڈپٹی کمشنروں پر حکم چلاتا تھا اور ان کے تبادلوں کا فیصلہ کرتا تھا۔ صوبہ کی تمام سرکردہ شخصیتیں اکثر و بیشتر (خصوصاً کرسمس کے موقع پر) سلام کرنے کے لئے اس کے در پر حاضری دیتی تھیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں یعنی 1900ء سے 1912ء تک کے عرصہ میں ملازمت کے لئے مقابلہ کے امتحان کا دستور نہیں تھا۔ ملازمین کے تقرر کا تمام تر انحصار انگریز کی خوشنودی پر تھا اور وہ بالعموم انہی خاندانوں سے نوجوانوں کا انتخاب کرتے تھے جو ان کے وفادار ہوتے تھے۔ اس طرح تمام محکموں کے عہدوں کو ایسے نوجوانوں سے پر کیا جاتا تھا جن کی وفاداری انگریز کے نزدیک لائق اعتماد تھی..... معززین چیف سیکرٹری اور دوسرے افسروں کے ہیڈ اردلیوں کو باقاعدہ بخشیش دیتے تھے اور ان کے بخشیش گزاروں میں سب سے زیادہ پابند میری والدہ کے ماموں سر خدا بخش تھے..... انہوں نے مجھے بتایا کہ چیف سیکرٹری کے ساتھ ملاقات ہو یا نہ ہو لیکن وہ ان کے اردلی کو ہر سال 50 روپے بخشیش ضرور دیتے تھے۔“[17]

باب: 3

تحریکِ خلافت مسلم درمیانے طبقے کی جذباتیت

تحریکِ خلافت کے محرکات

جب میاں فضل حسین کی زیر سرکردگی پنجاب میں 1919ء کے نئے آئین کے تحت پہلی وزارت قائم ہوئی تو اس وقت کانگرس، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے دسمبر 1920ء کے فیصلے کے مطابق عدم تعاون یا ترک موالات کی تحریک زوروں پر تھی۔ یہ تحریک ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اور بعض دوسرے مسلمان لیڈروں کی جذباتی سیاست اور اُن کی اس زمانے کے بین الاقوامی حالات سے عدم واقفیت اور گاندھی کی مکاری وعیاری کی پیداوار تھی۔ محمد علی جناح اور میاں فضل حسین وغیرہ نے اس تحریک کی بنا پر کانگرس سے علیحدگی اختیار کر لی تھی کیونکہ ان کی رائے یہ تھی کہ اس غیر حقیقت پسندانہ تحریک کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ بلاشبہ اس تحریک میں مسلمانوں کے ابھرتے ہوئے درمیانہ طبقہ کی سامراج دشمنی کا پہلو نمایاں تھا لیکن ان کا پان اسلام ازم کا نعرہ اس قدر کھوکھلا تھا کہ اس کے بارآور ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

گاندھی نے اس تحریک کے لئے جو سات نکاتی پروگرام مرتب کیا تھا وہ یہ تھا کہ (1) خطابات اور اعزازی عہدے ترک کر دیئے جائیں گے اور لوکل باڈیز کے نامزد ارکان مستعفی ہو جائیں گے۔ (2) حکومت کے استقبالیوں اور درباروں کے علاوہ ان سرکاری تقریبات میں شرکت سے انکار کیا جائے گا جو سرکاری حکام منعقد کریں گے یا کوئی اور ان کے اعزاز میں منعقد کرے گا۔ (3) ان سکولوں اور کالجوں سے بچوں کو آہستہ آہستہ نکال لیا جائے گا جو حکومت کی ملکیت ہوں گے یا جنہیں حکومت کی طرف سے امداد ملتی ہوگی یا جو حکومت کے کنٹرول میں ہوں گے۔ ان سکولوں اور کالجوں کی جگہ مختلف صوبوں میں قومی سکول اور کالج کھولے جائیں گے۔ (4)

وکلاء اور مقدموں میں ملوث افراد رفتہ رفتہ برطانوی عدالتوں کا بائیکاٹ کریں گے۔ ان عدالتوں کی جگہ پرائیویٹ ثالثی عدالتیں قائم کی جائیں گی جو پرائیویٹ تنازعات کا تصفیہ کریں گی۔ (5) جزیرۃ العرب کے لئے فوج، دفتری بابوؤں اور محنت کشوں کی نفری میں بھرتی ہونے سے انکار کیا جائے گا۔ (6) نئی کونسلوں کے انتخابات میں کوئی امیدوار کھڑا نہیں ہوگا اور اگر کوئی شخص کانگرس کی ہدایت کی خلاف بطور امیدوار کھڑا ہوا تو رائے دہندگان ووٹ دینے سے انکار کر دیں گے۔ (7) بدیشی اشیاء کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔ دیسی کپڑے کے فروغ کے لئے ہر گھر میں چرخہ کاتنے کی ترغیب دی جائے گی۔

برصغیر کے مسلمانوں میں برطانوی سامراج کے خلاف اس قسم کے عدم تعاون کے جذبات دراصل ستمبر 1911ء سے ہی پیدا ہو رہے تھے جبکہ اٹلی نے سلطنت عثمانیہ کے صوبہ طرابلس پر قبضہ کر لیا تھا اور پھر برطانیہ کے بادشاہ نے بال گنگا دھر تلک کی زیر قیادت پر تشدد سودیشی تحریک کے سامنے گھٹنے ٹیک کر تقسیم بنگال کے فیصلے کو منسوخ کر دیا تھا۔ جب اکتوبر 1912ء میں بلقان کی چار ریاستوں مونٹی نیگرو، سربیا، بلغاریہ اور یونان نے ترکی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا اور انگریزوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر مصر میں دخل اندازی شروع کر دی تھی تو ہندوستان کے مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کے جذبات اور بھی زیادہ مجروح ہوئے تھے چنانچہ انہوں نے ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں ایک میڈیکل مشن ترکوں کی امداد کے لئے ترکی بھیجا تھا۔ یہ مشن وہاں کوئی خاص خدمات سرانجام نہیں دے سکا تھا اور اس کے ارکان وہاں کے اندرونی حالات سے دل شکستہ اور مایوس ہو کر واپس لوٹے تھے۔ مئی 1913ء میں بلقان کی جنگ ختم ہوئی تو سلطنت عثمانیہ ان چاروں بلقانی ریاستوں سے محروم ہو چکی تھی۔ ابن سعود ترکوں کو کویت، خلیج فارس اور اومان کے علاقوں سے بیدخل کر چکا تھا اور برطانیہ کی عالمگیر سلطنت کے لئے روس کی بجائے جرمنی ایک زبردست خطرے کی صورت میں ابھرا تھا۔ 1905ء میں جاپانیوں کے ہاتھوں عبرتناک شکست کھانے کے بعد اس وقت تک روس کے حوصلے بہت پست ہو چکے تھے اور اس نے بظاہر ہندوستان کے بارے میں اپنے توسیع پسندانہ عزائم وقتی طور پر ترک کر دیئے تھے۔

4 راگست 1914ء کو پہلی عالمگیر جنگ شروع ہوئی تو اس سے تقریباً چھ ماہ قبل ترکی اور جرمنی میں فوجی معاہدہ ہو چکا تھا۔ انور پاشا ترکی کا وزیر جنگ تھا اور اس نے اکتوبر 1913ء میں

ہی جرمنی کے ساتھ فوجی معاہدے کی بات چیت شروع کر دی تھی۔ اس وقت تک اگرچہ ترکی طرابلس کے علاوہ بلقان کی ریاستوں سے محروم ہو چکا تھا لیکن ایشیائے کوچک، آرمینیہ، عراق، شام، فلسطین اور عرب پر مشتمل سات لاکھ مربع میل کا علاقہ ابھی تک اس کے زیرنگیں تھا اور برطانیہ اور فرانس کی نظریں اس زوال پذیر جاگیردارانہ سلطنت عثمانیہ کے اس وسیع وعریض علاقے پر لگی ہوئی تھیں۔ زارروس 1853ء میں ہی ترکی کو ''یورپ کا مرد بیمار'' قرار دے چکا تھا لیکن اس کے جاں بحق ہونے میں دیر محض اس لئے لگی تھی کہ برطانیہ اور فرانس کے عالمی مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ ''مرد بیمار'' کو روس کے قاتلانہ حملے سے بچایا جائے۔

خلافتی رہنماؤں کی غیر حقیقت پسندانہ جذباتی سیاست

ہندوستان میں ابوالکلام آزاد اور محمد علی جوہر جیسے درمیانہ طبقہ کے لیڈر اپنے ''تبحر علمی'' کے باوجود ان بین الاقوامی حالات سے بے خبر معلوم ہوتے تھے۔ بظاہر انہیں یہ شعور ہی نہیں تھا کہ ان کے پان اسلام ازم اور ہندوستانی قوم پرستی کے درمیان تضاد ہے اور یہ تضاد محض کھوکھلے نعروں سے حل نہیں کیا جا سکتا۔ وہ صرف لچھے دار اور جذباتی تحریروں اور تقریروں کے ماہر تھے۔ وہ اس حقیقت سے نا آشنا تھے کہ ترکوں کی جاگیردارانہ استبدادی سلطنت اندرونی طور پر کھوکھلی ہو چکی ہے اور اس کے عوام الناس میں سخت بے چینی پائی جاتی ہے۔ سلطان عبدالحمید دوم اپنی رعایا کے لئے ترقی پسندانہ سیاسی، معاشرتی اور معاشی اصلاحات کرنے کی بجائے محض دقیانوسی ملاؤں کی تائید وحمایت پر انحصار کرتا تھا۔ پان اسلام ازم اور تحفظ خلافت کی کھوکھلی تحریک اسی کے فیصلے کے مطابق شروع کی گئی تھی۔ جنگ کے دوران ان مسلمان لیڈروں کے علاوہ بہت سے سامراج دشمن ہندوؤں اور سکھوں کو بھی یہ یقین تھا کہ انگریزوں کو شکست ہوگی اور جرمنی فتح یاب ہوگا۔ چنانچہ ان میں سے بعض لیڈروں نے 1915ء میں کابل میں آزاد ہندوستان کی ایک عبوری حکومت بھی قائم کر لی تھی جس کا صدر راجہ مہندر پرتاپ تھا اور وزیراعظم مولوی برکت اللہ تھا۔ عبیداللہ سندھی بھی اسی مکتب فکر سے تعلق رکھتا تھا چنانچہ اس نے روس کے علاوہ ترکی اور جرمنی کے سفارت کاروں سے رابطہ پیدا کیا تھا اور 15 رمارچ 1915ء کو گاندھی نے کلکتہ میں طلبا کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''سیاست کو مذہب سے الگ نہیں کیا جا سکتا'' اور ''اگر میں بغاوت کے حق

میں ہوتا تو میں اس کا اظہار کرتا۔ میں با آواز بلند سوچتا اور پھر اس کے نتائج برداشت کرتا۔"[1]
سکھوں اور پٹھانوں نے اس دوران میں نمایاں طور پر مسلح جدوجہد کی تھی مگر اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔ مئی ۔ جون 1916ء میں عربوں نے انگریزوں کی امداد سے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی اور حجاز کا حکمران شریف حسین اس بغاوت کا سرغنہ تھا۔ اسے یہ تاثر دیا گیا تھا کہ جب جنگ ختم ہو گی تو اسے عالم اسلام کا خلیفہ مقرر کیا جائے گا۔ لیکن جب 11 رنومبر 1918ء کو جنگ عظیم ختم ہوئی تھی تو جرمنی کے علاوہ سلطنت عثمانیہ کے پرخچے اڑ چکے تھے اور مشرقی وسطیٰ میں برطانیہ کی ایک نئی سلطنت وجود میں آ چکی تھی۔

اس صورت حال کے پیش نظر دسمبر 1918ء میں دہلی میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس کی صدارت اے۔ کے۔ فضل الحق نے کی۔ اس اجلاس میں ہندوستان کے دوسرے فرقوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ خلافت عثمانیہ کے تحفظ کے لئے مسلمانوں کی امداد کریں۔ تحفظ خلافت کی یہ قرارداد ڈاکٹر انصاری نے پیش کی تھی۔ جناح نے اس قرارداد کی مخالفت کی تھی اور اس بنا پر سیشن سے واک آؤٹ کیا تھا۔ اسی سیشن میں محمود الحسن کی زیر سرکردگی علمائے ہند کی ایک سیاسی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ ہوا۔ مارچ 1919ء میں دہشت پسندوں یا انقلابیوں کی سرکوبی کے لئے رولٹ قوانین منظور ہوئے اور اسی مہینے کے اواخر میں ان استبدادی قوانین کے خلاف تحریک شروع ہوئی اور 13 اپریل کو جلیاں والے باغ کے حادثہ خونیں کے بعد پنجاب میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ ستمبر کے اوائل میں برطانیہ کے وزیر خارجہ ارل گرے نے اعلان کیا کہ "جرمنی کو انصاف مل گیا ہے۔ ترکی کے ساتھ اس سے سخت انصاف ہوگا۔" اس بیان کے پیش نظر 19 ستمبر کو لکھنؤ میں مختلف مکاتب فکر کے مسلمان لیڈروں کا ایک اجتماع سر ابراہیم ہارون جعفر کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ جس میں ایک آل انڈیا خلافت کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس کا صدر بمبئی کا سیٹھ چھوٹانی اور سیکرٹری بمبئی کا حاجی محمد صدیق کھتری مقرر ہوا۔ اس تنظیم کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ترکوں کی خلافت عثمانیہ جو جنگ عظیم کے خاتمہ پر نزع کے عالم میں تھی، کی جان بچائی جائے۔ چنانچہ خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام پہلے تو 27 اکتوبر کو یوم خلافت منایا گیا اور پھر اس نے اس سلسلے میں عملی اقدامات پر غور کرنے کے لئے 23 نومبر کو دہلی میں مسلمان اور ہندو لیڈروں کی ایک کانفرنس بلائی۔ اس کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کا صدر ایک کانگرسی لیڈر آصف علی تھا اور اس کے ایجنڈے میں تحفظ خلافت کے ساتھ

گئو رکھشا (گائے کا تحفظ) کا مسئلہ بھی شامل کیا گیا تھا۔ جب کانفرنس کا اجلاس گاندھی کی زیر صدارت منعقد ہوا تو اس کی تجویز کے مطابق گئو رکھشا کا مسئلہ ایجنڈے سے خارج کر دیا گیا۔ اس کی اس تجویز کی بنیاد بظاہر اس مؤقف پر تھی کہ برصغیر کے ہندو، مسلمانوں کے مذہبی مسئلہ خلافت کی غیر مشروط اور مکمل حمایت کریں گے۔ مسلمان لیڈر جو فیصلہ کریں گے ہم اس کا پورا ساتھ دیں گے۔

دسمبر 1919ء میں حکومت برطانیہ کی جانب سے نئی اصلاحات کے اعلان کے تقریباً ایک ہفتہ بعد امرتسر میں کانگرس، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے اجلاس ہوئے۔ کانگرس نے اپنے اجلاس میں نئی اصلاحات کو قبول کرنے کا فیصلہ کیا لیکن مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی نے عدم تعاون کا فیصلہ کیا اور یہ بھی طے کیا کہ وائسرائے اور حکومت برطانیہ کو خلافت عثمانیہ کے بارے میں ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات سے آگاہ کرنے کے لئے وفود بھیجے جائیں گے۔ چونکہ 31ردسمبر 1919ء کو علی برادران، محمد علی جوہر اور شوکت علی، چار سال کی نظر بندی کے بعد رہا ہوئے تھے اس لئے جب وہ جیل سے سیدھے امرتسر پہنچے تو ان کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ علی برادران نے اپنے روایتی جوش و خروش سے امرتسر کے اجلاس میں شرکت کی۔ مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے ہر فیصلے میں ان کی رائے کو بہت دخل تھا۔ محمد علی جوہر نے اپنی تقریر میں خلافت کے تحفظ کے لئے ہر قربانی دینے کے عزم کا اعادہ کیا۔ اس نے کہا کہ ”خدا کے برگزیدہ نبی نے ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ یہود و عیسائیوں کو جزیرہ عرب سے نکال باہر کر دو۔ اس حکم کی تعمیل ہم پر فرض ہے۔ وہ بیت المقدس جسے مسلمانوں نے اپنا خون بہا کر فتح کیا تھا اور جس پر اب تک خلیفۃ المسلمین کا اقتدار تھا ہم اس پر اغیار کا قبضہ ہرگز رہنے نہیں دیں گے..... توحید کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو ایک مانا جائے۔ اس کی غلامی کی جائے اس کے گھر کی حفاظت کی جائے۔ شعائر اسلام کی نگہداشت کی جائے۔ یہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کی بجا آوری کے سلسلے میں اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ میری نظر میں اپنی ماں اور بیوی کی حرمت سے اس کی عزت زیادہ ہے۔ میں جان اور متاع اس پر نثار کرنے کو تیار ہوں۔“[2] بلاشبہ اس تقریر میں قابل قدر مذہبی جذبے کا نہایت پرجوش الفاظ میں اظہار کیا گیا تھا لیکن اس تقریر کا اس زمانے کے بین الاقوامی حقائق سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ برطانیہ کی صنعتی سلطنت نے دسمبر 1917ء میں بیت المقدس پر قبضہ کرنے کے بعد عراق، شام اور مصر کو بھی اپنے زیر نگیں کر لیا تھا۔ ہندوستان کے محکوم و مجبور مسلمان محض جوشیلی

تقریروں اور بددعاؤں کے ذریعے مشرق وسطیٰ میں برطانیہ کا اقتدار ختم نہیں کر سکتے تھے۔ مزید برآں عرب ممالک کے حکمران طبقے انگریزوں کی غلامی کو ترکوں کی غلامی پر ترجیح دیتے تھے۔ حرمین شریفین کا پاسبان شریف حسین ترکوں کے خلاف عربوں کی بغاوت کا سرغنہ تھا۔ وہ خود انگریزوں کی مدد سے خلیفۃ المسلمین بننے کا خواب دیکھ رہا تھا اور یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کے بیٹوں کو برطانوی سامراج کے زیر سایہ عراق و شام کی مملکتیں مل جائیں۔

امرتسر میں خلافت کمیٹی کے اس فیصلے کے مطابق 19 رجنوری 1920ء کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ایک وفد نے ڈاکٹر انصاری کی قیادت میں وائسرائے چیمسفورڈ سے ملاقات کی اور خلافت اور مقامات مقدسہ کے بارے میں مسلمانان ہند کا نقطۂ نظر پیش کیا۔ وائسرائے نے اظہار ہمدردی کرتے ہوئے واضح کیا کہ ترکی کی قسمت کا فیصلہ صرف انگلستان کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ فرانس اور دیگر یورپی ممالک کو بھی اس فیصلے میں دخل حاصل ہوگا۔ چنانچہ ایک دفد محمد علی جوہر کی قیادت میں فروری 1920ء میں یورپ گیا۔ اس وفد نے تقریباً 9 ماہ تک پیرس، لندن اور دیگر یورپی صدر مقامات پر خلافت کے مسئلہ اور مقامات مقدسہ کے تحفظ کے بارے میں ہندی مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کر کے رائے عامہ ہموار کرنے کی کوشش کی لیکن وفد کو کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ برطانیہ کے وزیر اعظم لائیڈ جارج کا جواب یہ تھا کہ عربوں نے ترکوں سے جو آزادی حاصل کی ہے انہیں اس سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس پر وفد نے تجویز پیش کی کہ خلافت المسلمین کے ماتحت ترکوں اور عربوں کی فیڈریشن بنا دی جائے مگر حکومت برطانیہ کے لئے یہ تجویز بھی قابل قبول نہیں تھی اور لائیڈ جارج نے یہ بھی یقین نہیں دلایا تھا کہ ترکی زبان بولنے والے علاقے کے حصے بخرے نہیں کئے جائیں گے۔[3] حالانکہ محمد علی جوہر کے وفد کی یورپ کے لئے روانگی سے قبل 20 رجنوری 1920ء کو خلافت کمیٹی کی تحریک پر مسلمان اور ہندو لیڈروں کی ایک اور کانفرنس ہوئی تھی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ گاندھی نے حکومت برطانیہ سے ہمہ گیر عدم تعاون کے لئے جو سات نکاتی پروگرام مرتب کر رکھا ہے اس پر عمل کیا جائے گا۔

اس کانفرنس میں ابوالکلام آزاد نے بھی شرکت کی تھی جو حکومت برطانیہ کے عام معافی کے اعلان کے مطابق 30 ردسمبر 1919ء کو رانچی جیل سے رہا ہو چکا تھا۔ وہ برصغیر کی سیاست کی سٹیج پر جون 1912ء میں نمودار ہوا تھا جبکہ اس نے خلافت عثمانیہ کے تحفظ اور پان اسلام ازم کی تبلیغ

کے لئے کلکتہ سے ایک ہفتہ وار اخبار ''الہلال'' جاری کیا تھا۔ اس ہفت روزہ کی تحریروں پر ایک نظر ڈالی جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ جدید تعلیم سے بہرہ ور یہ نوجوان ان دنوں بین الاقوامی حالات سے کس قدر بے خبر تھا اور یہ اپنی انشا پردازی کے ذریعے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مشتعل کر کے انہیں کس طرف لے جا رہا تھا۔ بلاشبہ اس کی تحریروں میں اس کی سامراج دشمنی نمایاں تھی اور بظاہر یہ عالمگیر اسلامی اخوت و یگانگت کے بارے میں بھی مخلص تھا لیکن ان تحریروں میں سیاسی بالغ نظری اور حقیقت پسندی کا نام و نشان نہیں ہوتا تھا۔ یہ ترکی کے ان دقیانوسی ملاؤں کی طرح ماضی پرست تھا جو سلطنت عثمانیہ کی تباہی و بربادی کا باعث بنے تھے اور اس کی سیاست کا سرچشمہ محض اس کی لچھے دار تحریریں اور تقریریں ہوتی تھیں۔ 1915ء میں ''الہلال'' بند کر دیا گیا تو اس نے ''البلاغ'' کے نام سے ایک اور ہفت روزہ جاری کر لیا تھا۔ لیکن برطانوی سامراج اس کے اس ہفت روزہ کے وجود کو بھی برداشت نہ کر سکا چنانچہ اسے اپریل 1916ء میں کلکتہ سے بیدخل کر دیا گیا۔ وہاں سے یہ صوبہ بہار کے شہر رانچی پہنچا تو اسے وہاں نظر بند کر دیا گیا جہاں سے 30/دسمبر 1919ء کو اس کی رہائی عمل میں آئی۔ جب یہ 20/جنوری 1920ء کو پہلی مرتبہ گاندھی سے ملا تو یہ اس کی ''سیاسی بصیرت و فراست'' سے بہت متاثر ہوا حالانکہ اس نے تحفظ خلافت کے بارے میں درمیانہ طبقہ کے مسلمان لیڈروں کے غیر حقیقت پسندانہ مطالبہ کی تائید و حمایت محض اس لئے کی تھی کہ وہ کانگرس کی زیر سرپرستی ہندو۔ مسلم اتحاد قائم کرنے کے اس ''سنہری موقع'' کو ہاتھ سے نہیں گنوانا چاہتا تھا۔ ابوالکلام آزاد کے بقول ''لوکمانیہ'' بال گنگا دھر تلک بھی، جو انتہائی تنگ نظر اور قدامت پسند احیائی ہندو تھا، اس مطالبہ کا حامی تھا۔[4] چنانچہ محمد علی جوہر گاندھی کی اس ''مسلمان نوازی'' سے اس قدر متاثر و مغلوب ہوا کہ اس نے کچھ عرصہ بعد گاندھی کو ''پیغمبر'' کا درجہ دے دیا۔ خلافت کانفرنس کے دو دن بعد دہلی میں علماء کی کانفرنس ہوئی جس میں مفتی کفایت اللہ کو صدر اور مولوی احمد سعید کو سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ اگلے ماہ یعنی فروری 1920ء کو امرتسر میں علماء کی پہلی میٹنگ ہوئی جس کے ایک اجلاس کی صدارت مولوی عبدالباری اور دوسرے اجلاس کی صدارت مولوی محمود الحسن نے کی جو اس وقت مالٹا سے رہا ہو کر واپس ہندوستان آ گیا تھا۔

20/فروری 1920ء کو کلکتہ میں ابوالکلام آزاد کی زیر صدارت ایک اور خلافت کانفرنس ہوئی جس میں گاندھی کے مجوزہ پروگرام کے مطابق عدم تعاون یا ترک موالات کی

تحریک چلانے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ بھی طے ہوا کہا اس مقصد کے لئے یوم خلافت منایا جائے گا۔ 10 رمارچ کو میرٹھ میں خلافت کانفرنس ہوئی تو گاندھی نے پہلی مرتبہ ایک پبلک پلیٹ فارم سے عدم تعاون کی تحریک کا پرچار کیا۔ اس نے کہا کہ ''انگلستان ہم سے توقع نہیں کرسکتا کہ ہم ان حقوق کی غیر منصفانہ سلبی پر مؤدبانہ طور پر سر تسلیم خم کردیں گے جو مسلمانوں کے لئے زندگی وموت کے مسئلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔'' ابوالکلام آزاد نے بھی اپنی تقریر میں گاندھی کے اس مؤقف کی پرزور تائید وحمایت کی۔

مئی 1920ء کے اوائل میں یونان نے صلیبی پرچم بلند کرکے مسیحیت کے نام پر ترکی پر حملہ کردیا جبکہ خلافت عثمانیہ کا شیرازہ بالکل بکھر چکا تھا۔ 14 رمئی 1920ء کو اتحادی طاقتوں نے معاہدہ سیورے کے تحت ترکی کی قسمت کا فیصلہ سنا دیا۔ اس فیصلے سے سلطان ترکی کا مقامات مقدسہ اور جزیرۃ العرب پر اقتدار تو بحال نہ ہوا البتہ یہ طے ہوا کہ خالص ترکی آبادی والے علاقوں کو بھی مختلف طاقتوں میں بانٹ دیا جائے گا۔

20 رفروری 1920ء کے فیصلے کے مطابق 28 رمئی 1920ء کو یوم خلافت منایا گیا جس کے نتیجہ میں بمبئی اور الہ آباد وغیرہ میں متعدد گرفتاریاں عمل میں آئیں۔ 2 رجون کو الہ آباد میں آل پارٹیز کانفرنس ہوئی جس میں گاندھی اور بعض مسلمان لیڈروں پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کرکے اسے یہ ہدایت کی گئی کہ وہ تحفظ خلافت کا لائحہ عمل مرتب کرے۔

22 رجون کو خلافت کمیٹی کی جانب سے وائسرائے کو متنبہ کیا گیا کہ اگر یکم اگست تک ترکی کے ساتھ کی گئی بے انصافیوں کا ازالہ نہیں کیا جائے گا تو عدم تعاون کی تحریک شروع کردی جائے گی۔ یکم جولائی کو گاندھی نے بھی وائسرائے کو اسی مضمون کا نوٹس دے دیا اور اس کے بعد اس نے کانگرسی لیڈروں کو یہ ترغیب دینا شروع کی کہ وہ تحفظ خلافت کی تحریک میں خلافت کمیٹیوں سے تعاون کریں۔ اس مقصد کے لئے اس نے برصغیر کے متعدد علاقوں کا تقریباً ایک ماہ تک دورہ کرکے خلافت کمیٹی کے نصب العین کی تائید وحمایت کی۔

جب 10 راگست 1920ء کو سلطان ترکی نے معاہدہ سیورے پر دستخط کردیئے اور اس بنا پر خود ترکی میں سلطان اور قوم پرستوں کے درمیان افتراق پیدا ہوگیا تو گاندھی کی تحریک پر 8 رستمبر 1920ء کو کلکتہ میں کانگرس کا سپیشل سیشن ہوا جس میں اس کے عدم تعاون کے پروگرام پر

غور کیا گیا۔ گاندھی کی تقریر یہ تھی کہ سوراج اور خلافت کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے عدم تعاون یا ترک موالات کی تحریک ضروری ہے۔ ابوالکلام آزاد کے بیان کے مطابق اس خصوص سیشن کا صدر لالہ لاجپت رائے اور سی۔ آر۔ داس، گاندھی کے پروگرام کے خلاف تھے اور بنگالی لیڈر بپن چندر پال کو بھی عدم تعاون کا پورا پروگرام قبول نہیں تھا وہ صرف برطانوی مال کے بائیکاٹ کے حق میں تھا۔ تاہم ان سب کی مخالفت کے باوجود عدم تعاون کی تحریک چلانے کی قرارداد منظور ہو گئی۔''[5] ڈاکٹر امبید کر کا بیان یہ ہے کہ گاندھی کی اس قرارداد کے حق میں 1886 ووٹ ڈالے گئے اور مخالفت میں 884 ووٹ تھے۔ قرارداد کے حق میں ووٹ دینے والوں کی اکثریت کلکتہ کے ٹیکسی ڈرائیوروں کی تھی جنہیں اس مقصد کے لئے پیسے دیئے گئے تھے۔[6] اس قرارداد کے مطابق عدم تعاون کی جو تحریک چلائی جانے والی تھی اس کے ذریعے بیک وقت سوراج اور خلافت کے مسائل حل کرنے مقصود تھے۔ خلافت کے ساتھ سوراج کے نصب العین کو بپن چندر پال کے اصرار پر نتھی کیا گیا تھا۔

اُدھر ابوالکلام آزاد اور علی برادران وغیرہ اپنی غیر حقیقت پسندانہ جذباتی سیاست سے اس قدر مغلوب تھے کہ انہیں سوراج اور خلافت میں کوئی تضاد نظر نہیں آتا تھا وہ پان اسلام ازم اور قوم پرستی میں کوئی فرق نہیں دیکھتے تھے۔ ان کی سیاسی کوتاہ اندیشی اور بے بصیرتی اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ کانگرس کے اس سیشن سے قبل جمیعت العلمائے ہند کے سیکرٹری مولوی عبدالباری نے یہ فتویٰ صادر کر دیا تھا کہ انگریزوں کے ماتحت ہندوستان دارالحرب ہے اس لئے مسلمانوں کو یہاں سے ہجرت کر دینی چاہیے۔

نومبر 1920ء میں الہ آباد میں خلافت کمیٹی کی ایک میٹنگ میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا تو محمد علی جوہر نے عبدالباری کے فتوے کی حمایت میں زوردار تقریر کی اور پھر اس کے حق میں بھاری اکثریت سے ایک قرارداد منظور کی گئی۔ جبکہ مسلمانوں کے ادنیٰ درمیانہ طبقہ کے تقریباً 18 ہزار نیم تعلیم یافتہ افراد اس سے پہلے صرف اگست کے مہینے میں ہی معاہدہ سیورے پر دستخط ہونے کے بعد اپنا سب کچھ بیچ باچ کر اپنے اہل وعیال کے ہمراہ عازم کابل ہو گئے تھے۔ جب وہ اس برادر اسلامی ملک کی سرحد پر پہنچے تو انہیں سرحد پر ہی روک دیا گیا تھا اور ان خانماں برباد مہاجرین کو افغانستان میں رہنے کی اجازت نہ دی گئی تھی لہٰذا انہیں ذلیل وخوار ہو کر واپس اپنے گھروں کو آنا پڑا

تھا اور راستے میں ان میں سے بہت سے لوگ فاقہ کشی اور مختلف امراض میں مبتلا ہو کر جاں بحق ہو گئے تھے۔ مذہبی جذبے سے مغلوب ہو کر مصائب برداشت کرنے والے ان مہاجروں میں سندھ اور سرحد کے رہنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔ مگر جمیعت العلمائے ہند کا مولوی عبدالباری یا کوئی اور بڑا فتویٰ باز مولوی ان کی مصیبتوں میں شریک نہیں تھا۔ ان جبہ پوش ملاؤں کا کام صرف یہ تھا کہ وقتاً فوقتاً نا قابل عمل فتوے صادر کر کے سادہ لوح عامۃ المسلمین کو مختلف قسم کے مصائب و مشکلات میں مبتلا کرتے رہتے تھے جبکہ خود کسی گوشۂ عافیت میں بیٹھ کر حلوہ کھاتے تھے۔ ایسے ہی کوتاہ اندیش اور قدامت پسند ملاؤں نے سلطنت عثمانیہ کو تباہ و برباد کیا تھا کیونکہ وہ مذہب کے نام پر ہمیشہ اس کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی ترقی کی راہ میں حائل ہوتے تھے۔ دراں حالیکہ یورپ کے ممالک ہمہ گیر ترقی کی راہ پر تیزی سے گامزن تھے اور ان کی صنعتی و فوجی قوت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ بعض لوگوں کا بیان یہ ہے کہ ہجرت کا خیال سب سے پہلے ابوالکلام آزاد نے پیش کیا تھا۔[7]

ایک غیر سرکاری اندازے کے مطابق مولویوں کے اس فتوے کی بنا پر جن لوگوں نے تحریک ہجرت میں حصہ لیا تھا ان کی تعداد 5 لاکھ سے 20 لاکھ تھی۔[8] افغانستان میں رہنے کی اجازت نہ ملنے کی وجہ سے ان کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ اب وہ نہ ادھر کے رہے تھے اور نہ ادھر کے۔ وہ افغانستان میں نہیں رہ سکتے تھے لیکن اگر واپس اپنے گھروں کو جاتے تھے تو ان کے پاس اب زمینیں نہیں تھیں اور کاروبار بند ہو چکے تھے۔ مہاجرین کی ایک کثیر تعداد خصوصاً بوڑھے، عورتیں اور بچے سفر کی صعوبتیں برداشت نہیں کر سکے تھے اور راستے میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ پشاور سے لے کر کابل تک کی سڑک ان بدنصیب بوڑھوں، عورتوں اور بچوں کی قبروں سے بھر گئی تھی اور جو لوگ واپس اپنے آبائی وطن میں پہنچ گئے تھے ان کی حالت بہت بری تھی۔ ان کے پاس نہ تو کوئی مکان، نہ کوئی پیسہ تھا اور نہ ہی کوئی ذریعۂ روزگار تھا۔ وہ ''دارالحرب'' میں اپنا سب کچھ اونے پونے فروخت کر کے ''دارالسلام'' گئے تھے۔ ملاؤں کی سیاست نے انہیں کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ بالکل تباہ و برباد ہو گئے تھے۔

جناح اور فضل حسین کی تحریک سے لاتعلقی اور گاندھی کی منافقانہ قیادت

دسمبر 1920ء میں ناگپور میں کانگرس کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں مسلمان مندوبین

کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اس اجلاس میں گاندھی کا عدم تعاون کا پروگرام زیر بحث آیا تو ابوالکلام آزاد کے بیان کے مطابق لالہ لاجپت رائے اور سی۔آر۔داس، جو کانگرس کے ستمبر سیشن میں اس پروگرام کے خلاف تھے، اب کھلم کھلا اس کے حامی بن گئے تھے۔لیکن محمد علی جناح اور فضل حسین نے عدم تعاون کی قرارداد کی مخالفت کی کیونکہ وہ غیر آئینی ذرائع کے خلاف تھے اور اس قرارداد کو ناقابل عمل تصور کرتے تھےلیکن جب ان کی مخالفت کے باوجود یہ قرارداد منظور ہوگئی تو جناح اسی شام بمبئی واپس چلے گئے اور ان کے ساتھ فضل حسین نے بھی کانگرس سے قطع تعلق کرلیا۔ جناح کی رائے یہ تھی کہ گاندھی کے مجوزہ پروگرام سے افراتفری اور تباہی مچے گی اور مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع ہوجائے گی تاہم اس اجلاس کے بعد جمیعت العلمائے ہند کی جانب سے 925 مولویوں کے دستخطوں سے ایک فتویٰ صادر کیا گیا جس میں مسلمانان ہند کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ گاندھی کی مجوزہ پر امن عدم تعاون کی تحریک میں حصہ لیں۔[9] اس طرح موہن داس کرم چند گاندھی تحفظ خلافت کے لئے مسلمانان ہند کا ''امیر المومنین'' بن گیا جبکہ اس نے ''مہاتما'' کی حیثیت سے ہندوؤں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ انہیں ''ایک سال'' کے اندر سوراج حاصل کرکے دے گا۔[10] ہندوؤں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کو خلافت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ تو مسلمانوں کے کاندھوں پر سوار ہوکر سوراج حاصل کرنے کے متمنی تھے جبکہ مسلمان اس تحریک کو پان اسلام ازم کے فروغ کے لئے ایک مذہبی تحریک تصور کرتے تھے۔ مسلمانوں کے اس غیر حقیقت پسندانہ تصور کی معاشی بنیاد یہ تھی کہ ان کے درمیانہ طبقہ میں بے روزگاری روز بروز بڑھ رہی تھی۔ چنانچہ یہ تحریک کچھ عرصہ کے لئے خوب پروان چڑھی اور محمد علی جناح، فضل حسین اور محمد شفیع جیسے قائدین اپنی جدیدیت پسندی کی وجہ سے وقتی طور پر پس پردہ چلے گئے۔

جب جنوری 1921ء میں فضل حسین کی زیر سرکردگی پنجاب وزارت کی تشکیل ہوئی تو اس وقت عدم تعاون کی تحریک اپنے جوبن پر تھی۔ برصغیر کے ان علاقوں میں جو کانگرس کے زیر اثر تھے اس تحریک کا خاصا اثر ہوا تھا۔ ایک نئے کریمینل ایمنڈمنٹ ایکٹ کے ماتحت بے شمار رضاکار گرفتار ہوئے تھے جن میں مسلمانوں کی تعداد خاصی تھی۔ چرخہ کاتنے اور کھدر پہننے کو بھی بہت فروغ حاصل ہوا تھا۔ یو۔پی کے ضلع رائے بریلی میں کسانوں پر گولی چلی تھی۔ لیکن پنجاب میں مقابلتاً سکون رہا تھا۔ نئی کونسل کے انتخابات میں بھی لوگوں نے سرگرمی سے حصہ لیا تھا اور فضل

حسین کی نئی کابینہ کی تشکیل کا بھی خیر مقدم کیا گیا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پنجاب کے درمیانہ طبقہ نے اپریل سے لے کر جولائی 1919ء تک مارشل لاء میں بہت مصائب برداشت کئے تھے اور اب اس میں اتنی جلدی مزید مصیبتیں اٹھانے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اگست 1919ء کے بعد ہزاروں لاکھوں مسلمانوں نے تحریک ہجرت میں جو صعوبتیں برداشت کی تھیں ان کی بنا پر پنجابی مسلمانوں میں تحریک خلافت میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ تیسری وجہ بعض مسلمان عناصر کے اس پروپیگنڈے میں پنہاں تھی کہ گاندھی نے دراصل یہ تحریک مسلمانانِ ہند کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی ترقی کے سدباب کے لئے چلائی ہے۔ اگر مسلمانوں نے اس میں حصہ لیا تو 1857ء کے ''غدر'' کے بعد سرسید احمد خان کی کوششوں سے مسلمانوں نے جو تھوڑی بہت تعلیمی ترقی کی ہے وہ بالکل اکارت جائے گی اور ہر لحاظ سے پسماندہ مسلمان اور بھی پسماندہ ہو جائیں گے۔ سرکاری ملازمتوں، تجارت اور صنعت کے شعبوں میں ان کا داخلہ ہمیشہ کے لئے بالکل ہی بند ہو جائے گا۔ گاندھی کو تحفظ خلافت سے کوئی دلچسپی نہیں، اس نے دراصل ہندوؤں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی مفادات کے فروغ کے لئے یہ تحریک چلائی ہے۔ وہ ایک طرف تو انگریزوں کو بلیک میل کرنا چاہتا ہے اور دوسری طرف وہ رجعت پسند ملاؤں کی امداد سے مسلمانوں کے لئے ترقی کے سارے امکانات ختم کر کے انہیں اچھوتوں کا سا درجہ دینا چاہتا ہے۔ مزید برآں وہ اس تحریک کے ذریعے ہندوستان کی سیاست میں بلند ترین مقام حاصل کرنے کا خواہاں ہے تا کہ آنجہانی بال گنگا دھر تلک کی احیائی تحریک کو پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے۔ تاہم مشرقی و وسطی پنجاب کے شہر اس تحریک سے بالکل بے تعلق نہیں رہے تھے۔ بالخصوص ان شہروں کے ''اسلام پسند'' نیم تعلیم یافتہ عناصر سرگرم عمل ہوئے تھے چنانچہ انہیں بھی گرفتار کر کے نظر بند کر دیا گیا تھا۔

کانگرس کے ناگپور سیشن کے بعد علی برادران علی گڑھ گئے اس وقت تک سرسید احمد خان کا قائم کردہ اینگلو محمڈن کالج، مسلم یونیورسٹی بن چکا تھا جس کا وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین تھا۔ علی برادران کی خواہش تھی کہ یونیورسٹی کے ٹرسٹی حکومت سے امداد لینا بند کر دیں مگر ڈاکٹر ضیاء الدین اس پر آمادہ نہ ہوا اور اس نے طلبا کے والدین کو بذریعہ تار متنبہ کر دیا تھا کہ وہ اپنے بچوں کو عدم تعاون کی تحریک کا شکار ہونے سے بچائیں۔ تاہم خلیق الزماں کے بیان کے مطابق

تقریباً ایک سو طلبا علی برادران کی ترغیب پر یونیورسٹی سے نکل آئے اور انہی طلبا پر مشتمل علی گڑھ میں ہی ایک نئی یونیورسٹی جامعہ ملّیہ کی بنیاد رکھی گئی۔ محمد علی جوہر شیخ الجامعہ مقرر ہوا اور ڈاکٹر عالم کو اس کا پرنسپل بنایا گیا۔ خلیق الزماں اس نئی یونیورسٹی کے ابتدائی ٹرسٹیوں میں شامل تھا۔ نواب یامین خان لکھتا ہے کہ نا گپور سیشن کے بعد جب علی برادران علی گڑھ پہنچے تھے تو ان کے ہمراہ گاندھی بھی تھا اور وہ علی گڑھ کا خاتمہ کرنا چاہتا تھا۔'' چونکہ یہ دونوں بھائی طالب علموں میں بہت ہر دلعزیز تھے۔ ان کا بڑا اثر ہوا اور چند نادانشمند لوگ ان کے ساتھ ہو گئے۔ مسٹر گاندھی سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ پہلے بنارس ہندو کالج کو کیوں نہیں توڑتے، اس کا جواب دیا کہ اس پر مدن موہن مالویہ جی تیار نہیں اور یہاں شوکت علی، محمد علی کو اعتراض نہیں ہے۔ چند مسلمانوں نے کہا کہ آپ کا حملہ مسلمانوں پر ہے۔ مگر لڑکوں میں خلافت کی وجہ سے اشتعال پیدا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر ضیاالدین مرحوم نے کالج کو بچالیا ورنہ کالج اور مسلم قوم کا خاتمہ تھا۔ ڈاکٹر ضیاالدین کو ایسے موقع پر بہت عمدہ تدبیر سوجھی تھی۔ انہوں نے کالج کی چھٹی کر کے کالج بند کر دیا۔ لڑکے جانا نہیں چاہتے تھے اس کی تدبیر یہ کی گئی کہ لڑکوں کے والدین کو تار دیئے گئے کہ وہ لڑکوں کو آن کر لے جائیں اور ڈائننگ ہال بند کرنے کا نوٹس جاری کر دیا۔ لڑکے مجبوراً گھروں کو گئے لیکن شوکت علی محمد علی دونوں ڈاکٹر صاحب سے سخت ناراض ہو گئے اور مرتے وقت تک دونوں ناراض رہے۔ خواجہ عبدالمجید بیرسٹر اور ان کے چند ساتھیوں نے کالج کے چند اساتذہ کو اور کچھ طلبا کو اشتعال دے کر ایک کالج علیحدہ بنایا جو خواجہ مجید کے بنگلے میں قائم ہوا اور اس کا نام جامعہ ملیہ رکھا گیا۔ یہ نئی بات نہ تھی خواجہ مجید کے بزرگوں نے سید احمد خان سے خفا ہو کر ایک کالج اور بنایا تھا۔ جامعہ ملیہ عرصہ تک محمڈن کالج کا اور یونیورسٹی کا مخالف رہا پھر (1925ء میں) دلی منتقل ہو گیا۔ بہت سے مسلمان نوجوان لوگوں نے سرکاری ملازمتیں مثلاً ڈپٹی کلکٹری، ڈپٹی سرنٹنڈنٹ شپ پولیس، سپرنٹنڈنٹ شپ ڈاکخانہ جات وغیرہ سے استعفیٰ دے دیا۔ یہ کام جوش میں کر گئے مگر بعد میں بہت پچھتائے اور دھکے کھاتے پھرے۔ گاندھی نے ذرا سے چرکے میں مسلمانوں کو بیس سال پیچھے ڈال دیا اور جو ترقی سرسید کی پالیسی پر چلنے سے اور ان کے بعد نواب محسن الملک اور نواب وقارالملک کی قیادت میں کی تھی وہ سب کچھ عرصہ کے لئے درہم برہم ہو گئی اور مسلمان پھر ہندوؤں سے تعلیم میں اس قدر پیچھے ہو گئے جتنے پچاس سال پیشتر تھے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین نے اپنے اوپر سارے حربے کا بوجھ

لے لیا اور قوم کی کشتی کو بھنور میں ڈوبنے سے بچالیا۔"[11]

فرقہ وارانہ تضادات کی شدت میں اضافہ

چونکہ تحریک خلافت کی نوعیت سراسر مذہبی تھی اور یہ مذہبی نعرے کے تحت ہی جاری کی گئی تھی اس لئے اس کے ابتدائی مراحل میں ہی نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشیدگی کے آثار نظر آنے لگے تھے بلکہ مسلمانوں کے دو بڑے فرقوں شیعوں اور سنیوں میں بھی ناگزیر طور پر تناؤ پیدا ہو گیا تھا۔ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو یہ شکایت تھی کہ علی برادران اور دوسرے مسلمان مذہبی لیڈر اپنی تقریروں میں قرآن وحدیث کے حوالے دے کر نہ صرف مسلمانوں کو عیسائیوں اور دوسرے سارے کافروں کے خلاف جہاد کی تلقین کرتے تھے بلکہ وہ ہندوستان سمیت ساری دنیا میں اسلام کو سربلند کرنے کے عزم کا اظہار کرتے تھے۔

وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ہوم ممبر سر ولیم ونسنٹ کی اطلاع کے مطابق علی برادران مذہب کا نام لے کر بڑی اشتعال انگیز تقریریں کرتے تھے۔ یامین خان لکھتا ہے کہ "16راپریل 1920ء کو شوکت علی نے ایک تقریر میں کہا کہ امیر افغانستان جولڑائی لڑ رہے ہیں وہ ترکوں کی حمایت میں لڑ رہے ہیں اور اپنی سلطنت کو مقامات مقدسہ اور خلافت کے واسطے قربان کرنے کا تہیہ کر چکے ہیں اور افغان مشن جو ہندوستان آیا وہ یہ متنبہ کرنے آیا تھا کہ انگریز مقامات مقدسہ میں مداخلت نہ کریں۔ اسی مہینہ (اپریل 1920ء) میں شوکت علی نے بریلی میں کہا کہ اگر افغان یا ترک ہندوستان پر اس وجہ سے حملہ کریں گے کہ خلافت کا بدلہ لیں تو ہم ان کا ساتھ دیں گے۔ 11 راکتوبر کو مرادآباد میں محمد علی جوہر نے اپنی تقریر کے دوران یہ کہا کہ "ہم کو غلامی کا سبق ملا ہے۔ مگر انگریزوں کی غلامی بدترین غلامی ہے۔ گاندھی جی مجھے معاف کریں گے اگر میں یہ کہوں گا کہ میرا مذہب مجھ کو بتاتا ہے کہ جیسے کہ پیغمبر صاحب نے جنگ اُحد کے وقت تلوار کھینچی تھی میں بھی تلوار کھینچوں۔" اس نے 16راکتوبر کو شاہ جہاں پور میں کہا کہ "مسلمانوں کے پاس ایک چارہ کار رہ گیا ہے کہ وہ بھی وہی قوت استعمال کریں جو ان کے خلاف استعمال ہوتی ہے، اس کا نام جہاد ہے۔ یعنی وہ جہاد جس کا سبق مہاتما گاندھی نے دیا ہے۔" 17راکتوبر کو بریلی میں اس نے کہا کہ "جب ہم کو سارے انگریزوں کو مارنا ہو گا تو ہم خفیہ طور پر حملہ نہیں کریں گے۔ بلکہ اس دن اعلانیہ

کہہ دیں گے کہ اب تلواروں سے لڑائی ہے اور یہ اس وقت تک میان میں نہ جائے گی جب تک تمہاری گردن یا ہماری گردن نہ کٹ جائے گی" اور پھر اس نے 27 / مارچ 1921ء کو شاہ جہاں پور میں کہا کہ "خدا ظالم کو روک دے گا۔ لیکن اگر ظالم کے ہاتھ نہ رکے اور ہمیں تلوار نیام سے باہر کرنا پڑی تو کیا ہرج ہے لیکن جب اس ظالم سے لڑنے کا وقت آئے گا جو تشدد کرتا ہے تو ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہم کو تلوار باہر کرنی ہوگی۔ کوئی شخص میرے منہ کو اس میں پتھر بھر کر بند نہیں کر سکتا۔" 20 / نومبر کو شوکت علی نے اسی قسم کے الفاظ جھانسی میں استعمال کئے: "خدانخواستہ اگر ہمارے غرور کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے نان کوآپریشن تحریک فیل ہوئی تو مسلمان یا تو اس ملک کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں گے یا ملک میں خون بہا دیں گے اور اس کو تباہ کر دیں گے۔" 29 / نومبر کو پھر یہی کہا کہ "میں مسلمانان ہند سے کہوں گا کہ اگر نان کوآپریشن فیل ہو تو تمہارا آخری ذریعہ ہے کہ تلوار کھینچو۔"[12]

شیعوں کا موقف یہ تھا کہ چونکہ وہ عقیدۂ ادارۂ خلافت کے خلاف ہیں اس لئے انہیں اس تحریک میں شامل ہونے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ شیعوں اور سنیوں کے درمیان یہ تضاد دراصل اورنگ زیب کے زمانے میں ہی شدید ہو گیا تھا لیکن بیسویں صدی میں تحریک خلافت کے دوران انگریزوں نے اس تاریخی تضاد سے فائدہ اٹھا کر ان دونوں مذہبی فرقوں کے درمیان اختلافات کی خلیج مزید وسیع کر دی تھی۔ برطانوی سامراج کے عالمی مفاد کا تقاضا یہی تھا اور اسے ایسا ہی کرنا چاہیے تھا۔ چنانچہ یامین خان لکھتا ہے کہ "انگریزوں کی جانب سے پہلے تو مدن موہن مالویہ اور بنارس ہندو کالج کو آلۂ کار بنا کر ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالی گئی اور نفرت کا بیج بویا گیا۔ پھر مسلمانوں کی یک جہتی کو اس طرح توڑا گیا کہ چند شیعہ تعلقہ داران اودھ سے کہا گیا کہ تم سلطان ترکی کو خلیفہ کیوں مانتے ہو جبکہ وہ سنت الجماعت ہے اور تم شیعہ ہو۔ شاہ ایران شیعہ ہے لہٰذا تم اس کو مانو اور شیعہ تنظیم کر کے ترکی ٹوپی چھوڑ دو اور کالی ٹوپی مثل ایرانیوں کی ٹوپی کے پہنو اور اس کا نام شیعہ کیپ رکھو۔ تعلقہ دار تو گورنمنٹ کے پٹھو تھے انہوں نے اپنی وفاداری کا پورا ثبوت دیا اور مسلمانوں کے دو ٹکڑے کر دیئے اور شیعہ تعلیم یافتہ طبقہ شیعہ کیپ اوڑھنے لگا اور ترکی ٹوپی اتار پھینکی۔ یہ پالیسی اس وقت اختیار کی گئی جب لارڈ کرزن نے خلیج فارس کا سفر کیا اور ترکی اور ایران میں کشیدگی اس لئے پیدا کرائی گئی تھی کہ انگریز ایران کا اقتدار ختم کر کے اپنا رسوخ

پھیلائیں تو ترکی ایران کی مدد پر نہ آئے۔''[13] نواب یامین خان کا یہ مؤقف بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ کانگرسی لیڈروں کا تھا یعنی یہ کہ ہندو۔مسلم تضاد کی کوئی حقیقی بنیاد نہیں تھی، یہ صرف انگریزوں کی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کی پیداوار تھا۔حقیقت یہ تھی کہ شیعوں اور سنیوں کے درمیان تضاد کا ایک طویل تاریخی پس منظر تھا۔ یہ تضاد انگریزوں کی پیداوار نہیں تھا انہوں نے تو اس پرانے تضاد سے فائدہ اٹھایا تھا۔

9,8 اور 10ر جولائی 1921ء کو کراچی میں محمد علی جوہر کی صدارت میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی جس میں تقریباً پانچ ہزار مندوبین نے شرکت کی۔اس کانفرنس میں بعض ایسی قراردادیں منظور کی گئیں جو عملاً حکومت برطانیہ کے خلاف اعلان جنگ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ان میں سامراج دشمنی کا قابل تعریف جذبہ تو واقعی بہت نمایاں تھا لیکن یہ سیاسی فراست اور دور اندیشی سے بالکل عاری تھیں۔بعض قراردادوں کا خلاصہ یہ تھا کہ (1) یہ کانفرنس خلیفۃ المسلمین سلطان ترکی سے مسلمانان ہند کی وفاداری کا اعلان کرتی ہے اور اسے یقین دلاتی ہے کہ مسلمان اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے جب تک وہ خلافت کے متعلق اپنے مطالبات منظور نہیں کروالیں گے۔(2) جب تک مسلمان خلافت اسلامیہ، جزیرۃ العرب اور مقامات مقدسہ کا وقار بحال نہیں کریں گے جو کہ مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے وہ نہ امن سے بیٹھیں گے اور نہ ہی یہ مسئلہ اسلام کے دشمنوں کے ہاتھوں میں رہنے دیں گے۔(3) یہ کانفرنس تحریک ہجرت کے قائد جان محمد کی وفات پر اظہار تعزیت کرتی ہے اور سندھ کے ان مسلمانوں کو مبارکباد دیتی ہے جو اپنے مذہب اور ملک کی خاطر جیل میں گئے ہیں۔امید ہے کہ ان کی مساعی بارآور ہوں گی۔(4) یہ کانفرنس غازی مصطفٰے کمال پاشا اور انگورا کی حکومت کو اسلام کے قوانین کو سربلند کرنے کی کوشش پر مبارکباد پیش کرتی ہے اور دعا کرتی ہے کہ یہ بہت جلد ترکی کی سلطنت کے کونے کونے سے ساری غیر ملکی فوجوں کو باہر نکال دیں۔مزید برآں یہ کانفرنس واضح طور پر اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں کے لئے برطانوی فوج میں رہنا یا دوسروں کو اس میں بھرتی ہونے کی ترغیب دینا مذہباً حرام ہے۔تمام مسلمانوں اور بالخصوص علماء کا فرض ہے کہ وہ اس مذہبی حکم کو فوج میں ہر مسلمان تک پہنچائیں۔(5) اگر برطانوی حکومت نے انگورا کی حکومت کے خلاف بلا واسطہ، کھلم کھلا یا خفیہ فوجی کارروائی کی تو مسلمانان ہند قانون شکنی پر مجبور ہو جائیں گے اور کانگرس سے مل کر ایک آزاد ''جمہوریہ ہندوستان'' کے قیام کے

لئے تحریک سول نافرمانی شروع کردیں گے۔(6) تمام صوبائی، ضلعی اور دیہی کمیٹیوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ خلافت کے ایک کروڑ ارکان بھرتی کریں اور سونا اور مہاجرین کے لئے 40لاکھ روپے چندہ جمع کریں۔(7) سندھ کے پیروں اور زمینداروں سے پرزور اپیل کی جاتی ہے کہ وہ تحریک خلافت میں پہلے سے زیادہ دلچسپی لیں۔ پیروں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے مریدوں کو ایسا کرنے کا حکم دیں۔

اس قرارداد سے صاف ظاہر ہے کہ تحریک خلافت نے مسلمانانِ ہند کے لئے علی برادران کی زیر قیادت ایک خالصتاً مذہبی تحریک کی صورت اختیار کرلی تھی اور یہ پرُامن نہیں رہ سکتی تھی اور اس وجہ سے یہ ہندوؤں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے مفاد کے منافی تھی۔ انہوں نے تو گاندھی کی وساطت سے اس تحریک کی حمایت محض انگریزوں کو بلیک میل کرنے کے لئے کی تھی۔ ان کا مقصد یہ تو نہیں ہوسکتا تھا کہ وہ اسلام کی عالمگیر قوت کی حیثیت سے احیاء کی کوشش میں مسلمانان ہند کی امداد کریں۔ چنانچہ ڈاکٹر امبیدکر کے بیان کے مطابق سوامی شردھانند اور پنڈت مدن موہن مالویہ کو یہ خطرہ لاحق ہوگیا تھا کہ اگرچہ تحریک خلافت کی ابتدا اینٹی برٹش تحریک کی صورت میں ہوئی تھی لیکن یہ اینٹی ہندو تحریک بن جائے گی کیونکہ مسلمانوں کے علماء اپنی تقریروں میں قرآن کی جن آیات کا حوالہ دیتے تھے وہ کافروں کے خلاف جہاد کے متعلق تھیں لیکن گاندھی کہتا تھا کہ یہ قرآنی حوالے دراصل برٹش بیوروکریسی کے خلاف ہیں۔ انہیں ہندوؤں کے خلاف استعمال نہیں کیا جائے گا۔ کراچی کانفرنس کے فوراً بعد محمد علی جوہر اور خلافت کمیٹی کے چھ دوسرے لیڈروں کو گرفتار کرلیا گیا۔ ان کے خلاف ستمبر میں مقدمہ چلا تو محمد علی جوہر نے عدالت میں جو بیان دیا اس سے یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ اگرچہ تحریک خلافت برصغیر کے قدامت پسند مسلمان لیڈروں کی سیاسی بے بصیرتی اور بین الاقوامی حالات سے ان کی عدم واقفیت کا نتیجہ تھی لیکن جہاں تک محمد علی جوہر کا تعلق تھا وہ خلافت کے تحفظ کو فی الحقیقت مذہبی فریضہ تصور کرتا تھا اور اس مقصد کے لئے وہ ہر قربانی دینے پر آمادہ تھا۔ اس کے تاریخی عدالتی بیان کا ماحصل یہ تھا کہ ''اگر کوئی بیرونی مسلم طاقت ہوس ملک گیری کی خاطر ہندوستان پر حملہ آور ہو تو میں اس کی مزاحمت کروں گا لیکن اگر وہ تحفظ خلافت کے مقصد کی خاطر برطانیہ کے خلاف جہاد کرے اور اس سلسلے میں برطانیہ کے مقبوضہ علاقہ ہندوسان پر حملہ کرے تو میرے لئے نہ صرف اس کے خلاف لڑنا حرام ہے بلکہ

پوری قوت کے ساتھ اس کی مدد کرنا میرا فرض ہے۔" اس پر محمد علی جوہر اور اس کے ساتھیوں کو دو سال قید با مشقت کا حکم سنایا گیا۔ سزا پانے والوں میں شوکت علی اور سیف الدین کچلو بھی شامل تھے۔

خلافت عثمانیہ کا خاتمہ اور قوم پرست ترکوں کا اقتدار

جب علی برادران کی زیر قیادت متذکرہ قرارداد منظور کی گئی تھی اس سے قبل سلطنت عثمانیہ کا نام و نشان مٹ چکا تھا اور ترکی بولنے والے علاقوں کی نحیف و نزار حکومت بھی زندگی و موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ حرمین شریفین کے پاسبان شریف حسین کو کرنل لارنس کی امداد سے ترکوں کے خلاف کامیاب بغاوت کا انعام ملا تھا کہ اس کے ایک بیٹے امیر فیصل کو جزیرۃ العرب یا عراق کا بادشاہ بنا دیا گیا تھا اور دوسرے بیٹے امیر عبداللہ کے تحت شرق اردن کی ایک نئی مملکت قائم کی گئی تھی۔ فلسطین انگریزوں کے زیر انتداب آ چکا تھا اور شام پر فرانسیسیوں نے قبضہ کر کے اسے شام و لبنان کی دو مملکتوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ شمالی افریقہ میں ترکی سلطنت کے علاقوں پر فرانس، اٹلی، اسپین اور برطانیہ کا قبضہ تھا۔ سلطان ترکی نے اگست 1920ء میں معاہدہ سیورے پر دستخط کر دیئے تھے جس کے ماتحت بحیرہ روم کے جزیروں کے علاوہ سمرنا پر پانچ سال کے لئے یونان کے قبضہ کو تسلیم کر لیا گیا تھا اور عراق، شام، فلسطین اور حجاز کو اس طرح کی "آزادی" دی گئی تھی کہ اول الذکر تین ممالک فرانس اور برطانیہ کے زیر انتداب رہیں گے۔ کردستان کو خود مختاری دی گئی تھی اور قبرص پر انگریزوں کے تسلط کو مان لیا گیا تھا۔ خدیو مصر نے ترکوں کی اطاعت ختم کر دی تھی اور یہ ملک انگریزوں کے "تحفظ" میں آ گیا تھا۔ ترکی کو کوئی فوج رکھنے کی ممانعت کر دی گئی تھی البتہ اسے تقریباً 50 ہزار سرحدی پولیس رکھنے کی اجازت تھی علاوہ بریں سلطان اپنے باڈی گارڈز بھی رکھ سکتا تھا۔ بالفاظ دیگر اس شرمناک معاہدے کے تحت ترکی 440000 مربع میل کے علاقے سے محروم ہو گیا تھا جس کی آبادی تقریباً ایک کروڑ بیس لاکھ تھی۔ ایران میں فوج کے ایک ادنیٰ افسر رضا خان نے انگریزوں کی امداد سے عنان اقتدار سنبھال لی تھی اور وہ ملک کا وزیر اعظم بن گیا تھا۔ مزید برآں انگریزوں نے نجد کے حکمران ابن سعود کو بادشاہ تسلیم کر کے اسے ساٹھ ہزار پونڈ سالانہ امداد دینے کا اس شرط پر وعدہ کیا تھا کہ وہ حجاز، عراق اور شرق اردن پر حملہ نہیں کرے گا۔

اس صورت حال کے پیش نظر ترکی کے جواں سال قوم پرستوں نے مصطفےٰ کمال پاشا

کی زیر سر کردگی سلطنت عثمانیہ کی بحالی کا خیال ترک کر کے اپنی قومی آزادی کی جدوجہد کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے نہ صرف سارے محب الوطن عناصر پر مشتمل ایک قومی اتحاد قائم کیا تھا بلکہ انہوں نے پہلے اکتوبر 1920ء میں فرانس کے ساتھ اور پھر مارچ 1921ء میں سوویت یونین کے انقلابی سربراہ حکومت وی۔ آئی۔ لینن کے ساتھ افغانستان کے وسیع المشرب حکمران امیر امان اللہ خان سے دوستی کے معاہدے کئے تھے۔

علی برادران کی سادہ لوحی اور ہندو بورژوا کی مفاد پرستی

ہندوستان میں علی برادران ہنوز خلافت المسلمین، جزیرۃ العرب اور مقامات مقدسہ کے تحفظ کے لئے ہوا میں تلواریں چلا رہے تھے۔ بظاہر انہیں امید تھی کہ وہ سندھ کے بڑے بڑے جاگیرداروں اور پیروں کی امداد سے یہ کارنامہ سرانجام دے دیں گے۔ انہوں نے انگریزوں کی فوج میں شمولیت کو مذہباً حرام قرار دینے کے بارے میں جو قرارداد منظور کی تھی اس پر پنجاب اور برصغیر کے دوسرے علاقوں کے مسلمانوں نے عمل نہیں کیا تھا البتہ نواب یامین کے بیان کے مطابق تقریباً 950 مولویوں نے اس کی تائید میں ایک فتویٰ صادر کیا تھا جو حکومت نے ضبط کر لیا تھا اور رام گوپال کے کہنے کے مطابق آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے جولائی کے اواخر میں بمبئی میں ایک قرارداد کے ذریعے کراچی کانفرنس کے مؤقف کی تائید وحمایت کی تھی کیونکہ کمیٹی کی رائے میں ہر شخص کو سول اور ملٹری ملازمتیں ترک کرنے کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرنے کا حق حاصل تھا لیکن اس کے ساتھ ہی کمیٹی نے کانگرس سے تعلق رکھنے والے سارے لوگوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ یکم اگست سے غیر ملکی کپڑے کا استعمال بند کر دیں اور درآمدی تاجروں کو مشورہ دیا تھا کہ وہ غیر ملکی کپڑے کی درآمد کے آرڈر منسوخ کر دیں۔ اس قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ علی برادران اور ان کے ساتھیوں کو تو اس خلافت کے تحفظ کی فکر دامن گیر تھی جس کا وجود ہمیشہ کے لئے ختم ہو چکا تھا لیکن گاندھی اور اس کے ساتھیوں کو احمد آباد اور بمبئی میں پارچہ بافی کے کارخانوں کے ہندو مالکان کا مفاد عزیز تھا جن کا کپڑا بازار میں لنکا شائر اور جاپان کے کپڑے کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ 5 ر اکتوبر کو کانگرس کی مجلس عاملہ نے بھی کراچی کی خلافت کانفرنس کی تائید کی اور لوگوں کو ہدایت کی کہ وہ 16 ر اکتوبر کو پبلک جلسوں میں محمد علی جوہر کی تقریر کا اعادہ کریں۔ چنانچہ ہزاروں جلسوں

میں یہ تقریر پڑھی گئی۔

''مہاتما'' گاندھی کی طرف سے مسلمانوں کے کوتاہ اندیش اور رجعت پسند مذہبی پیشواؤں کی حوصلہ افزائی کرنے کا ایک نتیجہ تو یہ نکلا کہ بلا مبالغہ لاکھوں مسلمان ہجرت کرنے اور جیلوں میں جانے کے باعث خانماں برباد ہو گئے جبکہ ان کے لئے جس نصب العین کا تعین کیا گیا تھا وہ سراسر غیر حقیقت پسندانہ اور ناممکن الحصول تھا۔ دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ پورے برصغیر میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے مذہبی جذبات برانگیختہ ہو گئے اور پھر ان کے درمیان مذہب کی بنا پر فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا بلکہ ڈاکٹر امبید کر کے بقول ایک ایسی فرقہ وارانہ خانہ جنگی شروع ہو گئی جو بالآخر برصغیر کی تقسیم کا باعث بنی۔ گاندھی پہلی جنگ عظیم کے دوران جنوبی افریقہ سے آکر برصغیر کے افق سیاست پر اس وقت نمودار ہوا تھا جبکہ ہندوؤں کا سب سے بڑا احیائی لیڈر ''لوکمانیہ'' بال گنگادھر تلک لندن گیا ہوا تھا۔ پھر گاندھی نے تحفظ خلافت کے نام پر عدم تعاون کی یہ تحریک اس وقت شروع کی تھی جبکہ تلک لندن سے واپس آکر سورگباش ہو چکا تھا۔ اس نے برصغیر میں قیادت کے خلا کو پر کرنے کے لئے یہ ڈرامہ کھیلا تھا جو بہت خونریزی کے ساتھ انجام پذیر ہوا۔

کلکتہ، احمد آباد اور بمبئی کے ہندو صنعت کاروں نے اس سلسلے میں گاندھی کی امداد محض اس لئے کی تھی کہ تلک کے مرنے کے بعد سودیشی تحریک چلانے والا اور کوئی لیڈر باقی نہیں رہا تھا۔ انہیں ایک ایسے لیڈر کی ضرورت تھی جو ''لوکمانیہ'' تلک کی طرح مذہب کو سیاست کے ساتھ نتھی کر کے ان کے مفادات کو فروغ دے سکے۔ یہ ہندو بورژوا عناصر سیاسی طور پر بہت تنگ نظر وتنگدل تھے۔ اگر انہوں نے یورپ کے بورژوا انقلاب سے کوئی سبق سیکھا ہوتا تو وہ اپنی سیاست میں مذہب کو شامل نہ ہونے دیتے۔ برطانوی سامراج کی مزاحمت کے لئے بورژوا قوم پرستی کا ناقابل تسخیر قلعہ مذہب کی بنا پر تعمیر نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے ایک طرف تو ہندوؤں کے رام جیون کی پشت پناہی کر کے اور دوسری طرف مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں کی حوصلہ افزائی کر کے انگریزوں کو یہ سنہری موقع فراہم کیا تھا کہ وہ ہندوستان میں دیرینہ ہندو۔ مسلم تضاد سے فائدہ اٹھا کر اپنے اقتدار کو طول دے سکیں۔ بورژوا جمہوری انقلاب یا سوراج کی منزل پر مذہب کے راستے سے نہیں پہنچا جا سکتا تھا۔ یہ راستہ بڑا دشوار گزار اور خاردار تھا اور اس میں خون خرابہ ناگزیر

تھا۔محمد علی جناح کو گاندھی سے سب سے بڑی شکایت ہی یہ تھی کہ اس نے مذہب کے دھوئیں سے ہندوستان کی سیاسی فضا کو مکدر کر دیا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مذہب کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی نے مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں کو بطور سیاسی جماعت منظم ہونے کی آشیر بادد دی تھی۔ اس نے ''تحفظ خلافت'' کے لئے عدم تعاون کا جو پروگرام بنایا تھا نو سو سے زائد ملاؤں نے ایک فتویٰ میں اس کی تائید کی تھی۔ جبکہ محمد علی جناح گوپال کرشن گوکھلے اور سی۔آر۔داس جیسے وسیع القلب ہندو بورژوا لیڈروں کو پسند کرتے تھے۔ ان کو گاندھی کی منافقانہ ''مہاتمائیت'' سے سخت نفرت تھی۔جس رفتار سے کانگرس پر گاندھی کا غلبہ ہوتا چلا گیا اسی رفتار سے جناح کانگرس سے دور ہوتے چلے گئے۔ گاندھی کی زیر سرپرستی تحریک خلافت کے دوران جناح کی حیثیت محض ایک خاموش تماشائی کی تھی۔انہوں نے مرکزی لیجسلیٹو کونسل کا بائیکاٹ نہیں کیا تھا۔

مالا بار کے موپلہ مسلمانوں کی مسلح بغاوت اور گاندھی کی پریشانی

''امیر المومنین'' موہن داس کرم چند گاندھی کی ''تحفظ خلافت'' کے نام پر ہندو بورژوا طبقے کے مفادات کے فروغ کے لئے چلائی گئی تحریک عدم تعاون کی وجہ سے مذہبی جذبات کی انگیختی کا پہلا مظاہرہ اگست 1920ء میں اور اس کے بعد ہوا تھا جبکہ سندھ، پنجاب اور سرحد کے لاکھوں مسلمان ''دار الحرب'' ہندوستان سے دار السلام'' افغانستان کی جانب ہجرت کی کوشش میں خانماں برباد ہو گئے تھے اور ہزاروں اس دوران میں مرکھپ گئے تھے۔ ہزاروں مسلمانوں نے چھوٹی بڑی سرکاری ملازمتیں ترک کر دی تھیں اور ہزاروں جوشیلے مسلمان طلبا نے اپنی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر لیا تھا۔ دوسرا مظاہرہ اگست 1921ء میں جنوبی ہندوستان میں مالا بار ساحل پر موپلوں کی بغاوت کی صورت میں ہوا۔موپلوں کا یہ جنگی قبیلہ ان عرب سوداگروں کی اولاد تھا جو نویں صدی میں ہندوستان کے جنوبی علاقے میں آ کر آباد ہوئے تھے اور جنہوں نے یہاں مستقل رہائش اختیار کر کے یہاں کی دراوڑ عورتوں سے شادیاں کر لی تھیں۔ یہ لوگ بے زمین کسان اور کھیت مزدور تھے۔ پہاڑوں اور جنگلات میں رہتے تھے۔ جدید تعلیم و تہذیب سے نا آشنا تھے اور طویل عرصے سے انگریزوں کے علاوہ ہندو زمینداروں اور ساہوکاروں کے استحصال کا شکار تھے۔

جب 1920-21ء میں پورے ہندوستان میں تحریک خلافت کا بہت چرچا ہوا اور

ابوالکلام آزاد، محمد علی جوہر اور ان کے ساتھیوں نے برطانیہ کے خلاف ہوا میں تلواریں چلائیں تو موپلوں نے بھی خلافت کے نام پر بغاوت کر دی اور ایک شخص محمد حاجی کی زیر قیادت ''خلافت کی حکومت'' قائم کر لی۔ یہ لوگ اس مقصد کے لئے کئی ماہ سے ہتھیار جمع کر رہے تھے۔ ابھی کراچی کی خلافت کانفرنس کو ہفتہ گزرا تھا کہ مالابار کی مقامی انتظامیہ کو اس امر کی اطلاع ملی۔ چنانچہ پولیس نے تلاشیوں کا سلسلہ شروع کر دیا۔ موپلوں نے مزاحمت کی تو ان کا پولیس سے زبردست تصادم ہوا جس نے بہت جلد ایک عمومی بغاوت کی صورت اختیار کر لی۔ اس بغاوت کے ابتدائی مراحل میں پولیس کو شکست ہوئی تو انگریزوں کی فوج میدان میں آ گئی۔ جب اس فوج نے بھی ابتداً باغیوں کے ہاتھوں ہزیمت اٹھائی اور ایک انگریز فوجی افسر اور ایک پولیس افسر مارا گیا تو پورے علاقے میں لاقانونیت اور بدامنی پھیل گئی۔ جس کے دوران باغیوں نے ایک ریلوے سٹیشن کو جلا دیا۔ ریلوے لائن اکھاڑ دی اور کئی جگہ انگریزی فوج کا بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ انہوں نے اس دوران ان ہندو زمینداروں اور ساہوکاروں سے بھی حساب چکایا جو صدیوں سے ان کا استحصال کرتے چلے آ رہے تھے۔ چنانچہ انگریزوں نے ان کی سرکوبی کے لئے گورکھوں، گڑھوالیوں اور برما سے ان فوجیوں کی کمک منگوائی جو اسلام کے نعرے سے متاثر نہیں ہو سکتے تھے اور جنہیں پہاڑوں اور جنگلوں میں لڑنے کا تجربہ تھا۔ چنانچہ کئی ماہ تک ان سرکاری فوجیوں اور باغیوں میں خونریز جھڑپیں ہوتی رہیں جن میں خاصا جانی نقصان ہوا۔

بالآخر 7 رجنوری 1922ء کو موپلوں کے خلیفۃ المسلمین محمد حاجی کو گرفتار کر لیا گیا اور کورٹ مارشل کے بعد 20 رجنوری کو اسے اور اس کے 21 ساتھیوں کو گولی مار دی گئی۔ تقریباً چھ ماہ کی اس بغاوت کے دوران موپلوں کے 2266 افراد جاں بحق ہوئے 1615 زخمی ہوئے 5688 گرفتار ہوئے اور 38256 نے ہتھیار ڈال دیئے۔ جو باغی گرفتار ہوئے تھے ان میں سے بہت سوں کو فوجی عدالت میں سرسری مقدمات کے بعد گولی مار دی گئی۔ انگریزوں نے اس بغاوت کے خاتمہ کے بعد ان سے انتہائی بربریت کا سلوک کیا تھا جس کی ایک مثال یہ تھی کہ ایک موقع پر تقریباً ایک سو ملزموں کو جانوروں کی طرح مال گاڑی کے ایک بند ڈبے میں مقفل کر کے ایک مقام کی طرف روانہ کر دیا۔ مدراس کی انتہائی گرمی کے زمانے میں یہ لوگ سارا دن ہوا اور دانہ پانی کے بغیر اسی ڈبے میں مقفل رہے۔ شام کو جب قفل کھولا گیا تو 66 ملزم دم گھٹ کر مر چکے تھے اور باقی

موت کے قریب تھے۔

حکومت ہند نے پہلے تو کافی عرصے تک اس بغاوت کے بارے میں کسی کو کچھ پتہ نہ چلنے دیا لیکن جب گورکھوں، گڑھوالیوں اور برما کی فوجوں کی آمد کے بعد یہ مسلح بغاوت اپنے آخری مراحل میں پہنچی تو یکایک اس کی خبروں کی وسیع پیمانے پر اشاعت شروع ہوگئی۔ جس کا مقصد ہندو۔ مسلم تضاد سے فائدہ اٹھا کر تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کو کچلنا تھا۔ یہ اس لئے بھی ضروری تھا کہ نومبر 1921ء میں پرنس آف ویلز کی آمد پر بمبئی میں سخت فساد ہوا تھا اور پولیس اور فوجیوں کو گولیوں سے 53 افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ انگریز سامراجیوں کے نقطۂ نگاہ سے پروپیگنڈا کی یہ پالیسی صحیح تھی۔ وہ خبروں کے لئے کچھ اس قسم کا مواد مہیا کرتے تھے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ موپلوں کی یہ بغاوت دراصل حکومت برطانیہ کے خلاف نہیں تھی بلکہ اس کا رخ ہندو کافروں کی طرف تھا۔ چنانچہ اس دوران سینکڑوں ہندو مارے گئے اور ہزاروں کو جبراً مسلمان بنا لیا گیا۔ لیکن ان خبروں میں یہ نہیں بتایا جاتا تھا کہ جو ہندو موپلوں کی بغاوت کا شکار ہوئے تھے وہ دراصل بڑے زمیندار اور ساہوکار تھے جو صدیوں سے ان کا استحصال کر رہے تھے اور اس بنا پر باغیوں نے اپنا طبقاتی انتقام مذہب کا پرچم اٹھا کر لیا تھا۔ بقول ڈبلیو۔ سی۔ سمتھ ''موپلوں میں بڑی تلخی تھی۔ وہ ہندوؤں کے خلاف تھے، وہ انگریزوں کے خلاف تھے اور وہ ساری دنیا کے خلاف تھے جس نے انہیں دکھ کے سوا اور کچھ نہیں دیا تھا۔ ان کا جذبہ ایک مظلوم طبقے کا جذبہ تھا جو اپنے دشمنوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ان کا جذبہ مذہبی عصبیت کا جذبہ تھا۔ جس نے بدی کو تباہ و برباد کر کے نیکی کی حکومت قائم کرنے کا عزم کیا تھا۔''[14]

اس بغاوت کی ہندوؤں اور انگریزوں کے اخبارات میں کچھ اس طرح حاشیہ آرائی ہوئی کہ پورے ہندوستان کی فضا میں فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوگئی اور جگہ جگہ ہندو۔ مسلم فسادات کا سلسلہ شروع ہوگیا جبکہ موہن داس کرم چند گاندھی نے ایک دم ''امیر المومنین'' کا لبادہ اتار دیا اور پھر اس نے ''مہاتمائیت'' کی سناتنی لنگوٹی پہن کر موپلوں کی ''مذہبی دیوانگی'' کی زوردار الفاظ میں مذمت کی۔ اس نے ہندوؤں کو تلقین کی کہ وہ اپنے مذہب کے تحفظ کے لئے اپنے میں جرأت پیدا کریں اور کہا کہ ''مسلمانوں کی جانب سے موپلوں کی دیوانگی پر جو زبانی ناپسندیدگی کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ ان کی دوستی کا ثبوت نہیں ہے۔ موپلوں نے جبری تبدیلیٔ مذہب اور لوٹ مار کی جو

کارروائیاں کی ہیں مسلمانوں کو اس پر شرم محسوس کرنی چاہیے اور انہیں خاموشی اور مؤثر طریقے سے ایسا کام کرنا چاہیے کہ آئندہ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہ آنے پائے۔'' چونکہ ''مہاتما'' کے اس بیان میں اس حقیقت کا کوئی ذکر نہیں تھا کہ موپلوں کی طبقاتی نفرت کا شکار ہونے والے وہ ہندو زمیندار اور ساہوکار تھے جو صدیوں سے ان کا استحصال کرتے چلے آرہے تھے اور جو انگریز انتظامیہ سے ہر موقع پر عملی تعاون کرتے تھے۔ اس لئے جب کانگرس کی مجلس عاملہ میں موپلوں کی بغاوت کی مذمت کی قرارداد پیش ہوئی تو حسرت موہانی اور بعض دوسرے مسلمانوں نے اس کی مخالفت کی۔ تاہم یہ قرارداد کثرت رائے سے منظور ہوئی اور اس طرح یہ ثابت ہو گیا کہ گاندھی نے ''خلافت'' کے نام پر ہندو۔ مسلم اتحاد کا جو ڈھونگ رچایا تھا اس کی بنیاد سراسر منافقت پر تھی اور محمد علی جناح کی یہ پیش گوئی بھی صحیح ثابت ہوئی کہ تحفظ خلافت کے نام پر تحریک عدم تعاون سے ہندو۔ مسلم اختلافات کی خلیج وسیع ہو جائے گی۔

کسانوں کی پر تشدد کارروائیاں اور گاندھی کا تحریکِ خلافت کے خاتمے کا اعلان

جب جنوری 1922ء میں موپلوں کی بغاوت کا خاتمہ ہوا تو اس وقت حیدر آباد دکن اور یو۔ پی میں بے زمین کسانوں کی تحریک شروع ہو چکی تھی۔ گویا گاندھی کی مذہبی تحریک ایک زبردست طبقاتی تحریک کی صورت اختیار کر رہی تھی چنانچہ ''مہاتما'' بہت پریشان ہوا۔ اس نے پہلے تو حیدر آباد دکن میں مالیہ ادا نہ کرنے کی تحریک کی مخالفت کی اور پھر 5/فروری 1922ء کو یکا یک تحریک عدم تعاون ختم کر کے ان سادہ لوح مسلمانوں کو حیرت زدہ کر دیا جو اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ وہ گاندھی کی زیر قیادت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ پوری دنیا میں اسلام کا بول بالا کریں گے۔ گاندھی کی جانب سے تحریک ختم کرنے کی وجہ یہ بتائی گئی کہ یو۔ پی کے ضلع گورکھپور کے کسانوں نے ایک گاؤں چورا چوری کے تھانے کو نذر آتش کر دیا تھا اور اس حادثہ میں 21 سپاہی اور ایک سب انسپکٹر ہلاک ہو گئے تھے۔ گاندھی کو کسانوں کی اس پر تشدد کارروائی پر اتنا ''صدمہ'' ہوا کہ اس نے تحریک عدم تعاون کو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ لیکن ''مہاتما'' کو یہ اعلان کرتے وقت نہتے کسانوں پر کئے گئے مظالم پر ترس نہیں آیا تھا۔ پولیس کے اس عملہ نے اس واقعہ سے تھوڑی دیر پہلے کسان مظاہرین پر گولی چلائی تھی۔ جب کسان اس پر بھی منتشر نہیں ہوئے تھے

اور پولیس والوں کی گولیاں ختم ہوگئی تھیں تو وہ بھاگ کر اپنے تھانے میں گھس گئے تھے۔اس پر مظاہرین نے ان کا پیچھا کر کے تھانہ کی عمارت کو آگ لگا دی تھی اور یہ پولیس والے اس آگ کے شعلوں میں بھسم ہو گئے تھے۔ چند کانگرسیوں نے ''باپو'' کے اس آمرانہ فیصلہ پر احتجاج کیا کیونکہ اس وقت تک نہ تو خلافت کا تحفظ ہوا تھا اور نہ ہی سوراج حاصل ہوا تھا حالانکہ دسمبر 1920ء سے لے کر جنوری 1922ء تک تقریباً 30 ہزار رضا کار جیلوں میں جا چکے تھے۔ان کانگرسیوں نے انفرادی سطح پر تحریک جاری رکھی مگر جب حکومت نے 13 / مارچ 1922ء کو گاندھی کو ہفت روزہ ''ینگ انڈیا'' میں دو ایک ''قابل اعتراض'' مضامین لکھنے کے الزام میں گرفتار کر لیا تو یہ تحریک بالکل ختم ہوگئی اور وہ نیم تعلیم یافتہ مسلمان جو جزیرۃ العرب، مقامات مقدسہ اور خلافت المسلمین کے تحفظ کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے پر آمادہ نظر آتے تھے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہ گئے۔گاندھی نے جیل جانے سے پہلے حیدر آباد دکن اور یو۔پی کے کسانوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی طبقاتی جدوجہد بند کریں اور لگان کے بقایا جات ادا کر کے ملک میں امن کی بحالی کے لئے مناسب فضا پیدا کریں۔اس نے مدراس پریذیڈنسی کے ایک محدود علاقے میں کسانوں کی سول نافرمانی کی تحریک چلانے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ بھی چوراچوری کے واقعہ کے بعد واپس لے لیا تھا۔

برصغیر کی سیاسی سٹیج پر گاندھی کے اس ڈرامہ کے شرمناک اختتام کے بعد تحریک خلافت کچھ دیر تک رینگتی رہی جبکہ علی برادران اور تحریک کے دوسرے بڑے لیڈر جیلوں میں مقید تھے۔اگست 1922ء میں اس تحریک کے رینگنے کی رفتار اور بھی سست ہوگئی جبکہ مصطفےٰ کمال پاشا نے معاہدہ سیورے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اناطولیہ میں قومی فوج منظم کر کے سمرنا میں یونانی فوجوں پر بھرپور جوابی حملہ کر دیا۔ستمبر میں اس نے یونانیوں کو زبردست شکست دی اور پھر اکتوبر میں درہ دانیال میں برطانیہ کے بحری بیڑے پر بھی حملہ کر دیا۔نومبر میں ترکی کی گرینڈ نیشنل اسمبلی نے عبدالوحید کی جگہ عبدالمجید آفندی کو سلطان مقرر کیا لیکن اسے کوئی سیاسی اختیارات نہ دیئے بلکہ یہ طے کیا کہ وہ صرف خلیفہ یا سربراہ حکومت کی حیثیت سے مذہبی فرائض سرانجام دے گا۔وہ کاروبار حکومت میں کوئی دخل نہیں دے گا۔اسمبلی کے اس فیصلہ کا مطلب یہ تھا کہ قوم پرست ترکوں نے خود ہی مذہب کو سیاست سے الگ کر دیا تھا اور اس بنا پر خلافت کا عہدہ زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔چنانچہ خلافت کمیٹی کے ارکان کی بڑی حوصلہ شکنی ہوئی اور برصغیر کے مسلمانوں کا

درمیانہ طبقہ شتر بے مہار کی طرح سیاسی آوارگی میں مبتلا ہو گیا۔ ملاؤں کی سیاسی کوتاہ اندیشی اور گاندھی کی منافقانہ سیاست نے اسے ایک ایسے اندھے کنوئیں میں دھکیل دیا تھا جہاں سے باہر نکلنے کی اسے کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔

مصطفےٰ کمال کی یونانیوں اور انگریزوں کے خلاف تقریباً ایک سال کی کامیاب جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ جولائی 1923ء میں ترکی، یونان اور اتحادی طاقتوں کے درمیان معاہدہ لوسین ہوا جس کی رو سے معاہدہ سیورے منسوخ ہو گیا اور ترکی کی آزادی و خودمختاری کو تسلیم کر لیا گیا۔ اگست 1923ء میں ترکی کی نیشنل اسمبلی نے مصطفےٰ کمال پاشا کو صدر منتخب کر لیا۔ اکتوبر میں ترکی کی نئی قومی مملکت کا نیا جمہوری آئین بنا تو نومبر میں لندن سے آغا خان اور سید امیر علی نے حکومت ترکی کے نام ایک تار میں استدعا کی کہ مسلمانان عالم کی مذہبی قیادت کا تحفظ کیا جائے اور پھر دسمبر 1923ء میں آل انڈیا خلافت کمیٹی اور جمیعت العلمائے ہند نے بھی ایک قرارداد منظور کی جس میں ترکی کی نئی حکومت پر اپنے اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے گزارش کی گئی کہ مسلم ممالک کے علماء کا نمائندہ اجلاس بلایا جائے جس میں خلافت کے مسئلہ کا کوئی تسلی بخش حل تلاش کیا جا سکے۔ لیکن کمال اتاترک کی حکومت نے یہ مطالبات مسترد کر دیئے اور مارچ 1924ء میں یہ اعلان کر دیا کہ خلافت کا عہدہ ختم کر دیا گیا ہے۔ آئندہ ترکی کی حکومت سیکولر ہو گی اور جو عناصر سیاسی مقاصد کے لئے مذہب کو استعمال کریں گے انہیں آئین کے تحت سزا دی جائے گی۔

تحریکِ خلافت کی ناکامی کے اثرات اور اسباب

ترکی میں تقریباً ساڑھے پانچ سو سال بوڑھی خلافت کی اس موت کے بعد ہندوستان میں دس بارہ سال پرانی تحریک خلافت بھی ابدی نیند سو گئی۔ اس کے پسماندگان میں سے ابوالکلام آزاد جیسے عناصر پان اسلام ازم کی ایک انتہا سے یکا یک دوسری انتہا تک پہنچ گئے۔ اب ان کا خیال یہ ہو گیا تھا کہ مذہبی بنیاد پر سیاست کرنے کا یہ زمانہ نہیں اب سیاست قومی اور سیکولر بنیادوں پر ہونی چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آپ کو رسمی طور پر کانگرس سے وابستہ کر لیا حالانکہ اس جماعت کا ''باپو'' فخریہ اپنے آپ کو سناتنی ہندو کہتا تھا اور ''رام راج'' اس کی سیاست کا نصب العین تھا۔ محمد علی جوہر جیسے بعض دوسرے پسماندگان خلافت دو تین سال تک اس کوشش میں رہے کہ

ساری دنیا میں اسلام کی سربلندی کے لئے بین الاسلامی طرز کا کوئی ادارہ وجود میں آجائے۔ 1926ء میں جب ابن سعود نے حجاز پر قبضہ کرلیا تو انہوں نے بہت کوشش کی کہ خلافت المسلمین کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا جائے مگر انہیں بری طرح ناکامی ہوئی۔ ترکی اور ایران کو خلافت میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ عالم عرب میں انگریزوں کی سرپرستی میں کئی ''قومی ریاستیں'' وجود میں آگئی تھیں جن کو ابن سعود کی مذہبی سربراہی قابل قبول نہیں تھی۔ لہٰذا اب کسی خلیفہ کے ماتحت عالم اسلام کے اتحاد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس اثنا میں جمیعت العلمائے ہند کے مولویوں نے اپنی علیحدہ تنظیم کو قائم رکھا۔ اگرچہ وہ عملی طور پر کانگرس کا دم چھلہ بن گئے تھے۔ بعض دوسرے عناصر کو گاندھی اور دوسرے ہندو لیڈروں کی منافقانہ سیاست سے سخت صدمہ پہنچا تھا چنانچہ وہ پھر علی گڑھ تحریک کا جھنڈا اٹھا کر ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے علیحدہ سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقوق کے طلبگار بن گئے۔

جواہر لال نہرو نے گاندھی کی 22-1920ء کی تحریک عدم تعاون کی ناکامی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اس قومی تحریک کی بنیاد دراصل معاشی زبوں حالی اور بے روزگاری پر تھی۔ ان وجوہ کی بنا پر سارے گروہوں میں حکومت برطانیہ کے خلاف مشترکہ جذبات پیدا ہو گئے تھے اور سوراج یا آزادی کے لئے ایک مبہم سی خواہش نے بھی جنم لے لیا تھا۔ مخاصمت کی وجہ سے مشترکہ روابط پیدا ہوئے اور پھر مشترکہ اقدام ہوا لیکن مختلف گروہوں کے مقاصد مختلف تھے۔ ہر گروہ کے لئے سوراج کے معنی مختلف تھے۔ درمیانہ طبقے کے بے روزگاروں کو اُمید تھی کہ انہیں روزگار ملے گا۔ کسانوں کا خیال تھا کہ انہیں زمینداروں کے بوجھ سے خلاصی ملے گی۔ مسلمانوں کی جانب سے اس تحریک میں حصہ لینے کی بڑی وجہ خلافت تھی۔ یہ ایک خالص مذہبی مسئلہ تھا جس کا تعلق صرف مسلمانوں سے تھا۔ غیر مسلموں کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تاہم گاندھی نے اس تحریک کو اپنا لیا اور دوسروں کو بھی ایسا کرنے کی ترغیب دی کیونکہ اس کی رائے تھی کہ مصیبت زدہ بھائی کی مدد کرنا اس کا فرض ہے۔ اسے یہ بھی امید تھی کہ اس طرح ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے قریب تر آجائیں گے۔ عمومی طور پر مسلمانوں کا نظریہ مسلم نیشنلزم یا مسلم انٹرنیشنل ازم کا تھا، حقیقی نیشنلزم کا نہیں تھا لیکن وقتی طور پر ان دونوں کے درمیان تضاد نظر نہیں آتا تھا۔ دوسری طرف نیشنلزم کے بارے میں ہندو نظریہ یقینی طور پر ہندو نیشنلزم کا تھا۔ ہندو نیشنلزم اور حقیقی نیشنلزم میں اس

قسم کا واضح امتیاز کرنا ممکن نہیں تھا جیسا کہ مسلمانوں کے نظریے کے بارے میں ممکن تھا۔ ہندوؤں کے دونوں نظریے ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط تھے کیونکہ صرف انڈیا ہی ہندوؤں کا وطن تھا اور یہاں ان کی اکثریت تھی۔ لہٰذا ہندوؤں کے لئے مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ آسان تھا کہ وہ اپنے آپ کو خالص قوم پرست ثابت کریں۔ نیشنلزم کا تیسرا برانڈ حقیقی یا انڈین نیشنلزم کا تھا جو ان دونوں مذاہب اور فرقوں سے الگ تھا اور اس نیشنلسٹ گروہ میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شامل تھے۔ 22-1920ء کی تحریک میں نیشنلزم کے یہ تینوں نظریات یکجا ہو گئے تھے..... لیکن جب یہ تحریک یکا یک معطل ہو گئی تو انگریزوں کی ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو'' کی پالیسی کی کامیابی کے لئے فضا سازگار تھی کیونکہ اس تحریک کے نتائج برآمد نہیں ہوئے تھے۔ اس تحریک کے دوران جو تین مختلف سڑکیں متوازی چل رہی تھیں ان کی سمتیں پھر مختلف ہو گئیں۔ یہ کہنا سراسر غلط ہو گا کہ ہندوستان میں ہندو۔ مسلم مسئلہ انگریزوں کا پیدا کردہ ہے لیکن اس حقیقت کو بھی نظرانداز کرنا صحیح نہیں ہو گا کہ انہوں نے مسلسل یہ کوشش کی کہ یہ مسئلہ زندہ رہے اور دونوں فرقوں کے درمیان یکجہتی کی حوصلہ افزائی نہ ہو۔ سامراجی طاقتیں ایسا کرتی ہی ہیں۔ اگر ہندوستان میں ان کی یہ پالیسی کامیاب ہوئی تو اس میں انگریز حکومت کا کوئی گناہ نہیں تھا بلکہ یہ ہندوستانی عوام کی پسماندگی اور کمزوری کی علامت تھی۔''[15]

نہرو کا یہ تجزیہ بظاہر ٹھیک ٹھاک لگتا ہے کیونکہ اس میں یورپ کے سوشل ڈیموکریٹس کی ''ترقی پسندانہ'' زبان استعمال کی گئی ہے۔ لیکن اس کے اس افسانے میں اس ناگوار بات کا کوئی ذکر نہیں جو دراصل اس تحریک کی ناکامی کا باعث بنی تھی۔ وہ ناگوار بات یہ تھی کہ گاندھی کی منافقت نے برصغیر کی سیاست میں مذہبی عصبیت کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ وہ خلافت کے بارے میں مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کے مذہبی جذبات سے فائدہ اٹھا کر کلکتہ، احمد آباد اور بمبئی کے ہندو بورژوا طبقے کے مفادات کو فروغ دینا چاہتا تھا۔ لیکن جب یہ تحریک رائے بریلی، پرتاپ گڑھ، گورکھپور اور بارودلی میں کسانوں کی طبقاتی جدوجہد کی صورت اختیار کرنے لگی تو وہ میدان سے بھاگ گیا۔ وہ ہندوؤں کے بورژوا طبقے کے نمائندہ کی حیثیت سے برطانوی سامراج سے محاذ آرائی کا خواہاں نہیں تھا وہ تو صرف پُرامن طریقے سے بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے اس تحریک کے دوران وائسرائے لارڈ ریڈنگ سے خط و کتابت جاری رکھی اور اس سے کئی

ملاقاتیں کیں۔ وہ 13رمئی سے لے کر 18رمئی 1921ء تک شملہ میں چھ مرتبہ وائسرائے سے ملا تھا اور اس کے بعد علی برادران نے اپنی ان تقریروں پر اعلانیہ معذرت کی تھی جن میں انہوں نے کہا تھا کہ اگر افغانستان ہندوستان پر حملہ کرے گا تو مسلمانان ہند اس کا خیر مقدم کریں گے۔ وائسرائے گاندھی کی عدم تعاون کی تحریک کے باوجود اس کی عزت کرتا تھا کیونکہ روس میں طبقاتی انقلاب کے بعد برطانوی سامراج کو ہندوستان میں ایک ایسے مقامی لیڈر کی ضرورت تھی جو ہندوستانی عوام کو فروعی مذہبی مسائل میں الجھا کر ان کی ''پرُامن'' قومی تحریک کو پرتشدد طبقاتی جدوجہد کی صورت اختیار نہ کرنے دے۔ چونکہ ہندوؤں کے ابھرتے ہوئے بورژوا طبقے کا مفاد بھی اسی میں تھا اس لئے گاندھی نے یہ عوام دشمن کردار بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا۔ اس نے اس مقصد کے لئے، مسلمانوں میں مُلّا ازم کی حوصلہ افزائی کر کے جو پاپ کیا تھا اسے تاریخ کبھی معاف نہیں کر سکتی۔ سوامی شردھانند اور مدن موہن مالویہ کی شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں کی بھی گاندھی کی منافقانہ سیاست نے آبیاری کی تھی۔ پنجاب میں سکھوں کی فرقہ پرست جماعت اکالی دل نے بھی گاندھی کی عدم تعاون کی تحریک کے دوران جنم لیا تھا۔

محمد علی جناح کے بقول ''یہ گاندھی ہی تھا جس نے کانگرس کے نصب العین کو تباہ کیا تھا۔ صرف اسی شخص نے کانگرس کو ہندوازم کے احیاء کے لئے آلۂ کار بنایا تھا۔ اس کا نصب العین ملک میں ہندو مذہب کا احیاء اور ہندو راج کا قیام تھا اور وہ اس کے لئے کانگرس کو استعمال کر رہا تھا...... اس نے 12رمئی 1920ء کو لکھا تھا کہ ''میرے نزدیک مذہب کے سوا کوئی سیاست نہیں ہے۔ سیاست کا مقصد مذہب کی خدمت کرنا ہے۔ میں نے بطور سیاست دان کبھی کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ اگر میں سیاست میں حصہ لیتا ہوں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ سیاست ایک سانپ کی طرح ہم سے لپٹی ہوئی ہے۔ ہم جتنی بھی کوشش کریں اس کے شکنجے سے باہر نہیں جا سکتے۔ میں اس سانپ سے لڑنے کے لئے سیاست میں مذہب کو شامل کر کے اپنے ساتھ اور اپنے دوستوں کے ساتھ تجربات کرتا رہا ہوں''...... اور پھر اس نے ناگپور سیشن میں کانگرس پر پوری طرح غلبہ حاصل کرنے کے بعد 12راکتوبر 1921ء کو یہ لکھا کہ ''میں اپنے آپ کو سناتنی (قدامت پسند) کہتا ہوں کیونکہ اول میں ویدوں، اپنیشدوں، پورناؤں اور ہندوؤں کے سارے اشلوکوں پر عقیدہ رکھتا ہوں اور اس بنا پر اوتاروں اور آواگون کو بھی مانتا ہوں۔ دوئم میں ورنا شرما دھرما (ذات پات کے قوانین) کو اسی

طرح مانتا ہوں جیسا کہ ویدوں میں لکھا ہے۔ سوئم میں گئو رکھشا کو اپنے دھرم کا ایک جزو سمجھتا ہوں اور چہارم میں بت پرستی کے خلاف نہیں ہوں۔"[16]

ایسا تنگ نظر اور تنگدل شخص محض منافقت کے سہارے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ قومی تحریک کو منزل مقصود تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔ ہندوؤں کے بورژوا طبقے کے نمائندہ کی حیثیت سے اس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ یہ مذہب کو سیاسی مقصد کے لئے استعمال نہیں کرے گا۔ لیکن اس نے نہ صرف مذہب کو اپنی سیاست کا آلہ کار بنایا بلکہ ان دونوں کو کچھ اس طرح خلط ملط کر دیا کہ ہندو اکثریت کے درمیانہ طبقہ کے سیاسی عزائم آسمان تک پہنچ گئے اور مسلم اقلیت کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کو ہندو راج کا حقیقی خطرہ لاحق ہو گیا۔

باب: 4

فضل حسین، یونینسٹ پارٹی اور ہندو۔مسلم تضاد

مسلمانوں کے لئے تعلیم اور ملازمتوں میں کوٹہ مخصوص ہونے پہ ہندوؤں کا واویلا

پنجاب میں ''مہاتما'' گاندھی کی عدم تعاون کی تحریک کے دوران بوجوہ وسیع پیمانہ پر لاقانونیت نہ پھیلی لیکن اس کی مذہبی سیاست کے زہریلے اثرات اکتوبر 1921ء میں نمودار ہونا شروع ہوگئے جبکہ صوبہ کے مسلمان وزیر تعلیم فضل حسین نے لاہور کے میڈیکل کالج اور گورنمنٹ کالج میں مسلمان طلبا کے لئے چالیس فیصد نشستیں مخصوص کر دیں، میونسپل کمیٹیوں میں جہاں مسلمانوں کو اپنی آبادی کے تناسب سے کم نشستیں حاصل تھیں ان کی نمائندگی تناسب آبادی کے مطابق بڑھا دی اور سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا چالیس فیصد حصہ مقرر کر دیا۔ فضل حسین کا یہ فیصلہ کانگرس اور مسلم لیگ کے معاہدۂ لکھنؤ کے عین مطابق تھا لیکن صوبہ میں ہندوؤں کے درمیانہ طبقہ کے لئے یہ ناقابل برداشت تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نہرو کے بقول مجموعی طور پر ہندوؤں کی قوم پرستی کا مطلب ہندو قوم پرستی تھا جس کا مفہوم یہ تھا کہ پورے ہندوستان میں ان کا غلبہ ہو اور ان کی کسی قسم کی اجارہ داری میں کوئی خلل نہ پڑنے پائے۔ پنجاب کے مسلمان اکثریت میں ہونے کے باوجود سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی لحاظ سے بہت پسماندہ تھے لیکن ہندوؤں کا ترقی یافتہ درمیانہ طبقہ اپنے مسلمان قومی بھائیوں کے لئے ترقی کا کوئی راستہ کھلنے نہیں دیتا تھا۔ وہ اسے فرقہ پرستی قرار دیتے تھے اور اس سلسلے میں جب کبھی سرکاری سطح پر کوئی کوشش کی جاتی تھی تو وہ اس کی سرتوڑ مخالفت کرتے تھے۔ ان کا مؤقف یہ ہوتا تھا کہ ''ہر سرکاری اور غیر سرکاری ادارے میں داخلہ کا معیار صرف قابلیت اور صلاحیت ہونا چاہیے۔ اگر مذہب کو داخلہ کا معیار مقرر کیا گیا تو یہ اقدام غیر جمہوری ہوگا اور اس سے قوم میں افتراق و نفاق پھیلے گا'' پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ تک

انگریزوں نے ہندوؤں کے اس مؤقف کے خلاف کبھی کوئی مؤثر کاروائی نہیں کی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ہر شعبۂ زندگی میں ہندوؤں کی برتری اور بالادستی میں اضافہ ہوتا چلا گیا تھا اور مسلمان پسماندہ سے پسماندہ تر ہوتے چلے گئے تھے۔

مسلمانوں کے معاملے میں انگریزوں کی یہ بے انصافی اور بے حسی اس حقیقت کے باوجود تھی کہ 1870ء میں حکومت برطانیہ نے اپنے سامراجی مفادات کے تقاضوں کے تحت ہندوستان میں مسلم دشمنی کی پالیسی ترک کر دی تھی اور پھر سید امیر علی کے ایک میموریل پر طویل تحقیقات اور غور وخوض کے بعد 1885ء میں ایک سرکلر جاری کی گیا تھا جس میں صوبائی گورنروں، ہائی کورٹوں اور ماتحت افسروں کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب کی کمی کو دور کرنے کی خاص کوشش کریں اور محکمانہ کارگزاریوں کی رپورٹوں میں یہ بھی بتاتے رہیں کہ اس مقصد میں کس حد تک کامیابی ہو رہی ہے۔ اس کے بعد اس سرکلر کی ہدایات وقتاً فوقتاً مختلف الفاظ میں دہرائی جاتی رہیں اور حکومت ہند کی پالیسی کا ایک مستقل جزو بنی رہیں لیکن صرف کاغذ پر۔ سرکاری دفتروں میں ہندوؤں کی مکمل اجارہ داری تھی۔ دفتروں کے بابو مختلف بہانوں سے من مانی کرتے رہے اور انگریز افسروں نے اس مسئلے کو اپنا دردسر بنانے کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہ کی۔ لیکن جب 1919ء کی اصلاحات کے تحت فضل حسین پنجاب کا وزیر بنا تو انگریزوں کی اس بے عملی کی پالیسی میں تبدیلی آنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ تحریک خلافت کے دوران پنجاب کے مسلمانوں کو، جنہوں نے جنگ عظیم میں ''گراں قدر'' خدمات سرانجام دی تھیں، کسی حد تک مطمئن کر کے ان میں بے چینی اور بدامنی کا سدباب کرنا چاہتے تھے اور دوسری وجہ یہ تھی کہ فضل حسین پنجاب کے مسلمانوں کے شہری درمیانہ طبقہ کا ایک ایسا بااثر اور مدبر سیاسی لیڈر تھا جس نے اگرچہ کانگرس اور مسلم لیگ کے گہوارے میں سیاسی تربیت حاصل کی تھی لیکن اس کے باوجود وہ محمد علی جناح کی طرح آئین پسند تھا اور اس نے 1919ء میں اینٹی رولٹ ایکٹ ایجی ٹیشن کے دوران مسلمانوں کو ہنگاموں اور بلووں سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے 13 اپریل کو جلیاں والے باغ کے حادثۂ خونین کے دو تین دن بعد یعنی 16 اپریل کو شملہ میں وائسرائے سے ملاقات کر کے بظاہر اسے اپنی آئین پسندی کا یقین دلایا تھا اور پھر جب دسمبر 1920ء میں کانگرس نے گاندھی کی تجویز کے مطابق ''تحفظ خلافت'' اور سوراج کے حصول کے

لئے عدم تعاون یا ترک موالات کی تحریک چلانے کا فیصلہ کیا تھا تو اس نے جناح کی طرح کانگرس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔ برطانوی سامراج کے نقطۂ نگاہ سے 1921ء میں ایسے شخص کے جائز فیصلوں کی مخالفت مناسب نہیں تھی۔ چنانچہ جب میڈیکل کالج کے انگریز پرنسپل کرنل سدر لینڈ نے چالیس فیصد مسلمان طلبا کو اپنے ہاں داخل کرنے میں تامل کا اظہار کیا تھا تو فضل حسین نے اسے اپنے عہدے سے مستعفی ہو جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

عاشق بٹالوی لکھتا ہے کہ میاں فضل حسین کے متذکرہ فیصلوں کی بنا پر ''جوں جوں ہندو اخبارات اور لیڈر فضل حسین کے خلاف شور و غوغا کر رہے تھے وہ مسلمانوں میں روز بروز مقبول ہوتے جا رہے تھے، میاں صاحب کی پالیسی کی حمایت کے لئے لاہور سے مسلمانوں کا پہلا انگریزی روزنامہ ''مسلم آؤٹ لک'' نکلنا شروع ہوا۔ اسلامی انجمنوں نے قراردادیں منظور کر کے برملا ان کی تائید کی۔ مسلمانوں کے متعدد وفود نے گورنر کے پاس جا جا کر ان کی پالیسی کی اعانت کی۔ یہاں تک کہ مسجدوں میں فضل حسین کی تندرستی اور درازیٔ عمر کی دعائیں مانگی جانے لگیں۔ اپنی قوم میں فضل حسین کی مقبولیت اور محبوبیت کا یہ عالم تھا کہ جب 13 مارچ 1923ء کو ایک ہندو مہاسبھائی لیڈر راجہ نریندر ناتھ نے پنجاب کونسل میں ان کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کی۔ یہ قرارداد پانچ شقوں پر مشتمل تھی۔ (1) پنچایت ایکٹ میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا گیا۔ (2) سرکاری ملازمتوں میں فرقہ وارانہ نمائندگی داخل کر دی گئی۔ (3) میڈیکل کالج اور گورنمنٹ کالج میں داخلہ، فرقہ وارانہ اصول پر مقرر کیا گیا ہے۔ (4) بعض میونسپل کمیٹیوں میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا اصول رائج کر دیا گیا ہے۔ (5) گوردوارہ ایکٹ منظور کر کے ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان تفریق پیدا کی گئی ہے۔ اس قرارداد پر بڑی تند و تیز تقریریں ہوئیں۔ راجہ نریندر ناتھ نے اپنی تقریر میں فضل حسین کو مخاطب کر کے کہا کہ ''اورنگزیب مت بنو۔ اکبر بننے کی کوشش کرو۔'' اور احمد یار خان دولتانہ نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ اس وقت جبکہ بہت سے سیواجی ہمارے مدمقابل بن کر بیٹھے ہوئے ہیں ہمیں اکبر پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اورنگزیب ہی پیدا کرنے چاہئیں...... ہندوؤں کا تعصب اور ان کی تنگدلی اب ایک ایسے نقطۂ عروج پر پہنچ چکی ہے کہ جس سے مسلمانوں کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا ہے۔ کیا اس ایوان کے مسلمان ممبر اور کیا اس صوبے کے مسلمان باشندے سبھی ہندوؤں کے تعصب سے نالاں ہیں۔ فیروز خان نون نے کہا ''حالیہ

سرکلر کی رو سے میڈیکل کالج میں چالیس فیصد طلبہ لازماً داخل کئے جانے چاہئیں لیکن ہوا کیا ہے؟ امسال ایف۔ایس۔سی کے امتحان میں ممتحنوں کی اکثریت اسی وسیع القلب اور فراخ دل قوم کے فرزندوں پر مشتمل تھی جس کے ایک نونہال راجہ نریندر ناتھ ہیں چنانچہ مسلمان طلبا کو اس کثرت سے فیل کیا گیا کہ ان غریبوں کی چالیس فیصد تعداد میڈیکل کالج تک پہنچ ہی نہیں سکی۔کیا یہی انصاف ہے جس کا ہمیں مستحق قرار دیا گیا ہے۔''فضل حسین نے اس قرارداد پر بحث کے آخر میں جو طویل اور مدلل تقریر کی وہ اس کی زندگی کی بہترین تقریروں میں شمار ہوئی۔اس نے بہت سی مثالیں دے کر ثابت کیا کہ ہندوستان میں نفرت و عداوت کا جذبہ تنگدل و تنگ نظر ہندوؤں کا پیدا کردہ ہے۔''اس جذبہ کی ایک صورت چھوت چھات بھی ہے۔ ہندو صرف مسلمانوں ہی سے چھوت چھات نہیں کرتے بلکہ خود ہندو دھرم کے اندر ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو نجس خیال کرتا ہے۔ مثلاً برہمن غیر برہمنوں سے چھو جانا گناہ سمجھتے ہیں۔مثال کے طور پر صوبہ مدراس کو لیجیے، وہاں جس باہمی نفاق نے آگ لگا رکھی ہے کیا اس کا ذمہ دار بھی میں ہوں۔حکومت مدراس کی وزراء نے ایک قانون بنا دیا ہے جس کی رو سے کوئی برہمن غیر برہمنوں پر تشدد نہیں کر سکتا۔اس قانون کے مطابق یہ فیصلہ ہو گیا ہے کہ موجودہ وزارت کے عہد میں کسی برہمن کو سرکاری ملازمت نہیں دی جائے گی۔ نہ صرف یہ بلکہ کسی سرکاری ملازم کو جو برہمن ہے اس وقت تک ترقی نہیں مل سکے گی جب تک حکومت کے تمام محکموں میں غیر برہمنوں کو ان کا جائز حصہ عطا نہیں ہو جاتا۔میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس تمام تفرقے کا ذمہ دار بھی میں ہوں؟......گورنمنٹ کالج میں داخلہ کے وقت، طالب علم کے نمبروں کے علاوہ چار چیزوں کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔اول یہ کہ آیا امیدوار کا کوئی رشتہ دار کالج میں اس وقت پڑھتا ہے یا پہلے پڑھتا رہا ہے۔دوم یہ کہ آیا امیدوار کا باپ اس وقت سرکاری ملازمت میں ہے یا پینشن لے چکا ہے۔سوم یہ کہ آیا امیدوار نے سرکار والا تبار کی کوئی خدمت کی ہے یا نہیں۔چہارم آیا امیدوار کسی بڑے آدمی کی سفارش لایا ہے یا نہیں۔غور فرمائیے جس درس گاہ میں طلبا کے داخلہ پر اس قسم کی پابندیاں ہوں وہاں مسلمانوں کی خاک شنوائی ہوگی۔اول تو سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے دوسرے مسلمان یوں بھی تعلیم میں بہت پسماندہ ہیں۔تیسرے عام مسلمان بے حد غریب ہیں۔انہیں بڑے آدمیوں تک رسائی ہی ممکن نہیں وہ سفارشیں کیونکر مہیا کر سکتے ہیں۔ان حالات میں جبکہ امیدوار کا باپ سرکاری ملازم

بھی نہیں جبکہ قوم کی عام پسماندگی کے باعث امیدوار کا کوئی قریبی رشتہ دار گورنمنٹ کالج میں تعلیم بھی حاصل نہیں کر سکا۔ جبکہ غربت وافلاس کی وجہ سے امیدوار کی بڑے آدمیوں تک رسائی بھی نہیں تو پھر خدارا بتایئے کہ کیا گورنمنٹ کالج میں مسلمان طلبا کے داخل ہونے کا کوئی امکان ہے؟''
تاہم جب عدم اعتماد کی اس قرارداد پر رائے شماری ہوئی تو تمام مسلمان ممبروں نے فضل حسین کے حق میں اور تمام ہندوؤں اور سکھوں نے فضل حسین کے خلاف ووٹ دیئے۔ ایوان کی یہ تقسیم خالص فرقہ وارانہ تقسیم تھی۔ مسلمان فضل حسین کے ساتھ اور ہندو ان کے مخالف تھے۔ قرارداد کی ناکامی نے فضل حسین کو مسلمان عوام میں پہلے سے بھی زیادہ مقبول بنا دیا۔[1]

فضل حسین کے خلاف عدم اعتماد کی یہ قرارداد پنجاب میں ہندو۔ مسلم کشیدگی کی تاریخ میں ایک بڑے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ 1923ء میں ایک طرف تو پہلی مرتبہ پنجاب کے مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کی طرف سے اپنے حقوق کا مؤثر طریقے سے مطالبہ کیا گیا تھا اور دوسری طرف ہندوؤں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کی طرف سے یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ تاریخی وجوہ کی بنا پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ پسماندہ مسلمانوں کو کسی بھی شعبۂ زندگی میں کوئی رعایت دینے پر آمادہ نہیں تھے۔ تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کے ساتھ امتیازی سلوک ہندوؤں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے فرقہ وارانہ تعصب کی بدترین مثال تھی۔

پنجاب یونیورسٹی صوبہ کے سارے فرقوں کی طرف سے دیئے گئے چندہ سے وجود میں آئی تھی لیکن عربی اور فارسی کے سوا یونیورسٹی کے دوسرے سارے شعبوں میں مسلمان اساتذہ کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا اور مسلمان طلبا کا تناسب چار پانچ فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔ جو مسلمان طلبا اسلامیہ اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرتے تھے انہیں، ان کے اساتذہ اور ان کے والدین کو یہ عام شکایت تھی کہ چونکہ یونیورسٹی کے ممتحن ہندو ہوتے ہیں اس لئے انہیں ایک منصوبہ کے تحت کثرت سے فیل کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ صوبہ کے محکمہ تعلیم کے چھوٹے بڑے عملے میں ہندوؤں کی بھاری اکثریت تھی اس لئے یہ شکایت اکثر سننے میں آتی تھی کہ ہندو انسپکٹرز اسلامی اسکولوں کے بارے میں تعصب کی بنا پر مخالفانہ رپورٹیں دیتے ہیں۔ اس لئے حکومت کی طرف سے ان سکولوں کو ضروری مالی امداد نہیں ملتی۔ جہاں تک سرکاری ملازمتوں کا تعلق تھا فضل حسین کے

بقول ان میں مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ فضل حسین کی طرف سے 1923ء میں مسلمانوں کے لئے سرکاری دفاتر، تعلیمی اداروں اور میونسپل کمیٹیوں میں 55 فیصد مسلمانوں کی آبادی کے لئے 40 فیصد کوٹہ مقرر کرنے کا فیصلہ اس حقیقت کا بین ثبوت تھا کہ مسلم اکثریت کے اس صوبہ میں مسلمانوں کی حالت بڑی قابل رحم تھی۔

برہموسماج اور آریہ سماج کے ہندو قائدین بالخصوص ستیہ پرکاش، لالہ لاجپت رائے، بابو نوین چندر رائے، رائے مول راج اور راجہ نریندر ناتھ وغیرہ میں اتنی وسیع القلبی نہیں تھی کہ وہ بنگال کے سی۔آر۔داس اور بمبئی کے گوپال کرشن گوکھلے کی طرح پسماندہ اور غریب مسلمانوں سے قدرے مشفقانہ سلوک کر کے ان کا دل موہ لیتے اور اس طرح قوم پرستی کا ایک جذبہ پیدا کرتے جو فرقہ واریت سے بالاتر ہوتا۔ چونکہ ہندو سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تعلیمی لحاظ سے آگے تھے تو اس لئے فرقہ وارانہ اتحاد و یکجہتی کی فراخدلانہ پہل انہی کی طرف سے ہونی چاہیے تھی۔ لیکن لالہ لاجپت رائے وغیرہ نے سرکاری سکولوں میں تاریخ کی جو کتاب بعنوان ''واقعات ہند'' پڑھی تھی اس نے ان کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے نفرت کے جذبات پیدا کر دیئے تھے کیونکہ اس کتاب میں لکھا تھا کہ مسلمانوں نے اپنے عہد اقتدار میں ہندوؤں پر بڑے مظالم کئے تھے۔[2]

کے۔ایل۔ گابا کے بیان کے مطابق اس قسم کے ہندو لیڈروں کے مسلمانوں کے خلاف تعصب کی انتہا یہ تھی کہ وہ نہ صرف تعلیمی اور سرکاری اداروں میں مسلمانوں کے داخلہ کے خلاف تھے بلکہ وہ مسلمانوں کو ان تجارتی و صنعتی اداروں کے نزدیک بھی نہیں آنے دیتے تھے جو انہوں نے خود کھولے ہوئے تھے۔ مثلاً پنجاب نیشنل بنک، یونائیٹڈ کمرشل بنک، لکشمی انشورنس کمپنی، بھارت بنک اور بھارت انشورنس کمپنی میں شاید ہی کوئی مسلمان نظر آتا تھا۔ لاہور الیکٹرک سپلائی کمپنی جس کی ترقی اور خوشحالی میں مسلمان صارفین کا بھی اتنا ہی حصہ تھا جتنا کہ ہندوؤں کا تھا لیکن کمپنی کے ایگزیکٹو اور کلیریکل سٹاف میں اس وقت تک کوئی مسلمان نہیں تھا جب تک کہ حکومت نے کمپنی کو اپنی تحویل میں لینے کا دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ سرگنگا رام بہت مخیر شخص تھا لیکن وہ کھلم کھلا کہتا تھا کہ اس کی خیرات سے مستفید ہونے والوں میں کوئی مسلمان نہیں ہوگا۔ وہ ایک بھلا مانس تھا لیکن اچھا مخیر نہیں تھا۔ روزنامہ ٹریبیون قوم پرستی کو فروغ دینے کے لئے جاری کیا گیا تھا لیکن کبھی کوئی مسلمان اس کا ٹرسٹی، ایڈیٹر یا مینجر نہیں بنا تھا۔ سرگنگا رام کی طرف سے دلیل دی

جاسکتی ہے کہ چونکہ عطیہ دینے والا فرقہ پرست تھا اس لئے اس نے مسلمانوں کو اس سے استفادہ کرنے والوں میں سے خارج کر دیا ہوا تھا۔ لیکن دیال سنگھ مجیٹھیہ فرقہ پرست نہیں تھا۔ اس نے سب سے پہلے جو ٹرسٹی مقرر کئے تھے ان میں ایک عیسائی بھی تھا لیکن اب روزنامہ ٹریبیون، دیال سنگھ لائبریری اور دیال سنگھ کالج ہندو ادارے بن چکے تھے۔[3] ہندو لیڈروں کے اس قسم کے تنگدلانہ رویے کی بنا پر محسوس ہوتا تھا کہ وہ برصغیر میں دو قومی نظریے کو گہرا کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں جبکہ مسلمانوں کا درمیانہ طبقہ ان سے مشفقانہ اور فیاضانہ سلوک کی توقع کرتا تھا۔

پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی 55 فیصد تھی لیکن اکثریت کے باوجود وہ تعلیم میں بہت پیچھے تھے۔ چونکہ اس معاملے میں وہ ہندوؤں سے عہدہ برا نہیں ہو سکتے تھے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ انہیں بعض ضروری تحفظات عطا کئے جائیں۔ ہندوؤں کی آبادی 34 فیصد تھی جو بیشتر شہری اور قصباتی تھی۔ تعلیم، دولت، تجارت اور صنعت وحرفت میں ہندو۔ مسلمانوں سے آگے تھے۔ سکھ، صوبہ کی مجموعی آبادی کا 11 فیصد تھے۔ بیسویں صدی کے اوائل تک وہ ہندوؤں ہی کا ایک فرقہ سمجھے جاتے تھے لیکن 1909ء کی اصلاحات کے بعد ان میں بھی ایک زبردست انقلاب آ گیا جس سے وہ اپنے آپ کو ایک جداگانہ قوم تصور کرنے لگے۔ ان میں اپنی سیاسی اور عسکری اہمیت کا شعور بھی پیدا ہو گیا تھا۔ لہٰذا ان تینوں قوموں کی روایات اور مفادات ایک دوسرے سے اس قدر مختلف تھے کہ پنجاب برطانیہ کے شمالی آئرلینڈ کے طرح مستقل طور پر فرقہ پرستی کا اڈہ بن کر رہ گیا تھا اور یہاں کے باشندوں کا عام رجحان قوم پرستی کی طرف کم اور فرقہ واری کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔

ہندوؤں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کا خیال تھا کہ جس شخص نے ہندو۔ مسلم اتحاد کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے وہ فضل حسین ہے جبکہ مسلمانوں کا نوزائیدہ درمیانہ طبقہ فضل حسین کو اپنا سب سے بڑا محسن تصور کرتا تھا۔ اس کے مداحوں میں ڈاکٹر سر محمد اقبال جیسے لوگ بھی شامل تھے۔ سی۔ آر۔ داس، موتی لال نہرو ابوالکلام آزاد اور سروجنی نائیڈو نے اپریل 1923ء میں پنجاب کا دورہ کر کے یہاں بڑھتی ہوئی فرقہ واریت کا سدباب کرنے کی کوشش کی تھی مگر انہیں بہت جلد مایوس ہو کر واپس لوٹنا پڑا تھا۔ ان کانگرسی لیڈروں کی طرف سے پنجاب میں فرقہ وارانہ اتحاد کرانے کی کوشش کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ موتی لال نہرو کی سوراج پارٹی 1923ء کے اواخر میں ہونے والے عام انتخابات میں حصہ لینا چاہتی تھی۔

یونینسٹ پارٹی کا قیام۔ہندو بورژوا کی تنگ نظری کے خلاف ردعمل تھا

نومبر 1923ء میں نئے آئین کے تحت قائم شدہ پہلی صوبائی کونسل کی معیاد ختم ہونے کے فوراً بعد عام انتخابات ہوئے تو 9 سوراجی اور تین خلافتی امیدوار بھی منتخب ہو گئے۔ سوراجی سب کے سب ہندو تھے جن کا لیڈر ڈاکٹر گوکل چند نارنگ تھا۔ خلافتی ارکان میں چودھری فضل حق، رانا فیروز الدین اور مولوی مظہر علی اظہر شامل تھے۔ اس کے علاوہ پانچ ہندو ارکان تھے جنھوں نے اپنا نام نیشنل پروگریسو پارٹی رکھ لیا تھا لیکن دراصل ان کا تعلق ہندو مہاسبھا سے تھا اور ان کا لیڈر وہی راجہ نریندر ناتھ تھا جس نے فضل حسین کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی تھی۔ چھ ہندو جاٹوں کا ایک الگ گروپ تھا جس کا لیڈر راؤ بہادر کیپٹن لال چند تھا۔ ان کے علاوہ چوبیس مسلمان جاگیرداروں کا گروہ تھا اور سات ارکان اپنے آپ کو مسلم لیگی کہتے تھے حالانکہ انتخابات میں مسلم لیگ نے بحیثیت سیاسی جماعت کے حصہ نہیں لیا تھا۔ سکھوں میں گیارہ ممبر شرومنی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے نمائندے تھے اور چھ ارکان ایسے تھے جو اپنے آپ کو آزاد کہتے تھے اور ان سب کے علاوہ بیس بائیس ارکان پر مشتمل سرکاری بلاک بھی تھا۔ جب جنوری 1924ء میں نئی وزارت سازی کا موقع آیا تو فضل حسین نے چوبیس مسلمان جاگیرداروں اور راؤ بہادر لال چند کی زیر قیادت چھ ہندو جاٹوں پر مشتمل ایک غیر فرقہ وارانہ نیشنل یونینسٹ پارٹی بنالی اور گورنر میکلیگن نے نہ صرف فضل حسین کو وزارت تعلیم کے عہدہ پر فائز رکھا بلکہ اسے یہ بھی اجازت دی کہ وہ دوسری وزارت کے لئے اپنی پارٹی کے کسی ہندو رکن کو نامزد کرے۔ چنانچہ فضل حسین نے راؤ بہادر لال چند کو اپنا ساتھی منتخب کر لیا۔ لیکن کچھ عرصہ بعد جب راؤ بہادر کو ایک انتخابی عذرداری کی وجہ سے کونسل میں اپنی نشست خالی کرنا پڑی تو فضل حسین نے اس کی جگہ ایک اور ہندو جاٹ چودھری چھوٹو رام کو وزیر چن لیا۔

پنجاب میں شہری مسلمانوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کے ایک بورژوا ترقی پسند لیڈر فضل حسین کی جانب سے صوبہ کے دقیانوسی جاگیرداروں پر مشتمل یہ نئی غیر فرقہ وارانہ پارٹی بنانے کی وجہ کیا تھی؟ اس سوال کا جواب اس پارٹی کا اخباری ترجمان سید نور احمد یہ دیتا ہے کہ ''دو اڑھائی سال کے تجربے اور سوچ بچار کے بعد میاں فضل حسین کے ذہن میں یہ خیال مستحکم ہو گیا تھا کہ

موجودہ حالات اور آئندہ پارلیمانی طرز حکومت کے تحت مسلمانوں کے لئے پنجاب میں اپنے مقاصد حاصل کرنے اور اپنی سیاسی بالادستی قائم رکھنے کی صحیح عملی تدبیر یہ نہ تھی کہ وہ کونسل کے اندر صرف اپنی فرقہ وارانہ پارٹی قائم کرنے کی کوشش کریں بلکہ یہ تھی کہ وہ اپنا اتحاد بھی قائم رکھیں اور اپنی صفوں میں ہندو جاٹوں اور ان کے ہم خیال متفرق غیر مسلم عناصر کو بھی شامل کرلیں۔ اس کے لئے کوئی نیا پروگرام ڈھونڈنے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف اس بات کی ضرورت تھی کہ مسلم بلاک کو ایک غیر فرقہ وارانہ پارٹی کا نام دے کر ہندو جاٹوں کو اس میں شمولیت کی دعوت دے دی جائے۔ اس طرح پنجاب کونسل میں یونینسٹ پارٹی معرض وجود میں آئی جس کی قیادت میاں فضل حسین نے سنبھالی۔ اس پارٹی کا پروگرام وہی رہا جس پر میاں صاحب پہلے ہی عمل کر رہے تھے اور جس کی حمایت پر مسلمان ممبر جمع تھے۔ البتہ سرکاری ملازمتوں میں فرقہ وارانہ کوٹے کے سوال پر ہندو جاٹوں کے نقطۂ نگاہ اور خود مسلم ممبروں کی اکثریت کی خواہش کے مطابق میاں فضل حسین نے اپنے فارمولے میں اس طرح ترمیم کردی کہ مسلمانوں کا کوٹہ چالیس سے بڑھا کر پچاس فیصد اور ہندوؤں کا کوٹہ چالیس سے گھٹا کر تیس فیصد کر دیا۔ اس شرط کے ساتھ کہ ہر فرقے کے کوٹے میں ساٹھ فیصد اس کی زراعت پیشہ آبادی کے لئے مخصوص ہوگا۔ واضح رہے کہ یہ فارمولا یونینسٹ پارٹی کا تھا۔ حکومت پنجاب کی سرکاری پالیسی کی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ لہٰذا یہ تماشا ہوتا رہا کہ یونینسٹ وزیر اپنے محکموں میں اس کی پابندی کرتے تھے۔ غیر یونینسٹ وزیروں کو جب موقع ملتا تھا یا گورنر کی شہ ملتی تھی وہ من مانی کر لیتے تھے لیکن آہستہ آہستہ اسی فارمولے کو صوبائی محکموں کے عام دستور العمل کی حیثیت ہوگئی۔[4]

فضل حسین کا دست راست محمد ظفر اللہ خان لکھتا ہے کہ ''اس وقت کے حالات کے ماتحت یونینسٹ پارٹی کا قیام ایک سیاسی شاہکار تھا۔ اس پارٹی پر نہ تو یہ اعتراض ہوسکتا تھا کہ یہ فرقہ وارانہ پارٹی ہے۔ اس لئے یہ توقع نہیں ہوسکتی کہ یہ صوبے کے دوسرے فرقوں کے حقوق کا تحفظ نہ کرسکے یا ان کی مؤثر نمائندگی نہ کرسکے اور نہ ہی یہ اعتراض ہوسکتا تھا کہ یہ ایسی اقتصادی پارٹی ہے جو شہری طبقہ کے خلاف ہے اور ان کے حقوق کی حفاظت کی اس سے توقع نہیں ہوسکتی۔ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب اپنی سہ سالہ رکنیت مجلس کے دوران میں اس پارٹی کے رکن رہے۔ جن حالات میں اس پارٹی کا قیام عمل میں آیا اور جو کام اس نے کر دکھلایا ان کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کا

جائزہ لیا جائے تو ہر صائب غیر جانبدار رائے یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگی کہ بیس سال کے عرصے میں صوبہ پنجاب اگر ہندوستان کے ایک پسماندہ صوبے کی حیثیت سے بڑھ کر ایک ترقی یافتہ صوبہ شمار ہونے لگا تو اس قلب ماہیت کی داد کی مستحق یونینسٹ پارٹی تھی اور اس پارٹی کی بنیاد رکھنے والے اور روح رواں میاں سر فضل حسین ہر پنجابی کے مخلصانہ شکریہ کے مستحق تھے۔ فجزاہ اللہ۔ آج کے کئی خود ساختہ مؤرخ اس سادہ حقیقت کو نظر انداز کئے ہوئے ہیں کہ بیسویں صدی کا تیسرا اور چوتھا عشرہ ایک دور تھا۔ چوتھے عشرے کے وسط میں وہ دور بدلنا شروع ہوا اور بہت جلد سیاسیات ہند ایک نئے انقلابی دور میں داخل ہوگئی...... اس صدی کے چھٹے اور ساتویں عشرے کے سیاسی نقاد اور مؤرخ بھول جاتے ہیں کہ صدی کے آغاز میں مسلمان باوجود پنجاب میں اکثریت رکھنے کے دوسری قوموں کے مقابلے میں صوبے میں کیا حیثیت رکھتے تھے اور صوبہ پنجاب، صوبجات بنگال، بمبئی اور مدراس کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا تھا۔ اگر 1921ء کے بعد بھی وہی حالات جاری رہتے تو ترقی کے راستے کھلنے پر غیر مسلم عناصر کا قدم ترقی کی شاہراہ پر مسلمانوں کے مقابلے میں تیز سے تیز تر ہوتا جاتا اور ہر سال مسلمانوں کی نسبتی حالت گرتی چلی جاتی۔ قیاس غالب ہے کہ ان نقادوں اور مؤرخین میں سے اکثر کو کالج میں داخلہ بھی نصیب نہ ہوسکتا۔ پنجاب کا درجہ بجائے دوسرے صوبوں کے مقابل میں تدریجاً بلند ہونے کے تدریجاً گرتا چلا جاتا۔ میاں فضل حسین کی مساعی کے نتیجے میں تمام سرکاری اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں میں مسلمان طلبا کے لئے کم از کم چالیس فیصد نشستیں محفوظ ہوئیں۔ صوبہ بھر میں سکولوں اور کالجوں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ صوبہ بھر میں تعلیم کا معیار کیفیت اور کمیت کے لحاظ سے بلند ہونا شروع ہوا۔ ابتدائی تعلیم کے لحاظ سے پنجاب نے اول بڑے صوبوں کی ہمسری کی طرف قدم بڑھانا شروع کیا اور جلد ہی انہیں پیچھے چھوڑ دیا۔ صحت اور طبی محکموں اور اداروں میں چستی پیدا ہوئی۔ شہروں اور دیہات میں شفاخانوں اور ڈسپنسریوں کی تعداد میں ہر سال اضافہ ہونے لگا۔ صوبے کی زندگی کے ہر شعبے کی نبض تیز چلنے لگی۔ میاں سر فضل حسین صاحب دور بینی اور دور اندیشی کے اوصاف سے متصف تھے۔ حسن تدبیر سے کام لیتے تھے۔ درد مند دل رکھتے تھے۔ خدمت کو بھی انعام سمجھتے تھے۔ دوسروں سے کام لینے کا ڈھب انہیں آتا تھا...... 1921ء تا 1935ء کے دور میں میاں سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی بہت کارآمد اور کارگر ثابت ہوئی۔ ترقی کے منصوبوں کے لئے روپیہ کی ضرورت

تھی۔اس پارٹی نے اراضیات پر شرح محاصل کی ایزادی کی تائید میں رائے دے کر روپیہ فراہم کرنے کا سامان کیا۔ یہ کسی پر احسان نہیں تھا۔ پارٹی کے اراکین جانتے تھے کہ یہ روپیہ بلاواسطہ ان کی بہبودی والے منصوبوں پر خرچ ہوگا۔[5]

فیروز خان نون لکھتا ہے کہ ''اگر کسی فرد نے جمہوریت کی تائید میں سب سے زیادہ گراں قدر حصہ ادا کیا ہے تو وہ سر فضل حسین تھے۔انہوں نے یونینسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی جس نے پنجاب میں 1924ء سے 1946ء تک حکومت کی...... وہ جنوری 1921ء میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے۔دوسرے تمام اپنے اپنے اثر ورسوخ کے تحت منتخب ہوئے تھے لیکن سر فضل حسین نے مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں کو ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت کے جھنڈے تلے متحد کر دیا اور اس کا نام یونینسٹ پارٹی رکھا۔ان سب کے درمیان اتحاد کی قدر مشترک ان کا یہ عزم تھا کہ وہ دیہی باشندوں کے مفادات کا تحفظ کریں گے۔اسی عزم کی بدولت دیہی علاقوں کے نمائندے مذہبی عقیدوں سے صرف نظر کرتے ہوئے ایک پلیٹ فارم پر وزارت کی تشکیل کے لئے متحد ہو گئے۔سر فضل حسین نے ایک نہایت شاندار تصور پیش کیا تھا اور وہ کسی شک وشبہ کے بغیر مسلمہ طور پر پورے ایوان کے لیڈر تھے۔اس وقت دیہی اور شہری باشندوں کے درمیان نفرت کا شدید جذبہ تھا اور جب ہم نے منی لینڈرز ایکٹ (سودی قرضہ کا قانون) منظور کیا تو یہ جذبہ شدید تر ہو گیا۔ قانون کے تحت سود کی شرح غیر ادا شدہ قرضہ کے لئے لامحدود سے کم کر کے اٹھارہ فیصد اور ادا کردہ قرضہ کے لئے بارہ فیصد مقرر کر دی گئی۔اس وقت تک ملازمتوں میں دیہی علاقوں کے باشندوں کو خاص طور پر مسلمانوں کو مناسب نمائندگی نہیں دی جاتی تھی چنانچہ سر فضل حسین نے ان کے لئے نشستیں مخصوص کر دیں۔انہوں نے دیہی علاقوں میں سکول اور دوسرے تعلیمی ادارے کھولے اور وہاں سڑکیں تعمیر کیں۔انہوں نے ہر دس مربع میل کے علاقہ میں ایک دیہی شفاخانہ کے قیام کی سکیم شروع کی جو دیہات کے لئے ایک زبردست وسیلۂ رحمت ثابت ہوئی۔ہندو اخبارات ان کی شخصیت پر جتنا زیادہ حملہ کرتے تھے اتنا ہی وہ مسلمانوں میں محبوب بنتے جا رہے تھے۔سکھوں میں سے سر سندر سنگھ مجیٹھیہ اور ہندوؤں میں سے سر چھوٹو رام نے سر فضل حسین سے تعاون کیا...... جب منی لینڈرز بل اسمبلی میں پیش کیا گیا تو ہندو اخبارات اور ہندو لیڈر اس کی مخالفت میں ڈٹ کر کھڑے ہو گئے کیونکہ تقریباً تمام مہاجن ہندو تھے۔قرآن کریم میں سود لینے کی ممانعت کی گئی ہے

اگرچہ ادائیگی پر کوئی پابندی نہیں چنانچہ مسلمان اس نفع بخش پیشہ سے پہلے ہی دور تھے۔[6]

یونینسٹ پارٹی کا نقاد ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی لکھتا ہے کہ "گزشتہ تین سال کے تجربے نے فضل حسین کو یہ سبق سکھا دیا تھا کہ شہری اور کانگرسی ہندوؤں سے اب انہیں کسی قسم کے اشتراک وتعاون یا کسی نوع کی ہمدردی کی ہرگز اُمید نہ رکھنی چاہیے۔ اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی تھی۔ میاں فضل حسین چونکہ بڑے زیرک اور ہوشیار آدمی تھے۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا کہ سوراج پارٹی کے کونسلوں میں داخل ہونے کے بعد ہوا کا رُخ بدلنا شروع ہو گیا تھا۔ مرکزی اسمبلی میں مسٹر جناح کی پارٹی اور سوراجیوں میں کامل اتحاد پیدا ہو گیا تھا اور اس اتحاد کی وجہ سے حکومت کو پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں۔ بنگال میں سی۔آر۔داس کی کوہ پیکر شخصیت نے مسلمانوں کے تمام خدشوں کو دور کر کے انہیں اپنے ساتھ ملا لیا تھا اور اس طرح صوبہ میں حکومت کا نظام اور وزارت کا قیام ناممکن کر دیا تھا۔ فضل حسین کو اندیشہ تھا کہ اگر کل کو پنجاب میں کوئی موتی لال یا کوئی سی۔آر۔داس پیدا ہو گیا جس نے مسلمانوں کے تمام اندیشوں کو دور کر کے ایک زبردست حزب مخالف کی بنا ڈال دی تو ان کا کہیں ٹھکانہ نہیں رہے گا۔ ان خیالات سے متاثر ہو کر انہوں نے کونسل کے ہندو ممبروں میں سے اس شخص کو اپنا رفیق کار منتخب کیا جو شہری آبادی کا سب سے بڑا دشمن اور شہریوں کے حقوق کا سب سے بڑا مخالف تھا...... فضل حسین اور لال چند کی اس مشترکہ پارٹی کا نام نیشنل یونینسٹ پارٹی رکھا گیا اور کونسل کے شہری مسلمان بطیب خاطر اس میں شامل ہو گئے۔ لیکن سوراجیوں اور ہندو مہا سبھائیوں کو یہ کیونکر گوارا ہو سکتا تھا کہ رہتک کا ایک جاٹ ہندو قوم کا نمائندہ بن کر وزارت کی کرسی پر بیٹھ جائے۔ ان کے لئے گویا یہ منصب صرف انہی کے لئے مخصوص ہو چکا تھا۔ چنانچہ میاں فضل حسین کے اس فیصلے کے خلاف صوبے بھر کے شہری ہندوؤں میں ایک ہلچل مچ گئی۔[7]"

پنجاب میں جاگیرداروں کی یونینسٹ پارٹی کے ان تینوں مداحوں اور ایک نقاد کے ان تجزیوں میں ایک بات مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ اس پارٹی کا قیام فضل حسین کی غیر معمولی بصیرت وتدبر کا کارنامہ تھا۔ ان کے مطابق اگر پنجاب کے مسلمانوں میں یہ شخص پیدا نہ ہوتا تو یونینسٹ پارٹی وجود میں نہ آتی اور پھر ظفر اللہ خان کی رائے کے مطابق پنجابی مسلمانوں کے لئے ترقی کی ساری راہیں مسدود رہتیں، وہ پسماندہ تر ہوتے چلے جاتے اور فضل حسین کے "نقادوں اور مؤرخین میں سے اکثر کو کالج میں داخلہ بھی نصیب نہ ہوتا" دراصل یہ مداحین اور نقادان بے

شمار بورژوا مؤرخین میں سے ہیں جن کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی ایک شخص قوم کی تقدیر کو سنوارنے یا بگاڑنے میں فیصلہ کن کردارادا کر سکتا ہے۔ یہ مؤرخین اس نظریے سے اتفاق نہیں کرتے کہ کسی قوم کے تاریخی عمل میں غیر ملکی عوامل کے علاوہ مقامی طبقاتی قوتوں کی کارفرمائی ہوتی ہے اور کوئی شخص اس تاریخی عمل میں صرف اسی صورت قومی اچھائی یا برائی کے لئے مؤثر کردارادا کر سکتا ہے کہ اسے غیر ملکی عوامل کے علاوہ مقامی طور پر اس اچھی یا بری طبقاتی قوت کی امداد و اعانت حاصل ہو جو اس کے زمانے میں سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی بالادستی یا برتری کی حامل ہو۔

پنجاب میں جاگیرداروں کی یونینسٹ پارٹی کا قیام فضل حسین کی ''بے مثال'' سیاسی بصیرت و تدبر کا شاہکار نہیں تھا بلکہ یہ اس کی سیاسی زندگی کا عظیم المیہ تھا۔ عاشق بٹالوی کے بیان کے مطابق فضل حسین ازسرتاپا ایک ترقی پسند بورژوا لیڈر تھا جس نے کانگرس اور مسلم لیگ کے گہوارے میں سیاسی تربیت حاصل کی تھی۔ خاندان، وطنیت، طول قیام، روزگار، تعلیم و تربیت، بودو باش، عادات و اطوار، معیشت و معاشرت، تعلقات و مراسم غرضیکہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر پہلو سے فضل حسین دیہاتی نہیں بلکہ شہری تھا۔ اس کا رہن سہن، انداز نشست و برخاست اور طرز بودو و باش ایسا تھا جس میں ''دیہاتیت'' نام کو نہ تھی۔ ایسے شخص کو کن عوامل نے مجبور کیا تھا کہ وہ پنجاب کے ایسے دقیانوسی جاگیرداروں کا لیڈر بن جائے جن کا ماضی شرمناک تھا، جن کا حال افسوس ناک تھا اور جن کا مستقبل عبرتناک تھا۔ سر ظفر اللہ خان اپنے محسن اعظم میاں سر فضل حسین کے نقادوں کو ''خودساختہ'' مؤرخ کہتا ہے اور یہ طنز کرتا ہے کہ اگر فضل حسین نہ ہوتا تو ان نقادوں اور مؤرخوں میں سے اکثر کو کالج میں داخلہ بھی نہ ملتا۔ چونکہ ظفر اللہ خان اپنے مذہبی عقیدہ کے اعتبار سے خود بھی مضحکہ خیز، پست ذہن اور کوتاہ اندیش تھا اس لئے اس کی سیاسی فکر کی پرواز بھی ایک مرغی کی پرواز سے زیادہ نہ تھی۔ یہ فضل حسین کو بھی ''سیاسی پیغمبر'' کا درجہ دیتا ہے جس نے پنجابی مسلمانوں کی تقدیر سنوارنے کا ''معجزہ'' سرانجام دیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ فضل حسین اس قدر علم و دانش، صلاحیت و قابلیت، فہم و فراست اور بصیرت و تدبر کا حامل تھا کہ اسے قدرتی طور پر پنجاب کے مسلمانوں کے ترقی پذیر وسیع المشرب تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کا لیڈر بننا چاہیے تھا اور ابتداً وہ اسی حیثیت سے صوبہ کی سیاسی سٹیج پر نمودار ہوا تھا۔ لیکن یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ چونکہ اس وقت تک پنجاب کے مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ نے ایک

سیاسی قوت کی حیثیت اختیار نہیں کی تھی اس لئے وہ اس طبقہ کی تائید وحمایت کے سہارے کوئی قابل ذکر سیاسی پیش قدمی نہ کر سکا۔ اس کی سیاسی زندگی میں بنیادی تبدیلی 1919ء میں آئی جبکہ ایک طرف تو حکومت برطانیہ نے نئی آئینی اصلاحات کے تحت ہندوستانیوں کو مزید سیاسی رعایات دیں اور دوسری طرف جدید تعلیم سے بے بہرہ، قدامت پسند ملاؤں نے پان اسلام ازم اور تحفظ خلافت کے نام پر مسلمانان ہند کے درمیانہ طبقہ کی سیاست پر غلبہ حاصل کر لیا۔ وہ محمد علی جناح کی طرح اپنے طبقاتی پس منظر کی بنا پر ایک آئین پسند بورژوا وکیل تھا۔ جس کی خواہش تھی کہ مسلمانان ہند بالعموم اور مسلمانان پنجاب بالخصوص جدید علوم وفنون سے آراستہ ہو کر یورپ کے سرمایہ دار صنعتی معاشرے کی طرح سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی ترقی کی راہ پر گامزن ہوں۔ لیکن پیشہ ور ملاؤں نے مسلم عوام کی سامراج دشمنی، بے روزگاری اور افلاس سے فائدہ اٹھا کر انہیں ایک ایسی راہ پر ڈال دیا تھا جس کی کوئی منزل نہیں تھی۔ چونکہ مسلمانوں کا جدیدیت پسند درمیانہ طبقہ، قدامت پسند مولویوں کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ نہیں تھا اس لئے فضل حسین نے 16راپریل 1919ء کو شملہ میں وائسرائے سے ملاقات کی اور اسے یقین دلایا کہ پنجاب میں گاندھی کی جاری کردہ اینٹی رولٹ ایکٹ ایجی ٹیشن کی وجہ سے جو پرتشدد کاروائیاں ہوئی ہیں وہ اس کے خلاف ہے باوجودیکہ وہ ان دنوں صوبائی کانگرس کا صدر تھا۔ وائسرائے نے اس کے دست تعاون کو بخوشی قبول کر لیا۔

اسی دوران سانحہ جلیانوالہ کے ذمہ دار لیفٹیننٹ گورنر اوڈوائر کو 24رمئی کو اس کے عہدہ سے سبکدوش کر دیا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ روس میں نومبر 1917ء کے پرولتاری انقلاب کے بعد برطانوی سامراج پنجاب کے مسلمانوں کو کچھ رعایت دے کر ان میں بے چینی اور بدامنی کا سدباب کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ 13راپریل کو جلیانوالہ باغ کے بہیمانہ قتل عام کے نتیجے میں مشرقی و وسطی پنجاب میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے لینن کی نئی انقلابی حکومت اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھانے پائے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ حکومت ہند چاہتی تھی کہ پہلی جنگ عظیم میں سلطنت عثمانیہ کا شیرازہ بکھر جانے کے بعد یو۔ پی کے مولویوں نے برطانیہ کے خلاف جو اشتعال انگیزی شروع کر دی ہے اس سے پنجاب کے مسلمان متاثر نہ ہونے پائیں کیونکہ یہ انگریزوں کی فوج میں نہایت اہم عنصر کی حیثیت رکھتے تھے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ حکومت ہند پنجابی مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو ان دنوں ٹھنڈا رکھنا چاہتی تھی کیونکہ افغانستان کے امیر امان اللہ خان نے ہندوستان کے شمال مغربی

علاقے پر حملہ کر دیا تھا اور بعض مولویوں کی طرف سے یہ پروپیگنڈا کیا جارہا تھا کہ یہ حملہ خلافت المسلمین کے احیاء کے لئے کیا گیا ہے اور چوتھی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں پنجاب کے مسلمانوں میں ''اعتدال پسند'' سیاسی قیادت کا زبردست خلا پیدا ہو گیا تھا۔ میاں شاہ دین کا انتقال ہو چکا تھا۔ سر محمد شفیع وائسرائے کی ایگزیکٹو کا رکن بن چکا تھا۔ میاں شاہنواز اور ملک فیروز خان نون کے نامۂ اعمال میں خانۂ سیاست بالکل خالی تھا اور سکندر حیات خان کی صلاحیت وقابلیت کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ وہ جواں سال تھا اور وہ بظاہر اتنی اعلیٰ تعلیم وتربیت سے محروم تھا جتنی کہ فضل حسین نے حاصل کی ہوئی تھی۔ لہٰذا وائسرائے کا قرعہ فال فضل حسین پر پڑ گیا اور وہ شملہ سے ایسا اندازِ فکر لے کر واپس لاہور آیا جو کہ اس کے سابقہ اندازِ فکر سے مختلف تھا۔

فضل حسین کے اندازِ فکر میں مزید تبدیلی 1920ء کے اواخر میں ہوئی جبکہ گاندھی نے بال گنگا دھر تلک کی عدم موجودگی میں کانگرس پر غلبہ حاصل کر کے اس سے تحفظ خلافت اور سوراج کے لئے عدم تعاون کی تحریک چلانے کا فیصلہ کروالیا۔ مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کے جن باشعور عناصر کو گاندھی کی یہ منافقانہ مذہبی سیاست پسند نہیں آئی تھی ان میں محمد علی جناح کے علاوہ فضل حسین بھی شامل تھا۔ چنانچہ جناح کی طرح اس نے بھی کانگرس سے قطع تعلق کر کے نئی اصلاحات پر عملدرآمد کے لئے انگریزوں سے تعاون کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ حکومت ہند کو اس کا یہ فیصلہ بہت پسند آیا۔ اس کی ایک نئی وجہ یہ پیدا ہوگئی تھی کہ تحریک ہجرت کے باعث شہری مسلمانوں میں بہت ہیجان پیدا ہو گیا تھا اور اس امر کی اطلاعات بھی ملی تھیں کہ بعض پنجابی مہاجرین انگریزوں کے خلاف سوویت یونین کی امداد حاصل کرنے کے لئے ماسکو پہنچ گئے ہیں اور کابل میں جو ''آزاد ہند حکومت'' بنی ہے اس کا وزیراعظم ایک مسلمان مولوی برکت اللہ ہے۔

یہی وجوہ تھیں کہ جنوری 1921ء سے لے کر 1923ء تک فضل حسین نے پنجاب کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے مسلمانوں کے شہری درمیانہ طبقہ کی جو گراں قدر خدمات سرانجام دیں انہیں صوبائی گورنر سر ایڈورڈ میکلیگن اور کونسل میں سرکاری بلاک کے نامزد ارکان کی تائید وحمایت حاصل رہی۔ عاشق بٹالوی جیسا کوئی ''خود ساختہ'' مؤرخ یا سر ظفر اللہ خان جیسا کوئی ''خدا ساختہ'' مؤرخ اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ فضل حسین صوبائی گورنر کی امداد واعانت کے بغیر ایسی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے سکتا تھا اور نہ ہی وہ میڈیکل کالج کے انگریز پرنسپل کو مستعفی ہونے

پر مجبور کر سکتا تھا۔

فضل حسین کو اپنے ہر اقدام کے لئے صوبائی گورنر اور کونسل میں سرکاری بلاک کی تائید و حمایت پر اس لئے بھی انحصار کرنا پڑتا تھا کہ پنجابی ہندوؤں کے ترقی یافتہ درمیانہ اور سرمایہ دار طبقے سیاسی لحاظ سے بہت ہی تنگ نظر اور تنگدل تھے۔ ان کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ وہ اس صوبہ کی پسماندہ مسلم اکثریت کو ذرا سی سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی رعایت دینے پر آمادہ نہیں تھے۔ تجارت، صنعت اور سرکاری اداروں میں ان کی تقریباً اجارہ داری تھی اور وہ اس اجارہ داری کو بہر قیمت قائم رکھنا چاہتے تھے حالانکہ ان کی آبادی تیس پینتیس فیصد سے زیادہ نہیں تھی۔ انہیں ہندو۔مسلم تضاد کے تاریخی پس منظر اور معاشی مفادات نے اندھا کر رکھا تھا۔ سر گنگا رام جیسے مخیر ہندو کھلم کھلا اعلان کرتے تھے کہ ان کے کسی بھی فلاحی ادارے سے کوئی مسلمان مستفید نہیں ہو سکتا۔ لاہور شہر کے انارکلی بازار میں کوئی مسلمان کسی ہندو کے ہاتھ سے گلاس میں پانی نہیں پی سکتا تھا۔ وہ ملیچھ تھا۔ اسے دور ہی سے چلّو میں پانی پلایا جاتا تھا۔ لوہاری کے چوک میں ایک ہندو کی بہت بڑی دودھ، دہی کی دکان تھی۔ اس نے مسلمان گاہکوں کو لسی دینے کے لئے الگ گلاس رکھے ہوئے تھے۔ مسلمان گاہک خود ہی وہاں سے گلاس اٹھاتا تھا، دکاندار دور ہی سے اس میں لسی ڈال دیتا تھا جسے پینے کے بعد ''مُسلا'' خود ہی گلاس دھو کر وہیں رکھ دیتا تھا۔ اگر ہندوؤں کے ان مفاد پرست طبقوں میں اتنی زیادہ تنگدلی اور تنگ نظری نہ ہوتی تو وہ ضرور کوئی ایسا وسیع القلب اور وسیع النظر لیڈر پیدا کرتے جو صوبہ میں پسماندہ مسلم اکثریت کو کچھ رعایات دے کر اس کا دل موہ لیتے اور پھر فضل حسین جیسے لیڈر کو مسلمانوں کے لئے ترقی کی کچھ راہیں کھولنے کے لئے انگریزوں اور جاگیرداروں کے سامنے گھٹنے ٹیکنے نہ پڑتے۔ جب راجہ نریندر ناتھ نے 1923ء میں فضل حسین کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی تھی اور کونسل کے سارے ہندو اور سکھ ارکان نے اس تحریک کے حق میں ووٹ دیئے تھے تو انہوں نے پنجابی مسلمانوں کے اس لیڈر کو بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں ہی سیاسی طور پر اس مقام پر پہنچا دیا تھا جہاں محمد علی جناح تیسرے عشرے کے اواخر میں پہنچے تھے۔ عاشق بٹالوی کا یہ کہنا ہے کہ تین سال کے تجربے نے فضل حسین کو یہ سبق سکھا دیا تھا کہ شہری اور کانگرسی ہندوؤں سے اب اسے کسی قسم کے اشتراک و تعاون یا کسی نوع کی ہمدردی کی ہرگز امید نہیں رکھنی چاہیے۔ بلکہ

یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس عرصے میں پنجابی مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ ہندوؤں سے سیاسی، معاشرتی انصاف کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ یہی وجہ تھی کہ شہری مسلمانوں کی انجمنوں نے قراردادیں منظور کرکے برملا اس کی تائید کی تھی۔ مسلمانوں کے وفود نے گورنر کے پاس جا جا کر اس پالیسی کی حمایت کی تھی۔ یہاں تک کہ مسجدوں میں فضل حسین کی تندرستی اور درازیٔ عمر کی دعائیں مانگی جانے لگی تھیں حالانکہ اس کی گرانقدر خدمات میں گورنر میکلیگن کا ہاتھ ہوتا تھا۔ یہ گورنر پنجابی مسلمانوں کو کچھ رعایات دینے کے حق میں اس لئے نہیں تھا کہ یہ شریف الطبع یا انصاف پسند تھا یا اسے یکایک مسلمانوں سے محبت ہوگئی تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانے میں اس کی حکومت کے عالمی سامراجی مفادات کا تقاضا یہی تھا۔

پنجابی مسلمانوں کے شہری درمیانہ طبقہ کی ہندوؤں کے درمیانہ وسرمایہ دار طبقوں سے مایوسی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ 5رفروری 1922ء کو گاندھی کی جانب سے عدم تعاون کی تحریک کے واپس لئے جانے کے بعد پورے برصغیر میں ہندو۔مسلم فسادات کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوگیا تھا کہ جس کے پیش نظر ہندو۔مسلم مفاہمت کی کوئی صورت ہی نظر نہیں آتی تھی۔ مارچ اور اپریل 1923ء میں امرتسر اور ملتان میں شدید فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جن میں کئی جانوں کا اتلاف ہوا۔ مئی 1923ء میں امرتسر میں پھر فساد ہوا اور سندھ میں بھی گڑ بڑ ہوئی۔ جون اور جولائی 1923ء میں مرادآباد، میرٹھ، الہ آباد اور اجمیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کا خون بہایا اور پھر اگست اور ستمبر 1923ء میں امرتسر، پانی پت، جبلپور، گونڈا، آگرہ اور رائے بریلی میں خونریزی ہوئی۔ سہارنپور میں محرم کے جلوس کے موقع پر اتنے چُھرے چلے کہ سڑکیں خون سے سرخ ہوگئیں چنانچہ اس کے بعد دہلی، ناگپور، لاہور، لکھنؤ، بھاگل پور، گلبرگہ اور شاہجہاں پور وغیرہ میں دونوں فرقوں کے لوگوں نے خوب خون کی ہولی کھیلی۔

اس تلخ پس منظر میں جب جنوری 1924ء میں فضل حسین جاگیرداروں کی غیر فرقہ وارانہ جماعت یونینسٹ پارٹی کا لیڈر بن گیا تو پنجابی مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کے جدیدیت پسند عناصر نے بحیثیت مجموعی اس پر کوئی اعتراض نہ کیا بلکہ کونسل کے تین خلافتی ارکان کے سوا باقی سارے شہری مسلمان ارکان کونسل برضا ورغبت اس پارٹی کے رکن بن گئے۔ اگرچہ ان عناصر کا جاگیرداروں کے ساتھ قدرتی طور پر طبقاتی تضاد تھا لیکن یہ تضاد وقتی طور پر فرقہ وارانہ تضاد کے

خون میں غرق ہو گیا تھا۔ ان عناصر کا خیال تھا کہ چونکہ فضل حسین خود شہری درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتا ہے اس لئے وہ اپنے طبقہ کے مفادات سے بے وفائی نہیں کرے گا اور دقیانوسی جاگیرداروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی نہیں بنے گا۔ ان عناصر پر ہندو۔ مسلم تضاد اس قدر غالب آیا ہوا تھا کہ انہیں یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ جاگیرداروں کی یہ نام نہاد غیر فرقہ وارانہ پارٹی گورنر میکلیگن کی اجازت اور منظوری کے بغیر نہیں بن سکتی تھی۔ گورنر میکلیگن نے کونسل میں اس پارٹی کی تشکیل کی اجازت اس لئے دی تھی کہ وہ دوسرے انگریز ارباب اقتدار کی طرح مسلمانوں کے ابھرتے ہوئے درمیانہ طبقہ سے بھی اتنا ہی خائف تھا جتنا کہ وہ شہری ہندوؤں کے ترقی یافتہ طبقوں سے تھا۔ فضل حسین کی جانب سے اس گٹھ جوڑ کی بنیاد سراسر اس کی سیاسی مصلحت پر تھی۔ اس سلسلے میں اس کے رویے میں دوغلہ پن اور تضاد تھا۔ وہ ایک طرف تو جداگانہ طریق انتخاب کا اس قدر حامی تھا کہ وہ اس کے خلاف ایک لفظ سننے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا لیکن دوسری طرف وہ جاگیرداروں کی غیر فرقہ وارانہ جماعت کا لیڈر بننے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ ایک طرف تو مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کے نوجوانوں کو جدید علوم وفنون سے آراستہ کرنا چاہتا تھا لیکن دوسری طرف اس نے ایسے ان پڑھ یا نیم تعلیم یافتہ جاگیرداروں سے اتحاد کیا تھا جو ہر قسم کے علم و دانش کے دشمن تھے اور جو کئی پشتوں سے برطانوی سامراج کے اتنے وفادار پٹھو تھے کہ وہ کوئی چھوٹا بڑا کام اپنے ضلع کے ڈپٹی کمشنر کی اجازت و منظوری کے بغیر نہیں کرتے تھے۔ اس پارٹی میں وہ ''چیفس آف پنجاب'' شامل تھے جن کا ماضی اس قدر شرمناک اور گھناؤنا تھا کہ ان سے مسلمانوں کی کسی اجتماعی بھلائی کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ برطانوی سامراج کی اولاد تھے اور اس کو اپنا ''مائی باپ'' سمجھتے تھے۔

یونینسٹ پارٹی میں شامل جاگیرداروں کا تاریخی پس منظر

یونینسٹ پارٹی میں نواب مظفر علی قزلباش تھا جس کے دادا علی رضا خان نے 1839ء میں پہلی افغان جنگ کے دوران نہ صرف انگریزی فوج کو اناج اور ذرائع نقل وحمل مہیا کئے تھے بلکہ جب افغان حریت پسندوں نے ان سامراجی فوجوں کا محاصرہ کر لیا تھا تو اس نے محصورین کی امداد کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ اس نے محصور فوجوں کو اناج اور کپڑے مہیا کئے تھے اور جن انگریز افسروں کو ان کی عورتوں کے ہمراہ قید کر لیا گیا تھا اس نے ان کی ہر طرح سے

دیکھ بھال کی تھی۔ وہ اس مقصد کے لئے جیل کے کیپر محمد شاہ خان غلزئی کو پانچ سو روپے ماہوار بطور رشوت دیتا رہا تھا۔ اس نے تقریباً ایک سو ہندوستانی سپاہیوں کو اپنے گھر میں اس وقت تک پناہ دی تھی جب تک کہ دوسری انگریزی فوج کابل نہیں پہنچ گئی تھی...... اس پس منظر میں انگریز ارباب اقتدار کی رائے یہ تھی کہ پورے ہندوستان میں ایسا خاندان ملنا مشکل ہے جس نے ان کی حکومت کی اس قدر بے لوث خدمت کی ہو۔ ان کا کہنا تھا کہ جب تک کابل کی تباہ کن مہم یاد رہے گی اور پھر جب تک ہمارے گھروں میں 1857ء کے غم واندوہ اور شان وشوکت کا ذکر ہوتا رہے گا، اس وقت تک سارے سچے انگریز علی رضا خان اور اس کے بہادر خاندان کو شکریے اور احترام کے ساتھ یاد کرتے رہیں گے۔ [8]

اس پارٹی میں نواب شاہ نواز ممدوٹ بھی تھا جس کے دادا جمال الدین خان نے 1845ء میں فیروز پور کے نزدیک انگریزوں اور سکھوں کی لڑائی کے دوران یکا یک سکھوں کا ساتھ چھوڑ کر انگریز کمانڈر سر جان لٹلر (John Littler) کی امداد کی تھی چنانچہ اس کے معاوضے میں اس کی جاگیر کو بحال رکھا گیا تھا۔ پھر 1848ء میں اس کے بھائی جلال الدین نے ملتان میں انگریزوں کا ساتھ دیا تھا۔ چنانچہ اس خدمت کے اعتراف کے طور پر جمال الدین کو نواب کا خطاب دیا گیا تھا اور اسے امن کے زمانے میں ساٹھ گھوڑ سوار اور جنگ کے زمانے میں ستر گھوڑ سوار رکھنے کی اجازت دی گئی تھی۔ [9]

فضل حسین کی اس پارٹی میں ضلع شاہ پور کے ٹوانے شامل تھے جن کے پردادا ملک فتح شیر خان نے نہ صرف 49-1848ء میں انگریزوں کی سکھوں کے ساتھ آخری لڑائی میں ملتان میں چار سو گھوڑ سواروں کے ساتھ ایڈورڈز لارنس کی مدد کی تھی بلکہ اس نے 1857ء میں غدر کے دوران سب سے پہلے پنجاب کے بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کے چیئرمین جان لارنس کی امداد کی تھی۔ وہ ایک دم گھوڑ سواروں کی ایک رجمنٹ تیار کر کے انگریزوں کی ہریانہ فیلڈ فورس کی مدد کو پہنچ گیا تھا۔ ملک فتح شیر اور اس کے لشکر نے ہسار، بنگال اور جمال پور میں بڑی بہادری کے ساتھ انگریزی فوجوں کی اعانت کی تھی اور باغیوں کا قلع قمع کیا تھا۔ جب دہلی میں باغیوں نے ہتھیار ڈال دیئے تو ٹوانوں کے لشکر کو کرنل جیرالڈ کی فوج کے ساتھ منسلک کر دیا گیا تھا۔ اس لشکر نے نرنول کی لڑائی میں اچھی کارگزاری کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے باغیوں کو مکمل طور پر شکست ہوگئی اور انہیں بھاری

جانی نقصان اٹھانا پڑا۔[10]

ملک خضر حیات خان ٹوانہ کے دادا خان بہادر ملک صاحب خان نے 1848ء میں ایک سکھ سردار بھائی مہاراج سنگھ کا تعاقب کر کے اسے اور اس کے ساتھیوں کو پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ وہ ساہیوال کے لنگر خان کے ساتھ طویل مسافت طے کر کے جھنگ پہنچا تھا اور بھائی مہاراج سنگھ پر حملہ میں شریک تھا۔ اس لڑائی میں صاحب خان خود بھی لڑا تھا اور اس نے مہاراج سنگھ کے کئی پیروکاروں کو ہلاک کیا تھا۔ بعد ازاں صاحب خان اپنے آدمیوں کو ملتان لے گیا تھا اور وہ اس شہر کے محاصرے کی ابتدا میں وہاں موجود تھا۔ وہاں سے اس نے انگریزوں کی ہدایت کے مطابق چاچراں کے مقام پر سکھوں پر حملہ کر کے انہیں شکست دی اور ان کے بہت سے سپاہیوں کو قتل کر دیا۔ مئی 1857ء میں جب غدر کا آغاز ہوا تو صاحب خان نے 300 گھوڑ سواروں پر مشتمل ایک لشکر تیار کیا جس کی مدد سے اس نے پہلے جہلم میں اور پھر انبالہ میں باغیوں کے خلاف انگریزوں کی امداد کی۔ یہاں صاحب خان کی تجویز کردہ تدابیر کے مطابق عمل کیا گیا تو دوسو باغیوں کو کوئی گولی چلائے بغیر پکڑ لیا گیا۔ یہ کارروائی مکمل ہوئی تو اس کے لشکر کو کانپور بھیجا گیا۔ جہاں اس نے جمنا کے راستے کی کامیابی سے نگہبانی کی۔ اس نے کلپی کے مقام پر ان مزدوروں کی حفاظت کی جو توپ خانہ نصب کرنے کے کام میں مصروف تھے اور پھر اس نے وسطی ہندوستان کے جنرل نیپئر (Napier) کا ساتھ دیا اور یہ ہر لڑائی میں آگے ہوتا تھا۔[11]

ملک خضر حیات خان کے والد ملک عمر حیات خان نے پہلی جنگ عظیم میں، تیسری افغان جنگ میں اور 1919ء کے بلووں میں جو خدمات انجام دیں وہ سر لیپل (Lepel) کے بیان کے مطابق اتنی زیادہ اور اتنی گرانقدر ہیں کہ انہیں الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ وہ صوبائی کونسل کا پہلا رکن تھا جس نے جنگ کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ چنانچہ اسے ہندوستانی فوج کے ساتھ فرانس بھیجا گیا جہاں یہ اس فیروز پور بریگیڈ میں شامل تھا جو اکتوبر 1914ء کی پسپائی کے موقع پر فائرنگ لائن میں سب سے آگے تھا۔ اس نے میسوپوٹیمیا (عراق) میں جاسوسی اور پروپیگنڈا کا بھی بہت مفید کام کیا۔ چنانچہ اسے فرانس اور عراق میں خدمات کے اعتراف کے طور پر سر کا خطاب دیا گیا تھا۔ جب یہ ان محاذوں سے واپس آیا تو اس نے نئے رنگروٹوں کی بھرتی میں بہت مدد کی۔ اس کی اپنی جاگیر کے بہت سے لوگ بھی فوج میں بھرتی ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ

اس نے اپنے خرچ پر کیا تھا اور پوری جنگ کے دوران اس نے حکومت سے کوئی مالی امداد نہیں لی تھی۔ تاہم اسے مالیہ کی معافی اور انگروتنگ بیج دیا گیا تھا۔ جب 1919ء میں پنجاب میں بلوے ہوئے اور افغانستان کے ساتھ انگریزوں کی تیسری جنگ ہوئی تو عمر حیات خان نے حسب سابق سرکار والا تبار کی ہر قسم کی امداد کرنے کی میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ جب ببرا کالیوں نے شورش کی تھی تو اس نے 150 گھوڑ سواروں کے ساتھ سول انتظامیہ کی اعانت کی تھی۔ اس کے اس لشکر کے ایک حصے کو سالٹ رینج کے ''ڈاکوؤں'' کے خلاف بھی استعمال کیا گیا تھا۔ لہٰذا جب یہ انڈین کونسل کا رکن بنا تھا تو اسے پورا کرنل بنا دیا گیا تھا اور شہنشاہ معظم کا اے۔ ڈی۔ کیمپ مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے بیٹے ملک خضر حیات خان نے بھی 1918ء میں قابل قدر جنگی خدمات سرانجام دی تھیں اور 1919ء کے بلووں کے دوران بھی بڑی سرگرمی سے مطلوبہ خدمت سرانجام دی تھی چنانچہ اس نے تیسری افغان جنگ میں بھی لاہور ڈویژن کے جنرل آفیسر کمانڈنگ کے اے۔ ڈی۔ سی کی حیثیت سے اتنا اچھا کام کیا تھا کہ اسے افغان میڈل عطا کیا گیا تھا۔ 1921ء کی عدم تعاون کی تحریک کے دوران بھی اس نے امن وامان قائم رکھنے کے لئے سول انتظامیہ کی امداد میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا تھا[12]

ملک سر عمر حیات خان ٹوانہ، ملک فیروز خان نون کا نزدیکی رشتہ دار تھا جس کے دادا ملک فتح خان نے ملک صاحب خان کی طرح 1848ء میں ملتان، جہلم اور بنوں میں بہت خدمت کی تھی۔ چنانچہ اسے 1200 روپے کی پنشن دی گئی تھی۔ اس کے بیٹے ملک محمد حیات خان کو ایچی سن کالج میں تعلیم دلوا کر 1901ء میں پنجاب پروانشل سروس میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس نے اس سروس میں اتنا ''اچھا'' کام کیا تھا کہ یہ ڈپٹی کمشنر کے عہدے پر پہنچ گیا تھا۔ اسے 1923ء میں نواب کا خطاب دیا گیا تھا جبکہ اسے صوبائی دربار میں بھی کرسی ملتی تھی اور یہ تحصیل بھلوال ضلع شاہ پور میں وسیع رقبہ اراضی کا مالک تھا۔[13]

فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی میں ضلع کیمبلپور کے کھٹڑ خاندان کا فرزند ارجمند سکندر حیات خان بھی شامل تھا جس کے والد محمد حیات خان نے 1857ء کے غدر کے دوران آفریدیوں کا ایک لشکر منظم کر کے پشاور کے ڈپٹی کمشنر نکلسن (Nicholson) کی بہت امداد کی تھی۔ اس نے پہلے تو ہوتی ضلع مردان میں باغیوں کی سرکوبی میں عملاً امداد کی اور پھر جنرل نکلسن کے ہمراہ

دہلی پہنچا تھا اور وہاں وہ شہر کے محاصرہ کے دوران بڑی ''بہادری'' سے لڑا تھا۔ جب جنرل نکلسن دہلی کی لڑائی میں زخمی ہو گیا تھا تو اس نے ذاتی طور پر اس کی دیکھ بھال کی تھی اور مرتے دم تک اس کے پاس رہا تھا۔ چنانچہ اسے انعام کے طور پر 250 روپے سالانہ کی پنشن دی گئی تھی اور اسے خلعت بھی عطا ہوئی تھی۔ خود سکندر حیات خان نے علی گڑھ اور لندن میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد پہلی جنگ کے دوران رنگروٹوں کی بھرتی میں بڑا کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ اس نے انگریزوں کی جانب سے تیسری افغان جنگ میں ایک کمپنی کمانڈر کی حیثیت سے حصہ لیا تھا۔ اس نے بھرتی کے لئے جو کام کیا تھا اس کے انعام کے طور پر اسے سند اور خلعت عطا ہوئی تھی اور 1918ء میں اسے آنریری مجسٹریٹ بنا دیا گیا تھا۔[14]

سردار محمد نواز خان آف کوٹ فتح خان کے دادا فتح خان نے 49-1848ء میں سکھوں کی آخری لڑائی کے دوران نکلسن اور ایبٹ کی اعانت کی تھی۔ اس نے نہ صرف ان کے لئے ذرائع مواصلات کا تحفظ کیا تھا بلکہ سپاہیوں کی بھاری جمعیت بھی مہیا کی تھی۔ 1857ء میں فتح خان کی وفاداری بہت نمایاں رہی۔ لہٰذا اسے 600 روپے سالانہ کی پنشن، ایک ہزار روپے کی خلعت اور جاگیر عطا ہوئی۔ 1860ء میں اسے جاگیردار مجسٹریٹ بنا دیا گیا تھا اور اسے 18 دیہات میں سول اور فوجداری مقدمات کے فیصلے کرنے کا اختیار حاصل تھا۔ 1866ء میں اسے 3000 ایکڑ کی مزید جاگیر دی گئی تھی تاکہ وہاں گھوڑے اور مویشی پال سکے اور 1888ء میں خان بہادر کا خطاب دیا گیا تھا۔[15]

ملک عطا محمد خان نواب آف کالاباغ کے دادا ملک مظفر خان اور اس کے بیٹے یار محمد نے ایک سو سپاہی بھرتی کر کے ہربرٹ ایڈورڈز (Herbert Edwards) کی کمان میں دے دیئے تھے، جس نے ان کو پشاور کے درۂ خیبر پر متعین کر دیا تھا۔ خود یار محمد خان بھی پشاور میں دفعدار تھا۔ اس نے دوسری افغان جنگ کے دوران سپاہیوں کے علاوہ بار برداری کے لئے بہت سے مویشی بھی مہیا کئے تھے۔ ملک عطا محمد نے پہلی جنگ عظیم میں حکومت کو ایک لاکھ روپے قرضہ دیا تھا اور 75 ہزار روپے ایک جنگی ہوائی جہاز بنانے کے لئے اور 35 ہزار روپے گھوڑے خریدنے کے لئے دیئے تھے اور پھر 7 ہزار روپے ان لوگوں کی امداد کے لئے دیئے تھے جو جنگ میں زخمی ہو گئے تھے۔ جب 1924ء میں اس کا انتقال ہوا تھا تو اس کا بیٹا امیر محمد خان نابالغ تھا لہٰذا عیسیٰ خیل

اور میانوالی میں اس کی جاگیر کا انتظام کورٹ آف وارڈز کے سپرد کر دیا گیا تھا۔[16]

نواب مشتاق احمد گرمانی کا تعلق ضلع مظفر گڑھ کے پیروں کے خاندان سے تھا۔ اس کے والد محمد زمان نے پہلی جنگ عظیم کے دوران بہت سے لوگوں کو بھرتی کروایا تھا اور ایک کثیر رقم چندہ کے طور پر بھی دی تھی۔ اس کے خاندان کی انگریز بہادر سے وفاداری کا یہ عالم تھا کہ اس کا ایک بھائی سلطان احمد 1917ء میں رنگروٹوں کی بھرتی کے لئے ملتان کے ایک ایسے علاقے میں چلا گیا تھا جہاں ہیضہ کی وبا پھیلی ہوئی تھی اور یہ وہیں ہیضہ میں مبتلا ہو کر مر گیا تھا۔ انگریزوں نے اس کی اس قربانی کی قدر کی اور اس کے خاندان کو دس مربع اراضی اور 500 روپے کی جاگیر عطا کی۔ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر نے میاں محمد زمان خان کو ایک سند، خلعت اور بندوق بھی دی تھی۔ 1920ء میں اس کا انتقال ہوا تو مشتاق احمد گرمانی اور نیاز احمد گرمانی اس کی وسیع وعریض جائیداد کے وارث تسلیم کر لئے گئے۔[17]

میاں احمد یار خان دولتانہ کا مورث اعلیٰ غلام محمد لڈن تھا جس نے اپنے نام پر لڈن کے نام کا ایک گاؤں آباد کیا تھا۔ وہ ضلع ملتان کی تحصیل وہاڑی میں ایک ایسے جرائم پیشہ قبیلہ کا سردار تھا جو رسہ گیری اور دوسرے جرائم کی وجہ سے ستلج کے دونوں کناروں پر بہت خوف و ہراس پھیلاتا تھا۔ بالآخر انگریزوں نے اس قبیلہ کو رام کر لیا اور ان کے سردار لڈن کو 16000 ایکڑ اراضی اس شرط پر بطور انعام دی کہ آئندہ اس کے قبیلہ کی طرف سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوگا۔[18]

ملتان کے گیلانی مخدوم زادے ''خیر خواہان برطانیہ'' میں سے تھے۔ ان کو میجر ہربرٹ ایڈورڈز نے ایک سند دی تھی جس میں ان کی وفا شعاری کی تعریف کی گئی تھی۔ سر جان لارنس نے بھی 1857ء میں قوم فروشانہ خدمات پر مخدوم سید نور شاہ کو ایک سند اور 300 روپے کی ایک خلعت عطا کی تھی۔ 1876ء میں ''پیر سید ولایت شاہ'' کو گیلانی رئیس قرار دے کر آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے بعد مخدوم سید صدر الدین شاہ ''صوبائی درباری'' کہلائے۔[19]

فضل حسین کا دست راست یا پروردۂ خاص سر محمد ظفر اللہ خان ضلع گورداسپور کے جس مذہبی پیشوا مرزا غلام احمد کا پیروکار تھا وہ مغل میرزوں کی ایک شاخ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا مورث اعلیٰ سمرقند کا ایک برلاس مغل ہادی بیگ تھا جو بابر کے عہد میں ضلع گورداسپور میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ اس خاندان کے پاس قادیان اور اردگرد کے 82 دیہات کی جاگیر تھی لیکن آپس کے لڑائی

جھگڑوں نے سب ضائع کر دی۔ آخر رنجیت سنگھ نے میرزا غلام مرتضٰے کو فوجی خدمات کے عوض اس جاگیر کا معتدبہ حصہ واپس کر دیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں اس خاندان نے انگریز کا ساتھ دیا اور جنرل نکلسن سے تعریفی سرٹیفکیٹ پایا۔ میرزا غلام مرتضٰے کی وفات کے بعد میرزا سلطان احمد اس خاندان کا سربراہ مقرر رہا جو پہلے نائب تحصیلدار پھر ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھا۔[20] مرزا غلام احمد اسی کے گھر میں 1835ء کو پیدا ہوا تھا اور اس نے مختلف اداروں سے روایتی تعلیم حاصل کرنے کے بعد 1891ء میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اس نے مسلمانوں کے مسئلہ جہاد پر کئی کتابیں لکھیں اور یہ مؤقف اختیار کیا کہ انگریزوں کی ''مہربان حکومت'' کے خلاف جہاد حرام ہے۔ وہ ساری زندگی حکومت برطانیہ کا وفادار رہا اور اس نے اپنے پیروکاروں کو بھی یہ ہدایت کی کہ وہ بھی مسلسل حکومت کے وفادار رہیں۔[21]

مرزا غلام احمد انگریزی راج کی اس برکت کی بے حد قدر کرتا تھا جو اسے اپنے نئے مذہبی عقائد کی تبلیغ کی اجازت دیتی تھی۔ عامۃ المسلمین کو مرزا غلام احمد کے خلاف سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ انگریزوں کا ذلیل خوشامدی ہے۔ اس نے مسئلہ جہاد کے متعلق اپنی کتاب سرحد پر ہونے والے واقعات کے پیش نظر لکھی تھی۔ ان واقعات میں متعدد انگریز افسر مارے گئے تھے اور اس بنا پر ہر انگریز افسر کو یہ ہدایت کی جاتی تھی کہ وہ ''غازی'' کی طرف سے ہوشیار رہے یعنی اس مذہبی دیوانے افغان یا قبائلی سے جو کسی کافر کو قتل کرنا کارِ ثواب سمجھتا تھا۔ جب مرزا غلام احمد نے اپنے عقیدۂ جہاد کی تاویل میں ''مہربان انگریزی حکومت'' اور اس کی مذہبی رواداری کی طرفداری نہایت خوشامدانہ لہجہ میں کرنی شروع کی تو اس تاویل پر چند در چند شبہات پیدا ہوئے۔ پھر جب مرزا غلام احمد نے ممالک اسلامی کی عدم رواداری اور انگریزوں کی فراخدلانہ مذہبی پالیسی کا مقابلہ و موازنہ توہین آمیز انداز میں کیا تو مسلمانوں کا غیظ و غضب اور بھی زیادہ مشتعل ہو گیا۔ جب پہلی جنگ عظیم میں 1918ء میں بغداد پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا اور قادیان میں اس ''فتح'' پر جشن مسرت منایا گیا تو مسلمانوں میں شدید برہمی پیدا ہوئی اور احمدی انگریزوں کے پٹھو سمجھے جانے لگے۔[22] چنانچہ اس کے اور اس کے خلیفوں کے ساتھ مذہبی مباحثوں میں ملحد، مرتد، کافر، زندیق، مشرک، منافق، فاسق، فاجر، مفتری، ملعون، کذاب، شیطان، ابلیس اور مردود کے الفاظ عام استعمال ہونے لگے اور پھر فریقین نے ایسے الفاظ بھی استعمال کئے جو چنداں اصطلاحی نہ تھے

مثلاً ولد الزنا، ولد الحرام، خنزیر، طوائفیں، رنڈیاں، کتیاں، شرابی، بدکار، فریبی، غنڈہ، بے حیا اور بے شمار اسی قسم کے دیگر الفاظ زیر استعمال آئے۔ اس ساری دشنام طرازی کا پس منظر یہ تھا کہ مرزا غلام احمد اور اس کے پیروکاروں نے انیسویں صدی میں 1857ء کی جنگ آزادی، اس کے بعد دوسری افغان جنگ اور پھر اس کے بعد انگریزوں کی ترکوں کے خلاف جنگ اور پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ کے بعد 1919ء کے بلووں میں انگریزوں کی ہر ممکن امداد و اعانت کی تھی جبکہ مسلمانان ہند میں سامراج دشمنی کا جذبہ موجزن تھا۔

ضلع جھنگ کے سیال بھی فضل حسین کی پارٹی میں شامل تھے۔ ان سیالوں نے انگریزوں کی خدمت کر کے انعام و اکرام بھی پایا۔ چنانچہ ان میں سے محمد اسماعیل خان کو نہ صرف جھنگ کے پولیس سواروں کا رسالدار بنایا گیا بلکہ جنگ آزادی کی گورا فوج کی امداد کے عوض اسے جاگیر، پنشن اور خلعت سے بھی نوازا گیا۔ بعد میں رابرٹ ایجرٹن (Robert Eegerton) کی سفارش پر جاگیر میں اضافہ کر دیا گیا اور اسماعیل خان کو میونسپلٹی اور صوبائی دربار میں عہدے بھی دیئے گئے۔ اس خاندان کے پاس جاگیر کے علاوہ بیس دیہات کی زمین کے مالکانہ حقوق تھے۔ سیالوں کی شاخ ملتان کی تحصیل کبیر والا میں بھی آباد تھی اور اس کے افراد خطابوں اور عہدوں سے مالا مال تھے۔[23]

کمالیہ ضلع لائل پور (فیصل آباد) کا کھرل خاندان بھی فضل حسین کے ساتھ تھا۔ اس خاندان کی سرفرازی کی وجہ یہ تھی کہ اس کے ایک سردار سرفراز خان نے 1857ء میں انگریزوں کی اطاعت و وفاداری کو اپنا شعار بنایا جس کے صلہ میں اسے 525 روپے کی جاگیر اور 500 روپے کی خلعت ملی۔ یہی شخص تھا جس نے راتوں رات کیپٹن الفنسٹن کے گھر پہنچ کر آدھا گھنٹہ پہلے مخبری کی کہ کھرل اس پر حملہ کرنے والے ہیں جس پر اس نے اپنی حفاظت کے لئے لاہور سے بروقت امداد طلب کر لی۔"[24]

ملتان میں مخدوم قریشیوں کے آباؤ اجداد شیخ بہاوالدین زکریا کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ سکھوں کے زمانے تک اس مزار کے نام پر جو جاگیرداری رہی وہ ضائع ہو چکی تھی۔ رنجیت سنگھ نے 1818ء میں ملتان فتح کیا تو سجادہ نشین کے نام ساڑھے تین ہزار روپے کا وظیفہ لگا دیا۔ انگریزوں نے 49-1848ء میں پنجاب کا الحاق کیا تو سجادہ نشین کی جاگیر اور وظیفہ میں بھی اضافہ

کر دیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں اس خانقاہ کے جانشین مخدوم شاہ محمود نے انگریزوں کو خفیہ اطلاعات پہنچائیں، گھوڑ سوار مہیا کئے اور اپنے مریدوں کو منع کیا کہ مجاہدین کا ساتھ نہ دیں۔ انگریز اس سے بہت خوش ہوا۔ اس نے شاہ محمود کو تین ہزار روپے نقد انعام کے علاوہ 1780 روپے کی جاگیر اور آٹھ کنوئیں دیئے۔ جب وائسرائے لاہور آیا تو اس نے اسے بھنگیاں والا باغ بھی بخش دیا۔ شاہ محمود کی وفات کے بعد اس کی اولاد کو بھی بے شمار جاگیروں، زمینوں، القابوں اور خطابوں سے نوازا گیا اور اس خاندان کے بہت سے افراد بڑے بڑے عہدوں پر بھی متمکن کئے گئے۔[25]

ان کے علاوہ گکھڑ، مزاری، لغاری اور دوسرے اس قسم کے بہت سے خاندان فضل حسین کی پارٹی سے منسلک تھے جن کی مسلم عوام سے کبھی کوئی وفاداری نہیں رہی تھی بلکہ جو عوام الناس کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دینے کی بنا پر مالا مال ہوئے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ''خاندانی جاگیردار'' بن گئے تھے۔

فضل حسین نے جاگیرداروں کے ساتھ اتحاد کیوں کیا؟

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر پنجاب کا مسلمان جاگیردار طبقہ اس قدر عوام دشمن، ضمیر فروش اور سامراجی پٹھو تھا تو پھر فضل حسین جیسے دانشمند بورژوا سیاستدان نے یہ کیونکر توقع کی تھی کہ وہ اس طبقہ کی امداد و اعانت سے پنجابی مسلمانوں کی خوشحالی و ترقی کی شاندار عمارت تعمیر کر سکے گا۔ بظاہر اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ فضل حسین نے جنوری 1921ء سے لے کر دسمبر 1923ء تک سیاسی اقتدار کا مزا چکھ لیا تھا اور اب وہ اسے برقرار رکھنے کے لئے انگریزوں اور ان کے جاگیردار پٹھوؤں پر کلی طور پر انحصار کرنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا تھا۔ اسے یہ خوش فہمی تھی کہ اسے صوبہ کے مسلمانوں کے روشن خیال درمیانہ طبقہ کی تائید و حمایت بہر صورت حاصل رہے گی اور کانگرس کی روز افزوں سیاسی قوت کے پیش نظر انگریزوں اور جاگیرداروں کا اس کے بغیر گزارہ ممکن نہیں ہوگا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ پنجاب کے ہندوؤں کے درمیانہ و سرمایہ دار طبقوں کی تنگدلی و تنگ نظری سے فی الحقیقت مایوس ہو گیا تھا اور اسے مسلمانوں کی فلاح و ترقی کے لئے انگریزوں اور جاگیرداروں پر انحصار کرنے کے سوا کوئی اور چارہ کار نظر نہیں آتا تھا۔ دسمبر 1923ء میں جو تین خلافتی مسلمان کونسل کے ارکان منتخب ہوئے تھے اگرچہ ان کی تنظیم الگ تھی لیکن وہ عملی طور پر

سوراج پارٹی اور کانگرس سے منسلک تھے۔ وہ وہی مجمع باز اور شوریدہ سر مسلمان لیڈر تھے جنہوں نے 22-1921ء کی تحریک خلافت کے دوران کھوکھلے مذہبی نعرے لگا کر اور لچھے دار تقریریں کر کے مسلمانان ہند کے سیاسی مستقبل کو سخت نقصان پہنچایا تھا۔ ان کی کونسل میں موجودگی سے اس امر کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ غیر مسلم ارکان کے ساتھ مل کر ایسی صورت حال پیدا کر دیں گے کہ اگر اس کی وزارت کو انگریز گورنر، سرکاری بلاک اور جاگیرداروں کی بھرپور تائید و حمایت حاصل نہ ہوئی تو وہ کوئی تعمیری کام نہیں کر سکے گا۔ مرکزی اسمبلی میں جناح کی انڈیپینڈنٹ پارٹی اور موتی لال نہروں کی سوراج پارٹی میں اتحاد کی وجہ سے حکومت کو پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں۔

تیسری اور غالباً سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ فضل حسین ایک آئین پسند اور تن آسان بورژوا لیڈر تھا۔ وہ ڈرائنگ روم کی سیاست کا ماہر تھا۔ وہ عوام الناس سے گہرا رابطہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔ عاشق بٹالوی کے بقول ''میاں فضل حسین سرے سے عوامی تحریکوں کے مخالف تھے۔ وہ صرف اپنی فراست اور بساط سیاست کے چند مہروں کو اُدھر سے ادھر اور اِدھر سے اُدھر حرکت دے کر بازی جیتنے کے قائل تھے۔'' اسے یہ احساس نہیں تھا کہ 1924ء میں پنجاب کے شہروں میں مسلمانوں کا اچھا خاصا درمیانہ طبقہ پیدا ہو چکا تھا اور اس کی بے روزگاری اور مفلسی میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ اس طبقے کو صحیح اور دور اندیش سیاسی قیادت نصیب نہیں تھی اس لئے یہ اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا تھا۔ تین خلافتی ارکان اسی طبقے کی حمایت سے منتخب ہو کر کونسل میں آئے تھے۔ اگر اس طبقہ کو فضل حسین جیسی روشن خیال اور ترقی پسند قیادت نصیب ہو جاتی تو اسے سیاسی طور پر زیادہ دیر تک نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ 1924ء میں پورے برصغیر میں ہندو۔ مسلم کشیدگی اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ صوبہ کے مسلمان جاگیردار انگریزوں کی پشت پناہی کے باوجود شہروں کی مسلم رائے عامہ کی آسانی سے مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔ فضل حسین نے پنجابی مسلمانوں کے ترقی پذیر درمیانہ طبقہ پر بھروسہ کرنے کی بجائے زوال پذیر جاگیردار طبقہ پر انحصار کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلم درمیانہ طبقہ کھوکھلے مذہبی نعرے لگانے والے قدامت پسند مولویوں کے چنگل میں پھنسا رہا اور صوبہ پر جاگیردارانہ سیاست کا غلبہ قائم ہو گیا۔ بظاہر یہی انگریزوں کی منشا تھی اور انہوں نے اس مقصد کے لئے فضل حسین کو کامیابی سے استعمال کیا۔ اگر فضل حسین جیسی کوہ پیکر شخصیت ہوس اقتدار سے بالاتر ہوتی اور اس کا مسلم عوام سے رابطہ قائم

ہوتا تو وہ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے اواخر میں وہی کردار کر سکتا تھا جو محمد علی جناح نے تیسرے عشرے کے اواخر میں ادا کیا تھا۔ اس میں اتنی صلاحیت و قابلیت موجود تھی کہ وہ ایک صوبائی لیڈر بننے کی بجائے پورے برصغیر کے پسماندہ مسلمانوں کی قیادت کے فرائض سرانجام دے سکتا تھا۔

بعض عناصر کی طرف سے یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ اگر انیسویں صدی کے اواخر میں سرسید احمد خان نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے انگریزوں اور جاگیرداروں کی جو امداد و اعانت حاصل کی تھی اسے قابل اعتراض قرار نہیں دیا جا سکتا تو فضل حسین کی جانب سے پنجاب میں بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں اسی قسم کے کردار کو قابل مذمت کیوں کہا جاتا ہے۔ اس سوال کا ایک جواب تو یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں مسلمانوں میں درمیانہ طبقہ نہ ہونے کے برابر تھا اور عامۃ المسلمین میں 1857ء کے بعد اتنی پست حوصلگی پیدا ہو گئی تھی کہ ان سے فوری طور پر کسی سیاسی عمل کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سرسید کی تحریک معروف معنوں میں سیاسی تحریک نہیں تھی اور وہ مسلمانوں کو بار بار یہ تلقین کرتا تھا کہ وہ سیاسیات سے مکمل طور پر کنارہ کش ہو کر صرف اپنی تعلیمی ترقی کی طرف دھیان دیں۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ سرسید احمد خان کی علی گڑھ تحریک محض انگریزوں اور جاگیرداروں کی امداد و اعانت کی بنا پر کامیاب نہیں ہوئی تھی بلکہ یہ کامیابی سے محض اس لئے ہمکنار ہوئی تھی کہ یہ ایک عوامی تحریک بن گئی تھی۔ سرسید کا رابطہ عوام سے اتنا زیادہ تھا کہ مسلمانوں کے ہر گھر میں اس کا نام احترام سے لیا جاتا تھا اور بے شمار لوگ اسے مسلمانوں کا محسن اعظم تصور کرتے تھے۔ وہ پبلک جلسوں میں ایسی دلسوزی سے تقریریں کرتا تھا کہ حاضرین اشک بار ہو جاتے تھے اور پھر اس کے لئے پیسہ پیسہ کر کے چندہ جمع کرتے تھے۔ سرسید کا پلیٹ فارم بظاہر ایک فلاحی پلیٹ فارم تھا اس لئے اسے اپنے نصب العین کی تکمیل کے لئے جہاں کہیں سے بھی اعانت ملتی تھی وہ اس کا برملا شکریہ ادا کرتا تھا تاہم اس کے مجموعہ تقاریر پر ایک نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ غریب مسلمانوں کے جذبۂ ایثار و قربانی کی سب سے زیادہ قدر کرتا تھا۔ سرسید کے برعکس فضل حسین کا پلیٹ فارم خالصتاً سیاسی پلیٹ فارم تھا اور وہ اپنے اس سیاسی پلیٹ فارم کے ذریعے مسلمانانِ پنجاب کی خدمت کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کا یہ پلیٹ فارم اتنا اونچا تھا کہ عوام الناس کا ہاتھ وہاں تک پہنچتا ہی نہیں تھا۔ اس پلیٹ فارم پر

سر ظفر اللہ خان جیسے خوشامدیوں کے سوا کسی اور کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ فضل حسین کا سب سے بڑا سیاسی جرم یہ تھا کہ اس نے مشرقی پنجاب اور وسطی پنجاب کے مسلم عوام سے خود کوئی رابطہ قائم کرنے کی بجائے انہیں کئی سال تک خلافتیوں اور احراریوں جیسے فرقہ پرست، مجمع باز، اسلام فروش اور کوتاہ اندیش سیاسی عناصر کے حوالے کئے رکھا جنہوں نے منافقانہ مذہبی سیاست کی تربیت ''امام الہند'' موہن داس کرم چند گاندھی سے پائی تھی۔

فضل حسین کی زیر قیادت جنوری 1924ء میں جاگیرداروں کی سیاسی جتھہ بندی کے باعث پنجاب کے سارے معاشرے کی بالعموم اور مسلم معاشرے کی بالخصوص سیاسی، معاشرتی اور معاشی ترقی کی راہیں دشوار سے دشوار تر ہو گئیں۔ صنعتی ترقی کے امکانات تقریباً ختم ہو گئے۔ صوبہ میں زوال پذیر جاگیردارانہ معیشت وقتی طور پر مستحکم ہوگئی اور بظاہر برطانوی سامراج کی خواہش بھی یہی تھی کیونکہ اگر پنجاب میں بورژوا سیاسی رجحانات کو فروغ حاصل ہوتا تو یہاں سے پولیس اور فوج کے رنگروٹوں کی بھرتی میں دشواری پیش آتی۔ اس کے علاوہ لنکا شائر کے لئے سستی کپاس کی سپلائی میں بھی کمی آ جاتی۔ ان جاگیرداروں کی بھاری اکثریت بالکل ان پڑھ ہوتی تھی اور انہوں نے اپنے بیانات اور تقریریں لکھنے کے لئے شہری گریجوایٹوں کو بطور سیکرٹری ملازم رکھا ہوتا تھا۔ فیروز خان نون کے بقول ''ایک غیر ملکی حکمران کی خدمت گزاری میں کسی کو ذلت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ جغرافیائی اعتبار سے یورپ سے باہر قوم پرستی کا کوئی وجود نہ تھا۔ ہندوستان کا تو ذکر ہی کیا۔ اتحاد کے لئے خون کے رشتے یا جغرافیائی رشتے سے قوی تر طاقت مذہب کی تھی''۔ [26] یہ کوئی کام ڈپٹی کمشنر یا گورنر کی منظوری و اجازت کے بغیر کرنے کا تصور بھی نہیں کرتے تھے۔ ان کی سیاست کسی اصول، پروگرام یا پالیسی پر مبنی نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کا سارا انحصار انگریز آقاؤں کی مرضی کے علاوہ اندرون خانہ جوڑ توڑ، محلاتی سازشوں اور برادریوں پر ہوتا تھا۔ انہیں غریب عوام کی فلاح و ترقی میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ انہیں اپنے انگریز آقاؤں کی اس رائے سے اتفاق ہوتا تھا کہ اگر کسان غریب و پسماندہ رہے تو صوبہ میں امن و امان قائم رہتا ہے۔ اگر اسے پیٹ بھر کر کھانا ملے تو وہ جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ یہ اپنے علاقے میں کوئی سکول نہیں کھلنے دیتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اگر غریب کسانوں کے بچوں نے تعلیم حاصل کر لی تو وہ گستاخ ہو جائیں گے اور بالآخر اپنے حقوق مانگیں گے۔ یہ اپنے علاقے میں دبدبہ قائم رکھنے کے لئے قتل، اغوا اور

ڈکیتی کی وارداتیں کرواتے رہتے تھے۔ ان کے علاقے میں جو لوگ تجارت یا دستکاری کے ذریعے روزی کماتے تھے انہیں ''کمیں'' کہتے تھے اور ان سے حقارت آمیز سلوک کرتے تھے۔ حتیٰ کہ یہ گاؤں کے مولوی کو بھی ''کمیں'' تصور کرتے تھے اور اس سے ویسا ہی سلوک کرتے تھے جیسا کہ دوسرے ''کمیوں'' سے کیا جاتا تھا۔ ان جاگیرداروں میں سے اکثر ہندو ساہوکاروں کے مقروض ہوتے تھے کیونکہ یہ اپنی فصل کی ساری آمدنی، جو دراصل بے زمین کسانوں کی خون پسینے کی کمائی ہوتی تھی، تھوڑے ہی عرصے میں شراب و کنجری کی نذر کر دیتے تھے۔ شہری کنجری کا مجرا کرانا ان کا محبوب ترین مشغلہ ہوتا تھا اور اگر کوئی شہری کنجری ان سے ''شادی'' کر لیتی تھی تو یہ اسے اپنی بہت بڑی ''فتح'' تصور کرتے تھے۔

ظاہر ہے کہ فضل حسین اس قسم کے بے ضمیر اور اخلاق باختہ عناصر کی امداد و اعانت سے کوئی زیادہ سیاسی منازل طے نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ اسے بہت جلد پریشانی لاحق ہو گئی جبکہ صوبہ کے نئے گورنر سر میلکم ہیلی (Malcolm Hailey) نے جون 1924ء میں اپنے عہدہ کا چارج سنبھالتے ہی اس کے سیاسی اثر و رسوخ کو ختم کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ سر میلکم ہیلی قبل ازیں طویل عرصہ تک پنجاب میں ملازمت کر چکا تھا اور اس وجہ سے وہ سارے نونوں، قزلباشوں، ٹوانوں، قریشیوں، کھٹڑوں، گیلانیوں اور گرمانیوں وغیرہ کو اندر باہر سے جانتا تھا۔ وہ گزشتہ چار پانچ سال سے گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کا ممبر تھا۔ بظاہر حکومت ہند نے اسے 1924ء کے وسط میں پنجاب کا گورنر اس لئے مقرر کیا تھا کہ گورنر میکلیگن نے جنوری 1924ء میں فضل حسین جیسے بورژوا لیڈر کی دقیانوسی جاگیرداروں کا لیڈر بننے میں جو مدد کی تھی اس کا نتیجہ کہیں اس صورت میں برآمد نہ ہونے پائے کہ یہاں جاگیرداری نظام کی بنیادیں ہی ہل جائیں۔ سید نور احمد کے بیان کے مطابق سر میلکم ہیلی ''پرانے انگریز حاکموں کے اس مقصد میں بھرپور حصہ لے چکا تھا کہ پنجاب کے وفادار زمینداروں اور دیہاتی آبادی کو شہری وکیلوں اور سیاسی مطالبے کرنے والوں کے اثر سے محفوظ رکھا جائے۔''[27] چنانچہ جب اس نے جون 1924ء میں گورنری کے عہدہ کا چارج لیا تو اسے دیکھ کر صدمہ ہوا کہ اس کی غیر حاضری میں ان زمینداروں نے اسی خطرناک طبقے کے ایک فرد کو اپنا لیڈر بنا لیا تھا اور یہ لیڈر انہیں کونسل کی اجتماعی نفسیات کے ذریعے سرکاری بلاک کو آنکھیں دکھانے کا سبق سکھا رہا تھا۔

چنانچہ اس گورنر اور فضل حسین کے درمیان تضاد کا پہلا مظاہرہ جنوری 1925ء میں ہوا جبکہ صوبائی کونسل کے صدر کے انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوا۔ میلکم ہیلی کی خواہش تھی کہ اسی انگریز کو کونسل کا صدر منتخب کرلیا جائے جسے جنوری 1921ء میں ایک مقررہ معیاد کے لئے نامزد کیا گیا تھا۔ اس کے برعکس فضل حسین کی خواہش تھی کہ اس کی یونینسٹ پارٹی کے ایک رکن سر عبدالقادر کو صدر منتخب کیا جائے تاکہ اسے کونسل کی کارروائی کے دوران کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ چنانچہ اس نے پہلے تو اپنی پارٹی سے اس مضمون کی قرارداد منظور کرائی اور پھر اس نے میلکم ہیلی کو اس قرارداد کے زور پر آمادہ کرلیا کہ وہ انگریز صدر کا ارادہ ترک کردے اور کونسل میں سرکاری بلاک کو اس سلسلے میں غیر جانبدار رہنے کی ہدایت کردے۔

ان حالات میں مقابلہ یونینسٹ پارٹی کے سر عبدالقادر اور سوراج پارٹی کے ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کے درمیان ہوا اور سر عبدالقادر 32 کے مقابلے میں 41 ووٹوں سے جیت گیا۔ اگرچہ میلکم ہیلی کو ہندوؤں کے درمیانہ وسرمایہ دار طبقوں کی سوراج پارٹی کے مقابلے میں جاگیرداروں کی یونینسٹ پارٹی کی کامیابی ناگوار نہیں تھی لیکن اسے یہ بات بھی پسند نہیں تھی کہ فضل حسین کی بورژوا قیادت جاگیرداروں کے سہارے مضبوط تر ہوتی چلی جائے۔ سر عبدالقادر بھی ایک شہری بورژوا وکیل تھا اور اس کا جاگیرداروں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ چنانچہ جب جون 1925ء میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا ایک مسلمان رکن سر حبیب اللہ دو تین ماہ کی چھٹی پر گیا تو اس کی جگہ عارضی طور پر فضل حسین کا تقرر کردیا گیا۔ اس پر فضل حسین کی تجویز یہ تھی کہ اس کے مرکز میں تقرر کے باعث عارضی طور پر صوبائی وزارت کا جو عہدہ خالی ہوا ہے اس پر چودھری شہاب الدین کو مقرر کردیا جائے اور اس نے اس مقصد کے لئے اپنی پارٹی کے دو بڑے دھڑوں دولتانہ دھڑے اور نون۔ٹوانہ دھڑے میں مفاہمت بھی کروادی تھی۔ لیکن گورنر ہیلی نے اس کی تجویز منظور نہ کی۔ سر عبدالقادر کو وزیر مقرر کردیا گیا۔ اس کارروائی کا مقصد یہ بتانا تھا کہ ایاز قدرے خود بشناس۔ اس کے علاوہ جاگیرداروں پر یہ ظاہر کرنا تھا کہ فضل حسین کی قیادت ایسی نہیں ہے کہ اسے نیچا نہیں دکھایا جاسکتا۔ چنانچہ آئندہ انہوں نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے فضل حسین کی بجائے صرف گورنر ہیلی پر انحصار کرنا شروع کردیا اور فضل حسین نے بھی یہ سمجھ لیا کہ پنجاب میں برسراقتدار رہنے کے لئے جاگیرداروں کے علاوہ گورنر ہیلی کی خوشنودی ضروری ہے۔

تین ماہ کے بعد فضل حسین وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی رکنیت سے فارغ ہو کر واپس آیا تو گورنر ہیلی نے حسب وعدہ اسے پھر صوبائی وزارت کا عہدہ دے دیا اور سر عبدالقادر بالکل ہی فارغ ہو گیا۔ وہ نہ تو وزیر رہا اور نہ ہی کونسل کا صدر۔ سر عبدالقادر کی پشت پر کوئی جاگیردار دھڑا نہیں تھا۔ وہ محض ایک شہری وکیل تھا اور اس کے ساتھ اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی نہیں تھا۔ چنانچہ جب کونسل کی صدارت کے لئے کاغذات نامزدگی داخل کرنے کا وقت آیا تو ظاہر ہوا کہ یونینسٹ پارٹی فضل حسین کی جیب میں نہیں ہے بلکہ اس کے مختلف دھڑوں کی تاریں گورنر ہیلی ہلاتا ہے۔

جنوری 1926ء میں اس عہدہ کے لئے چودھری شہاب الدین، ملک فیروز خان نون اور میاں محمد شاہ نواز نے کاغذات نامزدگی داخل کر دیئے۔ ہندوؤں کی سوراج پارٹی اور نیشنل پروگریسو پارٹی نے کوئی امیدوار کھڑا نہ کیا اور فیصلہ کیا کہ ان پارٹیوں کے ارکان شاہ نواز کو ووٹ دیں گے کیونکہ اگرچہ اس کا تعلق ضلع لاہور کے ایک جاگیردار خاندان سے تھا۔لیکن وہ اپنے رہن سہن اور انداز فکر کے لحاظ سے ایک شہری تھا۔ اس پر دولتانہ گروپ کی نون۔ٹوانہ گروپ کے ساتھ مفاہمت ہو گئی۔ فیروز خان نون امیدواری سے دستبردار ہو گیا اور چودھری شہاب الدین، شاہ نواز کے مقابلے میں چھ ووٹوں سے جیت گیا۔

فیروز خان نون لکھتا ہے کہ ''جب میں نے کونسل کی سپیکر شپ کے لئے کاغذات نامزدگی داخل کئے تھے تو سر فضل حسین نے غالباً محسوس کیا کہ میں اس منصب کے لئے بہت کم عمر ہوں جس سے لوگ بالعموم ریٹائر ہوتے ہیں۔ لیکن وہ مجھ سے یہ بھی نہیں کہنا چاہتے تھے کہ اس سے کمتر منصب کا انتخاب کروں۔ حکمت عملی میں ان کی عظمت لاثانی تھی۔ انہوں نے میرے بیشتر حمایتیوں کو پارٹی میں اس غرض سے بھیجا کہ وہ مجھے یہ اعزاز طلب نہ کرنے کا مشورہ دیں۔ میں بڑے مخمصے میں پھنس گیا۔ اگر ان کے مشورے کے جواب میں نہیں کہتا تو ان کی حمایت سے محروم ہو جاتا۔ چنانچہ میں نے جواب دیا کہ ''سوچوں گا''۔ اچانک پارٹی کے دوسرے امیدوار چودھری شہاب الدین میری طرف مڑے اور بولے ''فیروز! مجھے تمہارے آگے اپنی مونچھ نیچی کرتے ہوئے کوئی خفت محسوس نہیں ہوتی۔ تم ابھی نوعمر ہو۔ یہ موقع ہمیں دو۔''[28] چنانچہ میں نے یہی کیا۔'' لیکن فیروز خان نون کی یہ کہانی سو فیصد درست نہیں ہے۔ اس کی سپیکر شپ کی امیدواری سے دستبرداری کے پس منظر میں فیصلہ کن بات یہ تھی کہ اگر وہ دستبردار نہ ہوتا تو جاگیرداروں کے

دوٹ تقسیم ہو جاتے اور اس بنا پر ایک شہری وکیل اس منصب پر فائز ہو جاتا۔ غالباً گورنر ہیلی نے بھی یہی مشورہ دیا تھا جس کی تعریف وتوصیف کے لئے فیروز خان نون کو الفاظ نہیں ملتے بالخصوص اس وجہ سے کہ اسی گورنر ہیلی نے تقریباً ڈیڑھ سال بعد اسے صوبائی وزارت کے عہدہ پر فائز کر دیا تھا حالانکہ اس کے نامۂ اعمال کا خانہ سیاست بالکل خالی تھا۔ لکھتا ہے کہ ''سر میلکم ہیلی ایک دانشمند اور کامیاب منتظم تھے۔'' ان کی خدمات وصفات پر دفتر کے دفتر قلم بند کئے جا سکتے ہیں۔ وہ پہلے گورنر تھے جن کے ساتھ مجھے کام کرنے کا موقع ملا اور میں نے ان سے نیز سر فضل حسین سے بہت کچھ سیکھا۔ میں ہر دو صاحبان سے اکثر مشورے کرتا تھا۔''[29]

ہندو۔ مسلم تضاد میں اضافہ اور جناح کی صلح کُل کی پالیسی

فضل حسین کی وزارت 1926ء کے اوائل تک قائم رہی اور اس دوران صوبہ میں متعدد ایسے واقعات رونما ہوئے جن کے پورے ہندوستان کے سیاسی مستقبل پر گہرے اثرات مرتب ہوئے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان واقعات نے برصغیر کی تقسیم کی داغ بیل ڈال دی۔ گاندھی کی منافقانہ مذہبی سیاست نے تحفظ خلافت کے نام پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی کا جو ڈھونگ رچایا تھا وہ فروری 1922ء میں ختم ہو گیا تھا جبکہ گاندھی نے یو۔ پی کے ضلع گورکھپور کے تھانہ چورا چوری میں آتش زنی کی واردات کی آڑ لے کر تحریک عدم تعاون کو ختم کر دینے کا اعلان کر دیا تھا۔ پھر جب کانگرس میں پھوٹ پڑ جانے کے بعد مارچ 1922ء میں حکومت ہند نے گاندھی کو گرفتار کر لیا تو ہندو۔ مسلم اتحاد نے ہندو۔ مسلم مخاصمت کی صورت اختیار کر لی۔ پورے برصغیر میں فرقہ وارانہ فسادات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔

کانگرس اور خلافت کی تحریکیں ختم ہوتے ہی سوامی شردھانند نے شدھی تحریک شروع کر دی جس کا مقصد مسلمانوں کو ہندو بنانا تھا۔ اس کے جواب میں خواجہ حسن نظامی نے تبلیغ کی تحریک شروع کی جس کا مقصد ہندوؤں کو مسلمان بنانا تھا اور اس کے ساتھ ہی جب مدن موہن مالویہ نے تحریک سنگھٹن شروع کی کہ ہندوؤں میں لڑنے کی جرأت اور صلاحیت پیدا کی جائے تو خلافت کمیٹی نے تنظیم کی تحریک کا آغاز کر دیا تاکہ مسلمان لٹھ بازی اور چھرے مارنے میں مہارت حاصل کریں۔ چنانچہ ''ہر محلہ میں گلی گلی اکھاڑے بنے جہاں کشتی، تلوار اور بنوٹ کی تربیت دی

جانے لگی۔'' نتیجۃً ''چھوٹی چھوٹی باتوں پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں آئے دن لڑائیاں ہونے لگیں۔ ہولی میں کسی مسلمان پر رنگ پڑ گیا، شہر میں بلوہ ہو گیا۔ مسجد کے سامنے ہندو باجا بجاتے نکل گئے، لڑائی ہو گئی۔ خبر پھیلی کہ مسلمان کہیں گائے کی قربانی کرنے والے ہیں، ہندو بپھر گئے اور متعدد جانیں ضائع ہو گئیں لیکن پس منظر میں مسلمانوں کی ہندوستان پر ایک ہزار سال کی حکومت تھی۔ ہندو اپنی غلامی کا بدلہ لینا چاہتے تھے اور اس احساس کمتری کا ازالہ کرنا چاہتے تھے جو اس دور کی یاد سے وابستہ تھا۔ مسلمانوں کو یہ زعم تھا کہ اس ملک کے حاکم ہمیشہ ہم رہے اور انگریز راستے سے ہٹ گئے تو پھر ہم ہی حاکم ہوں گے۔ ہندو ہمارے مقابلے کی تاب کہاں لا سکتا ہے۔''[30]

ان حالات میں جب گاندھی کو 5 رفروری 1924ء کو رہا کر دیا گیا تو اس نے سب سے پہلے تو ایک بیان میں موتی لال نہرو اور سی۔ آر۔ داس کی سوراج پارٹی کی حکومت ہند سے تعاون کی پالیسی کی مذمت کی اور پھر ہندو۔ مسلم اتحاد بحال کرنے کے لئے 21 دن کا برت رکھ لیا۔ مگر دونوں فرقوں کے لئے یہ مہاتمائی ڈرامہ غیر مؤثر ثابت ہوا اور فرقہ وارانہ فسادات جاری رہے۔

25 رمئی 1924ء کو لاہور میں مسلم لیگ کا خصوصی اجلاس ہوا۔ اس کی میزبانی فضل حسین نے کی اور محمد علی جناح نے صدارت کے فرائض سرانجام دیئے۔ یہ اجلاس اس بنا پر خاص اہمیت کا حامل تھا کہ گزشتہ دو تین سال سے مسلمانان ہند کی سیاست پر خلافتیوں کا غلبہ ہونے کے باعث مسلم لیگ عملی طور پر ختم ہو چکی تھی۔ محمد علی جناح نے دسمبر 1918ء کے بعد مسلم لیگ کے معاملات میں دلچسپی لینا بند کر دی تھی۔ کیونکہ اس جماعت نے تحریک خلافت کی تائید وحمایت کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا انہیں اس سے اختلاف تھا۔ 1922ء میں مسلم لیگ کا کوئی سالانہ اجلاس نہیں ہوا تھا اور 1923ء میں جو سالانہ اجلاس ہوا تھا اس میں حاضری اتنی کم تھی کہ اس کا کھلا اجلاس ہو ہی نہیں سکا تھا۔ تاہم جناح نومبر 1923ء میں بمبئی سے مرکزی اسمبلی کے بلا مقابلہ رکن منتخب ہو گئے تھے۔ ان کا اس انتخاب کے لئے ستمبر 1923ء میں جاری کردہ منشور یہ تھا کہ ''میں کوئی عہدہ یا خطاب قبول نہیں کروں گا۔ میرا واحد مقصد یہ ہے کہ میں حتیٰ الامکان ملک کی خدمت کروں۔'' وہ اگرچہ جنوری 1922ء کی آل پارٹیز کانفرنس کی اس رائے سے اتفاق کرتے تھے کہ کانگرس نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر کے ملک وقوم کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دی تھی۔ تاہم انہوں نے موتی لال نہرو اور سی۔ آر۔ داس کی سوراج پارٹی میں شرکت نہیں کی تھی اور انہوں نے یہ

انتخاب ایک آزاد امیدوار کی حیثیت سے لڑا تھا۔

25 مئی 1924ء کے اجلاس میں جناح نے اپنی صدارتی تقریر میں ہندو۔مسلم اتحاد پر زور دیا اور مطالبہ کیا کہ حکومت ہند اور مرکزی لیجسلیٹو اسمبلی کے نظام کی از سرِ نو تشکیل کی جائے۔ صوبوں میں بھی دوعملی کا نظام ناکام ہو چکا ہے لہٰذا مسلم لیگ کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ ملک کے مختلف عناصر میں اتحاد و یگانگت کی فضا پیدا کرے تاکہ 1916ء کی طرح نئے آئین کی کوئی مشترکہ سکیم مرتب کی جا سکے۔ جناح کی اس تقریر کے بعد سر عبدالقادر کی پیش کردہ یہ قرارداد منظور کی گئی کہ ''ہندوستان کے موجودہ صوبوں کو ایک وفاقی حکومت کے ماتحت اس طرح متحد کیا جائے کہ ہر صوبہ کو مکمل خودمختاری حاصل ہو اور مرکزی حکومت کے پاس صرف وہی امور رہیں جو مشترکہ دلچسپی کے حامل ہوں۔ مزید برآں مقننہ اور دوسرے سارے منتخب اداروں میں نمائندگی آبادی کی بنیاد پر ہونی چاہیے اور کسی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل نہیں کرنا چاہیے اور نہ ہی اسے مساوی حیثیت دینی چاہیے۔'' یہ قرارداد دراصل فضل حسین کے اس تلخ تجربے کی روشنی میں منظور کی گئی تھی کہ اگرچہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن 1916ء کے معاہدہ لکھنؤ اور 1919ء کے انڈین کونسل ایکٹ نے انہیں اقلیت کا درجہ دے دیا تھا لہٰذا وہ ازخود صوبائی حکومت کی تشکیل نہیں کر سکتے تھے اور انہیں کونسل کے منتخب غیر مسلم ارکان سے تعاون کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ چنانچہ مسلم لیگ نے ایک کمیٹی بھی مقرر کی جس کے ذمے یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ دوسری پارٹیوں سے صلاح مشورہ کے بعد ہندوستان کے نئے آئین کی سکیم مرتب کرے۔ اجلاس میں ایک اور قرارداد بھی منظور کی گئی جس میں اس مؤقف کا اعادہ کیا گیا کہ ''ملک میں سیاسی طور پر اس وقت تک ترقی نہیں ہو سکتی جب تک اس کی بنیاد ہندو۔مسلم اتحاد پر نہیں رکھی جائے گی۔''

اسی سال نومبر میں گاندھی نے مختلف جماعتوں کے لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس بمبئی میں منعقد کی جس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ دو مہینے کے بعد مختلف پارٹیوں کے نمائندوں کی کانفرنس دہلی میں ہو گی جس میں سوراج کی ایک متفقہ سکیم مرتب کی جائے گی اور فرقہ وارانہ اختلافات کو حل کرنے کے لئے تجاویز سوچی جائیں گی۔ اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی جسے یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ 31 مارچ 1925ء تک اپنی رپورٹ پیش کر دے۔ جناح اس کمیٹی کے رکن تھے اور انہوں نے اس کمیٹی کی رپورٹ کی ترتیب میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

دسمبر کے آخری ہفتے میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا جس کی صدارت سر رضا علی نے کی اور جناح کی دعوت پر کئی ہندو لیڈروں نے بھی اس اجلاس کو خطاب کیا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ساری تقریروں کا ماحصل یہ تھا کہ ہندو۔ مسلم اتحاد کے بغیر کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ جناح نے اس موقع پر ایک قرارداد پیش کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ مجالس قانون ساز اور دوسرے انتخابی اداروں میں مسلمانوں کی نمائندگی اور سرکاری ملازمتوں میں ان کے مناسب حصے سے متعلق مطالبات مرتب کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو دوسری پارٹیوں سے صلاح مشورے کے بعد اپنی رپورٹ پیش کرے۔ کمیٹی نامزد ہوگئی لیکن اس کا کوئی اجلاس منعقد کرنے یا کوئی نئے مطالبات مرتب کرنے کی نوبت نہ آئی جبکہ فضل حسین اور دوسرے پنجابی لیڈروں کو یہ شکایت رہی کہ جناح نے 25 مئی 1924ء کی قرارداد کی پابندی نہیں کی تھی اور وہ ہندوؤں سے سیاسی سودا بازی کا دروازہ کھلا رکھنا چاہتے تھے۔

مسلم لیگ کے بمبئی سیشن میں تحریک خلافت کے قائد محمد علی جوہر نے بھی شرکت کی تھی اور اس نے اس موقع پر جو تقریر کی تھی اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ تحریک خلافت کی ناکامی نے اس کے سیاسی نظریہ میں بنیادی تبدیلی پیدا کر دی ہے۔ اب اس کے سینے میں گاندھی اور دوسرے ہندو لیڈروں کے لئے محبت وعقیدت کے جذبہ کے بجائے نفرت اور مخاصمت کا جذبہ موجزن تھا۔ چنانچہ اس کی تحریک پر اس اجلاس میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ مسلمانان ہند کو مدن موہن مالویہ کی سنگھٹن کی تحریک کے مقابلے میں تنظیم کی تحریک شروع کرنی چاہیے۔ یہ وہی محمد علی جوہر تھا جس نے 1923ء میں کانگرس کے سالانہ اجلاس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ "بہت سوں نے مہاتما گاندھی کی تعلیمات اور بعد میں اس کی ذاتی اذیتوں کا یسوع مسیح کی تعلیمات اور ذاتی اذیتوں سے موازنہ کیا ہے..... مہاتما کے ظہور سے پہلے ہندوستان کے سیاسی حالات ایسے ہی تھے جیسے کہ یسوع مسیح کے ظہور سے پہلے فلسطین کے تھے۔ اس نے ہندوستان کی بیماری کے علاج کے لئے جو نسخہ تجویز کیا تھا وہ وہی تھا جو یسوع مسیح نے فلسطین میں تجویز کیا تھا۔ اذیتوں کے ذریعے تزکیہ نفس اور سوراج کے لئے اپنے آپ میں نظم وضبط پیدا کرنا۔ یہ تھا مہاتما کا لائحہ عمل اور عقیدہ۔" لیکن اب 1924ء میں محمد علی جوہر کا موقف یہ تھا کہ گاندھی کا اخلاق خواہ کتنا ہی پاکیزہ ہو لیکن میں مذہبی نقطۂ نگاہ سے اسے ہر مسلمان سے کمتر سمجھتا ہوں خواہ اس مسلمان کا کوئی اخلاق نہ ہو۔ محمد علی

جوہر نے اپنے اس مؤقف کا اظہار لکھنؤ کے ایک جلسہ عام میں کیا تھا۔ جب بعض اخبار نویسوں نے اس سے اس کی وضاحت چاہی تو اس نے کہا کہ ”میں اپنے مذہب اور عقیدہ کے مطابق ایک زانی اور انتہائی گرے ہوئے مسلمان کو گاندھی سے بہتر سمجھتا ہوں۔“[31] یہ وہی محمد علی جوہر تھا جو تحریک خلافت کے دوران ہندو۔ مسلم اتحاد برقرار رکھنے کے لئے گائے کے ذبیحہ پر پابندی عائد کرنے کے حق میں تھا لیکن اب وہ مسلمانوں کو مشورہ دے رہا تھا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کا مقابلہ کرنے کے لئے منظم ہو جانا چاہیے۔ اکبرالہ آبادی نے اس کی اس قسم کی ہوائی اور جذباتی سیاست کے پیش نظر یہ کہا تھا کہ

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں
گو گرد راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد اور ان کے ساتھیوں نے گاندھی کی ترغیب پر برصغیر کے مسلمانوں کی سیاست پر دقیانوسی مولویوں کا غلبہ قائم کرنے میں جو کردار ادا کیا تھا اسے تاریخ کا کوئی طالب علم بآسانی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ تحریک خلافت کا دور ہندوستانی مسلمانوں کا تاریک ترین دور تھا۔ اس دور میں مولویوں نے مذہب کی آڑ لے کر مسلمانوں کے سیاسی پلیٹ فارم پر جو قبضہ جمایا تھا اس کے اثرات آج تک زائل نہیں ہوئے۔ 22-1920ء میں مولوی کو سیاست کا ایسا چسکا لگا تھا کہ اب وہ اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔

23 جنوری 1925ء کو جناح کی تجویز کے مطابق دہلی میں گاندھی کی زیر صدارت آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں دوسرے ہندو لیڈروں کے علاوہ سوامی مدالیار، مدن موہن مالویہ، لالہ لاجپت رائے اور موتی لال نہرو نے شرکت کی اور مسلم نقطۂ نگاہ کی نمائندگی کرنے کے لئے صرف جناح شریک ہوئے۔ ایم۔ ایچ۔ سید کے بیان کے مطابق ان دنوں جناح مخلوط طریقہ انتخاب کے حامی تھے۔ ان کی رائے تھی کہ ہندوستانی عوام کی سیاسی تنظیم فرقہ وارانہ خطوط کی بجائے جماعتی خطوط پر ہونی چاہیے اور وہ سمجھتے تھے کہ ہندو اپنی اکثریت کے باوجود سات کروڑ مسلمانوں کو اپنا محکوم نہیں بنا سکتے۔ چنانچہ انہوں نے کانفرنس کے لئے ہندو۔ مسلم تنازعہ کے ممکنہ تصفیہ کے پانچ پہلو پیش کئے تھے۔ (1) جداگانہ طریقۂ انتخاب مع خصوصی نمائندگی۔ (2) آبادی کے عین مطابق نمائندگی۔ (3) مخلوط طریقہ انتخاب مع نشستوں کی تخصیص۔ (4) متناسب نمائندگی

جس کی بنیاد واحد قابل انتقال ووٹ پر ہوگی۔ (5) مشترکہ حق رائے دہندگی ہوگا اور کوئی فرقہ وارانہ پہلو پیش نظر نہیں رکھا جائے گا۔ ان پانچوں تجاویز میں سے دوسری تجویز وہی تھی جو مئی 1924ء میں مسلم لیگ کے لاہور سیشن میں منظور کی گئی تھی۔ مگر مدن موہن مالویہ، لالہ لاجپت رائے، سوامی شردھانند اور دوسرے ہندو لیڈروں نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ''وہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلم اکثریت کے اصول کو تسلیم نہیں کر سکتے۔ ہم فرقہ وارانہ نمائندگی کے اصول کو تسلیم نہیں کرتے۔ لیکن اگر مسلمان اس پر اصرار کریں تو بدرجہ آخر ہم اسے بھی منظور کر لیں گے لیکن اس صورت میں ہم پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے تناسب نمائندگی کے سوال پر لکھنؤ پیکٹ سے آگے جانے کو ہرگز تیار نہیں۔''[32] اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر مسلمان جداگانہ طریقہ انتخاب پر اصرار کریں گے تو انہیں ہمہ گیر اقلیت کی حیثیت قبول کرنا پڑے گی۔ ہندوؤں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقہ برصغیر کے کسی بھی علاقے میں مسلمانوں کی سیاسی بالادستی قبول کرنے پر آمادہ نہ تھا خواہ یہ بالادستی کتنی ہی محدود اور غیر مؤثر کیوں نہ ہو۔ لہٰذا اس کانفرنس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ طویل بحث وتمحیص کے بعد بالآخر ایک کمیٹی مقرر کی گئی جسے ہدایت کی گئی کہ وہ اس مسئلہ کا مفصل جائزہ لے کر رپورٹ پیش کرے۔ اس کمیٹی نے اس مقصد کے لئے ایک سب کمیٹی مقرر کی جس نے 5 مارچ کو اپنا کام غیر معین عرصے کے لئے ملتوی کر دیا کیونکہ بیشتر ارکان اس کام میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ تاہم جب دسمبر 1925ء میں علی گڑھ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تو اس میں ہندو۔ مسلم اتحاد کی ضرورت پر زور دیا گیا اور جناح کی پیش کردہ یہ قرارداد منظور کی گئی کہ اگرچہ 1919ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ غیر تسلی بخش ہے تاہم مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر اس پر عملدرآمد کرنے کے اصول کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ قرارداد سر عبدالرحیم کی اس صدارتی تقریر کے باوجود منظور کی گئی جس کا مفہوم یہ تھا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں سے علیحدہ رہنا چاہیے کیونکہ ہندو۔ مسلم اتحاد ممکن نہیں رہا۔ دسمبر 1926ء میں دہلی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تو اس میں 1924ء اور 1925ء کی قراردادوں کی توثیق کرنے کے علاوہ یہ مطالبہ کیا گیا کہ 1919ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں ترمیم کے لئے ایک رائل کمیشن مقرر کیا جائے جو ہندوستان میں مکمل طور پر ذمہ دار حکومت کے قیام کے لئے سکیم مرتب کرے۔ مزید برآں یہ رائے ظاہر کی گئی کہ جداگانہ طریقہ انتخاب جاری رہنا چاہیے تا آنکہ کوئی

فرقہ از خود مخلوط طریق انتخاب کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ لیگ کے اس اجلاس سے ایک ماہ قبل محمد علی جناح بمبئی کے ایک مسلم حلقہ سے آزاد امیدوار کی حیثیت سے مرکزی اسمبلی کے بلا مقابلہ رکن منتخب ہو چکے تھے۔

آل انڈیا مسلم لیگ کی ان تین سالوں کی کارگزاری سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان دنوں محمد علی جناح کا ہاتھ برصغیر کے مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کی نبض پر نہیں تھا۔ وہ مرکزی اسمبلی میں بمبئی کے مسلمان اور پارسی سرمایہ داروں کی نمائندگی کرتے تھے اور ان کی بورژوا سیاست واضح طور پر غیر فرقہ وارانہ تھی۔ اُن کی پختہ رائے تھی کہ اگر ہندو لیڈر مسلمانوں کو کچھ تحفظات دینے پر آمادہ ہو جائیں تو ہندو۔ مسلم اتحاد ہو سکتا ہے اور اس طرح ہندوستان آئینی ذرائع سے مکمل آزادی کی منزل پر پہنچ سکتا ہے۔ چونکہ اس وقت تک ان کا مسلم عوام سے رابطہ نہیں تھا اس لئے وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ 1921ء کے بعد بے شمار فرقہ وارانہ فسادات نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان عناد و مخاصمت کی ایک ایسی دیوار حائل کر دی ہے جس کو محض نیک خواہشات کے زور سے مسمار نہیں کیا جا سکتا۔ جواہر لال نہرو کے بقول ان فسادات کے پیچھے معاشی عوامل کارفرما تھے۔ برصغیر کے مسلمان تاریخی وجوہ کی بنا پر ہر شعبۂ زندگی میں پسماندہ تھے اور ہندوؤں کے ترقی یافتہ درمیانہ اور سرمایہ دار طبقے انہیں کوئی رعایت دینے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ لہٰذا جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی بات پر فرقہ وارانہ خونی تصادم ہوتے تھے اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ پورا ہندوستان ایک لاعلاج مذہبی جنون میں مبتلا ہو گیا ہے جس سے برطانوی سامراج خوب فائدہ اٹھا رہا تھا۔

پنجاب میں مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ میں بالخصوص بڑی تلخی پائی جاتی تھی۔ یہ طبقہ بنیادی طور پر نہری نظام اور مغربی پنجاب کی نو آبادیات کی پیداوار تھا۔ سرسید احمد خان کی ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن حمایت اسلام اور دوسری اس نوعیت کی تنظیموں نے اس کی نشوونما میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ نتیجۃً بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے وسط میں اس طبقہ میں تعلیم یافتہ عناصر کی تعداد کم نہیں تھی اگرچہ ان کے لئے شہروں میں روزگار کے سارے دروازے مسدود تھے۔ ان تعلیم یافتہ عناصر کو تجارت وصنعت کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی ان کے پاس مطلوبہ سرمایہ تھا لہٰذا ان کے لئے ان دونوں شعبوں میں کوئی گنجائش پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ جہاں تک سرکاری و نیم سرکاری اداروں کا تعلق تھا ان میں ہندوؤں کی اجارہ داری تھی چنانچہ مسلمان تعلیم

یافتہ نوجوان جہاں جاتے تھے انہیں دھکے مار کر باہر نکال دیا جاتا تھا۔ یہ نوجوان صبح سے لے کر شام تک درخواستیں لے کر مارے مارے پھرتے تھے لیکن انہیں ہر جگہ یہی جواب ملتا تھا کہ "کوئی نوکری نہیں ہے۔" چنانچہ یہ ان نوجوانوں کی مسلسل مایوسی اور نامرادی کا ہی نتیجہ تھا کہ فضل حسین، جس کی سیاسی تربیت کانگرس کے پلیٹ فارم پر ہوئی تھی اور جو اپنے دنیاوی نظریے کے لحاظ سے سراسر بورژوا تھا، جنوری 1924ء میں گورنر میکلیگن اور دقیانوسی جاگیرداروں کی امداد سے یونینسٹ پارٹی کی تشکیل پر مجبور ہو گیا تھا اور ڈاکٹر اقبال، شیخ عبدالقادر، شیخ دین محمد اور ملک برکت علی جیسے شہری مسلم زعما اور دانشوروں نے اس سلسلے میں اس کی تائید وحمایت کی تھی اور انہوں نے یہ سوچنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ اس طرح پنجاب کی سیاست پر رجعت پسند اور سامراج نواز جاگیردار طبقہ کا جو غلبہ قائم ہو جائے گا اس کا بالآخر نتیجہ کیا نکلے گا۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ فضل حسین کی جانب سے 23-1921ء میں وزیر تعلیم کی حیثیت سے حکومت ہند کی پالیسی اور 1916ء کے لکھنؤ پیکٹ کے مطابق مسلمانوں کے لئے مختلف سرکاری اداروں میں کوٹہ مقرر کرنے کی کاروائی پر ہندوؤں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں نے جو شور وغوغا بپا کیا تھا اس کے پیش نظر مسلم درمیانہ طبقہ کو یقین ہو گیا تھا کہ مفاد پرست ہندو عناصر اس قدر تنگدل وتنگ نظر ہیں کہ ان سے کسی سیاسی تعاون کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ یہ شور وغوغا اس قدر ناجائز اور غیر منصفانہ تھا کہ انڈین نیشنل کانگرس کے ممتاز مسلمان لیڈر ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے دسمبر 1924ء کے آخری ہفتہ میں آل انڈیا خلافت کمیٹی کے سالانہ اجلاس بلگام (احاطہ بمبئی) میں اپنے خطبہ صدارت میں علی الاعلان اس کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ "مجھے اس مجمع کے روبرو یہ اعلان کر دینے میں قطعاً کوئی تامل نہیں کہ میاں فضل حسین کا اس کے سوا اور کوئی قصور نہیں کہ وہ مسلمانوں سے کسی قدر انصاف کرنا چاہتے ہیں...... اس سلسلہ میں میاں صاحب کے خلاف پنجاب کے ہندوؤں نے جو شور وغوغا بپا کر رکھا ہے وہ بالکل نامناسب اور خود غرضانہ ہے۔ گزشتہ الیکشن کے بعد پنجاب میں جو سوراج پارٹی بنی تھی اس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ سراسر ایک ہندو پارٹی ہے۔ پنجاب کی مصیبتوں کا اصل سبب اقتصادی ہے۔ کیونکہ ایک طرف صوبے کی ساری تجارت پر ہندوؤں کا اجارہ ہے اور دوسری طرف سرکاری ملازمتوں کی بیشتر تعداد بھی انہی کے قبضہ میں ہے۔"[33]

اس شور وغوغا کا نتیجہ یہ نکلا کہ صوبہ میں معاشرتی رواداری وانصاف کا نام ونشان مٹ

گیا اور مذہبی تعصب اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ یہ تعصب اتنا شدید اور ہمہ گیر تھا کہ کوئی چھوٹا بڑا سرکاری وغیر سرکاری ادارہ اس سے محفوظ نہیں رہا تھا۔ ہر چیز پر ہندو یا مسلمان کی چھاپ لگی ہوئی تھی۔ یہاں تک کہ پبلک مقامات پر دونوں فرقوں کے بیت الخلا بھی الگ الگ ہوتے تھے۔ دونوں فرقوں کی گلیاں اور بستیاں بھی الگ الگ ہوتی تھیں اور ان کے درمیان کوئی معاشرتی تعلقات نہیں ہوتے تھے۔ اسٹیشنوں، بسوں کے اڈوں اور دوسری بے شمار جگہوں پر ہمہ وقت ہندو روٹی، مسلمان روٹی، ہندو پانی، مسلمان پانی کی آوازیں آتی تھیں۔ جبکہ برطانوی سامراج کا دل یہ آوازیں سن کر باغ باغ ہو جاتا تھا۔

اس فرقہ وارانہ مذہبی تعصب کی انتہا کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ ان دنوں لاہور ہائی کورٹ کے جج بخشی ٹیک چند، مہر چند مہاجن اور چیف جسٹس سر شادی لال برصغیر کے متعصب ترین ہندوؤں میں شمار ہوتے تھے اور وہ اپنے اس تعصب کا برملا اظہار کرتے تھے۔ ظفر اللہ خان لکھتا ہے کہ ''جب بخشی ٹیک چند وکیل تھا تو کہا کرتا تھا کہ ''فضل حسین 40 فیصد مقدمات بھی مسلمان وکلا کو بھجوانے کا انتظام کرے! جج کی کرسی پر بیٹھتے ہی آپ نے جیسے تہیہ کر لیا کہ ان کے اجلاس سے کوئی مسلمان فریق مقدمہ ہندو فریق کے خلاف کامیاب نہ ہو سکے گا...... نہ کوئی مسلمان وکیل کسی ہندو وکیل کے مقابلے میں کامیاب ہو سکے گا اور آخر تک انہوں نے اس قاعدے سے کبھی انحراف نہ کیا۔ بخشی صاحب کا طریق کار یہیں تک محدود نہیں تھا۔ ان کا منصوبہ ایک مکمل منصوبہ تھا جس کے موٹے اصول یہ تھے۔ (1) اگر فریق مقدمہ ایک جانب مسلمان اور دوسری جانب غیر مسلمان ہو تو فیصلہ غیر مسلمان کے حق میں ہوگا۔ (2) اگر دونوں فریق مسلمان ہوں اور ایک فریق کی طرف سے ہندو وکیل ہو اور دوسرے کی طرف مسلمان، تو فیصلہ ہندو وکیل کے حق میں ہوگا۔ (3) اگر دونوں فریق مسلمان ہوں اور دونوں کے وکلا مسلمان ہوں تو فیصلہ اس فریق کے حق میں ہوگا جس کے وکیل کو دوسرے فریق کے وکیل کے مقابلے میں بخشی صاحب کم قابلیت کا سمجھتے ہوں...... بخشی صاحب کا یہ رویہ اس قدر قاہر و جابر تھا کہ بعض ہندو وکلا کیس کے فیصلے کے متعلق شرط باندھ کر بڑی بڑی فیس وصول کرتے تھے...... سر شادی لال جتنا عرصہ چیف جسٹس رہے مسلمانوں کو ان کے ہاتھوں بہت نقصان پہنچا اور بہت ناانصافیاں ان کے ساتھ ہوئیں۔ لیکن مقدمات کے فیصلے میں وہ کھلے بندوں بخشی صاحب کی سی جرأت اور حوصلے کے ساتھ

انصاف کے گلے پر چھری نہیں پھیرتے تھے۔سرشادی لال کے فیصلوں میں ممکن ہے تلاش کرنے پر کچھ مثالیں بخشی کے وضع کردہ تین قواعد کے خلاف مل جائیں لیکن ان کے ہاتھوں سب سے بڑا ظلم جو مسلمانوں اور اصول انصاف کے ساتھ ہوا وہ بخشی صاحب کو کرسیٔ عدل پر بٹھانے میں مدد ہونا تھا...... میں نے مسٹر جسٹس مہر چند مہاجن صاحب کی ججی کا زمانہ بہت کم دیکھا لیکن ان کی پریکٹس کے زمانے میں انہیں اچھی طرح جانتا تھا۔ان کی قابلیت مسلمہ تھی لیکن بخشی صاحب کے چیلے اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے تھے...... سرشادی لال کی پالیسی کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ ہائی کورٹ کی ججی پر کسی قابل مسلمان کا تقرر گوارا نہیں کرتے تھے...... اگر ان کا بس چلتا تو کوئی مسلمان ہائی کورٹ کا جج ہونے نہ پاتا۔لیکن یہ ان کے بس کی بات نہ تھی۔ایک ایسے صوبے کی ہائی کورٹ میں جس کی آبادی میں کثرت مسلمانوں کی تھی مسلمان ججوں کا تقرر لازم تھا۔شیخ عبدالقادر صاحب اپنی مرنجاں مرنج طبیعت اور شیریں گفتاری کی وجہ سے ہر طبقہ میں ہردلعزیز تھے۔ایک عارضی اسامی پر ان کے تقرر پر سرشادی لال رضا مند ہو گئے۔تین مہینے کے بعد پھر دو سال کے لئے ان کا تقرر رہا۔اس کے بعد اگر عارضی تقرر جاری رہتا تو وہ جلد مستقل اسامی پر فائز ہو جاتے لیکن سرشادی لال کو شبہ تھا کہ مسلمانوں کی طرف سے جو کبھی ان کی شکایت میں آواز اٹھتی ہے اس میں شیخ صاحب کا ضرور دخل ہوتا ہے۔لہٰذا جب پھر ان کے تقرر کا سوال اٹھا تو اس بہانے انکار کر دیا کہ ان کا کام تسلی بخش نہیں رہا...... آخر میں پھر شیخ سر عبدالقادر کا تقرر ہوا لیکن اب میعاد اتنی میسر نہ تھی کہ پنشن کے حقدار ہو سکتے۔"[34]

اگر صوبہ میں عدل وانصاف کے اعلیٰ ترین ادارے میں فرقہ وارانہ بے انصافی کا یہ عالم تھا تو یہ قیاس کرنا مشکل نہیں کہ دوسرے سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں صورت حال کیسی ہوگی۔ہائی کورٹ کے بارے میں ظفر اللہ خان کی اس تحریر میں کوئی جھوٹ یا مبالغہ نہیں بلکہ اس نے اپنی وکیلانہ عادت سے مجبور ہو کر اس بیان میں بڑے مہذب اور نرم الفاظ استعمال کئے ہیں۔آج بھی اگر لاہور ہائی کورٹ کے کسی عمر رسیدہ مسلمان وکیل کو سرشادی لال کا زمانہ یاد دلایا جائے تو اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے اور وہ اس امر پر افسوس کا اظہار کرتا ہے کہ پاکستان کے نوجوان اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ تحریک پاکستان کا پس منظر کس قدر سیاسی، معاشرتی اور معاشی تلخیوں سے بھرپور تھا۔

تصور پاکستان کا ابتدائی خالق۔پنجاب کا لالہ لاجپت رائے

پنجاب میں روز افزوں فرقہ وارانہ تعصب کے پیش نظر یہاں کے ممتاز کانگریسی اور آریہ سماجی لیڈر لالہ لاجپت رائے نے ہندو۔مسلم اتحاد کو خارج ازامکان قرار دیا تھا۔ اس نے دسمبر 1923ء میں سی۔آر۔داس کے بنگال پیکٹ کی مخالفت کی تھی جس کے تحت پسماندہ بنگالی مسلمانوں کو کچھ رعایت دینے کا وعدہ کیا گیا تھا اور پھر اس نے جنوری 1925ء میں آل پارٹیز کانفرنس منعقدہ دہلی میں محمد علی جناح کے مجوزہ نیشنل پیکٹ کی بھی مخالفت کی تھی اور اس بنا پر اس کانفرنس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا تھا۔[35] لالہ لاجپت رائے نے 16 رجون 1925ء کو سی۔آر۔داس کے انتقال سے چند ماہ قبل اس کے نام ایک خط میں ہندو۔مسلم اتحاد کو ناممکن العمل قرار دیا تھا۔خط یہ تھا کہ "ایک اور مسئلہ جو کچھ عرصہ سے مجھے پریشان کر رہا ہے اور جس کی طرف میں آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں، وہ ہندو۔مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے۔میں نے گزشتہ چھ ماہ میں بیشتر وقت مسلمانوں کی تاریخ اور فقہ کے مطالعہ میں صرف کیا ہے اور میں یہ سوچنے پر مائل ہوگیا ہوں کہ یہ نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی قابل عمل ہے۔اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ مسلمان لیڈر ترک موالات کی تحریک میں مخلص تھے پھر بھی میرا خیال ہے کہ ان کا مذہب ہندو۔مسلم اتحاد کے راستے میں مؤثر رکاوٹ ہے۔آپ کو وہ بات چیت یاد ہوگی جو میری حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو سے ہوئی تھی اور جس کے بارے میں، میں نے کلکتہ میں آپ کو بتایا تھا۔ہندوستان میں حکیم اجمل خان سے بہتر کوئی مسلمان نہیں ہے لیکن کیا کوئی مسلمان لیڈر قرآن کی خلاف ورزی کر سکتا ہے؟ میں یہی امید کرتا ہوں کہ اسلامی فقہ کے بارے میں میں نے جو کچھ سمجھا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔اگر مجھے اس بات کا یقین ہو جائے تو مجھے اس سے بے انتہا سکون ملے گا۔لیکن اگر اسلامی فقہ کے بارے میں میری سمجھ صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ برطانیہ کے خلاف متحد ہو سکتے ہیں لیکن ہم برطانوی خطوط پر ہندوستان کی حکومت چلانے کے لئے ایسا نہیں کر سکتے۔ہم جمہوری خطوط پر ہندوستان کی حکومت چلانے کے لئے ایسا نہیں کر سکتے۔تو پھر اس کا علاج کیا ہے؟ میں سات کروڑ مسلمانوں سے خوفزدہ نہیں ہوں۔لیکن میرا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کے سات کروڑ کے ساتھ افغانستان، وسطی ایشیا، عرب، میسوپوٹیمیا اور ترکی کے مسلح جتھے مل گئے تو ان کی مزاحمت ممکن نہیں ہو

گی۔ میں دیانتداری اور خلوص سے مانتا ہوں کہ ہندو۔مسلم اتحاد کی ضرورت ہے۔ میں مسلمان لیڈروں پر بھروسہ کرنے پر بھی پوری طرح تیار ہوں۔لیکن قرآن وحدیث کے احکامات کے بارے میں کیا کیا جائے۔ یہ قائدین ان کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے لئے کوئی راہ نجات نہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ کا عالمانہ ذہن اور دانشمندانہ دماغ اس مشکل سے نکلنے کی کوئی راہ تلاش کرلیں گے۔"[36]

لالہ لاجپت رائے نے اس سے قبل 1924ء میں لاہور کے ایک اخبار ٹریبیون میں ایک مضمون میں بھی لکھا تھا جس میں پہلی مرتبہ برصغیر کی فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کی سکیم پیش کی گئی تھی۔اس کی سکیم یہ تھی کہ "مسلمانوں کی چار ریاستیں ہوں گی۔(1) پٹھانوں کا صوبہ یا شمال مغربی سرحد۔(2) مغربی پنجاب (3) سندھ اور (4) مشرقی بنگال۔اگر ہندوستان کے کسی اور علاقے میں مسلمانوں کی اتنی تعداد یکجا ہو کر ان کا صوبہ بن سکے تو ان کی بھی اس طرح تشکیل ہونی چاہیے۔ لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ یہ متحدہ ہندوستان نہیں ہوگا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان واضح طور پر مسلم انڈیا اور غیر مسلم انڈیا میں تقسیم ہوگا۔"[37] اس سکیم میں بلوچستان کا ذکر نہیں تھا۔غالباً یہ محض اس کی سہو تھی تاہم یہ حقیقت دلچسپی سے خالی نہیں کہ 1947ء میں جو پاکستان وجود میں آیا وہ لالہ لاجپت رائے کی سکیم کے عین مطابق تھا۔ چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ تصور پاکستان کا ابتدائی خالق کوئی مسلمان مفکر نہیں تھا بلکہ پنجاب کا ایک آریہ سماجی ہندو لیڈر تھا جس کے سینے میں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت وعداوت کا بے پناہ جذبہ موجزن تھا اور جسے یہ سوچ کر رات کو نیند نہیں آتی تھی کہ افغانستان، وسطی ایشیا، عرب، میسوپوٹیمیا اور ترکی کے مسلمان ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں سے متحدہ محاذ بنالیں گے اور ان سب کے مشترکہ حملے کی مزاحمت نہیں ہوسکے گی۔

مطلوب الحسن سید لکھتا ہے کہ "قبل ازیں حسرت موہانی نے ہندو۔مسلم تنازعہ کے تصفیہ کے لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کی دو الگ الگ ریاستیں قائم کرنے کی سکیم سوچی تھی لیکن لاجپت رائے کے اپنے بیان کے مطابق اس نے حسرت موہانی کی سکیم میں اصلاح کی تھی۔حسرت موہانی ہندوستان کے بالآخر اتحاد کے بارے میں پر امید تھا۔لیکن لاجپت رائے نے ایسی ساری امیدیں ترک کر دی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ جب تک مسلمان جداگانہ انتخاب اور جداگانہ

نمائندگی پر اصرار کرتے ہیں اس وقت تک ہندوستان کے اتحاد کی کوئی امید نہیں کی جا سکتی۔ اس نے ہندوؤں کو متنبہ کیا تھا کہ اگر مسلمانوں کو اپنی الگ حیثیت رکھنے کی اجازت دے دی گئی تو حالات کی رفتار ہندوؤں کی خواہش کے مطابق نہیں ہوگی لہٰذا انہیں مخلوط انتخاب پر اصرار کرنا چاہیے۔ اس کا موقف یہ تھا کہ اگر مسلمان اپنی الگ حیثیت رکھنے پر اصرار کریں گے تو وہ سیلف گورنمنٹ کے حصول میں تاخیر کے ذمہ دار قرار پائیں گے اور اگر برطانیہ ان کی حمایت کرے گا تو اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ وہ ہندوستان پر اپنی امپریل گرفت کو دائمی بنانا چاہتا ہے۔ اس کے پاس دو حل تھے۔ یا تو مسلمان اپنی الگ حیثیت کو ترک کر دیں یا ہندوستان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کی الگ الگ ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کے اور حسرت موہانی کے مابین اختلاف یہ تھا کہ حسرت نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک فیڈریشن کا تصور پیش کیا تھا لیکن لاجپت رائے نے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔"[38]

بعض حلقوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ لالہ لاجپت رائے سے قبل حسرت موہانی کے علاوہ دہلی کے خیری برادران، بدایوں کے عبدالقادر بلگرامی اور ڈیرہ اسماعیل خان کے سردار محمد گل خان نے 1917ء، 1920ء اور 1923ء میں ہندوستان کی کسی نہ کسی صورت میں تقسیم کی تجویزیں پیش کی تھیں۔ لیکن ان تجاویز کے جو مختصر خاکے بتائے جاتے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک خاکہ بھی اتنا غیر مبہم اور واضح نہیں تھا جتنا کہ لاجپت رائے کا تھا۔ لاجپت رائے کی سکیم میں کوئی الفاظ کا ہیر پھیر نہیں تھا۔ اس نے بالکل دوٹوک الفاظ میں لکھا تھا کہ مسلمان مخلوط طریقہ انتخاب منظور کر کے ہندو قوم پرستی میں ضم ہو جائیں اور اگر وہ ایسا کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتے تو ہندوستان کو فرقہ وارانہ بنیاد پر آزاد و خود مختار ریاستوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اس کی سکیم میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی تجویز بھی شامل تھی اور یہ کہا گیا کہ اس کی مجوزہ مسلم ریاستیں صرف مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ہوں گی اور یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ریاستوں میں کوئی فیڈریشن یا کنفیڈریشن نہیں ہوگی۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ لاجپت رائے نے یہ سکیم اس زمانے میں پیش کی تھی جبکہ محمد علی جناح ہندو۔ مسلم اتحاد کے عظیم علمبردار تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ہندو لیڈر مسلمانوں کو کچھ تحفظات دینے پر آمادہ ہو جائیں تو مخلوط طریقہ انتخاب منظور کرنے میں کوئی حرج نہیں ہوگا اور یہ کہ ہندوستانی

عوام کی سیاسی تنظیم فرقہ وارانہ بنیادوں کی بجائے جماعتی بنیادوں پر ہونی چاہیے۔ جناح نے جنوری 1925ء میں آل پارٹیز کانفرنس میں اس مقصد کے لئے لکھنؤ پیکٹ منسوخ کر کے ایک اور نیشنل پیکٹ کی بھی تجویز پیش کی تھی مگر لاجپت رائے کی شدید مخالفت کے باعث یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکی تھی۔ وہ ہندوستان کی مسلم اقلیت کو کوئی تحفظات دینے پر آمادہ نہیں تھا وہ کہتا تھا کہ پائیدار ہندو۔ مسلم اتحاد صرف اسی صورت میں قائم ہوسکتا ہے کہ مسلمان اپنی الگ حیثیت پر اصرار نہ کریں اور غیر مشروط طور پر ہندو قوم پرستی کے دھارے میں شامل ہوجائیں۔ لاجپت رائے، مدن موہن مالویہ، سوامی شردھانند، ساورکر، بال گنگا دھر تلک، بپن چندر پال اور بہت سے دوسرے ممتاز ہندو لیڈروں کے اس قسم کے نظریات وافکار کے تاریخی ریکارڈ کا انبار موجود ہے۔ لیکن کوئی ایک ہندوستانی مؤرخ بھی یہ نہیں لکھتا کہ ان کی یہ فرقہ پرستی برطانوی سامراج کی سازش کا نتیجہ تھی۔ آج تک کسی ایک ہندو مؤرخ نے ان ہندو زعما کو برطانوی سامراج کے ایجنٹ یا پٹھو قرار نہیں دیا اور کسی نے بھی یہ نہیں لکھا کہ لاجپت رائے نے 1924ء میں برصغیر کی فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کی سکیم برطانوی سامراج کے کہنے پر پیش کی تھی۔

لاجپت رائے کی سکیم کی بنیاد معاشی تھی۔ پنجابی ہندوؤں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں نے پہلی جنگ عظیم کے دوران ملٹری ٹھیکوں، ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کے ذریعے خوب کمایا تھا۔ ان کی اس خوشحالی کی بنیاد کاروبار اور ساہوکارہ پر تھی، صنعتکاری پر نہیں تھی لہٰذا وہ کلکتہ، احمد آباد اور بمبئی کے ہندو درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں سے بھی زیادہ تھڑدلے تھے۔ وہ اس صوبے کے 55 فیصد پسماندہ مسلمانوں کو تعلیمی اور سرکاری اداروں میں 40 فیصد حصہ دینے پر بھی تیار نہیں تھے۔ ان کی سرمایہ دارانہ مفاد پرستی نے انہیں بالکل اندھا کر رکھا تھا۔ چنانچہ جب فضل حسین نے گورنر میکلیگن کے تعاون سے اس سلسلے میں کچھ اقدامات کئے تو ہندوؤں کے یہ طبقے اپنا توازن کھو بیٹھے۔ انہوں نے پہلے تو 1923ء میں فضل حسین کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کر کے یہ کہا کہ ''اورنگ زیب مت بنو اکبر بنو''۔ مطلب یہ تھا کہ پنجابی مسلمانوں کے ابھرتے ہوئے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کو کوئی رعایت دینے کی ضرورت نہیں اور جو شخص اسے کوئی رعایت دینے کی کوشش کرے گا وہ فرقہ پرست اور سامراجی پٹھو قرار پائے گا۔

جب فضل حسین پر ہندو لیڈروں کی اس قسم کی تقریروں اور تحریروں اور ہندو ذرائع

ابلاغ کے معاندانہ پروپیگنڈا کا کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے جنوری 1924ء میں دوسری صوبائی کونسل کے چند ہندو جاٹوں کو ساتھ ملا کر یونینسٹ پارٹی قائم کر لی تو لاجپت رائے وغیرہ کو یوں محسوس ہوا کہ پنجاب کا پسماندہ مسلمان درمیانہ طبقہ تو وہی کچھ کرنے لگا ہے جو ہندوؤں کا سرمایہ دار طبقہ کل ہند سطح پر کرتا ہے یعنی اقلیتی فرقہ میں سے چند پٹھوؤں کو ساتھ ملا کر غیر فرقہ واریت اور جمہوریت کے نام پر حکومت کرو۔ یہ صورت حال پنجاب میں ہندوؤں کے ترقی یافتہ طبقوں کے لئے کسی صورت قابل قبول نہیں ہو سکتی تھی چنانچہ لاجپت رائے نے لاہور کے روزنامہ ٹریبیون میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ جن میں ابتداً تو ہندو۔ مسلم اتحاد کو خارج از امکان قرار دے کر پنجاب کی فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کا مطالبہ کیا گیا اور پھر اسی اصول کا ہندوستان کے دوسرے علاقوں پر اطلاق کر کے پورے برصغیر کی تقسیم کی متذکرہ سکیم پیش کر دی۔

دی۔ پی۔ مینن، ڈاکٹر تارا چند، ستیہ مورتی، ڈاکٹر راجندر پرشاد اور جواہر لال نہرو سمیت کسی بھی چھوٹے بڑے ہندو مؤرخ نے یہ نہیں بتایا کہ لالہ لاجپت رائے نے یہ سکیم کس کے کہنے پر پیش کی تھی؟ کیا یہ سکیم برطانوی سامراج کی سازش کا نتیجہ تھی؟ اور کیا لالہ لاجپت رائے سامراجی پٹھو تھا؟ جو عناصر 1947ء میں لاجپت رائے کی سکیم کے عین مطابق برصغیر کی تقسیم کو برطانوی سامراج کی سازش کا نتیجہ قرار دیتے ہیں وہ متذکرہ سوالات کا اطمینان بخش جواب دیئے بغیر اپنا مؤقف تسلیم نہیں کرا سکتے۔ مارچ 1947ء میں آل انڈیا کانگرس کی مجلس عاملہ نے پنجاب کی فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کے حق میں جو قرارداد منظور کی تھی وہ لاجپت رائے کی سکیم کے مطابق تھی اور پھر اپریل 1947ء میں سردار پٹیل، جواہر لال نہرو اور گاندھی نے برصغیر کی تقسیم جس اصول کی بنا پر منظور کی تھی وہ بھی بالکل وہی اصول تھا جو لاجپت رائے نے 1924ء میں پیش کیا تھا۔ ابوالکلام آزاد کو ان کی یہ باتیں سن کر بہت دکھ ہوا تھا اور خان عبدالغفار خان تو سناٹے میں آ گیا تھا۔ غالباً ان دونوں ''قوم پرستوں'' کو یہ محسوس ہوا ہوگا کہ کانگرس کی ہندو قیادت انہیں بالکل اسی طرح استعمال کرتی رہی تھی جس طرح کہ پنجاب میں فضل حسین رہتک کے چند ہندو جاٹوں کو استعمال کیا کرتا تھا۔ ان دونوں کا سیاسی کردار کل ہند سطح پر تقریباً ایسا ہی رہا تھا جیسا کہ جنوری 1924ء کے بعد پنجاب میں راؤ بہادر کیپٹن مولچند اور سر چھوٹو رام کا ہوا کرتا تھا۔

فضل حسین کی موقع پرستانہ سیاست کے اثرات

جنوری 1927ء میں جو تیسری کونسل وجود میں آئی اس کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ اس میں صوبہ کے شہری مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کی جانب سے چودھری افضل حق، رانا فیروز الدین اور مولوی مظہر علی اظہر وغیرہ کی بجائے ڈاکٹر سر محمد اقبال، شیخ دین محمد، مقبول محمود اور چودھری محمد ظفر اللہ خان منتخب ہو کر آئے تھے۔ ان مسلم دانشوروں نے کونسل میں اپنی کوئی الگ پارٹی نہیں بنائی تھی وہ فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی میں ہی شامل ہو گئے تھے۔ دوسرا اہم پہلو یہ تھا کہ شہری ہندوؤں کی جانب سے انتخابی جیت مہا سبھائی امیدوار کی ہوئی تھی اور جو ہندو جاٹ کونسل میں آئے تھے ان میں سے بیشتر نے بھی اپنے آپ کو یونینسٹ پارٹی کی بجائے مہا سبھا سے منسلک کر لیا تھا۔ گویا اس زمانے میں پورے صوبہ میں فرقہ وارانہ تعصب کی جو فضا پائی جاتی تھی اس کا کونسل کے انتخاب میں بھی پوری طرح مظاہرہ ہوا تھا۔ تیسرا اہم پہلو یہ تھا کہ اس میں فضل حسین ایک منتخب وزیر کی حیثیت سے موجود نہیں تھا کیونکہ گورنر ہیلی نے اسے 1926ء کے اوائل میں سر سندر سنگھ مجیٹھیہ کی جگہ پانچ سال کے لئے اپنی ایگزیکٹو کونسل کا ریونیو ممبر نامزد کر لیا تھا اور اس کی جگہ سر جوگندر سنگھ کو منتخب وزیر مقرر کر دیا تھا۔ اس وزارتی ردو بدل کا مقصد یہ تھا کہ پنجابی مسلمانوں کے شہری درمیانہ طبقہ کے نمائندہ فضل حسین کی سیاسی قوت و اہمیت میں اضافہ نہ ہونے دیا جائے کیونکہ شہری مسلمانوں میں اس کی مقبولیت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ چنانچہ یہ مقصد پورا ہوا تو تقریباً ایک سال تک صرف دو منتخب وزیر رہے ایک سر چھوٹو رام اور دوسرا سر جوگندر سنگھ۔ اس دو رکنی منتخب کابینہ میں صوبہ کی مسلم اکثریت کی کوئی نمائندگی نہیں تھی۔ چوتھا اہم پہلو یہ تھا کہ ایک سال بعد منتخب وزیروں کی تعداد دو سے بڑھا کر تین کر دی گئی تھی۔ ایک سر جوگندر سنگھ دوسرا سر منوہر لال اور تیسرا ملک فیروز خان نون۔ گویا وزرا کا تقرر جماعتی بنیاد کی بجائے فرقہ وارانہ اصول کی بنیاد پر ہوا تھا۔

مسلمان منتخب وزیر ملک فیروز خان نون کی اس وقت جسمانی عمر تو تقریباً 36 سال تھی لیکن اس کی دماغی عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ وہ ایک سیاسی احمق تھا اور برطانوی سامراج کا پشتینی جی حضوری ہونے کی وجہ سے کسی بھی انگریز کی حکم عدولی کو کفر و الحاد سمجھتا تھا اور گورنر سر میلکم ہیلی تو اس کا مائی باپ تھا۔ جس کی ''خدمات اور صفات پر دفتر کے دفتر قلمبند کئے

جا سکتے تھے۔'' لکھتا ہے کہ ''سر میلکم ہیلی ایک دانشمند اور کامیاب منتظم تھے۔ وہ پنجاب کے گورنر تھے اور انتظامی امور میں میری معاونت کے لئے ان کا ایک مخصوص طریقہ تھا۔ انہوں نے وزراء کی کونسل کے لئے میرا انتخاب دیہی آبادی کے مفادات کی نمائندگی کی خاطر کیا۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت میں ہندوستان کا سب سے کم سن وزیر تھا۔''[39] دیہی آبادی کے مفادات کی نمائندگی کا مطلب یہ تھا کہ وہ جاگیرداروں کا نمائندہ تھا اور اسے شہری مسلمانوں کے مفادات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دیہات کے غریب کسانوں کی ترقی وخوشحالی کا بھی خواہاں نہیں تھا۔ وہ رنجیت سنگھ کی اس پالیسی سے اتفاق کرتا تھا کہ کسان کو نادار رکھو تو وہ پرُ امن رہے گا۔ بیرسٹر کی حیثیت سے اس کا تجربہ یہی تھا۔ ''میرے پاس قتل کے جو مقدمے آئے ان میں سے بیشتر وارداتیں مئی میں گندم کی فصل کی کٹائی کے بعد ہوئی تھیں۔ روپیہ اور پھر موسم کی حدت یہ دونوں مل کر کسانوں کے دماغ کو پراگندہ کر دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ لڑائی دنگا کرتے ہیں اور قتل بھی کر گزرتے ہیں اور پھر مقدموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ دولت ناخواندگی کے ساتھ مل کر کوتاہ اندیشی کو جنم دیتی ہے اور بعض لوگوں کو یہ باور کراتی ہے کہ اگر وہ اپنے دشمنوں کی سرکوبی کریں تو وکیلوں کی بھاری فیس اور رشوت ادا کرنے کے بعد وہ مواخذہ سے بچ بھی سکتے ہیں۔''[40] مطلب یہ تھا کہ اس کی رائے میں کوئی جاگیردار قتل، اغوا، ڈکیتی، رسہ گیری، زنا کاری اور اس قسم کے دوسرے سنگین جرائم کا ارتکاب نہ تو خود کرتا تھا نہ ہی اپنے چوہڑوں چماروں سے کرواتا تھا۔ یہ غریب کسان ہی تھے جو مئی میں گندم کی فصل کی کٹائی کے بعد جرائم کرتے تھے۔ لہٰذا امن وامان کی خاطر انہیں نادار رکھنا ضروری تھا۔ قدرتی طور پر برطانوی سامراج کو ایسا شخص بہت اچھا لگتا تھا چنانچہ اس نے آئندہ بیس سالوں میں اسے متعدد اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا۔ اس میں خوبی یہ تھی کہ اس کا دماغ عقل ودانش سے خالی تھا اور اس میں کسی حد تک طفلانہ معصومیت بھی پائی جاتی تھی۔ اس کی وفاداری اور فرمانبرداری کی انتہا یہ تھی کہ یہ اپنے ماتحت انگریز افسر کو بھی اپنا آقا تصور کرتا تھا اور اس کے اپنے بقول اسے انگریزوں کی خدمت کرنے میں کوئی خفت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

تیسری کونسل کی تشکیل میں مضمر پانچواں اور سب سے اہم پہلو یہ تھا کہ کونسل میں یونینسٹ پارٹی کی اکثریت نہیں تھی اور کسی وزیر کا تقرر اس پارٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ سر چھوٹو رام دو ایک ہندو جاٹوں کے ہمراہ مسلمان جاگیرداروں کی اس پارٹی سے چمٹا رہا

تھا تاہم اس پارٹی کی کوئی سیاسی وقعت نہیں رہی تھی۔ کونسل میں سرکاری بلاک کی حیثیت فیصلہ کن عنصر کی تھی اور منتخب اور غیر منتخب وزیر کا عہدہ گورنر ہیلی کے رحم و کرم پر تھا۔ فضل حسین نے اس پارٹی کی وساطت سے صوبہ میں اپنی جو آزاد سیاسی پوزیشن بنانے کی کوشش کی تھی، وہ گورنر نے ایک ڈیڑھ ماہ میں ہی ختم کر دی تھی۔ گویا برطانوی سامراج کے لئے یہ بات قابل قبول نہیں تھی کہ پنجاب میں سامراج نواز جاگیرداروں کی تائید و حمایت سے کوئی ایسا مسلمان لیڈر پیدا ہو جو کسی وقت بھی اسے کامیابی سے چیلنج کر سکے۔ گورنر ہیلی نے جون 1924ء میں اپنے عہدے کا چارج لینے کے بعد حکومت ہند کی پالیسی کے مطابق پنجاب کے سارے عوام کو بالعموم اور مسلم عوام کو بالخصوص سیاسی طور پر پسماندہ رکھنے کا جو پروگرام بنایا تھا اس پر کامیابی سے عمل ہوا اور پورا صوبہ تین فرقہ وارانہ گروہوں میں تقسیم ہو گیا۔

فضل حسین کی سیاست ناکام ہوئی اور اس کی حیثیت محض ایک سرکاری ملازم کی سی ہو گئی۔ اس کے سیاسی بال و پر کتر دیئے گئے تھے۔ اس کی ہوس اقتدار نے بالآخر اسے ایک سامراجی پٹھو بنا کر رکھ دیا۔ اگر وہ گورنر میکلیگن کی امداد و اعانت سے جاگیرداروں کے چنگل میں نہ پھنستا تو وہ اپنی صلاحیت و قابلیت کے مطابق نہ صرف صوبہ پنجاب میں بلکہ پورے برصغیر میں ایک اعلیٰ سیاسی مقام حاصل کرتا۔ پنجاب کے ابھرتے ہوئے مسلم درمیانہ طبقہ کو ایک لیڈر کی ضرورت تھی اور برطانوی سامراج اس طبقہ کی تمناؤں، خواہشات اور ضروریات کو زیادہ دیر تک نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اب برطانوی سامراج کی حیثیت وہ نہیں تھی جو 1857ء میں تھی۔ اب وہ ایک زوال پذیر عالمی طاقت تھا۔ روس میں عظیم پرولتاری انقلاب برپا ہو چکا تھا۔ جنوبی آئرلینڈ بزور قوت آزادی حاصل کر چکا تھا۔ اگرچہ سلطنت عثمانیہ ختم ہو گئی تھی لیکن کمال اتاترک نے کامیابی کے ساتھ اپنے وطن عزیز کی آزادی و خود مختاری کا دفاع کیا تھا اور افغانستان کے امان اللہ خان نے بھی تیسری افغان جنگ کے بعد اپنے ملک کی مکمل آزادی و خود مختاری کو تسلیم کروا لیا تھا۔ فضل حسین کی موقع پرستانہ سیاست سے پنجاب کے شہری مسلمانوں کی کچھ معاشرتی و معاشی ترقی ہوئی لیکن انہیں سیاسی طور پر سخت نقصان پہنچا۔ ایک طرف تو وہ سیاسی طور پر دقیانوسی جاگیرداروں کے نرغے میں آ گئے اور دوسرے نہایت فرقہ پرست، قدامت پسند اور اسلام فروش عناصر پر مشتمل مجلس احرار نے ان کا گھیراؤ کر لیا۔

باب: 5

پنجابی مسلم درمیانہ طبقہ کی سیاسی پیش قدمی کی کوشش

پنجابی مسلم رہنماؤں کی جناح کے خلاف بغاوت۔ ''شفیع لیگ''

جب پنجاب میں فرقہ وارانہ بنیاد پر تیسری وزارت کا تقرر ہوا تو اس کے دو ایک ماہ بعد یعنی 20/مارچ 1927ء کو دہلی مرکزی لیجسلیٹو کونسل کی انڈیپینڈنٹ پارٹی کے قائد محمد علی جناح کی تحریک پر ایک ایسا واقعہ ہوا جس سے پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی سیاست بالعموم اور پنجاب کے مسلمانوں کی سیاست بالخصوص بہت متاثر ہوئی۔ اس واقعہ کا پس منظر یہ تھا کہ محمد علی جناح مئی 1924ء کے بعد سے مسلسل اس کوشش میں تھے کہ ہندو۔مسلم اتحاد کی کوئی صورت نکل آئے تا کہ ہندوستان پر امن اور آئینی ذرائع سے بلا تاخیر آزادی حاصل کر سکے۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے مسلم لیگ کی جانب سے دو تین مرتبہ کمیٹیاں بھی مقرر کروائی تھیں تا کہ ہندو۔مسلم مصالحت کے لئے کوئی ایسا آئینی فارمولا تیار ہو سکے جو دونوں فرقوں کے لئے قابل قبول ہو مگر تین سال تک ان کوششوں کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ انہوں نے بنگال کے ایک وسیع النظر ہندو لیڈر سی۔آر۔داس کے تعاون سے جنوری 1925ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک نیشنل پیکٹ (National Pact) کروانے کی بھی کوشش کی تھی مگر لاجپت رائے، مدن موہن مالویہ اور بعض دوسرے ہندو لیڈروں کی مخالفت کی وجہ سے یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی تھی۔ لیکن جب نومبر 1926ء میں گاندھی نے سیاسیات سے ''ریٹائر'' ہونے کا اعلان کر دیا اور دسمبر میں آل انڈیا کانگرس نے سری نواس آئینگر کی زیر صدارت یہ قرارداد منظور کی کہ ہندو۔مسلم اتحاد کے لئے گفت وشنید ہونی چاہیے تو جناح نے مارچ 1927ء میں مرکزی کونسل کے بجٹ سیشن کے دوران اس مقصد کے لئے پھر سلسلہ جنبانی کی۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ آئینگر جنوبی ہند کے صوبہ مدراس کا

رہنے والا ہے اور وہ مسلم دشمنی کے جذبہ سے مغلوب نہیں ہے اس لئے ممکن ہے کہ فرقہ وارانہ مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ چنانچہ انہوں نے 20/مارچ دہلی میں 30 مختلف الخیال مسلمان لیڈروں کی ایک کانفرنس طلب کی تا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان پائیدار اتحاد قائم کرنے کے مسئلہ پر غور کیا جائے۔ جناح کی زیر صدارت اس کانفرنس میں پنجاب سے سر میاں محمد شفیع، میاں شاہ نواز اور سردار محمد نواز خان کے علاوہ بعض دوسرے اصحاب نے شرکت کی اور آئینگر کی ان تجاویز پر غور کیا گیا جو اس نے فرقہ وارانہ مصالحت کے لئے جناح کو بھیجی تھیں۔ ان تجاویز کا خلاصہ یہ تھا کہ 1916ء کے لکھنؤ پیکٹ میں ترمیم و تنسیخ کر کے ملک میں مخلوط طریقہ انتخاب رائج کیا جائے۔

کانفرنس میں ان تجاویز کے تمام پہلوؤں پر طویل بحث و تمحیص ہوئی اور پھر یہ قرار پایا کہ (1) سندھ کو احاطہ بمبئی سے الگ کر کے ایک جدا صوبہ بنایا جائے۔ (2) شمال مغربی صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دیگر صوبہ جات ہند کی طرح اصلاحات رائج کی جائیں۔ (3) مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی ایوان کی ایک تہائی سے کم نہ ہو۔ (4) پنجاب اور بنگال کی مجالس قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب سے مقرر کی جائے۔ (5) مسلمانوں کی اقلیت کے صوبوں میں ان کا ویٹیج برقرار رکھا جائے تو مسلمان ہندوستان کے مرکز اور تمام صوبوں میں مخلوط انتخاب قبول کرنے پر تیار ہیں۔ 29/مارچ کو جناح نے ایک بیان میں اس مجوزہ آئینی فارمولا کی وضاحت کی اور کہا کہ مسلمان قانون ساز اسمبلیوں میں نشستوں کے تحفظ کے ساتھ مخلوط انتخاب جب ہی قبول کریں گے کہ پہلے ہندو ہماری ساری شرطیں تسلیم کر لیں۔ یعنی یہ کہ سندھ کو احاطہ بمبئی سے علیحدہ کیا جائے اور صوبہ سرحد اور بلوچستان میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔

15/مئی کو سری نواس آئینگر کی صدارت میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں ہوا۔ جس میں جناح کی تجاویز کو من و عن تسلیم کر لیا گیا اور بقول عاشق حسین بٹالوی سارا ہندوستان تہنیت و مبارکباد کے نعروں سے گونجنے لگا۔ سری نواس آئینگر نے اس صورت حال کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ ''تجاویز دہلی اس وقت ہمارے درمیان ایک نہایت محفوظ اور معقول مفاہمت کی بنیاد بن سکتی ہیں جس پر آگے چل کر مستقبل میں مکمل اور مستحکم قومیت کی عمارت کھڑی کی جا سکے گی۔'' موتی لال نہرو نے کہا کہ ''ملک میں اس وقت جو افسوس ناک فرقہ وارانہ کشیدگی

پیدا ہو چکی ہے اس کو دور کرنے کے لئے ان تجاویز سے بہتر اور کوئی نسخہ نہیں ہے۔'' سروجنی نائیڈو نے کہا کہ '' کانگرس نے مسٹر جناح کی، جنہیں مسٹر گوکھلے ہندو۔ مسلم اتحاد کا بہترین سفیر کہا کرتے تھے، تجاویز منظور کر کے ثابت کر دیا ہے کہ یہ جماعت ہندوستان کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے میں بجا اور مخلص ہے۔'' محمد علی جوہر کا تبصرہ یہ تھا کہ '' مجھے یقین ہے کہ آنے والی نسلیں ہمارے اس فیصلے پر ہمیشہ فخر کریں گی'' اور محمد کریم چھاگلہ کا خیال یہ تھا کہ ''صرف جناح کی جادوگری ہی سے یہ کارنامہ سرانجام دیا جا سکتا ہے۔''

دہلی کی ان تجاویز سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں محمد علی جناح مسلمانان ہند کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی مسائل سے پوری طرح آگاہ نہیں تھے۔ اگست 1921ء کے بعد سے پورے برصغیر میں مسلسل فرقہ وارانہ فسادات ہو رہے تھے لیکن انہوں نے ان فسادات کے پس منظر کا صحیح تجزیہ نہیں کیا تھا۔ انہیں اپنے اس مؤقف پر اصرار تھا کہ اگر مسلمانوں کو کچھ سیاسی تحفظات و حقوق دے دیئے جائیں تو مخلوط طریقہ انتخاب سے ہندو۔ مسلم اتحاد قائم ہو سکتا ہے۔ سیکولر ہندوستانی قوم پرستی کو فروغ مل سکتا ہے اور انگریزوں سے آئینی و جمہوری ذرائع سے آزادی حاصل کی جا سکتی ہے۔ بلاشبہ وہ خلوص دل سے ایسا چاہتے تھے لیکن ان کی اس خواہش کا برصغیر کے فرقہ وارانہ حقائق سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ 22-1921ء میں گاندھی کی ترغیب پر ''تحفظ خلافت'' کے لئے جو مذہبی تحریک شروع کی گئی تھی اس کے نتیجے میں دونوں فرقوں کے درمیان وہ تمام سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی تضادات منظر عام پر آ گئے تھے جو صدیوں کی تاریخ کی پیداوار تھے۔ ایک طرف تو مسلمانوں کے ابھرتے ہوئے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ انگریزوں کے جانے کے بعد ہندوؤں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقے انہیں پارلیمانی جمہوریت اور انڈین نیشنلزم کے نام پر ثابت ہی نگل لیں گے اور دوسری طرف ہندوؤں کے بہت سے تعلیم یافتہ عناصر کے دلوں میں یہ خطرہ جاگزیں ہو گیا تھا کہ اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنی الگ حیثیت قائم رکھی تو وہ زود یا بدیر افغانستان، ایران اور ترکی وغیرہ سے اتحاد کر کے پھر پورے برصغیر پر اپنا تسلط قائم کر لیں گے۔ پنجاب کے دونوں فرقوں میں یہ خطرات بہت زیادہ گہرے ہو گئے تھے کیونکہ 23-1921ء میں فضل حسین نے انگریزوں اور جاگیرداروں کے تعاون سے مسلمانوں کے پسماندہ درمیانہ طبقہ کو جو تھوڑے بہت حقوق دینے کی کوشش کی تھی اس کی شہری

ہندوؤں نے سخت مزاحمت کی تھی۔ وہ مسلمانوں کو کوئی رعایت دینے پر آمادہ ہی نہیں ہوتے تھے۔ ان کی مزاحمت کی انتہا یہ تھی کہ ان کے ممتاز ترین لیڈر لاجپت رائے نے 1924ء میں پہلے تو ایک سلسلۂ مضامین میں فرقہ وارانہ بنیاد پر پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کیا اور پھر اسی اصول کی بنیاد پر پورے برصغیر کی تقسیم کی تجویز پیش کر دی تھی۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ لاجپت رائے جیسے انتہائی تنگدل عناصر ہندو۔ مسلم اتحاد کو خارج از امکان قرار دیتے تھے اور ان کے اس مؤقف کے برملا اظہار کا ردعمل یہ ہوا تھا کہ مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کا ترجمان شاعر علامہ اقبال ''اب سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' کا ترانہ نہیں گاتا تھا۔ اب اس کا نیا ترانہ یہ تھا کہ ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' جناح نے جب 20 مارچ 1927ء کو دہلی میں اپنی ''جادوگری'' سے مختلف الخیال مسلمان لیڈروں سے بعض شرائط کے تحت مخلوط طریقہ انتخاب منظور کرایا تھا تو انہیں معلوم نہیں تھا کہ پنجاب میں مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کی طرف سے اس کی سخت مخالفت کی جائے گی اور ان کے مخالفین میں علامہ اقبال بھی پیش پیش ہوں گے۔

چنانچہ جب میاں محمد شفیع دہلی سے واپس لاہور آیا تو اس نے یہاں اپنے دوستوں کے مشورے کے مطابق ایک اخباری بیان میں جناح کی تجویز کی سخت مخالفت کی۔ اس کی مخالفت کی بنیاد پنجاب کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اس مؤقف پر تھی کہ پنجابی مسلمانوں کو صوبائی کونسل میں جداگانہ طریقہ انتخاب کے ذریعے اکثریت حاصل ہونی چاہیے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ انگریزی حکومت سے یہ امید نہیں کی جاسکتی کہ وہ محدود رائے دہندگی کی سکیم کو بدل کر بالغ رائے دہندگی کا اصول منظور کر لے اور محدود رائے دہندگی کی صورت میں ووٹروں کی فہرست میں مسلمان صرف چالیس فیصد تھے حالانکہ صوبہ میں ان کی آبادی 55 فیصد تھی۔ مزید برآں ان کا کہنا یہ تھا کہ چونکہ مسلمان سیاسی، معاشرتی، تعلیمی اور معاشی لحاظ سے انتہائی پسماندہ ہیں اس لئے اگر بالغ رائے دہندگی کا بندوبست ہو بھی جائے تب بھی ہندوؤں کی بالادستی قائم رہے گی کیونکہ نہ صرف ان کی دولت بلکہ انتظامی مشینری پر ان کی اجارہ داری انتخابات پر اثر انداز ہوگی بلکہ وہ چند مسلمان پٹھوؤں کو اپنے ساتھ ملا کر من مانی کرتے رہیں گے اور مسلمان کبھی بھی ترقی کی راہ پر گامزن نہیں ہوں گے۔

جب 15 مئی 1927ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ''تجاویز دہلی'' کو منظور کر لیا اور اس کے ساتھ ہی یہ تحریک بھی شروع ہوگئی کہ ہندوستان کا ایک اساسی دستور وضع کرنا چاہیے تا کہ وزیر

ہندلارڈ برکن ہیڈ کا منہ بند کیا جاسکے جو آئے دن یہ کہتا رہتا تھا کہ ہندو اور مسلمان متفق ہو کر اپنے ملک کا دستور وضع کرنے سے معذور ہیں تو انہی دنوں پنجاب کے مسلمانوں نے مخالفانہ جلسوں اور مظاہروں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ ان کا پہلا جلسہ یکم مئی کو لاہور میں ہوا تھا جس میں علامہ اقبال نے ''تجاویز دہلی'' کے خلاف ایک قرارداد پیش کی اور دوسرے لیڈروں نے اس خطرے کا اظہار کیا کہ اگر کانگرس نے ان ''تجاویز'' کو منظور کر لیا تو حکومت برطانیہ بھی ہتھیار ڈال دے گی اور اس بنا پر مسلمان ہمیشہ کے لئے ہندوؤں کی محکومی میں چلے جائیں گے۔ اگرچہ 23-1921ء میں ہندوؤں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے متعصبانہ رویے کے پیش نظر پنجابی مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کو لاحق شدہ یہ خطرہ بے بنیاد نہیں تھا۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ''تجاویز دہلی'' کی مخالفت میں برطانوی سامراج کا بھی ہاتھ تھا اور سامراجی نقطۂ نگاہ سے ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ 1927ء میں ہندوستان کے لئے نئی اصلاحات کا تذکرہ زوروں پر تھا کیونکہ اس وقت تک یہ طے ہو چکا تھا کہ 1919ء میں جس شاہی کمیشن کے تقرر کا وعدہ کیا گیا تھا کہ آئینی اصلاحات کے عملی تجربے کے دس سال بعد مقرر ہوگا، اس کا تقرر 1927ء کے آخری مہینوں میں ہو جائے گا۔ اگر اس زمانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمائندہ زعماء فرقہ وارانہ اتحاد کے لئے کسی آئینی فارمولا پر متفق ہو جاتے تو حکومت برطانیہ کو بڑی مشکل کا سامنا کرنا پڑتا۔ جناح دراصل یہی چاہتے تھے لیکن ان کی یہ خواہش موہوم تھی کیونکہ یہ نہ صرف برصغیر کے فرقہ وارانہ حقائق سے مطابقت نہیں رکھتی تھی بلکہ برطانوی سامراج کے مفاد کے بھی سخت مخالف تھی۔ چنانچہ پنجاب کے ''بڑوں'' نے دوسرے صوبوں میں اپنے ''دوستوں'' کو اشارے کئے۔ کلکتہ، پٹنہ، مدراس اور ہندوستان کے کئی دوسرے مقامات پر اسی قسم کے جلسے ہوئے۔ پھر سر فضل حسین نے چودھری ظفر اللہ خان اور ڈاکٹر ضیا الدین کو جو غالباً اپنے کسی اور کام کے لئے انگلستان جا رہے تھے اس کام پر مامور کیا کہ وہ انگلستان کے اخباروں میں اور دوسرے طریقوں پر یہ پروپیگنڈا کریں کہ ''تجاویز دہلی'' کے حامی چند افراد ہیں۔ عام مسلمان مخلوط طریقۂ انتخاب کو اپنے لئے سخت خطرناک سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر ضیا الدین فرانس جا کر آغا خان سے ملے جس سے سر فضل حسین کے خاص تعلقات تھے اور انہیں فضل حسین کی یہ درخواست پہنچائی کہ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی بڑا جلسہ اس سلسلے میں کیا گیا تو بشرط ضرورت وہ اس کی صدارت کرنے کی تکلیف اٹھائیں۔ [1]

ظفر اللہ خان لکھتا ہے کہ ''پنجاب کونسل کا دوسرا اجلاس گرمیوں میں شملہ میں ہوا تو مسلم اراکین نے فیصلہ کیا کہ ان کا ایک نمائندہ انگلستان جائے اور وہاں اراکین پارلیمنٹ اور دیگر اہل الرائے اصحاب سے مل کر ہندوستان کے آئندہ آئینی دستور کے متعلق مسلمانوں کا نقطۂ نگاہ ان پر واضح کرے۔ یہ تجویز میاں سر فضل حسین کی تھی اور آخر انہی کے مشورے سے اس خدمت کو سرانجام دینے کے لئے مجھے منتخب کیا گیا...... میں جب لندن پہنچا تو ڈاکٹر شفاعت احمد خان صاحب یو۔پی کونسل کے مسلم اراکین کے نمائندے کی حیثیت سے لندن میں پہنچے ہوئے تھے......ان دنوں لندن میں مسجد احمدیہ کے انچارج مولانا عبدالرحیم دردصاحب تھے۔ان کا پورا تعاون بھی مجھے حاصل رہا۔ان کی مشفقانہ توجہ سے مجھے اپنے کام میں بہت مدد ملی۔میرے عزیز دوست ڈاکٹر آسکر برنلر کی رہائش بھی میرے قریب ہی تھی، ان کا مشورہ بھی بعض امور میں میرے لئے مفید ثابت ہوا۔کبھی فرصت کی گھڑی میسر آتی تو میں ان کے ساتھ گزار لیتا۔ سارا دن ملاقاتوں، مجالس میں تقریروں اور نوٹ لکھوانے میں صرف ہوتا۔ بہت سی سرکاری وغیر سرکاری شخصیتوں سے ملنے کا موقع میسر آیا۔''[2]

سر ظفر اللہ خان ابھی لندن ہی میں تھا کہ حکومت برطانیہ نے نومبر 1927ء میں سر جان سائمن (John Simon) کی سرکردگی میں موعودہ شاہی کمیشن کا اعلان کر دیا جس کے ذمہ یہ کام کیا گیا کہ وہ ہندوستان میں اہل الرائے اصحاب سے تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد نئی آئینی اصلاحات کے بارے میں اپنی تجاویز پیش کرے۔اس کمیشن نے اپنا ابتدائی دورہ دسمبر 1927ء میں کیا تو مسلم لیگ اور کانگرس دونوں ہی نے اس کا بائیکاٹ کیا کیونکہ اس میں کوئی ہندوستانی نمائندہ شامل نہیں تھا۔لیکن پنجاب میں فضل حسین وغیرہ کمیشن کے بائیکاٹ کے حق میں نہیں تھے۔ ان کی رائے یہ تھی کہ اگر ایسا کیا گیا تو حکومت برطانیہ مشترکہ طرز انتخاب کی تجویز منظور کر لے گی اور اس طرح برصغیر میں مسلمانوں کا سیاسی مستقبل بالکل تاریک ہو جائے گا۔پنجاب میں ان کے چھ سالہ تجربے نے انہیں یہ سکھایا تھا کہ پسماندہ مسلمانوں کے بارے میں ہندوؤں کے ترقی یافتہ درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں سے فراخدلی کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔مزید برآں حکومت برطانیہ کی بھی یہ خواہش تھی کہ نئی اصلاحات کے بارے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتفاق رائے نہ ہونے پائے کیونکہ یہ بات ان کے سامراجی مفادات کے منافی تھی۔ چنانچہ اس بنا پر آل انڈیا

مسلم لیگ دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک دھڑا ''جناح لیگ'' قرار پایا اور دوسرا ''شفیع لیگ'' کے نام سے مشہور ہوا۔

سید نور احمد کے بیان کے مطابق سر فضل حسین گروپ نے دراصل آل انڈیا مسلم لیگ پر قبضہ کرنے کی سکیم مارچ 1927ء میں جناح کی ''تجاویز دہلی'' کے بعد تیار کر لی تھی۔ لیکن جناح نے یہ سکیم کامیاب نہ ہونے دی تو پنجابی لیڈروں نے متوازی لیگ قائم کر لی۔ وہ لکھتا ہے کہ ''اتفاق سے 1926ء کے اجلاس کے موقع پر لیگ کو آئندہ سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد کرنے کی دعوت دی جا چکی تھی جو منظور کر لی گئی تھی۔ اگر لاہور میں اجلاس ہوتا تو پنجابی لیڈروں کو لیگ کے پنڈال میں اپنا ہم خیال ہجوم جمع کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ لیگ کی مجلس عاملہ کے بعض ممبروں نے اس خطرے کو بھانپ لیا۔ انہوں نے مجلس عاملہ میں لیگ کے سالانہ اجلاس کی جگہ کلکتہ مقرر کرنے کی کی تجویز پیش کر دی۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اجلاس کے انتظامات میں ردوبدل کرنے کا اختیار مجلس عاملہ کو حاصل ہے۔ سر محمد شفیع بھی لیگ کی عاملہ کا ممبر تھا اس نے اعتراض کیا کہ جو فیصلہ ہو چکا ہے اسے بدلا نہیں جا سکتا۔ کلکتہ میں اجلاس منعقد کرنے کی تجویز کثرت رائے سے پاس ہو گئی لیکن سر شفیع کا یہ دعویٰ تھا کہ یہ فیصلہ ناجائز اور کالعدم ہے اور پہلا فیصلہ بدستور قائم ہے۔ اس اختلاف نے آخر یہ صورت اختیار کی کہ بیک وقت لیگ کا ایک اجلاس لاہور میں ہوا اور ایک اجلاس کلکتہ میں ہوا۔ اجلاس لاہور میں سر محمد شفیع کو لیگ کا صدر اور علامہ اقبال کو سیکرٹری چن لیا گیا۔ اجلاس کلکتہ کی صدارت سر محمد یعقوب نے کی۔ اجلاس لاہور نے ''تجاویز دہلی'' کی مخالفت کی اور مذمت کی اور سائمن کمیشن کے سامنے مسلمانوں کے مطالبات پورے زور سے پیش کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اجلاس کلکتہ نے ''تجاویز دہلی'' کی حمایت کی اور سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا۔''[3] اجلاس لاہور میں سر محمد شفیع کے علاوہ جن قابل ذکر لوگوں نے شرکت کی ان میں علامہ اقبال، نواب سر ذوالفقار علی اور حسرت موہانی بھی شامل تھے اور اجلاس کلکتہ میں شرکت کرنے والوں میں محمد علی جوہر، شوکت علی، ظفر علی خان، ملک برکت علی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ڈاکٹر محمد عالم، ابوالکلام آزاد، سر عبدالرحیم، سر علی امام، مہاراجہ محمود آباد، ایم۔ سی چھاگلہ اور مولوی فضل الحق وغیرہ شامل تھے۔

دسمبر 1927ء میں مدراس میں آل انڈیا کانگرس کا بھی سالانہ اجلاس ہوا جس میں

''تجاویز دہلی'' کے بارے میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی 15 رمئی 1927ء کی قرارداد پر مہر تصدیق ثبت نہ کی گئی بلکہ مجلس عاملہ کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ ایک آل پارٹیز کانفرنس طلب کرے جو ''تجاویز دہلی'' اور دوسری ''پارٹیوں کی تجاویز'' کو مدنظر رکھتے ہوئے ملک کے لئے آزادی کا متفقہ آئین تیار کرے۔ یہ قرارداد گاندھی کے مشورے کے مطابق منظور کی گئی تھی جو تقریباً ایک سال تک سیاسیات سے کنارہ کش رہنے کے بعد پھر اپنے مخصوص مہاتمائی انداز میں میدان عمل میں آ گیا تھا۔ چنانچہ مجوزہ آل پارٹیز کانفرنس 12 رفروری 1928ء کو ہوئی جبکہ سائمن کمیشن 3 رفروری کو دوسری مرتبہ ہندوستان آ کر مختلف علاقوں کا باقاعدہ دورہ شروع کر چکا تھا اور اس کے خلاف مظاہروں کی وجہ سے پورے برصغیر کی سیاسی فضا میں خاصی تلخی پیدا ہو چکی تھی۔ کانفرنس میں دو تین ہفتے تک بحث ہوتی رہی مگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

5 رمئی کو محمد علی جناح چند ماہ کے لئے انگلستان چلے گئے تو ان کی عدم موجودگی میں 19 رمئی کو بمبئی میں دوسری آل پارٹیز کانفرنس منعقد ہوئی جس میں دستور وضع کرنے کا کام ایک سب کمیٹی کے حوالے کر دیا گیا جس کے یہ دس ارکان تھے۔ سر علی امام، شعیب قریشی، موتی لال نہرو، ایم۔ ایس۔ رفیع، ایم۔ آر۔ جیکار، جی۔ آر۔ پردھان، سردار منگل سنگھ، سر تیج بہادر سپرو، ایم۔ این جوشی اور سبھاش چندر بوس۔ موتی لال نہرو اس کمیٹی کا صدر تھا۔

28 راگست 1928ء کو لکھنؤ میں ڈاکٹر انصاری کی زیر صدارت تیسری آل پارٹیز کانفرنس ہوئی اور جب اس میں ''نہرو کمیٹی'' کی رپورٹ کا اعلان ہوا تو پتہ چلا کہ اس کمیٹی نے ان ''تجاویز دہلی'' کو مسترد کر دیا ہے جو محمد علی جناح نے 20 رمارچ 1927ء کو مختلف الخیال مسلمان لیڈروں سے منظور کرائی تھیں اور جنہیں آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے 15 رمئی 1927ء کو من وعن منظور کر لیا تھا۔ نہرو کمیٹی کے اس انحراف کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ ''جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف مسلم تجاویز اور دوسری طرف ہندو مہا سبھا اور سکھ لیگ کے مطالبات ایک دوسرے کی ضد ہیں تو ہم دونوں میں کسی ایک نقطۂ نگاہ کو پورے طور پر تسلیم نہیں کر سکتے۔'' کمیٹی نے جو آئینی اصول مرتب کئے تھے ان میں پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نشستیں آبادی کے تناسب سے مخصوص کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا اور اس کی بجائے بالغ رائے دہندگی کے اصول کے تحت بلاتخصیص مخلوط انتخاب رائج کر دینے کی سفارش کی گئی تھی۔ مرکز میں بھی مسلمانوں کے لئے ایک تہائی

(33 فیصد) نشستیں مخصوص کرنے کے اصول کی مخالفت کی گئی تھی اور سفارش کی گئی تھی کہ مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نمائندگی دی جائے (تقریباً 25 فیصد)۔ اس کے علاوہ انہیں دیگر نشستوں کے لئے انتخاب لڑنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ لیکن اس رپورٹ کی اہم ترین تجویز یہ تھی کہ ''مرکزی حکومت کا ڈھانچہ وحدانی ہوگا اور صوبوں کے اختیارات محدود ہوں گے۔'' تاہم کانفرنس نے اس شرط پر ان تجاویز کی منظوری دے دی کہ دسمبر میں جب کانگرس کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہوگا تو ایک کنونشن منعقد کر کے نہرو رپورٹ پر آخری مہر تصدیق ثبت کی جائے گی۔ اس رپورٹ کا مطلب یہ تھا کہ کلکتہ، بمبئی اور احمد آباد کا ہندو بورژوا طبقہ برصغیر کے سات کروڑ مسلمانوں کو کوئی سیاسی، معاشرتی اور معاشی رعایت دینے پر آمادہ نہیں تھا اور وہ پارلیمانی جمہوریت کی آڑ لے کر ہندوستان پر اپنا مستقل تسلط قائم کرنا چاہتا تھا۔

قدرتی طور پر پنجاب کے شہری مسلمانوں میں اس رپورٹ پر بڑا ہی سخت ردعمل ہوا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لئے ان کی آبادی کے لحاظ سے نشستیں مخصوص نہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اپنی دولت اور انتظامیہ پر اجارہ داری کی وجہ سے اپنی آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں حاصل کر لیں گے اور پھر وہ چند مسلمان، پٹھوؤں کو اپنے ساتھ ملا کر مسلم اکثریت کے صوبوں پر بھی اپنا سیاسی غلبہ قائم کر لیں گے۔ ان کا یہ خطرہ بے بنیاد نہیں تھا کیونکہ پنجاب میں دوسرے فرقے کے چند پٹھوؤں کو ساتھ ملا کر سیاسی غلبہ قائم کرنے کی روایت دراصل فضل حسین نے جنوری 1924ء میں ڈالی تھی جبکہ اس نے رہتک کے دو تین ہندو جاٹوں کو ساتھ ملا کر سامراج نواز جاگیرداروں کی یونینسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی تھی۔ جو حربہ اپنا سیاسی اقتدار قائم رکھنے کے لئے فضل حسین اختیار کر سکتا تھا وہی حربہ کوئی لالہ لاجپت رائے یا راجہ نریندر ناتھ بھی اپنا سیاسی تسلط قائم کرنے کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔ متعدد خلافتی مسلمان سیاسی، پٹھوؤں کا کردار ادا کرنے کے لئے ہمہ وقت آمادہ تھے اور انہیں سیاسی مقاصد کے لئے سرمایہ دار ہندوؤں سے مالی امداد یا خیرات لینے کی بھی عادت پڑ گئی ہوئی تھی۔

پنجاب کے شہری مسلمان نہرو رپورٹ پر اس لئے بھی بے انتہا سیخ پا ہوئے کہ اس رپورٹ پر عملدرآمد کی صورت میں انہیں کسی بھی شعبۂ زندگی میں اپنا کوئی مستقبل نظر نہیں آتا تھا۔ عاشق حسین بٹالوی بتاتا ہے کہ ''تجارت، صنعت وحرفت اور کاروبار میں شہری مسلمانوں کی قطعاً

کوئی حیثیت نہیں تھی۔ یہ تمام پیشے کلیتہً ہندوؤں کے قبضے میں تھے۔ بیمہ کمپنیوں، بنکوں اور درآمد و برآمد کے اداروں میں مسلمان ڈھونڈنے سے نظر نہیں آتا تھا۔ کاشتکاری اور زمینداری کے دروازے بھی شہری مسلمانوں پر بند ہو چکے تھے۔ ان نامساعد حالات میں لے دے کر صرف سرکاری ملازمت رہ گئی تھی جس سے شہروں کے تعلیم یافتہ مسلمان روٹی کما سکتے تھے۔ لیکن یہاں یونینسٹ پارٹی نے ان کے راستے میں ایک سنگین دیوار کھڑی کر دی ہوئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا تھا کہ تعلیم یافتہ شہری مسلمانوں میں بے کاری بڑھنے لگی تھی اور روزافزوں بیکاری کے ساتھ اضطراب، انتشار اور پریشانی میں بھی اضافہ ہونا شروع ہو گیا تھا''......''میاں فضل حسین اور سر محمد شفیع نے اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھایا اور یہ پروپیگنڈا شروع ہو گیا کہ اگر مسلمان مارچ 1927ء میں ''تجاویز دہلی'' پیش کر کے اپنے قومی مؤقف سے روگردانی اختیار نہ کرتے اور کسی شرط پر بھی جداگانہ انتخاب کو ترک کرنے کی حامی نہ بھرتے تو آج نہرو رپورٹ مرتب کرنے والوں کو مسلمانوں کے قومی مطالبات کے ساتھ یہ استہزا کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔''[4]

چنانچہ لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس کے تقریباً ایک ہفتہ بعد 4 ستمبر کو شملہ میں مرکزی اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو سر فضل حسین کی تحریک پر اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے 39 مسلم ارکان نے یہ فیصلہ کیا کہ نہرو رپورٹ کی مخالفت کے لئے ایک آل پارٹیز مسلم کانفرنس بلائی جائے اور سر آغا خان کو اس کی صدارت کے لئے لندن سے بلایا جائے۔ اس فیصلہ پر دستخط کرنے والوں کے نام یہ تھے۔ نواب سر ذوالفقار علی خان، سر عبدالقادر، میاں شاہ نواز، لیفٹیننٹ سردار محمد نواز خان، میاں عبدالحئی، سید راجن بخش، مولوی محمد یعقوب، نواب محمد اسماعیل خان، محمد یامین خان، عبداللہ سہروردی، عبدالحلیم غزنوی، محمد رفیق، حاجی چودھری اسماعیل خان، انوار العظیم، عبدالمتین چودھری، محمود سہروردی، مولوی محمد شفیع داؤدی، نوابزادہ سید اشرف الدین، بدیع الزماں، حاجی عبداللہ ہارون، محمد پناہ خان، وحید بخش بھٹو، سر ابراہیم ہارون، فاضل ابراہیم، رحمت اللہ، مولوی سید مرتضیٰ، عبداللطیف فاروقی، صاحبزادہ نواب سر عبدالقیوم خان، عبدالقادر صدیقی، راجہ غضنفر علی خان، حاجی عبداللہ، حاجی قاسم، کبیر الدین احمد، سید حسین شاہ، پرنس اکرم حسین ولد واجد علی شاہ نواب آف لکھنؤ، کرنل نواب سر عمر حیات خان، میجر نواب محمد اکبر خان ہوتی، نواب سید مہر شاہ، سید محمد پادشاہ، غلام محمد مصطفےٰ چودھری اور علی بخش محمد حسین۔ چونکہ اس فہرست میں سرکاری بلاک کے

نامزد ارکان کے نام بھی شامل تھے اس لئے یہ شبہ بے جا نہیں تھا کہ اس فیصلہ میں سرکار عالی مرتبت کا بھی ہاتھ تھا۔ بظاہر وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ہندو اور مسلمان مل کر کوئی آئین نہیں بنا سکتے اور بظاہر ہندو بورژوا لیڈروں نے بھی یہ قسم کھا رکھی تھی کہ وہ مسلمانوں کے ابھرتے ہوئے درمیانہ طبقہ کو کوئی رعایت نہیں دیں گے اور اس طرح برکن ہیڈ کے اس چیلنج کو درست ثابت کر کے رہیں گے۔ صرف چار کانگرسی مسلم ارکان رفیع احمد قدوائی، تصدق احمد خان شروانی، یوسف امام اور شاہ محمد زبیر نے اس فیصلے پر دستخط نہیں کئے تھے۔ 10 ستمبر کو 39 غیر کانگرسی مسلم ارکان اسمبلی و کونسل آف سٹیٹ کی طرف سے ایک اخباری بیان میں اعلان کیا گیا کہ مسلمانوں کی ساری جماعتوں کی ایک کانفرنس دہلی میں ہوگی جس میں نہرو رپورٹ پر غور کیا جائے گا۔ اس کانفرنس کی صدارت سر آغا خان کریں گے اور نواب چھتاری استقبالیہ کمیٹی کا صدر ہوگا۔

ان حالات میں جب 26 اکتوبر 1928ء کو محمد علی جناح انگلستان سے واپس آئے تو برصغیر کی سیاسی فضا ان کے خلاف تھی۔ پنجاب کے شہری مسلمان ان سے ناراض تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ جناح کی ''تجاویز دہلی'' نے مسلم کش نہرو رپورٹ کے لئے میدان ہموار کیا تھا۔ پنجاب کے علاوہ برصغیر کے دوسرے علاقوں کے بیشتر مسلم جاگیردار اور تعلقہ دار بھی جناح کے خلاف تھے کیونکہ نہرو رپورٹ پر عملدرآمد کی صورت میں ہندوستان کی سیاست میں ان کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی اور برطانوی سامراج بھی اسے پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ ''تجاویز دہلی'' کے مطابق ہندو۔ مسلم اتحاد کا مطلب ہندوستان میں برطانوی اقتدار کا خاتمہ تھا۔ تاہم جناح نے بمبئی پہنچتے ہی ایک اخباری انٹرویو میں کہا کہ ''نہرو رپورٹ اور لکھنؤ کانفرنس کی اخباری رپورٹوں سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ''تجاویز دہلی'' کو پورا کرنے کی سنجیدگی سے کوشش کی گئی ہے۔ مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے میری پوزیشن یہ ہے کہ میں اپنی جماعت کے فیصلوں کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کر سکتا۔ کانگرس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس حسب معمول دسمبر میں ہوں گے اور مجھے امید ہے کہ ہم اس نازک مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل تلاش کر لیں گے۔ دریں اثنا میں ان تمام لوگوں سے، جو لکھنؤ تجاویز سے اتفاق نہیں کرتے ہیں، اپیل کروں گا کہ وہ بغاوت نہ کریں، اپنے جذبات کو ٹھنڈا رکھیں اور اپنا نقطۂ نگاہ منوانے کے لئے اپنے آپ کو منظم کریں۔ میں مسلمانوں سے بالخصوص اپیل کرتا ہوں کہ وہ کوئی خطرہ محسوس نہ کریں۔ مجھے خفگی اور افراتفری کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

مسلمانوں کو اپنے آپ کو منظم کرنا چاہیے، متحد رہنا چاہیے اور اپنے فرقے کے لئے ہر جائز بات منوانے پر زور دینا چاہیے..... انگلستان میں ویسٹ منسٹر کے ارکان متحد ہیں لیکن ہندوستان میں ہم میں تفرقہ پھیلا ہوا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ ہم گزشتہ فروری میں ہندو۔ مسلم مسئلہ کو حل نہیں کر سکے تھے۔ اس سے ہندوستان کے مستقبل پر بہت اثر پڑا ہے۔ برطانیہ کی رائے یہ ہے کہ ہندوستان میں علم و دانش کی کمی نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ ہم حقائق کا احساس کرنے میں ناکام رہے ہیں اور ہم میں نظم و ضبط اور تنظیم نہیں ہے۔ انہیں یقین ہے کہ جن عناصر کے پاس ہندوستان کی سیاسیات کی باگ ڈور ہے ان میں سیاسی تدبر اور دور اندیشی نہیں ہے اور وہ ملک کی ساری پارٹیوں کو متحد نہیں کر سکیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ سر جان سائمن اعلیٰ حلقوں کی پالیسی کے مطابق پولیس کے پہرے میں نام نہاد پبلک جلسے کر کے تحقیق و تفتیش کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہے۔"[5]

لیکن جناح کے اس بیان کا برصغیر کی مسلم رائے عامہ پر کوئی اثر نہ ہوا یہاں تک کہ خود ان کے اپنے شہر بمبئی کی مسلم لیگ نے نومبر کے اواخر میں ایک قرارداد کے ذریعے نہرو رپورٹ کی سفارشات کو مسترد کر دیا۔ جناح پھر بھی نہ مانے اور انہوں نے اعلان کیا کہ "بمبئی لیگ کا فیصلہ پوری مسلم لیگ کا فیصلہ نہیں ہے۔ جب مسلم لیگ کی مرکزی کونسل کا اجلاس دسمبر میں کلکتہ میں ہوگا تو رپورٹ کے حسن و قبح کا جائزہ لے کر مناسب فیصلہ کیا جائے گا۔" 22/دسمبر کو کلکتہ میں آل پارٹیز نیشنل کنونشن ہوا اور جناح اس میں شرکت کرنے کے لئے کلکتہ پہنچے تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی پوزیشن زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ مسلم لیگ دو متحارب گروپوں میں منقسم ہو چکی تھی اور مرکزی خلافت کمیٹی کا آفیشل گروپ کنونشن کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ تاہم جناح نے افہام و تفہیم کے ذریعے سب کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ کنونشن میں شرکت کے لئے مسلم رہنماؤں کی ایک مضبوط کمیٹی تشکیل کی جائے جس کی قیادت وہ خود کریں گے۔ چنانچہ 30 ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی قائم کی گئی جس میں دوسرے ارکان کے علاوہ مہاراجہ محمود آباد، ڈاکٹر کچلو، ایم۔سی۔ چھاگلہ، ملک برکت علی، ڈاکٹر سید محمود، مولانا ظفر علی خان، سید عبداللہ بریلوی، ڈاکٹر محمد عالم، سیٹھ یعقوب حسن، تصدق احمد خان شروانی، چودھری خلیق الزماں، نواب زادہ لیاقت علی خان، مولوی فضل الحق، سر عزیز الحق، شاہ محمد زبیر اور مولوی محمد اکرم خان وغیرہ شامل تھے۔ جناح نے اس کمیٹی کی جانب سے نیشنل کنونشن کی سب کمیٹی کے روبرو نہرو رپورٹ میں تین ترامیم پیش کیں۔ "پہلی ترمیم یہ تھی کہ

مرکزی اسمبلی کے منتخب شدہ ممبروں میں سے ایک تہائی مسلمان ہوں گے دوسری ترمیم یہ تھی کہ پنجاب اور بنگال میں مخلوط طریقہ انتخاب رائج کر کے کم از کم دس سال کے لئے مسلمانوں کی نشستیں ان کی آبادی کے تناسب سے مخصوص کی جائیں اور دس سال کی میعاد گزر جانے کے بعد مسلمانوں کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اس تجویز پر نظر ثانی کر سکیں اور تیسری ترمیم یہ تھی کہ اختیارات ماسبقی مرکزی حکومت کی بجائے صوبوں کو تفویض کئے جائیں گے یعنی مرکز کی حکومت وحدانی نہیں ہوگی بلکہ وفاقی ہوگی۔'' مگر سب کمیٹی نے یہ تینوں ترامیم مسترد کر دیں۔

28ردسمبر کو کنونشن کا کھلا اجلاس ہوا تو جناح نے پھر یہ ترامیم پیش کیں اور اپنی تقریر میں بڑی دردمندی کے ساتھ ہندو لیڈروں سے اپیل کی کہ وہ مسلمانوں کو یہ تحفظات دینے میں بخل سے کام نہ لیں۔ ان کی تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ چونکہ مسلمان ہندو اکثریت کے ظلم و ستم سے خوفزدہ ہیں اس لئے انہیں یہ تحفظات دیئے بغیر حقیقی ہندو۔ مسلم اتحاد قائم نہیں ہو سکے گا۔ انہوں نے متنبہ کیا کہ ''اگر ملک میں ایسا آئین نافذ کیا جائے گا جس کے تحت اقلیتیں اپنے آپ کو محفوظ محسوس نہیں کریں گی تو اس کا ناگزیر نتیجہ انقلاب اور خانہ جنگی کی صورت میں برآمد ہوگا۔'' سر تیج بہادر سپرو نے جناح کے اس موقف کی تائید کی اور کہا کہ ''ہمیں حساب کتاب کے چکر میں نہیں پڑنا چاہیے بلکہ بحیثیت عملی سیاستدان مجوزہ ترامیم منظور کر کے اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' لیکن بمبئی کے ایک مہاسبھائی لیڈر ایم۔ آر۔ جیکار نے کہا کہ ''جناح ایک ضدی بچے کی مانند ہے جس کا دماغ کانگرس کے لاڈ پیار سے خراب ہو گیا ہے۔ جناح مسلمانوں کی ایک چھوٹی سی اقلیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ اگر اس کی ترامیم منظور کر لی گئیں تو ہم مسلمانوں کی اکثریت کی حمایت حاصل نہیں کر سکیں گے۔ مسلمانوں کی اکثریت کانگرس اور جمیعت العلماء کے ساتھ ہے اور یہ جماعتیں نہرو رپورٹ کو من وعن تسلیم کر چکی ہیں۔ مزید برآں میں نے بمبئی میں اپنی جماعت ہندو مہاسبھا کے بہت سے لیڈروں کو نہرو رپورٹ کے خلاف بغاوت کرنے سے باز رکھا ہے لیکن جناح کی ترامیم کی منظوری کی صورت میں انہیں بغاوت سے نہیں روک سکوں گا۔'' جناح نے اپنی جوابی تقریر میں کہا کہ مسلم لیگی مندوبین اس کنونشن میں تنازعات کو ہوا دینے کے لئے نہیں آئے بلکہ وہ اتحاد و اتفاق کی فضا پیدا کرنے کے لئے آئے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ کینیڈا اور مصر کے دستوروں کی بنیاد آبادی پر نہیں ہے بلکہ عدل و انصاف پر ہے۔ یہ کوئی معمولی مسائل نہیں ہیں۔ انہیں سیاسی تدبر

اور بصیرت سے ہی حل کیا جا سکتا ہے۔ مگر جب جناح کی ان ترامیم پر رائے شماری ہوئی تو انہیں کثرت رائے سے مسترد کر دیا گیا۔ قبل ازیں محمد علی جوہر نے، جو کانگرس کے سابق صدر کی حیثیت سے کنونشن میں شریک ہوا تھا، جناح کی ترامیم کے حق میں اور ڈومینین سٹیٹس کے خلاف تقریر کرنے کی کوشش کی تو حاضرین نے بہت شور مچایا تھا اور محمد علی جوہر کو واک آؤٹ کرنا پڑا تھا۔

نیشنل کنونشن میں ہندو لیڈروں کے اس رویے سے جناح کو اس قدر مایوسی ہوئی کہ انہوں نے رپورٹ کی منظوری کے بعد مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں بھی کوئی دلچسپی نہ لی اور وہ اسی دن یہ اجلاس غیر معین عرصہ کے لئے ملتوی کر کے عازم بمبئی ہو گئے۔ جب کلکتہ کے ریلوے سٹیشن پر اُن کا ایک پارسی دوست انہیں الوداع کہنے کے لئے آیا تو اس نے دیکھا کہ جناح کی آنکھیں نمناک تھیں۔ غالباً انہیں پہلی مرتبہ یہ احساس ہوا تھا کہ مئی 1924ء کے بعد سے ان کی سیاست کس قدر غیر حقیقت پسندانہ رہی تھی۔ انہوں نے ہندو۔ مسلم تضاد کے غیر معاندانہ ہونے کے بارے میں کتنا غلط اندازہ لگایا ہوا تھا اور یہ کہ ہندوؤں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقے سیاسی طور پر بے انتہا تنگ نظر اور سنگدل تھے اور بالآخران طبقوں نے وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ کے اس چیلنج کو درست ثابت کر ہی دیا تھا کہ ہندو اور مسلمان کسی مسودہ آئین پر اتفاق نہیں کر سکتے۔ ہندو لیڈروں کی ہٹ دھرمی نے پنجاب کے سر محمد شفیع اور دوسرے مسلمان لیڈروں کے اس مؤقف کو بھی صحیح ثابت کر دیا تھا کہ جناح نے مارچ 1927ء میں مخلوط طرز انتخاب کے بارے میں دہلی میں مختلف الخیال مسلمان لیڈروں سے جو تجاویز منظور کروائی تھیں وہ مسلمانانِ ہند کے مفادات کے منافی تھیں۔ جناح کی بے انتہا مایوسی کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ انہوں نے اپنی خانگی پریشانیوں کو پس پشت ڈال کر قومی مفاد میں پائیدار ہندو۔ مسلم اتحاد قائم کرنے کی بے سود کوشش کی تھی۔ ان کی جواں سال اہلیہ رتن بائی چند ماہ قبل پیرس میں ان سے جھگڑا کرنے کے بعد واپس بمبئی آ گئی ہوئی تھی اور یہاں اس نے تاج محل ہوٹل میں رہائش اختیار کر رکھی تھی۔ جب جناح دسمبر 1928ء کے آخری ہفتے میں کلکتہ میں ہندو لیڈروں سے یہ التجائیں کر رہے تھے کہ مسلم اقلیت کو کچھ تحفظات اور رعائتیں دے دو تو اس وقت ان کی اہلیہ بمبئی کے اس ہوٹل میں بستر علالت پر پڑی ہوئی تھی اور اس کے تقریباً دو ماہ کے بعد وہ راہی ملکِ عدم ہو گئی تھی۔ گویا جناح جب 30 دسمبر کو کلکتہ سے بمبئی کے لئے روانہ ہوئے تھے تو وہ سیاسی و معاشرتی دونوں ہی لحاظ سے دل شکستہ تھے۔ اب انہیں اپنی کوئی

سیاسی منزل نظر نہیں آتی تھی اور نہ ہی خانگی سکون کی کوئی صورت دکھائی دیتی تھی۔ وہ سیاسی اور معاشرتی طور پر اپنے آپ کو اس بھری دنیا میں بالکل تنہا محسوس کرتے تھے۔ حالات کی باگ ڈور ان کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔

31ردسمبر 1928ء کو دہلی میں سر آغا خان کی زیر صدارت آل پارٹیز مسلم کانفرنس ہوئی جس میں بہت سے خطاب یافتہ جاگیرداروں اور تعلقہ داروں کے علاوہ محمد علی جوہر، حسرت موہانی، مفتی کفایت اللہ اور مولوی شفیع داؤدی وغیرہ نے بھی شرکت کی۔ کانفرنس میں دو دن کی بحث کے بعد سر محمد شفیع کی ایک قرارداد منظور کی گئی جس کے اہم نکات یہ تھے۔ (1) چونکہ ہندوستان نہایت وسیع ملک ہے جس میں مختلف لوگ آباد ہیں اس لئے اس کے واسطے فیڈرل گورنمنٹ موزوں ہے جس میں مرکز کو تھوڑے اختیارات ہوں باقی سب صوبجات کو ہوں۔ (2) مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں اگر تین چوتھائی مسلم یا تین چوتھائی غیر مسلم کسی بل کی مخالفت کریں تو وہ بل پیش نہ ہو اور نہ قانون بنے۔ (3) مسلمانوں کا انتخاب جداگانہ فہرست مسلمانان کے ذریعے ہوتا ہے یہ حق ان سے ان کی مرضی کے بغیر نہیں لیا جا سکتا۔ (4) مسلمان انتخاب جداگانہ کے ذریعے قانون ساز جماعتوں میں منتخب ہو کر جائیں گے، وہ انتخاب مشترکہ کو ہرگز قبول نہ کریں گے۔ (5) شمال مغربی صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دیگر صوبجات ہند کی طرح اصلاحات رائج کی جائیں (6) مسلمانوں کی نمائندگی ان صوبجات میں جہاں وہ اکثریت میں ہیں ان کی تعداد کے تناسب سے کم نہ ہو اور جہاں وہ اقلیت میں ہیں وہاں ان کو جس تناسب سے نمائندگی ملی ہوئی ہے اس میں کمی نہ کی جائے۔ (7) مسلمانوں کو مرکز میں 33 فیصد نمائندگی دی جائے۔

اس کانفرنس کے تقریباً تین ماہ بعد یعنی 28 رمارچ 1929ء کو دہلی میں جناح لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تو ڈاکٹر عالم، چودھری خلیق الزماں اور رفیع احمد قدوائی کے علاوہ بعض دوسرے کانگرس نواز عناصر نے یہ کوشش کی کہ نہرو رپورٹ کے حق میں قرارداد منظور کرا لی جائے جبکہ جناح، حکیم اجمل خان کے مکان پر سر محمد شفیع کے ساتھ مصالحت کی بات چیت کر رہے تھے۔ لیگ کے ان دونوں دھڑوں میں مصالحت اس بنیاد پر ہونا قرار پائی کہ جناح آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی یکم جنوری 1929ء کی قرارداد منظور کر لیں گے اور سر شفیع اپنے دھڑے کو پھر آل انڈیا مسلم لیگ میں ضم کر دے گا۔ جب یہ تصفیہ ہو گیا تو جناح اور سر شفیع کے حامیوں نے جلسہ گاہ پر دھاوا بول دیا

اور جو لوگ نہرو رپورٹ کے حق میں تقریریں کر رہے تھے انہیں دھکے دے کر باہر نکال دیا۔ اس موقع پر کرسیوں کی لڑائی بھی ہوئی مگر سر شفیع کا پنجابی گروپ غالب آ گیا چنانچہ جب جناح سر شفیع کے ہمراہ وہاں پہنچے تو جلسہ میں سے کانگرس نواز عناصر کو بے دخل کیا جا چکا تھا۔ ''جناح زندہ باد'' کے نعروں کی گونج میں متحدہ مسلم لیگ کا اجلاس ہوا۔ جناح نے مختصر سی تقریر کی اور پھر اجلاس اگلے دن کے لئے ملتوی کر دیا۔ جب 29/مارچ کو دوسرا سیشن منعقد ہوا تو جناح نے صدر مسلم لیگ کی حیثیت سے چودہ نکات پر مشتمل ایک قرارداد پیش کی جس کا نفس مضمون تقریباً وہی تھا جو کہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس یکم جنوری 1929ء کی قرارداد کا تھا۔ اس قرارداد کے چودہ نکات یہ تھے۔

1۔ آئندہ آئین کی ہیئت وفاقی ہونی چاہیے اور اختیارات مالبقی صوبوں کے پاس ہونے چاہئیں۔

2۔ سارے صوبوں کو یکساں خودمختاری دی جائے گی۔

3۔ تمام قانون ساز اور دوسرے منتخب اداروں کی اس طرح تشکیل ہوگی کہ ہر صوبہ میں اقلیتوں کو مناسب مؤثر نمائندگی ملے گی لیکن اس طرح کسی صوبہ کی اکثریت کو اقلیت میں یا مساوی نیابت میں تبدیل نہیں کیا جائے گا۔

4۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی ایک تہائی سے کم نہیں ہوگی۔

5۔ مختلف فرقوں کی نمائندگی بدستور جداگانہ انتخاب کے ذریعے جاری رہے گی تا آنکہ کوئی فرقہ از خود مخلوط طریقہ انتخاب کے حق میں ہو جائے۔

6۔ اگر کبھی علاقائی ردوبدل ضروری سمجھا گیا تو یہ اس طرح ہونا چاہیے کہ پنجاب، بنگال اور شمال مغربی صوبہ سرحد کی مسلم اکثریت اس سے متاثر نہ ہو۔

7۔ سارے فرقوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ یعنی انہیں حسب خواہش مذہبی عقیدہ رکھنے، عبادت کرنے اور روایات قائم رکھنے کی آزادی ہوگی۔

8۔ کسی قانون ساز اسمبلی یا دوسرے منتخب ادارے میں کوئی قانون، قرارداد یا اس کا کوئی حصہ منظور نہیں کیا جائے گا اگر کسی فرقہ کے تین چوتھائی ارکان اس بنا پر اس کی مخالفت کریں گے کہ یہ اس فرقہ کے مفادات کے لئے ضرر رساں ہوگا یا اس کی بجائے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے گا جو ایسے معاملات سے نمٹنے کے لئے قابل عمل ہو۔

9۔ سندھ کو احاطہ بمبئی سے الگ کر دیا جائے۔

10۔ شمال مغربی صوبہ سرحد اور بلوچستان میں دیگر صوبجات ہند کی طرح اصلاحات نافذ کی جائیں۔

11۔ آئین میں ایسی دفعات رکھی جائیں جن کے تحت مسلمانوں کو دوسرے ہندوستانیوں کی طرح ساری سرکاری ملازمتوں اور لوکل باڈیز کی ملازمتوں میں مناسب نمائندگی دی جائے لیکن ایسا کرتے ہوئے کارکردگی کے معیار کو ملحوظ خاطر رکھا جائے۔

12۔ آئین میں ایسے تحفظات رکھے جائیں جن سے مسلم ثقافت، مسلم تعلیم، زبان، مذہب، پرسنل لاز اور مسلم خیراتی اداروں کی حفاظت ہو سکے اور ان خیراتی اداروں کو حکومت اور لوکل باڈیز کی مالی امداد میں مناسب حصہ مل سکے۔

13۔ مرکز یا صوبہ میں کوئی وزارت نہ بنائی جائے جس میں کم از کم ایک تہائی مسلم وزراء نہ ہوں۔

14۔ مرکزی قانون ساز اسمبلی انڈین فیڈریشن کی ریاستوں کی مرضی کے بغیر آئین میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گی۔

بھگت سنگھ اور علم دین...... پنجاب میں پرُتشدد سیاست کا آغاز

اپریل 1929ء میں سائمن کمیشن نے ہندوستان میں اپنی تحقیق و تفتیش کا کام ختم کر دیا۔ اس کمیشن نے گزشتہ تقریباً ڈیڑھ دو سال میں تین مرتبہ برصغیر کا دورہ کیا تھا جس کے دوران بہت ہنگامے ہوئے تھے۔ مارچ 1928ء میں مرکزی اسمبلی میں کمیشن کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش ہوئی جو جناح کی انڈیپنڈنٹ پارٹی کی حمایت کی وجہ سے منظور ہو گئی۔ 30 راکتوبر 1928ء کو یہ کمیشن ریل کے ذریعے لاہور پہنچا تو کانگرسیوں اور مہاسبھائیوں نے اس کے خلاف زبردست مظاہرہ کیا۔ مظاہرین نے لاجپت رائے کی زیر قیادت کالی جھنڈیوں سے اس کا استقبال کیا اور ''سائمن واپس جاؤ'' کے پرجوش نعرے لگائے۔ جب یہ مظاہرین لنڈے بازار کے اختتام پر ریلوے سٹیشن کے نزدیک پہنچے تو ان کا پولیس سے تصادم ہو گیا جس کے دوران ایک انگریز پولیس افسر سکاٹ نے بہت ڈنڈے برسائے۔ اس کا ایک ڈنڈا لاجپت رائے کے سینے پر لگا۔ فوری طور پر تو اس کا زیادہ اثر محسوس نہ ہوا لیکن وہ ایک روز کے بعد اس چوٹ کی وجہ سے

صاحب فراش ہوگیا اور پھر بستر سے نہ اٹھ سکا حتیٰ کہ 17 رنومبر کو ہندوؤں کے اس ''شیر پنجاب'' کا دیہانت ہوگیا۔

اس پر چند دہشت پسند نوجوانوں کی خفیہ پارٹی ''نوجوان بھارت سبھا'' نے اس واقعہ کا بدلہ لینے کا تہیہ کیا۔ چنانچہ 16 ردسمبر کو سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس لاہور کے دفتر میں ایک اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس سانڈرس وردی پہنے کھڑا تھا۔ اس کی پیٹھ سڑک کی طرف تھی۔ قدوقامت کے لحاظ سے سانڈرس اور سکاٹ میں کوئی فرق نہ تھا۔ چنانچہ جو نوجوان سکاٹ کی تاک میں تھے انہوں نے سانڈرس کو سکاٹ سمجھ لیا۔ ایک گولی چلی جو سانڈرس کی پیٹھ میں داخل ہوکر دل میں جا بیٹھی اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اس واقعہ کے بعد حکومت نے چپ چاپ سکاٹ کو رخصت دے کر انگلستان روانہ کر دیا اور وہ اس طرح گیا کہ کسی کے کان میں بھنک تک نہ پڑی۔

8 راپریل 1929ء کو ''نوجوان بھارت سبھا'' کے دو نوجوانوں بھگت سنگھ اور بی۔ کے۔ دت نے مرکزی اسمبلی میں دو بم مارے اور پستول سے گولیاں چلائیں۔ لیکن اس سے کوئی جانی نقصان نہ ہوا۔ صرف ایک پارسی رکن اسمبلی سر یومن منجی دلال کو معمولی زخم آئے جو ہسپتال میں چند دن کے علاج معالجے کے بعد مندمل ہو گئے۔ بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی بی۔ کے۔ دت کو موقع پر پبلک گیلری میں ہی گرفتار کر لیا گیا اور انہوں نے عدالت کے سامنے اقبال جرم کرتے ہوئے کہا کہ ان کا مقصد برطانوی سامراج کو متنبہ کرنا تھا کہ اگر وہ پُرامن طریقے سے ہندوستان سے دستبردار نہ ہوا تو یہاں بھی واشنگٹن، گیری بالڈی، لینن اور کمال اتاترک پیدا ہو سکتے ہیں۔

بھگت سنگھ کی یہ خفیہ پارٹی اگرچہ اپنے آپ کو سوشلزم کا علمبردار کہتی تھی لیکن دراصل اس کے پاس کوئی واضح سیاسی و معاشی پروگرام نہیں تھا۔ یہ تنظیم زیادہ تر مشرقی پنجاب، یو۔ پی اور بہار کے نیم تعلیم یافتہ ہندو اور سکھ نوجوانوں پر مشتمل تھی اور اس کی بنیاد سامراج دشمنی اور روز افزوں بے روزگاری پر تھی۔ اس تنظیم کا ایم۔ این۔ رائے کی قائم کردہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا سے کوئی تعلق نہیں تھا، نہ ہی اسے بورژوا کانگرس کی تائید وحمایت حاصل تھی۔ عدالت سے بھگت سنگھ اور بی۔ کے۔ دت کو عمر قید کی سزا ہوئی۔

اس دوران 15 راپریل 1929ء کو لاہور کی پولیس ایک بم فیکٹری کا پتہ چلا چکی تھی۔

چنانچہ اس سلسلے میں بھی اس خفیہ تنظیم کے 13 ارکان کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔ ملزموں میں بھگت سنگھ بھی شامل تھا اوران پر یہ الزام بھی عائد تھا کہ انہوں نے اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس سانڈرس کو گولی مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ لاہور جیل میں ان نوجوانوں پر بڑی سختی کی گئی جس کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ایک ملزم جتندر ناتھ نے بھوک ہڑتال کر دی اور تریسٹھ دن کے بعد راہی ملکِ عدم ہوگیا۔ اس واقعہ سے پورے برصغیر کی سیاسی فضا میں زلزلہ آ گیا اور یہ حقیقت اظہر من الشمس ہوگئی کہ ان نوجوانوں کے جذبہ حریت کی پختگی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ باقی بارہ ملزموں میں سے بھگت سنگھ، راج گورو اور سکھ دیو کو خصوصی ٹریبونل سے موت کی سزا ہوئی اور سات ملزموں کو عمر قید کی سزا دی گئی۔ بھگت سنگھ 23 رمارچ 1931ء کو جس جرأت اور بہادری کے ساتھ پھانسی کے تختہ پر گیا اس بنا پر وہ پورے پنجاب میں ایک افسانوی ہیرو بن گیا۔ اس کی خفیہ انقلابی تنظیم کے ارکان پر یہ الزام بھی تھا کہ انہوں نے 23 ردسمبر 1929ء کو دہلی کے نزدیک وائسرائے ٹرین کو بم سے اڑانے کی ناکام کوشش کی تھی۔

8 راپریل 1929ء کو مرکزی اسمبلی میں ہوئے دھماکہ خیز واقعہ کے اگلے دن یعنی 9 راپریل کو لاہور میں ایک اور خونی واقعہ ہوا جس سے یہ تلخ حقیقت مزید واضح ہوگئی کہ ہندوستان میں محض سامراج دشمنی اور بے روزگاری ہندو۔ مسلم اتحاد کی بنیاد نہیں بن سکتی۔ یہ واقعہ لاہور کے ایک آریہ سماجی کتب فروش راج پال کے قتل کی صورت میں رونما ہوا۔ اس کتب فروش نے ایک پمفلٹ بعنوان ''رنگیلا رسول'' شائع کیا تھا جس میں پیغمبر اسلام کی توہین کی گئی تھی۔ بہت دنوں تک یہ پمفلٹ جس پر کسی مصنف کا نام درج نہیں تھا، مسلمانوں کے نوٹس میں ہی نہیں آیا تھا اور صوبائی حکومت کی پریس برانچ کی نگاہ سے بھی بچا رہا تھا۔ کافی عرصے کے بعد 1926ء میں جب اس پمفلٹ پر مسلمانوں کی نظر پڑی اور انہوں نے احتجاج کیا تو حکومت نے فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے الزام میں راج پال پر مقدمہ چلایا۔ لاہور کے ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمے کی خاصی طویل سماعت کے بعد ملزم کو سزا ہوئی۔ سیشن کورٹ میں اپیل ہوئی، وہاں بھی ملزم کو مجرم قرار دیا گیا۔ گو اس کی سزا میں تخفیف کر دی گئی۔ 1927ء میں ملزم نے ہائی کورٹ میں نگرانی کی درخواست دائر کی جس کی سماعت ایک سکھ جج کنور دلیپ سنگھ نے کی اور پھر اس نے اپنے فیصلہ میں ملزم کو بری کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی کہ یہ پمفلٹ فرقہ وارانہ منافرت پھیلانے کے

متعلقہ قانون کی زد میں نہیں آتا۔ یہ فیصلہ مسلمانوں کے لئے بہت اشتعال انگیز تھا۔ چنانچہ اندرون شہر کا ایک نوجوان علم دین 9/اپریل 1929ء کو خنجر سے مسلح ہو کر راج پال کی دکان پر پہنچا اور اس نے دن دہاڑے سب کے سامنے راج پال کو ڈھیر کر دیا اور خود گرفتار ہو گیا۔

اس واقعہ کا سیاسی پس منظر یہ تھا کہ 1921ء کے بعد جب فضل حسین نے یہ کوشش کی تھی کہ مسلمانوں کو تعلیمی اداروں میں 40 فیصد کوٹہ دیا جائے، لوکل باڈیز میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے مطابق ہو تو اس کے بعد سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بڑی سخت کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ اس فرقہ وارانہ کشیدگی کے دور میں آریہ سماجی لیڈر لالہ لاجپت رائے نے پہلے پنجاب کی فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم کا مطالبہ کیا تھا اور پھر اسی بنیاد پر پورے برصغیر کو تقسیم کرنے کی سکیم پیش کی تھی۔ یہ پمفلٹ اسی دور کی پیداوار تھا اور اس سے شہری مسلمانوں کو یہ تاثر ملا تھا کہ ان کا ہندوؤں کے ساتھ کسی صورت گزارا ممکن نہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان یہ دراڑ کسی نے باہر سے آکر پیدا نہیں کی تھی۔ اس امر کی کوئی شہادت موجود نہیں کہ راج پال نے یہ اشتعال انگیز پمفلٹ انگریزوں کے کہنے پر شائع کیا تھا اور نہ ہی کبھی کسی نے یہ الزام عائد کیا ہے کہ علم دین نے کسی انگریز کے کہنے پر راج پال کو قتل کیا تھا۔ یہ واقعہ دراصل اس حقیقت کا مظہر تھا کہ 1929ء میں پنجاب میں فرقہ وارانہ کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

صوبہ کے شہری مسلمانوں کے لئے علم دین ایک عظیم ہیرو تھا جس نے ناموس رسول ﷺ کے تحفظ کے لئے یہ غازیانہ کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ شاید ہی کوئی مسلمان گھرانہ ایسا ہو گا جس میں غازی علم دین کی تصویر نمایاں طور پر نہیں لٹکائی گئی تھی اور یہ تصویر ہر روز ہر مسلمان کو یہ یاددہانی کراتی تھی کہ "ہندو اس کا دشمن ہے"۔ چنانچہ جب علم دین کو قتل کے الزام میں پھانسی کی سزا دی گئی تو اس کے جنازے کے جلوس میں لاہور اور بیرون لاہور سے آئے ہوئے مسلمانوں کا فقید المثال ہجوم تھا۔ لیکن ہندوؤں کی بورژوا قیادت نے اس واقعہ سے کوئی سبق نہ سیکھنا تھا اور نہ سیکھا۔ البتہ وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ کے اس سامراجی مؤقف کی تائید میں مزید ثبوت مل گیا کہ ہندو اور مسلمان کسی نظام حکومت پر اتفاق نہیں کر سکتے اور سائمن کمیشن بھی یہی تاثر لے کر 13/اپریل 1929ء کو عازم انگلستان ہو گیا۔

ملک گیر ہڑتالیں، عالمی کساد بازاری اور پہلی گول میز کانفرنس

مئی 1929ء میں برطانیہ میں عام انتخابات ہوئے تو لیبر پارٹی کامیاب ہوگئی۔ جون کے اوائل میں لیبر حکومت کی تشکیل ہوئی تو ریمزے میکڈانلڈ (Ramsay Macdonald) وزیراعظم بنا اور وزیر ہند کے عہدے پر کرنل ویج ووڈ بن (Wedgwood Benn) فائز ہوا۔ اسی مہینے میں وائسرائے لارڈ ارون (Irwin) چار ماہ کی رخصت پر انگلستان چلا گیا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ برطانیہ کے نئے ارباب اقتدار سے تبادلۂ خیالات کرنے کے بعد کوئی ایسا طریقہ تلاش کیا جائے جس کے تحت ہندوستان کے لئے نئے آئینی فارمولے کی تشکیل کے لئے یہاں کے سارے سیاسی حلقوں کا تعاون حاصل کیا جائے۔ اسے یہ ضرورت اس لئے محسوس ہوئی تھی کہ سائمن کمیشن کا کانگرس، مسلم لیگ اور دوسری ساری بورژوا سیاسی جماعتوں نے بائیکاٹ کیا تھا اور خطرہ تھا کہ اگر برطانوی پارلیمنٹ نے اس کمیشن کی رپورٹ کی بنیاد پر کوئی نئی آئینی اصلاحات منظور کیں تو وہ اعتدال پسند ہندوستانی لیڈروں کے لئے بھی قابل قبول نہیں ہوں گی جبکہ پورے برصغیر میں 1926ء میں قائم شدہ کمیونسٹ پارٹی کی زیر قیادت مزدوروں کی ہڑتالوں اور پرتشدد کاروائیوں کا سلسلہ پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ پارٹی نے 29-1928ء میں 203 ہڑتالیں کرائی تھیں جس میں سب سے بڑی ہڑتال ساؤتھ انڈین ریلوے کی تھی جس میں پانچ لاکھ سے زائد مزدوروں نے حصہ لیا تھا۔ چنانچہ حکومت ہند نے مارچ 1929ء میں 32 لیبر لیڈروں کو گرفتار کر کے ان پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ انہوں نے کانپور میں حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کی تھی۔ ملزموں میں برٹش کمیونسٹ پارٹی کے تین ارکان بھی شامل تھے جو ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم میں امداد دینے کے لئے یہاں آئے ہوئے تھے۔ اس امداد میں ''سیاسی لائن'' بھی شامل تھی۔

وائسرائے ارون اکتوبر میں واپس آیا تو اس نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے لئے نیا آئینی فارمولا تیار کرنے کے لئے ایک گول میز کانفرنس منعقد کی جائے گی۔ اس آئینی فارمولے کا بالآخر مقصد یہ ہوگا کہ ہندوستان کو ڈومینین سٹیٹس مل جائے۔ اس پر کانگرس پارٹی نے یہ مطالبہ کیا کہ حکومت برطانیہ کو واضح طور پر یہ وعدہ کرنا چاہیے کہ مجوزہ گول میز کانفرنس ڈومینین سٹیٹس کی سکیم مرتب کرنے کے لئے بلائی جائے گی اور حتیٰ الوسع فوراً ڈومینین سٹیٹس کے اصولوں کے تحت

حکومت کا کاروبار چلانا شروع کر دیا جائے گا۔ مزید برآں سارے سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے اور یہ بھی وعدہ کیا جائے کہ مجوزہ کانفرنس میں کانگرس کے نمائندوں کی فیصلہ کن اکثریت ہو گی۔ لیکن جب حکومت نے اس قسم کا کوئی وعدہ نہ کیا تو کانگرس نے 31 ردسمبر 1929ء کو لاہور میں جواں سال جواہر لال نہرو کی زیر صدارت اپنے سالانہ اجلاس میں ایک قرارداد منظور کر کے گول میز کانفرنس کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا اور یہ اعلان کیا کہ ہندوستان کے نئے آئین کے بارے میں ایک سال قبل جو نہرو رپورٹ مرتب کی گئی تھی وہ کالعدم ہو چکی ہے۔ اب کانگرس کا نصب العین مکمل آزادی ہے۔ آئندہ کانگرس مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں شرکت نہیں کرے گی اور نہ ہی کسی انتخاب میں حصہ لے گی۔ 26 رجنوری 1930ء کو کانگرس نے یوم آزادی منایا۔ اس موقع پر مجلس عاملہ کی جانب سے جو قرارداد پارٹی برانچوں کو بھیجی گئی اس میں کہا گیا تھا کہ برطانوی اقتدار نے ہمارے ملک کو معاشی، سیاسی، ثقافتی اور روحانی طور پر تباہ کر دیا ہے۔ ہم ایسے اقتدار کے سامنے مزید سر تسلیم خم کرنا انسان اور خدا کے خلاف ایک جرم تصور کرتے ہیں۔ عوام الناس کو ایک ایسی سول نافرمانی کی تحریک کے لئے تیاری کرنی چاہیے جس کے دوران ٹیکسوں کی ادائیگی بھی نہیں کی جائے گی۔

بظاہر کانگرس کا یہ فیصلہ انقلابی اور جذبۂ حریت سے بھرپور تھا اور اس سے بعض عناصر کو وقتی طور پر یہ محسوس ہوا تھا کہ اعتدال پسند بورژوا کانگرس کے سیاسی کردار میں بنیادی تبدیلی آ گئی ہے۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ اس فیصلہ کا برصغیر کے سیاسی حقائق سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ صحیح ہے کہ حکومت ہند 1924ء میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے قیام کے بعد پریشان ہو گئی تھی اور جب 1928ء میں پورے برصغیر میں ہڑتالوں اور دہشت پسند کارروائیوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا تو وہ بوکھلا گئی تھی۔ اسے خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ چونکہ سٹالن نے سوویت یونین میں طبقاتی انقلاب کو مستحکم کر لیا ہے اس لئے وہ لازمی طور پر ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ممالک کی طرف توجہ کرے گا۔ جب فروری 1929ء میں سوویت یونین نے مغربی طاقتوں کی جنگی تیاریوں کے پیش نظر پولینڈ، رومانیہ، ایسٹونیا، ترکی اور ایران سے معاہدات کئے تھے تو حکومت ہند کی بوکھلاہٹ میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا چنانچہ اس نے اپریل میں انڈین ٹریڈ ڈسپیوٹس ایکٹ (Indian Trade Disputes Act) اور پبلک سیفٹی ایکٹ (Public Safety Act) جیسے جابرانہ قوانین نافذ کئے تھے حالانکہ کانگرس اور مسلم لیگ نے ان غیر جمہوری قوانین کی سخت

مخالفت کی تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ مغربی طاقتوں نے وسط 1929ء میں سوویت یونین کے خلاف جنگی تیاریوں کی تکمیل کے لئے جرمنی کا مقبوضہ علاقہ رائن لینڈ خالی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا حالانکہ برلن کی حکومت نے تاوان جنگ کی مزید ادائیگی سے معذوری ظاہر کر دی تھی اور یہ بھی صحیح ہے کہ اکتوبر 1929ء میں نیویارک کے سٹاک ایکسچینج میں یکا یک فقید المثال کساد بازاری پیدا ہونے کے باعث امریکہ نے یورپی ممالک کو قرضے دینے بند کر دیئے تھے اور اس بنا پر ایک عالمگیر معاشی بحران کا آغاز ہو چکا تھا۔ جواہر لال نہرو اور دوسرے کانگرسی لیڈروں کا خیال تھا کہ وہ ان حالات میں حکومت برطانیہ کو بلیک میل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن ان کا یہ رویہ جدلیاتی نہیں تھا۔ وہ تصویر کا صرف ایک ہی رخ دیکھتے تھے حالانکہ اس کا دوسرا رخ دیکھے بغیر کوئی صحیح تجزیہ یا فیصلہ نہیں ہوسکتا تھا۔ دوسرا رخ یہ تھا کہ 1921ء کے بعد پورے برصغیر میں فرقہ وارانہ فسادات کے باعث ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تضاد کی خلیج اس قدر وسیع ہوگئی تھی کہ اسے کسی نہ کسی طرح پاٹے بغیر برطانوی سامراج کے چنگل سے آزادی حاصل نہیں ہوسکتی تھی۔ لیکن کانگرسی لیڈروں کو یہ احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہندو۔ مسلم تنازعہ کا پائیدار تصفیہ کئے بغیر جب آزادی کا نعرہ لگاتے تھے تو مسلمانوں کا تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ اس کا مطلب یہ سمجھتا تھا کہ اگر اس نعرے کی تکمیل ہوئی تو وہ انگریز کی بجائے ہندو کا محکوم ہو جائے گا۔ بالخصوص پنجابی مسلمانوں کا تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کانگرس کے نعرۂ آزادی سے بے انتہا خطرہ محسوس کرتا تھا۔ اس طبقہ کو تشویش تھی کہ جو مفاد پرست ہندو عناصر انگریزوں کے عہد اقتدار میں پنجاب کی 55 فیصد اکثریت کو صوبہ کے سرکاری تعلیمی اداروں میں 40 فیصد نشستیں دینے پر آمادہ نہیں ہوئے وہ انگریزوں کی یہاں سے روانگی کے بعد مسلمانوں کو سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی طور پر نیست و نابود کر دیں گے۔ لاہور میں کانگرس کی متذکرہ قرار داد آزادی دراصل پنجابی مسلمانوں کی نظر میں ان کی دائمی محکومی کی قرارداد کی حیثیت رکھتی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر برصغیر میں پارلیمانی جمہوریت کے نام پر ہندو راج قائم ہو گیا تو ان کا بالکل اسی طرح نام و نشان مٹ جائے گا جس طرح کہ قبل ازیں اسپین میں مٹ چکا تھا۔ انہیں فی الحقیقت اسلام خطرے میں نظر آتا تھا۔ علامہ اقبال کی دوسرے عشرے کے آخری سالوں کی بیشتر شاعری کی بنیاد اسی خطرے کے احساس پر تھی اور پنجابی مسلمانوں کا تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ اس شاعری سے بہت متاثر تھا۔

مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح نے کانگرس کی اس ''قرارداد آزادی'' کی سخت مخالفت کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ ''کانگرس نے گاندھی کے زیر اثر اس 'سیاسی دیوانگی' کا مظاہرہ کیا ہے۔ گاندھی ذہنی اور جسمانی طور پر نئی باتیں سیکھنے اور پرانی باتوں کو بھلانے کی اہلیت نہیں رکھتا ہے۔ اس نے ماضی میں اسی قسم کی سیاسی غلطی کی تھی لیکن اس کے باوجود اس کی آنکھیں حقائق کو دیکھنے سے قاصر ہیں''۔ 7رفروری 1930ء کو وائسرائے لارڈ ارون نے لکھنؤ کے ایک دربار عام میں متنبہ کیا کہ اگر کانگرس نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تو اس کے خطرناک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں اور اس کے چند دن بعد آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے جناح کی زیر صدارت ایک قرارداد میں وائسرائے کے 31راکتوبر 1929ء کے اعلان کا خیر مقدم کیا اور یہ اعلان کیا کہ مسلم لیگ مجوزہ گول میز کانفرنس میں شرکت کرے گی۔

14رفروری کو کانگرس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس نے تین دن کے غور وخوض کے بعد گاندھی کو اختیار دے دیا کہ وہ جب مناسب سمجھے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دے۔ سول نافرمانی کے پروگرام کی تفصیل بھی گاندھی کی صوابدید پر چھوڑ دی گئی۔ چنانچہ گاندھی نے اپنے ہفت روزہ اخبار ''ینگ انڈیا'' میں حکومت ہند کو آٹھ مطالبات پیش کئے اور اعلان کیا کہ اگر یہ مطالبات تسلیم کر لئے جائیں تو سول نافرمانی کی تحریک شروع نہیں کی جائے گی۔ اس مضمون میں کانگرس کی 31ردسمبر 1929ء کی ''قرارداد آزادی'' یا ''پورنا سوراج'' کا کوئی ذکر نہیں تھا البتہ یہ مطالبات کئے گئے تھے کہ ''فوجی اخراجات میں 50 فیصد کمی کی جائے۔ غیر ملکی کپڑے کی درآمد پر تحفظاتی ٹیرف عائد کیا جائے۔ سارے سیاسی نظر بندوں کو رہا کیا جائے۔ بڑے افسروں کی تنخواہوں میں کمی کی جائے اور نمک ٹیکس منسوخ کیا جائے''۔

اس مضمون کی اشاعت کے بعد وائسرائے اور گاندھی میں خط وکتابت ہوئی جس کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ چنانچہ گاندھی نے 12رمارچ کو ڈانڈی کے ساحل پر غیر قانونی طور پر نمک بنانے کے لئے اپنے 75 ساتھیوں کے ہمراہ سفر شروع کر دیا۔ 200 میل کا یہ سفر 24 دن میں ختم ہوا اور راستے میں ہزاروں لوگ گاندھی کے اس جلوس میں شامل ہو گئے۔ 6راپریل کو گاندھی اور اس کے ساتھیوں نے ڈانڈی پہنچ کر غیر قانونی طور پر نمک بنانا شروع کیا مگر حکومت ہند نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ البتہ مولانا محمد علی جوہر نے 23راپریل کو اس مہاتمائی ڈرامہ کا نوٹس لیا اور

بمبئی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس میں اعلان کیا کہ ''ہم گاندھی کی اس تحریک میں شریک ہونے سے انکار کرتے ہیں کیونکہ یہ تحریک ہندوستان کی مکمل آزادی کی تحریک نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کو ہندو مہا سبھا کا دست نگر بنا دیا جائے۔ مسلمان برطانوی غلبہ کے خلاف ہیں لیکن وہ ہندو غلبہ کے بھی اتنے ہی مخالف ہیں۔ گاندھی ہندو مہاسبھا کے زیر اثر کام کر رہا ہے۔ وہ ہندوازم کی برتری اور مسلمانوں کی غرقابی کے لئے جدوجہد کر رہا ہے''۔

بالآخر حکومت ہند نے 5 رمئی کو گاندھی کو گرفتار کرلیا کیونکہ اس کی اس ''پر اُمن تحریک'' کی وجہ سے برصغیر کے مختلف علاقوں میں پر تشدد مظاہرے شروع ہو گئے تھے اور 23 راپریل کو فوج نے پشاور میں نہتے سرخ پوشوں کا زبردست قتل عام کیا تھا۔ حکومت نے اس کے ساتھ ہی کانگرس کی مجلس عاملہ کو بھی غیر قانونی قرار دے کر اس کے ارکان کو بھی نظر بند کر دیا۔ تاہم سول نافرمانی کی یہ تحریک کسی نہ کسی صورت جاری رہی اور دہشت پسند گروپوں کی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ مئی میں سائمن کمیشن کی رپورٹ شائع کر دی گئی جس میں یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ ہندوستان میں وحدانی نظام حکومت نافذ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کی جگہ وفاقی طرز حکومت رائج ہونا چاہیے۔ صوبوں میں دو عملی کو ختم کر دینا چاہیے اور منتخب کابینہ کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دینے چاہئیں۔ صوبہ سرحد میں دوسرے صوبوں کی طرح کی ذمہ دار حکومت کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کی بجائے وہاں محض لیجسلیٹو کونسل کی تشکیل کی جائے اور سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے سوال کا مزید جائزہ لیا جائے۔

11 ستمبر کو گول میز کانفرنس کے مندوبین کا اعلان ہوا۔ پنجاب سے اس فہرست میں سر میاں محمد شفیع، بیگم شاہنواز، سر لیاقت حیات خان اور سر محمد ظفر اللہ خان مسلمانوں کے نمائندوں کے طور پر نامزد کئے گئے تھے۔ سر فضل حسین کا نام اس فہرست میں شامل نہیں تھا کیونکہ وہ قبل ازیں اپریل 1930ء میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن نامزد ہو چکا تھا۔ تاہم عام تاثر یہ تھا کہ نہ صرف پنجابی مسلمان نمائندوں بلکہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے بیشتر مسلمان نمائندوں کی نامزدگی بھی اسی کی سفارش سے ہوئی تھی۔ کانگرس نے اس کانفرنس کا بائیکاٹ کیا تھا۔ تاہم سر تیج بہادر سپرو، سر چمن لال سیتلواڑ، سر راما سوامی مدالیار اور اسی قسم کے متعدد دوسرے آئین پسند لبرل

ہندو لیڈر تقریباً پچاس مندوبین میں شامل تھے۔ مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح کا نام بھی اس فہرست میں شامل تھا لیکن سر ظفر اللہ خان کے بیان کے مطابق جناح کانفرنس کی کاروائی سے مطمئن نہیں تھے۔ بظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ سر فضل حسین اور برطانوی سامراج دونوں ہی جناح کو قابل اعتماد نہیں سمجھتے تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ جناح اپنے قوم پرستانہ رجحانات کی بنا پر کانگرس سے مخلوط طریقۂ انتخاب کی بنیاد پر کوئی مفاہمت کر لیں گے۔ چنانچہ ان دونوں کی حمایت کی وجہ سے مسلمان مندوبین کی عنان قیادت سر آغا خان کے ہاتھ میں دے دی گئی تھی۔ کانفرنس کا پہلا سیشن 12 نومبر 1930ء سے لے کر 19 جنوری 1931ء تک جاری رہا۔

علامہ اقبال نے خطبہ الہ آباد میں مسلمانوں کی آزاد مملکت کا تصور پیش نہیں کیا تھا۔

اس دوران دسمبر 1930ء میں الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا جس کی صدارت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے کی۔ اس اجلاس میں حاضری اتنی کم تھی کہ بہت دیر تک 75 ارکان کا کورم ہی پورا نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ حفیظ جالندھری ڈیڑھ دو گھنٹے تک اپنی مشہور نظم شاہنامہ اسلام پڑھتا رہا جبکہ مقامی مسلم لیگی زعما شہر میں نئے ممبر بھرتی کرنے میں مصروف رہے۔ ان دنوں لیگ کی رکنیت کی فیس پانچ روپے اور سالانہ چندہ چھ روپے تھا۔ لہٰذا عامۃ المسلمین ''بڑے لوگوں'' کی اس جماعت میں دلچسپی لینے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے۔ جب میزبانوں کی بڑی تگ و دو کے بعد کسی نہ کسی طرح کورم پورا ہو گیا تو علامہ اقبال نے اپنا وہ خطبہ صدارت ☆ پڑھا جس کا اُس وقت اور اُس کے بعد 1940ء تک کوئی خاص نوٹس نہیں لیا گیا تھا۔ مسلمان دانشوروں اور مؤرخوں نے اس خطبہ کی تاریخی اہمیت کو 23 مارچ 1940ء کو قرارداد لاہور کی منظوری کے بعد ہی رفتہ رفتہ محسوس کرنا شروع کیا تھا اور پھر 14 اگست 1947ء کے بعد پنجابی شاونسٹوں نے یہ ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا کہ اسلامی مملکت پاکستان کا تصور دراصل پہلی مرتبہ علامہ کے اس تاریخی خطبہ میں پیش کیا گیا تھا۔ تاریخ کو مسخ کرنے کی اس سے بدتر مثال شاید ہی کہیں اور ملے۔

☆ مکمل متن کے لیے دیکھئے ضمیمہ نمبر 1

علامہ اقبال کے اس خطبہ میں ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد وخود مختار یعنی (Soverign) اسلامی مملکت کا کوئی تصور پیش نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں آسام اور بنگال کے مسلم اکثریت کے علاقوں کا کوئی ذکر نہیں تھا اور نہ ہی ریاست جموں وکشمیر کا کوئی تذکرہ تھا۔ البتہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریت کے علاقوں کو ایک ریاست میں ضم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا اور اسے وفاق ہندوستان کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک خود اختیار یونٹ کی حیثیت سے وضع کرنے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔ علامہ کے الفاظ یہ تھے کہ:

''میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست میں ضم کر دیا جائے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ سیلف گورنمنٹ، خواہ یہ سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا سلطنت برطانیہ کے باہر ہو، اور ایک مربوط شمال مغربی ہندی مسلم ریاست کی تشکیل بالآخر مسلمانوں کی کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کی تقدیر ٹھہرے گی۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے بھی پیش کی گئی تھی۔ اس نے اس بنا پر اس تجویز کو رد کر دیا تھا کہ اگر اس قسم کی ریاست قائم ہوئی تو یہ بے ہنگم طور پر وسیع وعریض ریاست ہوگی جس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے گا۔ جہاں تک رقبہ کا تعلق ہے نہرو کمیٹی کی رائے درست ہے لیکن اگر آبادی پر نظر کی جائے تو اس ریاست کے باشندوں کی تعداد اس وقت کے بعض ہندوستانی صوبوں سے بھی کم ہوگی۔ انبالہ ڈویژن اور غالباً ایسے اضلاع جہاں غیر مسلم اکثریت میں ہیں، کو چھوڑ دیا جائے تو اس ریاست کی انتظامی مشکلات میں کمی ہو جائے گی اور آبادی کے اعتبار سے اس میں مسلمان زیادہ ہو جائیں گے۔ اس طرح مجوزہ علاقے چھوڑ دینے کے نتیجے میں یہ مربوط ریاست اپنے علاقے کے اندر آباد غیر مسلم اقلیتوں کو موثر طور پر تحفظ فراہم کر سکے گی۔ اس تجویز کو سن کر انگریزوں اور ہندوؤں کو خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہندوستان مسلمانوں کا سب سے بڑا ملک ہے۔ اس جیتے جاگتے ملک میں اسلام کے ایک تمدنی قوت کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک مخصوص علاقہ میں اس کی مرکزیت قائم ہو۔ مسلمانان ہند کے اس سب سے جاندار حصے کی مرکزیت کی بدولت، کہ جس نے حکومت برطانیہ کی شدید ناانصافیوں کے باوجود فوج اور پولیس کی خدمات انجام دے کر برطانوی راج کو ممکن بنایا، بالآخر نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس سے مسلمانوں میں احساس ذمہ داری مضبوط ہوگا اور جذبۂ حب الوطنی فروغ پائے گا۔ اگر شمال مغربی ہندوستان

کے مسلمانوں کو یہ بھرپور موقع دیا جائے کہ وہ ہندوستان کے نظام سیاست میں رہ کر نشوونما کر سکیں تو وہ ہندوستان کے خلاف تمام حملوں کی صورت میں، چاہے یہ حملہ بزور قوت ہو یا بزور خیالات، ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔ پنجاب، جس کی 56 فیصد آبادی مسلمان ہے ہندوستان کی لڑاکا فوج کی 54 فیصد نفری مہیا کرتا ہے۔ اگر ہندوستان کی پوری فوج سے آزاد ریاست نیپال کے انیس ہزار گورکھوں کو نکال دیا جائے تو پنجاب کا حصہ تمام ہندوستانی فوج کا باسٹھ فیصد ہو جاتا ہے۔ اس اندازے میں وہ چھ ہزار جنگجو شامل نہیں جو صوبہ سرحد اور بلوچستان سے بھرتی کئے گئے ہیں۔ ان باتوں سے آپ شمال مغربی ہندوستان کی مسلم آبادی کی ان صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں جن کی بدولت وہ تمام ہندوستان کو غیر ممالک کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ رائٹ آنریبل سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ ''شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی خود مختار ریاستوں کے قیام کے مطالبہ کا مقصد ان ذرائع کا حصول ہے جن کی بدولت ہنگامی حالات میں حکومت ہند پر دباؤ ڈالا جا سکے''۔ میں صاف طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے مطالبہ کی پشت پر وہ جذبہ نہیں ہے جو وہ سمجھتے ہیں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ وہ اپنی ترقی کی راہ میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائیں۔ لیکن یہ ایسی وحدانی حکومت کے تحت ممکن نہیں ہوگا جس کو قوم پرست ہندو سیاست دان محض اس لئے قائم کر رہے ہیں کہ ان کو دوسرے فرقوں پر ہمیشہ کے لئے غلبہ حاصل ہو جائے۔

''ہندوؤں کے دلوں میں یہ خدشہ نہیں ہونا چاہیے کہ خود مختار مسلم ریاستوں کے قیام سے ان علاقوں میں ایک طرح کی مذہبی حکومتیں قائم ہو جائیں گی۔ میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں مذہب کا مفہوم کیا ہے حقیقت یہ ہے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں ہے بلکہ ایک ایسی ریاست ہے جس کا وجود بطور تعہدی نظام، روسو کے اظہار خیال سے کہیں پہلے قائم ہوا۔ اس کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کے مطابق انسان کسی خاص خطہ زمین سے وابستہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتی ہے اور اس کے زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کی مالک ہے۔ مسلم ریاست کی نوعیت کا اندازہ ٹائمز آف انڈیا کے ایک اداریے سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی بنکنگ کی انکوائری کمیٹی کے سلسلے میں اخبار نے لکھا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ریاست سود کی شرح کے متعلق قوانین بناتی تھی لیکن

باوجودیکہ اسلام میں سود لینا حرام ہے، مسلم دور حکومت میں ہندوستانی مسلم ریاستوں نے شرح سود پر کوئی پابندیاں نہیں لگائیں۔ اس لئے میں ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفاد میں ایک مربوط مسلم ریاست کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ ہندوستان کے لئے اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اندرونی توازن قوت کی وجہ سے امن وامان قائم ہو جائے گا اور اسلام کے لئے یہ ایک موقع ہوگا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو جائے جو عربی سامراجیت نے اس پر مسلط کئے تھے اور خود اپنے قوانین، تعلیم اور ثقافت کو وضع کرے اور انہیں اپنی حقیقی روح اور زمانۂ حال کی روح دونوں کے قریب تر لے آئے۔ پس یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں ان گنت قسم کی آب وہوا، نسلوں، زبانوں، عقیدوں اور معاشرتی نظاموں کی موجودگی میں ہندوستان میں ایک مستحکم دستوری ڈھانچہ صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ یہاں ایسی خود مختار ریاستیں قائم کی جائیں جو زبان، نسل، تاریخ، مذہب اور اقتصادی مفاد کی شناخت کے اشتراک پر مبنی ہوں۔ سائمن رپورٹ کے اندر وفاق کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اس کے تحت ضروری ہے کہ مرکزی مجلس قانون ساز ایک عوامی مجلس نہ رہے بلکہ وفاقی ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔ مزید اس وفاق کا تقاضا یہ بھی ہے کہ علاقے کی ازسر نو حد بندی انہی خطوط پر کی جائے جن کی میں نے نشان دہی کی ہے اور اس رپورٹ میں ان دونوں تجاویز کی سفارش کی گئی ہے۔ میں ان دونوں تجویزوں کی دل سے تائید کرتا ہوں بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی کہوں گا کہ سائمن کمیشن کے مطابق علاقوں کی حد بندی کو دو شرائط ضرور پوری کرنی چاہئیں۔ اول یہ کہ یہ حد بندی نئے دستور کے نفاذ سے قبل مکمل ہونی چاہیے۔ دوم یہ کہ اس کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے۔ مناسب طور پر کی گئی نئی حد بندی سے ہندوستان کے آئینی مناقشہ میں چل رہا مخلوط اور جداگانہ نیابت کا قضیہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ یہ صوبوں کا موجودہ ڈھانچہ ہی ہے جس کی وجہ سے یہ جھگڑا جاری ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ جداگانہ نیابت کا اصول قومیت کی حقیقی روح کے منافی ہے۔ ان کے نزدیک لفظ قوم کا مفہوم یہ ہے کہ تمام باشندے آپس میں اس طرح خلط ملط ہو جائیں کہ ان کے اندر مخصوص فرقے کا انفرادی وجود باقی نہ رہے۔ تاہم ہندوستان کی صورت حال یہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ خواہش پائی جاتی ہے کہ ایسا ہو۔ ہندوستان میں مختلف النوع مذاہب اور اقوام ہیں۔ مزید برآں اگر مسلمانوں کی عمومی معاشی پسماندگی، ان پر بھاری قرضوں کا بوجھ، خصوصاً پنجاب میں، اور بعض صوبوں کی

موجودہ ہیئت میں ان کی ناکافی اکثریتوں کا خیال کرلیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آ جاتی ہے کہ مسلمان جداگانہ نیابت کے لئے کیوں بے چین ہیں۔ ایسے ملک میں اور ان حالات میں جو یہاں ہیں یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ علاقہ وار انتخابات سے تمام مفادات کا تحفظ ہو سکے گا۔ اس سے ناگزیر طور پر صرف ایک گروہ کی حکومت ہو جائے گی۔ لیکن اگر صوبوں کی حد بندی اس انداز سے کر دی جائے کہ نسبتاً ہم آہنگ فرقوں پر مشتمل صوبے وجود میں آجائیں جن میں لسانی، نسلی، ثقافتی اور مذہبی یکجہتی پائی جاتی ہو تو مسلمانان ہند کو خالصتاً علاقہ وار انتخابات کے اصول کے نفاذ پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا...... میں خود اختیار (سیلف گورننگ) ہندوستان کے لئے وحدانی طرز حکومت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ جن کو ''اختیارات مالبقی'' کہا جاتا ہے، خود اختیار (سیلف گورننگ) ریاستوں کے سپرد ہونے چاہئیں۔ مرکزی وفاقی ریاست کے سپرد صرف ایسے اختیارات ہونے چاہئیں جو تمام وفاقی ریاستیں واضح طور پر بخوشی اس کے سپرد کریں۔ میں مسلمانان ہند کو ہرگز یہ تلقین نہیں کروں گا کہ وہ کسی ایسے نظام کے لئے رضامند ہو جائیں، چاہے وہ ہندوستانی ہو یا برطانوی، جو کہ وفاق کے صحیح اصول پر مبنی نہ ہو یا جس میں ان کے جداگانہ سیاسی وجود کو تسلیم نہ کیا گیا ہو...... میرے نزدیک سب سے بہتر صورت یہ ہوتی کہ صرف برطانوی ہندوستان کے علاقوں پر مشتمل وفاق قائم کر کے ابتدا کی جاتی۔ کسی وفاقی سکیم سے جو جمہوریت اور مطلق العنانیت کے ناپاک امتزاج سے قائم ہو، اس کے سوا کوئی اور نتیجہ اخذ نہیں ہوسکتا کہ برطانوی ہندوستان کو بدستور وحدانی طرز حکومت کے تحت رکھا جائے۔ ممکن ہے کہ یہ وحدانی طرز حکومت انگریزوں، والیان ریاست اور اکثریتی فرقہ کے لئے مفید ہو لیکن اس سے مسلمانوں کو اس وقت تک فائدہ نہیں ہوسکتا جب تک انہیں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں تمام اختیارات مالبقی کے ساتھ اکثریت کے حقوق حاصل نہ ہوں اور وفاقی مجلس قانون ساز میں انہیں 33 فیصد نشستیں نہ ملیں...... مجھے یقین ہے کہ وفاقی حکومت کے قیام کی صورت میں مسلم وفاقی ریاستیں ہندوستان کے دفاع کی خاطر غیر جانبدار بری اور بحری فوجوں کو قائم کرنے کے لئے بخوشی رضامند ہو جائیں گی۔ ہندوستان کے دفاع کے لئے اسی قسم کی غیر جانبدار فوجی طاقت مغلیہ دور حکومت میں موجود تھی۔ اکبر کے زمانہ میں ان تمام سرحدی فوجوں کے افسر ہندو تھے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ ہندوستان کے وفاق پر مبنی ایک غیر جانبدار ہندوستانی فوج کے قیام سے مسلمانوں کی حب الوطنی

میں اضافہ ہو جائے گا اور اس سے اس بدگمانی کا بھی ازالہ ہو جائے گا کہ بیرونی حملہ کی صورت میں مسلمان، حملہ آور مسلمانوں کے ساتھ مل جائیں گے...... مسلمانان ہند کا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے مستقل حل کے لئے برطانوی ہندوستان کے صوبوں کی از سر نو حد بندی کی جائے تاکہ اگر فرقہ وارانہ مسئلے کے علاقائی حل کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے تو میں پورے شد و مد سے ان مطالبات کی تائید کرتا ہوں جن کا آل انڈیا مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ نے بارہا اعلان کیا ہے...... ہر وہ دستور جو ایک ہمہ گیر ہندوستان کے تصور پر مرتب کیا جائے گا جس کا مقصد یہ ہوگا کہ یہاں ایسے اصولوں کا نفاذ کیا جائے جو برطانیہ کے جذبۂ جمہوریت کی پیداوار ہو تو اس کا مطلب ہندوستان کو غیر شعوری طور پر خانہ جنگی کی طرف لے جانا ہوگا۔ میرے خیال میں جب تک یہ تسلیم نہ کر لیا جائے کہ ہندوستان میں بسنے والے مختلف لوگوں کو ماضی سے بہ یک قلم اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر جدید اصولوں پر اپنی نشو و نما کے مواقع میسر ہوں گے اس وقت تک ہندوستان میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔"[6]

علامہ اقبال کے خطبہ کے ان اقتباسات سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے دسمبر 1930ء میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ضم کر کے وفاق ہندوستان کے دائرے میں ایک خود مختار یعنی (Autonamous) ریاست قائم کرنے کی جس خواہش کا اظہار کیا تھا اس کی بنیاد دراصل کسی نئے تصور پر نہیں تھی۔ علامہ کے اپنے بیان کے مطابق 1927ء میں "آل پارٹیز کانفرنس منعقدہ دہلی کی قراردادوں سے اسی بلند نصب العین کا اظہار ہوتا تھا" اور پھر 1928ء میں نہرو کمیٹی کے روبرو بھی یہ تجویز پیش کی گئی تھی مگر اس نے اس کو مسترد کر دیا تھا۔ اسی سال یعنی 1928ء میں ہی پنجاب میں سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کے ترجمان اخبار "انقلاب" میں مرتضےٰ احمد خان میکش کے نام سے ایک سلسلۂ مضامین شائع ہوا تھا جن میں یہی مطالبہ کیا گیا تھا۔ علامہ اقبال ان دنوں پنجاب کونسل میں یونینسٹ پارٹی کے رکن تھے اور جب دسمبر 1930ء میں انہوں نے یہ خطبہ پڑھا تھا اس وقت تک بھی انہوں نے یونینسٹ پارٹی سے استعفیٰ نہیں دیا تھا۔ اس خواہش یا تجویز یا مطالبہ کا مقصد یہ نہیں تھا کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک مکمل طور پر آزاد و خود مختار یعنی (Sovereign) اسلامی مملکت قائم کی جائے۔ پورے خطبہ میں اس کے لئے کسی جگہ بھی (Sovereign) کا لفظ استعمال نہیں کیا گیا۔ یہ دراصل پنجابی مسلمانوں کے ابھرتے

ہوئے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کی اس خواہش کا اظہار تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کا نیا آئینی ڈھانچہ فیڈرل ہو اور اس میں شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل ایک وسیع ریاست تشکیل دے دی جائے جس کو اتنی خودمختاری حاصل ہو کہ وہ مقابلتاً ترقی یافتہ ہندوؤں کے شکنجے سے آزاد ہو کر سیاسی، معاشی اور معاشرتی ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ اس میں لفظ ''ریاست'' بہ معنی ''صوبہ'' کے استعمال کیا گیا تھا جس کی حیثیت متحدہ ہندوستان میں ایک وفاقی یونٹ کے طور پر تجویز کی گئی تھی۔ علامہ اقبال فرقہ وارانہ بنیادوں پر فقط صوبوں کی نئی حد بندی چاہتے تھے اور ان صوبوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک مرکزی اسمبلی کا قیام چاہتے تھے جس کی سائمن رپورٹ میں بھی منظوری دی گئی تھی۔ مسلم وفاقی ریاست یا ریاستوں کا دائرہ کار ایک متحدہ وفاقی ہندوستانی حکومت کے ماتحت تھا۔ علامہ کے اس خطبہ کے بعض دوسرے قابل توجہ نکات یہ تھے۔

1۔ مجوزہ خودمختار مسلم ریاست قائم ہونے سے مسلمانوں میں احساس ذمہ داری مضبوط ہو گا اور جذبہ حب الوطنی فروغ پائے گا۔ اگر وہ ہندوستان کے نظام سیاست میں رہ کر مکمل نشوونما کر سکیں تو وہ ہندوستان کے خلاف تمام حملوں کی صورت میں ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔

2۔ مجوزہ ریاست میں مذہبی حکومت قائم نہیں ہو گی بلکہ یہ ایک ایسی ریاست ہو گی جس میں شرح سود پر کوئی پابندی نہیں ہو گی۔

3۔ مجوزہ ریاست میں مسلمانوں کو مخلوط نیابت کے اصول کے نفاذ پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ کیونکہ اگر وفاقی ہندوستان میں صوبوں کی حد بندی فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے اصول کی بنا پر ہو گی تو اس سے مخلوط اور جداگانہ نیابت کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے گا۔

4۔ مجوزہ ریاست کے قیام کے صورت میں ہندوستان میں اندرونی توازن قوت کی وجہ سے امن وامان قائم ہو جائے گا اور اسلام کو یہ موقع ملے گا کہ وہ اس جمود کو توڑ ڈالے جو اس کی تہذیب وتمدن، تعلیم اور قانون پر صدیوں سے طاری ہے۔

5۔ ہندوستان میں وفاقی طرز حکومت قائم ہونے سے مسلم وفاقی ریاست یا ریاستیں ہندوستان کے دفاع کی خاطر مشترکہ برّی اور بحری فوجوں کو قائم کرنے کے لئے رضامند ہو جائیں گی اور انہیں تمام سرحدی فوجوں کے افسروں کے ہندو ہونے پر کوئی

اعتراض نہیں ہوگا۔ اکبر کے زمانہ کی طرز کی فوجوں کی تشکیل سے مسلمانوں کی حب الوطنی میں اضافہ ہوگا اوراس سے اس بدگمانی کا بھی ازالہ ہوجائے گا کہ بیرونی حملہ کی صورت میں مقامی مسلمان حملہ آور مسلمانوں کے ساتھ مل جائیں گے۔

6۔ اگر ہندوستان میں ایسا دستور نافذ کرنے کی کوشش کی گئی جس کی بنیاد برطانیہ کی پارلیمانی جمہوریت کے اصولوں پر ہوگی تو اس کا نتیجہ خانہ جنگی کی صورت میں برآمد ہوگا اور برصغیر میں امن وامان قائم نہیں ہوسکے گا۔

ظاہر ہے کہ علامہ اقبال نے ان نکات پر مشتمل ہندوستانی وفاق کے دائرے میں رہتے ہوئے ایک خودمختار وفاقی مسلم ریاست یا ریاستوں کا جو تصور پیش کیا تھا اس کا اس تصور سے کوئی تعلق نہیں تھا جس کی بنیاد پر 14 راگست 1947ء کو پاکستان وجود میں آیا تھا۔ تصور پاکستان کے خالق دراصل علامہ اقبال نہیں تھے بلکہ پنجاب کا ممتاز آریہ سماجی ہندولیڈر لالہ لاجپت رائے تھا جس نے 1924ء میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر برصغیر کی تقسیم کی تجویز پیش کی تھی۔ لاجپت رائے فیڈرل بنیاد پر بھی متحدہ ہندوستان کا قائل نہیں تھا۔ اس کی رائے میں تاریخی، مذہبی اور دوسری وجوہ کی بنا پر متحدہ ہندوستان میں ہندو۔ مسلم اتحاد واتفاق کا کوئی امکان نہیں تھا۔ بلکہ اس کا واحد حل یہ تھا کہ برصغیر کو کلی طور پر آزاد وخودمختار ہندو اور مسلمان مملکتوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ چنانچہ 1947ء میں بالکل ایسے ہی ہوا۔ ہر چیز کی تقسیم بالکل اسی طرح ہوئی جس طرح کہ لالہ لاجپت رائے نے تجویز کی تھی۔ علامہ اقبال کے خطبہ کے کسی حصہ سے بھی یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے ذہن میں ایک کلی طور پر آزادوخودمختار یعنی (Indepedent and Sovereign) اسلامی مملکت کے قیام کا تصور تھا۔ وہ تو صرف یہ چاہتے تھے کہ گول میز کانفرنس آئندہ ہندوستان کے لئے ایسا آئینی ڈھانچہ منظور کرے کہ برصغیر کے مسلمانوں کو بالعموم اور پنجاب کے مسلمانوں کو بالخصوص ''معاشی پستی اور بھاری قرضوں کے بوجھ'' سے نجات حاصل ہو۔ یہی وجہ تھی کہ ان دنوں سرفضل حسین کے ترجمان اخبار ''انقلاب'' کی تجویز کے مطابق پنجاب میں مسلمانوں کے لئے ان کی آبادی کے مطابق چھپن فیصد سیاسی، معاشی اور معاشرتی حقوق کے حصول کے لئے جو تحریک چل رہی تھی، علامہ اس کی تائید وحمایت کرتے تھے۔ جبکہ خلافتی لیڈر حبیب الرحمن لدھیانوی اور بعض دوسرے ''قوم پرست'' لیڈروں کا الزام یہ تھا کہ کانگرس مکمل آزادی کے لئے جو جدوجہد کر رہی

ہے، یہ تحریک اس میں انتشار و اختلاف پیدا کرنے کے لئے چلائی گئی ہے۔ علامہ کا خیال تھا کہ اگر انبالہ ڈویژن کو پنجاب سے الگ کر دیا جائے اور پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو مدغم کر کے اس علاقے کو ہندوستان کی فیڈریشن کے اندر ایک خودمختار ریاست کا درجہ دے دیا جائے تو اس میں مسلمانوں کی اتنی اکثریت ہوگی کہ وہ ہندو سرمایہ داروں اور ساہوکاروں کی مخالفت کے باوجود اپنے لئے ترقی کی راہیں تلاش کر لیں گے۔ وہ اس مجوزہ ریاست میں مُلّاؤں کی مذہبی حکومت کے قیام کے بھی خلاف تھے۔ وہ اس میں شرح سود پر کوئی پابندی عائد کرنے کے بھی خلاف تھے اور شمال سے خطرہ کے سدباب کے لئے وسیع المشرب مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر کے ہندوؤں کے ساتھ مشترکہ دفاعی نظام کے احیاء کے حق میں تھے۔

گاندھی۔ اروِن معاہدہ اور مسلمانوں کی تشویش

19 جنوری 1931ء کو گول میز کانفرنس کے پہلے سیشن کے افتتاحی اجلاس میں برطانوی وزیراعظم ریمزے میکڈانلڈ نے ہندوستان کے لئے ان آئینی تجاویز کا اعلان کیا جن پر مندوبین نے عمومی طور پر اتفاق کر لیا تھا۔ ان تجاویز کا خلاصہ یہ تھا کہ صوبائی حکومتوں پر عوامی نمائندوں کو مکمل کنٹرول حاصل ہوگا لیکن مرکزی حکومت میں دفاع اور امور خارجہ کے محکمے عوامی نمائندوں کے کنٹرول میں نہیں دیئے جائیں گے بلکہ ان پر گورنر جنرل کا براہ راست کنٹرول ہوگا اور باقی نظم ونسق پر اس کی بالواسطہ اور عمومی بالادستی قائم رہے گی۔ برطانوی وزیراعظم کے اس اعلان کا بین الاقوامی پس منظر یہ تھا کہ عالمگیر معاشی بحران نے پوری سرمایہ دار دنیا کو مکمل تباہی و بربادی کے کنارے پر لا کھڑا کیا تھا۔ بے شمار صنعتیں بند ہوگئی تھیں۔ لاکھوں کمپنیوں کا دیوالیہ نکل گیا تھا اور کروڑوں لوگ تلاش روزگار میں دردر کی ٹھوکریں کھا رہے تھے۔ اس فقید المثال زبوں حالی پر قابو پانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ اسلحہ سازی کی صنعت میں توسیع کر کے سوویت یونین کے خلاف دوسری عالمی جنگ کی تیاری کی جائے اور مختلف ممالک میں فاشسٹ حکومتیں قائم کر کے داخلی بدامنی کو کچلا جائے۔ چنانچہ اٹلی، اسپین اور پرتگال میں فسطائیت زوروں پر تھی اور جرمنی میں دائیں بازو کی حکومت بن چکی تھی حالانکہ اسے پارلیمنٹ میں اکثریت کی حمایت حاصل نہیں تھی۔

ان حالات میں برطانوی سامراج کے مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستان کی سب سے

بڑی سیاسی جماعت کانگرس سے کوئی نہ کوئی مفاہمت کی جائے تاکہ اس کی عالمی سلطنت کا سب سے بڑا ستون تخریب کاری اور بدامنی کا شکار نہ ہونے پائے۔ گاندھی کی سول نافرمانی کی تحریک روز بروز زور پکڑ رہی تھی کیونکہ مہنگائی اور بے روزگاری میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا اور کمیونسٹ پارٹی اس سے پورا فائدہ اٹھا رہی تھی۔ چنانچہ وزیر اعظم میکڈانلڈ کی تقریر کے فوراً بعد وزیر ہند ویج وڈ بین نے وائسرائے لارڈ اردن کو ہدایت کی کہ وہ گاندھی سے سمجھوتے کی کوئی صورت نکالے کیونکہ کانگرس کے تعاون کے بغیر ہندوستان میں کوئی آئینی سکیم کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ وائسرائے اردن نے اس ہدایت کے مطابق 26 رجنوری کو گاندھی اور اس کی کانگرس کی مجلس عاملہ کے ارکان کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔ فروری میں اردن اور گاندھی کے درمیان مفاہمت کی گفتگو ہوئی اور 5 رمارچ کو ان دونوں نے ایک معاہدے پر دستخط کر دیئے جس کے تحت یہ قرار پایا کہ (1) کانگرس سول نافرمانی کی تحریک ختم کر دے گی۔ (2) کانگرس گول میز کانفرنس میں شرکت کرے گی۔ (3) کانگرس کو اجازت ہو گی کہ وہ پرامن مظاہرہ کر کے عوام کو صرف ہندوستان کی ساختہ اشیاء خریدنے کی ترغیب دے۔ (4) حکومت ان تمام قوانین کو منسوخ کر دے گی جو کانگرس کو دبانے کے لئے نافذ کئے گئے تھے۔ (5) حکومت ان تمام اعلانات کو منسوخ کر دے گی جو بعض انجمنوں کو غیر قانونی قرار دینے کے لئے جاری کئے گئے تھے۔ (6) حکومت ان لوگوں کے خلاف دائر کردہ مقدمات واپس لے لے گی جو تشدد کے مرتکب نہیں ہوئے تھے۔ (7) جن لوگوں کو سول نافرمانی کی تحریک میں گرفتار کیا گیا تھا انہیں رہا کر دیا جائے گا۔ (8) حکومت جرمانوں اور ضبط کردہ منقولہ جائیدادوں کے بارے میں بھی رعایت دے گی اور تعزیراتی پولیس چوکیاں ہٹالی جائیں گی۔

چونکہ گاندھی اور اردن کے درمیان اس معاہدے سے کانگرس کے وقار میں یکا یک بہت اضافہ ہو گیا تھا اس لئے پنجاب اور برصغیر کے دوسرے علاقوں کے مسلمانوں کے درمیانے طبقے کو یہ تشویش لاحق ہو گئی کہ برطانیہ کی لیبر حکومت ہندوستان کی مسلم اقلیت کے حقوق کو نظر انداز کر کے ہندوؤں سے کوئی نہ کوئی سودے بازی کر لے گی۔ لہٰذا اس معاہدے کے چند دن بعد بمبئی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا جس میں یہ اعلان کیا گیا کہ ہندو۔ مسلم تنازعہ کے تصفیہ کے بغیر مسلمانوں کے لئے کوئی آئین قابل قبول نہیں ہو گا اور گول میز کانفرنس نے جس

وفاقی ڈھانچے پر عمومی طور پر اتفاق کیا ہے وہ غیر تسلی بخش ہے، اس میں ترمیم ہونی چاہیے۔ مجلس عاملہ کی قرارداد میں مزید کہا گیا تھا کہ اگر مسلمانوں کی تمناؤں کی تکمیل نہ ہوتو انہیں لندن کانفرنس کا بائیکاٹ کرنا چاہیے۔ مولانا حسرت موہانی کا مؤقف یہ تھا کہ ''جب ہندو مغربی طرز کی جمہوریت پر اصرار کرتے ہیں تو وہ دراصل اس آڑ میں پورے برصغیر میں ہندوراج قائم کرنا چاہتے ہیں جس سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو سخت نقصان پہنچے گا۔''[7] مولانا موہانی کا یہ مؤقف وہی تھا جس کا اظہار مولانا محمد علی جوہر مرحوم نے تقریباً ایک سال قبل 23راپریل 1930ء کو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس میں کیا تھا جبکہ گاندھی نے ''پورنا سوراج'' کے حصول کے لئے اپنی سول نافرمانی کی تحریک شروع کی تھی۔ بہت سے دوسرے مسلمان سیاسی لیڈر اس مؤقف سے برملا اتفاق کرتے تھے۔ انہیں یہ تشویش لاحق ہوگئی تھی کہ برطانیہ کی لیبر حکومت اور کانگرس کے درمیان گٹھ جوڑ کے باعث ہندوستان میں سات کروڑ مسلمانوں کے حقوق ہمیشہ کے لئے سلب ہو جائیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ نے وزیراعظم ریمزے میکڈانلڈ کو ''رام چند مکندا ملی'' کا نام دے رکھا تھا۔

باب: 6

احراری۔قادیانی تضاد اور پنجاب کی سیاست پر ملّاؤں کا غلبہ

مجلس احرار اسلام...... پنجابی مسلم درمیانہ طبقہ کی جماعت

مسلم رائے عامہ کے دباؤ کے تحت مئی 1931ء میں پنجاب کے خلافتی لیڈروں نے کانگرس سے ناطہ توڑ کر مجلس احرار اسلام کے نام سے اپنی ایک الگ تنظیم قائم کر لی۔ مولوی حبیب الرحمان لدھیانوی نے 11رجولائی کو اس جماعت کے پہلے اجلاس میں اپنے خطبہ صدارت میں اعلان کیا کہ ''میں ہندوستان کی تمام اقوام کو کھلے الفاظ میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ جماعت احرار کسی قوم کے ساتھ بے انصافی نہیں چاہتی مگر اس کے ساتھ ہی ہندوستان میں وہ اچھوت بن کر رہنے کے لئے بھی تیار نہیں۔ مسلمان ہندوستان میں برابر کے حقدار ہیں اور وہ ہندوستان کی حکومت میں برابر کے حصہ دار ہو کر رہیں گے۔ ہندو پریس کے نزدیک ہر مسلمان اس لئے فرقہ پرست ہے کہ وہ مسلمان ہے اگرچہ اس نے ملک وقوم کے لئے زبردست قربانیاں دی ہیں لیکن جہاں اس نے کسی مسلمان پر ظلم ہوتے دیکھ کر اس کی امداد کی، اس وقت اسے فرقہ پرست کا خطاب مل گیا۔ کوئی مسلمان تمام عمر کانگرس کا وفادار رہے مگر وہ کسی ایک ہندو کی شخصی رائے کی مخالفت کرے تو فرقہ پرست ہے۔ اس لئے میں اعلان کرتا ہوں کہ نہ میں قوم پرست ہوں نہ فرقہ پرست، صرف مسلمان ہوں۔ میں نے آج تک اپنے ملک اور قوم سے کبھی غداری نہیں کی۔ ہندو پریس میں اگر آج بھی تھوڑا سا انصاف کا جذبہ آجائے تو میں یقین کرتا ہوں کہ تمام جھگڑے آج ہی ختم ہو جائیں...... ابھی تک کانگرس کے دفتروں میں مسلمانوں کو اچھوت سمجھنے والے ہندو موجود ہیں۔

جنگ آزادی (گاندھی کی سول نافرمانی) شروع کرنے سے پہلے کانگرس کے جلیل القدر رہنماؤں نے نہرو رپورٹ کو مسترد کرتے ہوئے مسلمانوں کو یہ یقین دلایا تھا کہ آئندہ کوئی نظام حکومت منظور نہیں کیا جائے گا جس میں آزاد خیال مسلمانوں کی رضامندی حاصل نہ ہوگی۔"[1]

عاشق بٹالوی پنجاب میں مسلمانوں کی اس نئی جماعت کے قیام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ گاندھی کی "سول نافرمانی میں مسلمانوں کے اس گروہ نے جو آگے چل کر احرار کے نام سے مشہور ہوا اپنی استعداد سے بڑھ کر قربانیاں دی تھیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، چودھری افضل حق، مولوی مظہر علی اظہر، مولوی حبیب الرحمان لدھیانوی اور ان کے بیسیوں رفقا نے قید و بند کی سختیاں برداشت کیں لیکن مارچ 1931ء میں جب کانگرس کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا تو مہاتما گاندھی کی خواہش تھی کہ پنجاب کے کسی مسلمان کو کانگرس کی مجلس عاملہ میں لیا جائے۔ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد سے درخواست کی کہ کسی موزوں آدمی کی سفارش کیجئے۔ مولانا نے مولوی عبدالقادر قصوری سے ذکر کیا اور مولوی عبدالقادر نے جھٹ اپنے دوست ڈاکٹر محمد عالم کا نام تجویز کر دیا اور یوں ڈاکٹر عالم کانگرس کی ورکنگ کمیٹی میں شامل کر لئے گئے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے ساتھیوں کو اس واقعہ سے سخت رنج پہنچا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ ورکنگ کمیٹی کی رکنیت کا اعزاز چودھری افضل حق کو ملنا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر محمد عالم کا پنجاب میں قطعی کوئی اثر و رسوخ نہیں تھا۔ مسلمانوں کا کوئی گروہ ان کی پشت پر نہ تھا اور وہ سوائے اپنی ذات کے پنجاب کے کسی قابل ذکر ادارے کی نمائندگی کا دعویٰ نہیں کر سکتے تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور ان کے رفقا نے محسوس کیا کہ کانگرس نے ان کی قربانیوں کی کوئی قدر نہیں کی اور ان کی خدمات کو ٹھکرا کر ایک ایسے شخص کو معتمد بنا لیا ہے جو اعتماد کا اہل نہ تھا۔ اس خیال سے متاثر ہو کر اس پورے گروہ نے کانگرس سے قطع تعلق کر کے اپنی الگ جماعت بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ کراچی سے واپس آتے ہی مجلس احرار اسلام کی بنیاد رکھی گئی اور کانگرس سے اپنا تعلق منقطع کر کے اس مجلس نے مسلمانوں کے جداگانہ حقوق اور جداگانہ نیابت کا اعلان کر دیا۔"[2]

بٹالوی کے اس بیان کی بہت حد تک تائید جواہر لال نہرو کی خودنوشت سوانح عمری سے بھی ہوتی ہے۔ نہرو لکھتا ہے کہ "کراچی میں جو ورکنگ کمیٹی کا انتخاب کیا گیا اس سے ایک ناخوشگوار نتیجہ پیدا ہوا جس کا ہم لوگوں کو اس وقت خیال بھی نہ تھا۔ آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے بعض

ممبروں کو انتخاب پر (خصوصاً ایک مسلمان کے نام پر) اعتراض تھا۔ شاید انہیں یہ بھی شکایت تھی کہ ان میں سے کوئی بھی نہیں لیا گیا۔ ظاہر ہے کہ پندرہ ارکان کی کمیٹی میں ہر گروہ کی نمائندگی ناممکن تھی اور اصل نزاع جس کا ہمیں کچھ علم نہ تھا محض ذاتی اور مقامی تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اعتراض کرنے والا گروہ رفتہ رفتہ کانگرس سے علیحدہ ہو گیا اور انہوں نے پنجاب کے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے حصے کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ لوگ زیادہ تر نچلے درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کا عام مسلمانوں پر بڑا اثر تھا...... احرار پارٹی کے بعض لیڈروں کے کانگرس کے الگ ہو جانے سے پنجاب کی کانگرس کو بہت نقصان پہنچا۔ مگر کراچی میں ہمیں اس کا کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ ان کے الگ ہو جانے کی وجہ صرف وہ ناراضگی ہی نہیں تھی جو ورکنگ کمیٹی کے انتخاب سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ تو محض ایک علامت تھی جس سے صورت حال کا اظہار ہو گیا۔ اصل اسباب کچھ اور تھے۔"[3]

جواہر لال نہرو نے ان اصل اسباب پر روشنی نہیں ڈالی۔ تاہم جو لوگ پنجاب کے دوسرے عشرے کی تاریخ سے واقف ہیں ان کے لئے سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور اس کے ساتھیوں کی 1931ء میں کانگرس سے علیحدگی کے اصل اسباب کی تلاش مشکل نہیں۔ ان کی کانگرس سے علیحدگی اور پنجاب میں صرف مسلمانوں کی فرقہ پرست جماعت کے قیام کا پس منظر یہ تھا کہ 1921ء کی تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد پورے برصغیر میں فرقہ وارانہ کشیدگی اور فسادات کا جو سلسلہ شروع ہوا تھا اس سے صوبہ پنجاب بری طرح متاثر ہوا تھا جہاں پر مسلمان آبادی کے لحاظ سے اکثریت میں ہونے کے باوجود سیاسی، معاشرتی اور معاشی لحاظ سے انتہائی پسماندہ تھے اور ہندو عوامی زندگی کے ہر شعبے پر چھائے ہوئے تھے حالانکہ ان کا آبادی کا تناسب 30 فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔ جب میاں فضل حسین نے 23-1921ء میں بطور صوبائی وزیر تعلیم حکومت ہند کی پالیسی اور 1916ء کے لکھنؤ پیکٹ کے مطابق 55 فیصد پنجابی مسلمانوں کے لئے سرکاری تعلیمی اداروں اور لوکل باڈیز میں 40 فیصد نشستیں مخصوص کی تھیں تو پنجاب کونسل کے ہندوؤں نے بیک زبان بہت واویلا کیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے اس "گناہ عظیم" کی وجہ سے کونسل میں راجہ نریندر ناتھ نے 1923ء میں اس کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کر دی تھی جس کے حق میں سارے منتخب ہندوؤں اور سکھوں نے ووٹ دیئے تھے۔ تاہم جنوری 1924ء میں جب صوبائی کونسل کے نئے انتخابات ہوئے تھے تو شہری حلقوں سے تین خلافتی ارکان چودھری افضل حق، رانا فیروز الدین اور

مظہر علی اظہر منتخب ہو گئے تھے۔ ان کی اس کامیابی کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ انہوں نے یہ انتخاب کانگرس یا سوراج پارٹی کے ٹکٹ پر نہیں لڑا تھا بلکہ ان کے پاس خلافت کمیٹی کا لیبل تھا جس کے لئے شہری مسلمانوں کے نچلے درمیانہ طبقہ کے دل میں ابھی تک قدرے جذبہ احترام تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ لوگ مذہبی اصطلاحات پر مشتمل لچھے دار تقریروں اور تحریروں کے ماہر تھے اور اس بنا پر یہ شہری مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو بآسانی ابھار سکتے تھے۔ لیکن تیسری اور غالباً سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ میاں فضل حسین نے اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے ان دقیانوسی جاگیرداروں سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا جن کے ساتھ مسلمانوں کے شہری درمیانہ طبقہ کا قدرتی تضاد تھا اور اس کا عملی مظاہرہ خلافتی امیدواروں کی کامیابی کی صورت میں برآمد ہوا۔ لیکن جب 1924-26ء میں میاں فضل حسین کی دوسری وزارت کے دوران یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ اپنی جاگیردار اور سامراج نوازی کے باوجود عملی طور پر پنجابی مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کا خیر خواہ ہے اور اس کے برعکس یہ خلافتی گروہ اپنی ''اسلام پسندی'' کے باوجود کانگرس اور ہندوؤں کے عملی طور پر حلیف ہیں تو اس گروہ کی مقبولیت ختم ہو گئی۔ ویسے بھی 1926ء میں ترکی میں خلافت کے عہدے کے قطعی خاتمہ کے بعد خلافتیوں کے سیاسی وجود کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا۔ چنانچہ جنوری 1927ء میں صوبائی کونسل کے جو انتخابات ہوئے ان میں کوئی خلافتی امیدوار کامیاب نہ ہو سکا بلکہ ان کی بجائے علامہ اقبال اور شیخ محمد صادق جیسے درمیانہ طبقہ کے امیدوار کامیاب ہوئے جنہوں نے کونسل کے اندر اپنے آپ کو میاں فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی سے منسلک کیا اور جو کونسل کے باہر مسلمانوں کے لئے جداگانہ حقوق کی علمبردار شفیع لیگ میں شامل رہے۔ اس عرصے میں میاں فضل حسین کی مسلمانوں میں مقبولیت کا اندازہ کانگرسی لیڈر ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے اس خطبہ صدارت سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے دسمبر 1924ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے سالانہ اجلاس منعقدہ بلگام (بمبئی پریذیڈنسی) میں پڑھا تھا۔ ڈاکٹر کچلو نے علی الاعلان کہا تھا کہ ''میاں فضل حسین کی پالیسی حق و انصاف پر مبنی ہے۔ اس سلسلہ میں میاں صاحب کے خلاف پنجاب کے ہندوؤں نے جو شور و غوغا بپا کر رکھا ہے وہ بالکل نامناسب اور خود غرضانہ ہے۔ گزشتہ الیکشن کے بعد پنجاب میں جو سوراج پارٹی بنی تھی اس نے اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ وہ سراسر ایک ہندو پارٹی ہے۔ پنجاب کی مصیبتوں کا اصل سبب اقتصادی ہے کیونکہ ایک طرف صوبے کی ساری تجارت پر ہندوؤں کا اجارہ

ہے اور دوسری طرف سرکاری ملازمتوں کی بیشتر تعداد بھی ان کے قبضہ میں ہے۔"[4]

پنجاب کی سیاست کے اس پس منظر میں جب برطانوی وزیر اعظم نے 19 رجنوری 1931ء کو ہندوستان کے لئے آئندہ کے آئینی ڈھانچے کے بنیادی نکات کا اعلان کیا اور پھر وزیر ہند کی ہدایت کے مطابق وائسرائے اروِن نے 5 رمارچ کو گاندھی کے ساتھ معاہدہ کیا تو مسلمانوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کو واقعی بڑی تشویش لاحق ہوئی تھی اور اسے اپنا مستقبل بڑا ہی تاریک نظر آنے لگا تھا۔ لہٰذا برصغیر کے شہری مسلمانوں میں بالعموم اور پنجاب کے شہری مسلمانوں میں بالخصوص ہندوؤں اور کانگرس کے خلاف مخالفانہ جذبات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ ان حالات میں عملی سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ پنجاب کے مسلمان خلافتی لیڈر ہندو کانگرس سے اپنا رشتہ منقطع کر کے اپنی ایک الگ تنظیم قائم کریں۔ بصورت دیگر گول میز کانفرنس کے بعد متوقع عام انتخابات میں ان کی کامیابی کا کوئی امکان پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر عالم کی کانگرس ورکنگ کمیٹی میں نامزدگی نے انہیں بہانہ مہیا کر دیا۔ انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور 4 رمئی 1931ء کو لاہور میں مجلس احرارِ اسلام کے نام سے مسلمانوں کی ایک نئی جماعت کے قیام کا اعلان کر دیا۔

یہ بانیان احرار پنجاب کے شہروں کے مسلمانوں کے نچلے درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے ان میں سے بیشتر جدید علوم سے ناآشنا تھے البتہ ان کی روایتی مذہبی علوم سے خاصی آشنائی تھی۔ چونکہ ان کی سیاست کی ابتدا مہاتما گاندھی کی زیرسرپرستی مذہبی تحریک خلافت سے ہوئی تھی اس لئے مذہب ان کا سب سے بڑا سیاسی حربہ تھا۔ ان کی سیاسی موقع پرستی کی حالت یہ تھی کہ جب تک کانگرس سے منسلک رہے یہ ہندوستان کی قومی وحدت کا پرچار کرتے رہے لیکن جب یہ کانگرس سے الگ ہوئے تو یکایک مسلمانوں کے جداگانہ حقوق کے علمبردار بن گئے اور یہ کہنے لگے کہ "مسلمان ہندوستان میں اچھوت بن کر رہنے کے لئے تیار نہیں۔ وہ ہندوستان میں برابر کے حق دار ہیں۔ وہ ہندوستان کی حکومت میں برابر کے حصہ دار ہو کر رہیں گے۔" ان کے پاس کوئی واضح سیاسی، معاشرتی اور معاشی پروگرام نہیں تھا۔ چونکہ ان کی سیاست کا انحصار سراسر مذہب پر تھا اس لئے انہوں نے اپنی مقبولیت کے دور میں پنجابی مسلمانوں کو سیاسی لحاظ سے سخت نقصان پہنچایا۔

بیسویں صدی کا تیسرا عشرہ پورے برصغیر میں بے پناہ سیاسی بیداری کا زمانہ تھا کیونکہ عالمی معاشی بحران نے برطانوی سامراج کی بنیادیں کھوکھلی کر دی تھیں اور روز افزوں مہنگائی اور بے روزگاری

نے کروڑوں لوگوں کو سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔لیکن پنجاب میں ایک طرف تو نیم تعلیم یافتہ احراریوں نے شہری مسلمانوں کو بے معنی اور بے مقصد مذہبی شورش میں الجھائے رکھا اور دوسری طرف جاگیرداروں کی تنظیم یونینسٹ پارٹی نے دیہاتی مسلمانوں کو برادریوں کے مفادات اور دیہاتیوں اور شہریوں کے تضادات میں مبتلا رکھا۔اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پنجاب کے شہری اور دیہاتی مسلمان اس تاریخی عشرے میں بھی سیاسی طور پر کوئی قابل ذکر پیش قدمی نہ کر سکے۔

احراری۔قادیانی تضاد اور کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد کو نقصان

جب مئی 1931ء میں مجلس احرار کا قیام عمل میں آیا تو پنجاب کے مسلم اخبارات میں کشمیری مسلمانوں کے حقوق کے لئے پروپیگنڈا مہم جاری تھی۔ کیونکہ ڈوگرہ حکومت جموں وکشمیر کے مسلمانوں کو، جن کی آبادی ریاست کی کل آبادی کے 70 فیصد سے زیادہ حصہ پر مشتمل تھی، کوئی سیاسی، معاشرتی، معاشی، ثقافتی اور مذہبی حقوق نہ دینے پر مصر تھی اور جو ریاستی باشندے اس مقصد کے لئے آواز اٹھاتے تھے انہیں سخت ظلم وستم کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ریاستی مسلمانوں کی شکایات یہ تھیں کہ ریاستی حکومت نے متعدد مسجدوں، قبرستانوں اور دوسروں مقدس مقامات پر قبضہ کر رکھا ہے۔مسلمانوں کو سرکاری دفاتر میں ملازمت نہیں دی جاتی۔ان کی مذہبی رسوم کی بجا آوری پر قیود عائد کی جاتی ہیں اور ریاست میں کوئی باقاعدہ اور آئینی قانون ساز مجلس موجود نہیں۔جب پنجاب کے مسلم اخبارات میں ان شکایات کے تدارک کے لئے پروپیگنڈا مہم جاری رہی تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کشمیری مسلمانوں کی جانب سے پچھلے کچھ عرصے سے اپنے حقوق کے لئے جو پرامن جدوجہد جاری تھی وہ 13رجولائی کو سری نگر جیل کے سامنے پولیس کی زبردست فائرنگ کے بعد ایک عوامی بلوے اور فرقہ وارانہ فساد کی صورت اختیار کر گئی۔

اس پر پنجاب میں دو جماعتوں نے تحریک کشمیر کا چارج لینے کی کوشش کی۔ان میں ایک آل انڈیا کشمیر کمیٹی تھی جو 26رجولائی 1931ء کو شملہ میں وجود میں آئی تھی۔اس کمیٹی کا سربراہ جماعت احمدیہ کا امیر مرزا بشیر الدین محمود تھا اور اس کا سیکرٹری ایک احمدی عبدالرحیم درد تھا۔ اس کے ارکان میں ڈاکٹر سر محمد اقبال، نواب سر ذوالفقار علی خان، خواجہ حسن نظامی، نواب ابراہیم علی خان آف کنج پورہ، سید محسن شاہ، خان بہادر شیخ رحیم بخش، مولانا اسماعیل غزنوی، مولانا نورالحق،

سید حبیب شاہ اور ریاست کشمیر اور صوبہ کے چار پانچ نمائندے شامل تھے۔ دوسری مجلس احرار تھی جس کی تحریک کشمیر میں شرکت کی سب سے بڑی وجہ ''تاریخ احرار'' کے مصنف اور مقتدر احراری لیڈر چودھری افضل حق کے بیان کے مطابق یہ کہ ''کشمیر کمیٹی نے ریاست میں مرزائی مبلغ بھیج کر سرکاری نبوت کی اشاعت شروع کر دی تھی اور دنیا بھر میں یہ ڈھنڈورا پیٹا تھا کہ پورے اسلامی ہند نے اسے لیڈر مان کر اس کے باپ کی نبوت کی تصدیق کر دی ہے۔ کشمیر کا سادہ دل اور مصیبت زدہ مسلمان ہر کس و ناکس کو اپنا ہمدرد سمجھ کر اس کی طرف متوجہ ہوتا تھا اس لئے باخبر اہل مذہب کو مرزائی مبلغین کے ہاتھوں مسلمانان کشمیر کے ارتداد کا خطرہ لاحق ہو گیا تھا'' چنانچہ اس خطرے کا سدباب کرنے کے لئے احراری لیڈروں نے پہلے تو لاہور کے محمڈن ہال میں ایک جلسہ میں شرکت کی جو مسئلہ کشمیر پر غور کرنے کے لئے ڈاکٹر سر محمد اقبال کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ ان کا مقصد بقول افضل حق، یہ تھا کہ ''کوئی تدبیر لڑا کر مرزا بشیر کمیٹی کے مقابلے میں احرار کے حق میں تائید حاصل کی جائے۔ چونکہ حاضرین طبقہ اولیٰ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے وہ احرار کے نام پر حقارت سے منہ پھیرتے تھے مگر ڈاکٹر صاحب احرار کو آگے بڑھانے پر بضد تھے۔ بہر حال وہ بزوری و بزاری ان کا اعلان اپنے حق میں کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس طرح انہیں تھوڑی سی جگہ ملی چنانچہ وہ بیٹھے اور پاؤں پسار کر ساری جگہ پر قبضہ کر لیا۔''[5]

اس قبضہ کی ابتدا اکتوبر 1931ء کو شروع ہوئی جبکہ مظہر علی اظہر کی سرکردگی میں ایک سو رضا کاروں کا ایک جتھا سیالکوٹ سے جموں کے علاقے میں غیر قانونی طور پر داخل ہو گیا اور پھر احراریوں کے جتھے جموں کی حدود میں داخل ہو کر مظاہرے کرتے رہے۔ پریم ناتھ بزاز کی اطلاع کے مطابق اکتوبر کے مہینے میں 4500 احرار رضا کار ریاست کی حدود میں داخل ہوئے جن سے متاثر ہو کر صوبہ جموں کے مقامی باشندوں نے بھی سیاسی مظاہرے شروع کر دیئے۔ چنانچہ 4 رنومبر کو جالندھر سے فوج منگوائی گئی جس نے بآسانی اس تحریک کو کچل دیا۔ پریم ناتھ بزاز لکھتا ہے کہ ''پنجاب میں جماعت احمدیہ اور مجلس احرار کی ناچاقی و نااتفاقی سے کشمیری مسلمانوں کی تحریک آزادی پر بہت مضر اثر پڑا...... ریاست میں انتہائی فرقہ وارانہ فضا پیدا ہو گئی یہاں تک کہ خود پنجاب کی سیاست پر بھی اس کے نتیجے میں بہت مضر اثرات مرتب ہوئے۔

مجلس احرار کی تحریک کشمیر کے آغاز سے قبل 7 رستمبر 1931ء کو لندن میں گول میز

کانفرنس کا دوسرا سیشن شروع ہو چکا تھا جو یکم دسمبر 1931ء تک جاری رہا۔ چونکہ کانفرنس کے پہلے سیشن کے دوران مولانا محمد علی جوہر کا لندن میں ہی انتقال ہوگیا تھا اس لئے ان کی جگہ پنجاب سے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی نامزدگی ہوئی۔ غالباً یہ نامزدگی سر فضل حسین کی سفارش پر ہوئی تھی کیونکہ اس وقت تک ڈاکٹر اقبال نہ صرف یونینسٹ پارٹی سے منسلک تھے بلکہ وہ محمد علی جناح کے برعکس کانگرس کے نظریہ قومی وحدت کے خلاف اور مسلمانوں کے لئے جداگانہ حقوق کے حق میں تھے۔ سر ظفر اللہ خان کے بیان کے مطابق ''لندن میں ڈاکٹر کا ورود وہاں کے فلسفی، ادبی اور مستشرقین حلقوں میں دلچسپی کا موجب رہا اور والڈرف ہوٹل میں آپ کے اعزاز میں وسیع پیمانہ پر استقبالی دعوت کا انتظام ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اپنے پرانے اور نئے احباب کی ملاقاتوں سے بہت محظوظ ہوئے لیکن کانفرنس کی سست رفتاری سے ان کی طبیعت اکتائی رہی۔ مسٹر جناح نے پہلی گول میز کانفرنس کے اختتام پر ہندوستان واپسی کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور لندن میں ایک پر فضا مقام پر ایک مکان میں رہائش اختیار کر کے پریوی کونسل میں پریکٹس شروع کر دی تھی۔ پہلی گول میز کانفرنس کی کارروائی سے وہ مطمئن نہیں تھے۔ دوسری گول میز کانفرنس کی کارروائی بھی ان کے لئے زیادہ دلچسپی کا موجب نہ ہو سکی۔''[6]

ڈاکٹر اقبال کی اس کانفرنس کی کارروائی سے بیزاری کی وجہ تو غالباً یہ تھی کہ ان کی شاعرانہ طبیعت منافقانہ آئینی موشگافیوں کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی لیکن جناح کی عدم دلچسپی اس لئے تھی کہ کانفرنس کے دوسرے سیشن میں سر آغا خان کے علاوہ گاندھی کا بھی غلبہ تھا۔ گاندھی کانگرس کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے دوسرے سیشن میں شریک ہوا تھا اور وہ اپنے انڈین نیشنلزم اور پارلیمانی جمہوریت کے نظریے پر مصر تھا اور اس بنا پر وہ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو کوئی جداگانہ حقوق دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ وہ جناح کے اس مؤقف سے اتفاق نہیں کرتا تھا کہ انڈین نیشنلزم اور پارلیمانی جمہوریت کے خواب کی تعبیر کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ہندو۔ مسلم تنازعہ کا تصفیہ کر لیا جائے۔ تاہم ظفر اللہ خان اپنے سیاسی سرپرست میاں فضل حسین کی ہدایت کے مطابق کانفرنس میں سرگرمی سے حصہ لیتا رہا۔ یکم دسمبر کو کانفرنس کے خاتمہ کے بعد ظفر اللہ واپس دہلی آیا تو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے اسے لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی دعوت دی جو اس نے قبول کر لی۔ اس پر احراریوں نے دہلی میں لیگ اور جماعت احمدیہ کے خلاف مظاہرہ کیا کیونکہ اس

وقت تک تحریک کشمیر ختم ہو چکی تھی۔ چنانچہ لیگ کا سالانہ اجلاس دہلی کے ایک پرائیویٹ مکان میں ہوا جس میں کوئی قابل ذکر کاروائی نہ ہوئی۔

علامہ اقبال اور قادیانیت۔ تعلق اور لاتعلقی

جب اپریل 1932ء میں میاں فضل حسین کی علالت کے باعث اس کی جگہ ظفر اللہ خان کا وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے عارضی رکن کے طور پر تقرر کا اعلان ہوا تو احراریوں کو نہ صرف ظفر اللہ خان اور اس کی جماعت احمدیہ کے خلاف بلکہ میاں فضل حسین اور اس کی یونینسٹ پارٹی کے خلاف سیاسی مہم چلانے کا ایک سنہری موقع مل گیا۔ میاں فضل حسین نے اپنی علالت کے باعث چار ماہ کے لئے رخصت لی تھی اور وائسرائے ولنگڈن سے یہ سفارش کی تھی کہ اس کی جگہ اس مختصر مدت کے لئے ظفر اللہ خان کا تقرر کر دیا جائے۔ وائسرائے نے یہ سفارش مان لی جبکہ صوبہ کے بیشتر شہری مسلمانوں کو امید تھی کہ آئندہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں کوئی اسامی خالی ہوئی تو اس پر ڈاکٹر محمد اقبال کا تقرر ہوگا۔ چنانچہ لاہور کے روزنامہ ٹریبیون میں یہ خبر شائع بھی ہوگئی تھی کہ سر فضل حسین کی رخصت کے دوران اس کی جگہ ڈاکٹر اقبال کو نامزد کیا جائے گا۔ مگر جب چند دن کے بعد ظفر اللہ خان کے حق میں سرکاری اعلان ہوا تو شملہ میں ٹریبون کے نمائندہ درگا داس نے یہ لکھا کہ ''میاں صاحب کی جگہ ایک ادنیٰ درجہ کے وکیل کا تقرر ہوا ہے۔''

ایس۔ ایم۔ اکرام اور بعض دوسرے مؤرخین اشاروں کنایوں میں لکھتے ہیں کہ اگرچہ 1931ء کے اواخر میں ڈاکٹر اقبال اور جماعت احمدیہ کے امیر مرزا بشیر الدین محمود کے درمیان کشمیر کمیٹی کے طریقہ کار اور مقاصد کے سوال پر اختلاف رائے پیدا ہو چکا تھا لیکن دراصل اپریل 1932ء میں سر محمد ظفر اللہ خان کے تقرر کا واقعہ ڈاکٹر اقبال کی جماعت احمدیہ اور یونینسٹ پارٹی سے رنجیدگی و بیگانگی کا باعث بنا تھا۔ اس واقعہ سے قبل علامہ اقبال نے اپنی کسی تحریر یا تقریر میں کبھی مرزا غلام احمد اور اس کی جماعت احمدیہ پر نکتہ چینی نہیں کی تھی اور اس کا ذکر مرزا بشیر الدین محمود نے اپنی 1939ء میں تحریر کردہ کتاب سیرت المہدی میں کیا تھا۔ خود علامہ نے بھی 1897ء میں مرزا کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ ان کا نام 313 مقلدین میں شامل تھا۔ 1930-31ء تک وہ مرزا کو مجدد سمجھتے تھے اور ان کے بڑے بیٹے آفتاب احمد نے کئی سال تک قادیان میں تعلیم حاصل کی تھی۔''[7]

علامہ نے 1911ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ''ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر'' کے عنوان سے ایک تقریر کی تھی جس میں انہوں نے احمدیہ جماعت کو اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ قرار دیا تھا۔انہوں نے اپنی اس تقریر میں مسلمانان ہند کے مختلف اسالیب کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا تھا ''ہندوستان میں جب ہم اسلامی جماعت کے ارتقا کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں تیمور اسلوب اول کا مظہر نظر آتا ہے۔بابر اسالیب اول و دوئم کے امتزاج کو ظاہر کرتا ہے۔جہانگیر اسلوب ثانی کے سانچے میں خصوصیت کے ساتھ ڈھلا ہوا ہے اور عالمگیر جس کی زندگی اور کارنامے میری دانست میں ہندوستان کی اسلامی قومیت کی نشوونما کا نقطۂ آغاز ہیں اسلوب ثالث کا چہرہ کشا ہے ......میری رائے میں قومی سیرت کا وہ اسلوب جس کا سایہ عالمگیر کی ذات نے ڈالا ہے ٹھیٹھ اسلامی سیرت کا نمونہ ہے اور ہماری تعلیم کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ اس نمونہ کو ترقی دی جائے اور مسلمان ہر وقت اسے پیش نظر رکھیں...... ہندوستان میں مسلمانوں کی عمرانی رفتار کو نگاہ غور سے دیکھنے سے اس حقیقت کا انکشاف ہوتا ہے جو کہ قوم کے اخلاقی تجربے کے مختلف خطوط کا نقطۂ اتصال ہے۔ پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا جسے فرقۂ قادیانی کہتے ہیں۔''[8] یہ تقریر انگریزی میں لکھی گئی تھی اور اس کا ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان دنوں ظفر علی خان کو بھی جماعت احمدیہ کے بارے میں علامہ اقبال کی اس رائے سے اختلاف نہیں تھا۔حالانکہ اس سے بہت پہلے جماعت احمدیہ کے عقائد کا برملا اظہار ہو چکا تھا اور اس کا بانی سربراہ مرزا غلام احمد اپنے دعاوی کا اعلان کر چکا تھا۔اس کے انتقال (1908ء) کے تین سال بعد علامہ اقبال نے متذکرہ تقریر کی تھی۔

مارچ 1882ء میں مرزا غلام احمد نے دعویٰ کیا تھا کہ اسے الہام ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسے ایک خاص مقصد تفویض کیا ہے۔دوسرے لفظوں میں گویا وہ مامور من اللہ ہے۔ 1888ء میں اس نے پھر ایک الہام کی بنا پر اپنے مریدین سے بیعت کا مطالبہ کیا تھا۔1890ء کے اواخر میں اس کو پھر الہام ہوا کہ یسوع ناصری (عیسیٰ ابن مریم) نہ صلیب پر فوت ہوا، نہ آسمان کی طرف اٹھایا گیا بلکہ جب وہ صلیب پر زخمی ہو گیا تو اس کے شاگردوں نے اسے اسی مجروح حالت میں صلیب پر سے اتار لیا اور اس کے زخموں کا علاج کیا۔اس کے بعد وہ کشمیر چلا گیا اور وہیں طبعی موت مر گیا۔یہ عقیدہ غلط ہے کہ وہ روز قیامت کے قریب اپنے اصلی جسم عنصری کے ساتھ

دوبارہ ظاہر ہوگا۔ اس کے دوبارہ ظہور کے وعدے کا مطلب صرف یہ ہے کہ عیسیٰ ابن مریم کے صفات واخلاق رکھنے والا ایک اور شخص امت محمدیہ میں پیدا ہوگا وہ وعدہ پورا ہو چکا ہے اور وہی (مرزا غلام احمد) مثیل عیسیٰ ہے اور مسیح موعود واقع ہوا ہے۔ اس عقیدے کی اشاعت سے مسلمانوں میں اضطراب پیدا ہوگیا تھا کیونکہ یہ اس عام مسلمہ عقیدہ کے منافی تھا کہ عیسیٰ ابن مریم جسم عنصری کے ساتھ آسمان سے اترے گا۔ چنانچہ اس مسلمہ عقیدہ کے حامل علماء نے اس کی شدید مخالفت شروع کردی تھی۔ اس کے بعد مرزا غلام احمد نے ''مہدی موعود'' ہونے کا دعویٰ بھی کیا تھا اور اعلان کیا تھا کہ میں ایسا مہدی نہیں جو جنگ وخونریزی میں مصروف ہو جاؤں بلکہ میں مہدی معقول ہوں اور دلائل وبراہین کی قوت سے اپنے مخالفین کو مغلوب کرونگا۔ اس نئے دعویٰ سے اس کی مخالفت زیادہ بھڑک اٹھی تھی اور علماء اس کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرنے لگے تھے۔

1901ء میں مرزا غلام احمد نے ایک اور عقیدے کا اظہار کیا تھا کہ آج کے بعد جہاد بالسیف کا قصہ ختم ہے۔ اب جہاد اس پر موقوف ہے کہ مخالف کو دلیل وبرہان سے قائل کرنے کی کوشش کی جائے۔

1901ء میں مرزا غلام احمد نے ظلی نبی ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور ''ایک غلطی کا ازالہ'' کے عنوان سے ایک اشتہار شائع کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ختم نبوت کے عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے انتقال کے بعد کوئی ایسا نبی پیدا نہ ہوگا جو کسی نئی شریعت کا حامل ہو لیکن کسی غیر تشریعی نبی کا ظہور عقیدہ ختم نبوت کے خلاف نہیں ہے۔ نومبر 1906ء میں مرزا غلام احمد نے سیالکوٹ کے ایک جلسہ عام میں مثیل کرشن ہونے کا بھی دعویٰ کیا تھا۔ جماعت احمدیہ 1901ء میں قائم کی گئی تھی اور مرزا غلام احمد کی استدعا پر اسی سال مردم شماری کے کاغذات میں اس جماعت کو ایک علیحدہ مسلم فرقہ ظاہر کیا گیا تھا۔ اس جماعت کو مرزا غلام احمد کی زندگی ہی میں خاصی تائید حاصل ہوگئی تھی اور متعدد ممتاز اور ذی اثر لوگ بھی اس میں شامل ہو گئے تھے۔

جب 1908ء میں مرزا غلام احمد کا انتقال ہوگیا تو مولوی نورالدین اس کا ''خلیفہ اول'' مقرر ہوا تھا۔ علامہ اقبال نے 1911ء میں جو تقریر کی تھی وہ اسی ''خلیفہ اول'' کے عہد میں تھی۔ اس ''خلیفہ اول'' کا انتقال 1914ء میں ہوا تھا اور اس کی جگہ مرزا غلام احمد کا بیٹا مرزا بشیر الدین محمود احمد ''خلیفہ ثانی'' قرار پایا تھا۔ مرزا بشیر الدین کی مسند نشینی پر جماعت میں پھوٹ پڑ گئی تھی۔

جماعت کا ایک حصہ خواجہ کمال الدین اور مولوی محمد علی کی سرکردگی میں الگ ہو گیا تھا اور ایک علیحدہ پارٹی ''لاہور پارٹی'' کے نام سے وجود میں آ گئی تھی۔ دونوں پارٹیوں میں فرق یہ تھا کہ قادیانی پارٹی کے عقیدے میں مرزا غلام احمد ''نبی'' تھا لیکن لاہور پارٹی مرزا کو یہ درجہ دینے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس کے نزدیک مرزا غلام احمد زیادہ سے زیادہ مجدد یا محدث تھا۔ ان الگ ہونے والوں نے لاہور میں اپنی ایک تنظیم قائم کر لی تھی جو احمدیہ انجمن اشاعت اسلام کہلاتی تھی۔

بظاہر علامہ اقبال فرقہ قادیانی کے بارے میں اپنی اس رائے پر 1932-1931ء تک قائم رہے تھے کیونکہ اس سے قبل انہوں نے اس جماعت پر کبھی نکتہ چینی نہیں کی تھی۔ نیاز فتح پوری کے بیان کے مطابق علامہ کی اس رائے میں بنیادی تبدیلی 1933ء کے بعد آئی تھی جبکہ ''احرار کی شورش سے مرعوب ہو کر اپنی جان چھڑانے کے لئے وہ ایک بیان دینے پر مجبور ہو گئے۔ ورنہ وہ اس سے قبل احمدیت کے بڑے مداح تھے۔''[9] علامہ نے اپنے اس بیان میں اپنی 1911ء کی تقریر کی اس طرح وضاحت کی تھی کہ ''مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس اس تقریر کے ابتدائی انگریزی مسودے کی کوئی کاپی نہیں ہے اور نہ ہی اردو ترجمے کی کوئی کاپی ہے۔ یہ اردو ترجمہ مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے تقریر 1911ء میں یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ اس سے پہلے مولوی چراغ علی مرحوم نے جو مسلمانوں میں بہت ممتاز تھے اور اسلام پر کئی انگریزی کتابوں کے مصنف بھی تھے، اس تحریک کے بانی سے تعاون کیا تھا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے اس نے کتاب موسومہ ''براہین احمدیہ'' کے لکھنے میں بھی گرانقدر حصہ لیا تھا۔ لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں منکشف نہیں ہوتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لئے برسوں چاہئیں۔ تحریک کے دو گروہوں کے باہمی نزاعات اس امر پر شاہد ہیں کہ خود ان لوگوں کو جو بانئ تحریک کے ساتھ ذاتی رابطہ رکھتے تھے معلوم نہ تھا کہ تحریک آگے چل کر کیا صورت اختیار کرے گی۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک کے بارے میں اس وقت شبہ میں مبتلا ہو گیا تھا جبکہ ایک ایسی نئی نبوت کا قطعی طور پر دعویٰ کیا گیا تھا جو بانئ اسلام کی نبوت سے بھی برتر تھی اور مسلم دنیا کو کافر قرار دے دیا گیا تھا۔ بعد ازاں میرے شکوک نے قطعی بغاوت کی صورت اختیار کر لی۔ جبکہ میں نے خود اپنے کانوں سے تحریک کے ایک رکن کو پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے

میں توہین آمیز زبان استعمال کرتے ہوئے سنا۔ درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔"[10] خواجہ نذیر احمد کہتا ہے کہ "1931ء میں مرزا بشیر الدین محمود سے اختلاف پیدا ہونے کے بعد ڈاکٹر اقبال نے احمدیوں کے خلاف کتاب لکھی تو میرے والد خواجہ کمال الدین نے اس سے پوچھا کہ "اویار تری بیعت دا کی ہویا۔" اس پر علامہ کا جواب یہ تھا کہ "اوہ ویلا ہور سی ایہہ ویلا ہور اے۔"[11]

فرقہ قادیانی کے بارے میں علامہ اقبال کی رائے میں یہ بنیادی تبدیلی احراریوں کی شورش کی وجہ سے یا کشمیر کمیٹی میں مرزا بشیر الدین محمود سے اختلاف پیدا ہونے کی وجہ سے یا سر ظفر اللہ خان کے عارضی ایگزیکٹو کونسلر بننے کی وجہ سے یا اس فرقہ کے ایک رکن کی پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں گستاخانہ زبان استعمال کرنے کی وجہ سے یا ان سارے عوامل کی وجہ سے ہوئی تھی اس کا فیصلہ نہیں ہوسکتا۔ البتہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ علامہ نے 1933ء سے قبل جماعت احمدیہ کے خلاف لب کشائی یا خامہ فرسائی نہیں کی تھی اور جب انہوں نے جون 1933ء میں اس جماعت کی مخالفت کی تو اس سے احراریوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ ان کی قادیانی فرقہ سے مذہبی چشمک تو بہت سالوں سے چلی آرہی تھی۔ 1927ء میں اس چشمک میں کچھ تندی اور تیزی آگئی تھی جبکہ جماعت احمدیہ کے "خلفیہ ثانی" مرزا بشیر الدین محمود نے علم دین شہید کے واقعہ کے بعد سیرت النبی ﷺ کے جلسے شروع کر دیئے تھے۔ ان دنوں علامہ اقبال پنجاب کونسل میں ظفر اللہ خان کے ہمراہ سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کے رکن تھے۔ پھر 1931ء میں احرار۔ احمدیہ چشمک میں کچھ اور اضافہ ہوا جبکہ مرزا بشیر نے اپنے سیاسی اور مذہبی مقاصد کے لئے تحریک کشمیر شروع کی۔ لیکن جب 1932ء میں جماعت احمدیہ کے سربرآوردہ رکن ظفر اللہ خان کا وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں تقرر ہوا تو قادیانی۔ احرار آویزش نے ایک مذہبی ہنگامے کی صورت اختیار کرلی۔ احراریوں نے جگہ جگہ جلسے کر کے مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کو جھٹلایا اور اپنی لچھے دار اور اشتعال انگریز تقریروں کے ذریعے عامۃ المسلمین کو تلقین کی کہ وہ اسلام کے خلاف قادیانی فتنہ کے سدباب کے لئے مجلس احرار کے جھنڈے تلے جمع ہوجائیں۔ اگرچہ وہ اپنے ان جلسوں میں ختم نبوت کے مسئلہ پر بظاہر تبلیغی نوعیت کی تقریریں کرتے تھے۔ لیکن ان کا مقصد سراسر سیاسی تھا۔

روایتی مسلم درمیانہ طبقہ میں قادیانی مخالف جذبات کی وجوہات

جب اگست 1932ء میں برطانوی وزیراعظم ریمزے میکڈانلڈ نے کمیونل ایوارڈ کا اعلان کرکے یہ واضح کردیا کہ نئے آئین کے تحت آئندہ عام انتخابات کرانے میں زیادہ عرصہ نہیں لگے گا تو احراریوں کی اینٹی قادیانی تحریک اور بھی تیز ہوگئی۔ وہ اپنی تقریروں میں سر فضل حسین پر الزام عائد کرتے تھے کہ وہ قادیانیوں کی سرپرستی کرتا ہے لہٰذا مسلمانوں کو اس کی یونینسٹ پارٹی کا اثر قبول نہیں کرنا چاہیے۔ ان کی یہ تحریک دو تین سال تک خاصی کامیاب رہی۔

اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان دنوں فقید المثال معاشی بحران کے باعث پنجابی مسلمانوں میں بے روزگاری اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی لہٰذا وہ ہر اس اجتماع میں زور وشور سے حصہ لیتے تھے جو برطانوی سامراج اور اس کے پٹھوؤں کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے منعقد ہوتا تھا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ قادیانی جماعت روایتاً سامراج نواز تھی اور حکومت برطانیہ سے وفاداری اس کی پالیسی کا بنیادی اصول تھا۔ جب پہلی جنگ عظیم میں خلافت عثمانیہ کا زوال ہوا تھا تو اس جماعت نے قادیان میں جشن منایا تھا۔ احراری لیڈر، مرزا غلام احمد کی بعض تحریروں کا حوالہ دے کر کہتے تھے کہ فرقہ قادیانی برطانوی سامراج کا ''خودکاشت پودا'' ہے جبکہ قادیانیوں کا جواب یہ ہوتا تھا کہ سرسید احمد خان، مولانا محمد حسین بٹالوی، ڈاکٹر سر محمد اقبال، مولانا ظفر علی خان، مولانا حالی، مولانا شبلی کے علاوہ دوسرے بہت سے ممتاز مسلمان سیاسی و مذہبی زعما بھی انگریز حکمرانوں کے قصیدے لکھتے اور پڑھتے رہے ہیں۔ سرسید احمد خان نے اپنے رسالہ ''اسباب بغاوت ہند'' میں انگریزوں کے خلاف بغاوت کو ''حرامزدگی'' قرار دیا تھا اور علامہ اقبال نے 1918ء میں پنجاب کے بدنام ترین لیفٹیننٹ گورنر مائیکل اوڈوائر کا قصیدہ لکھا تھا جو انہوں نے خود مشاعرہ میں پڑھا تھا اور پھر یہ 11رمئی 1918ء کو امرتسر کے اخبار ''وکیل'' میں شائع ہوا تھا۔ 1919ء کے اوائل میں اسی اوڈوائر کے حکم سے جلیاں والا باغ میں قتل عام کیا گیا تھا اور پھر پورے پنجاب میں مارشل لاء نافذ ہوا تھا۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ جماعت احمدیہ کا تنظیمی ڈھانچہ فسطائی اور خفیہ نوعیت کا تھا اور اس کے خلیفہ کو آمرانہ اختیارات حاصل تھے۔ جس کی بنا پر عامتہ المسلمین میں اس کے بارے میں

بے شمار شکوک وشبہات پیدا ہو گئے ہوئے تھے۔

چوتھی وجہ یہ تھی کہ اس جماعت کے ارکان عام مسلمانوں کا تقریباً اسی طرح معاشرتی بائیکاٹ کرتے تھے جس طرح کہ ہندو کرتے تھے۔کوئی احمدی روایتی عقیدہ کے حامل کسی مسلمان سے ازدواجی تعلقات قائم نہیں کرتا تھا اور نہ ہی اس کی مذہبی یا معاشرتی تقریب میں شرکت کرتا تھا۔

پانچویں وجہ یہ تھی کہ اس جماعت کے ارکان ایک دوسرے کی فلاح و بہبود کا اس طرح خیال رکھتے تھے جیسے کہ ان کا مذہبی فریضہ تھا۔ وہ ایسا کرتے ہوئے عدل وانصاف کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ہر شعبہ زندگی میں برملا جماعتی بھائیوں کی امداد کرتے تھے۔خواہ اس طرح کسی دوسرے شخص سے بے انصافی ہی کیوں نہ ہوتی ہو۔

چھٹی وجہ یہ تھی کہ بیسویں صدی کے دوسرے عشرے میں جب اس جماعت نے یونینسٹ پارٹی کی امداد سے پنجاب کی سیاست میں مؤثر کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا تو اس یونینسٹ پارٹی کی امداد سے پنجاب کی سیاست میں مؤثر کردار ادا کرنا شروع کر دیا تھا تو اس کے ''خلیفہ ثانی'' کے مذہبی اور سیاسی عزائم یکا یک بہت بلند ہو گئے تھے۔جس کی وجہ سے روایتی عقیدہ کے حامل مسلمانوں کو اس سے زبردست خطرہ محسوس ہونے لگا تھا۔

ساتویں وجہ یہ تھی کہ اس جماعت کی جارحانہ تبلیغی سرگرمیوں سے عامتہ المسلمین کے مذہبی جذبات مجروح ہوتے تھے۔ لہٰذا وہ اس کے خلاف اپنے غم وغصہ کے اظہار کے لئے احراریوں کے جلسوں اور کانفرنسوں میں شریک ہوتے تھے۔

آٹھویں وجہ یہ تھی کہ مجلس احرار کے بیشتر قائدین ایجی ٹیشن، مجمع گیری اور الفاظ فروشی کے ماہر تھے۔ان کی تقریریں اور تحریریں خوشنما اور دلکش اصطلاحات سے اس قدر سجی ہوتی تھیں کہ نیم تعلیم یافتہ نچلے درمیانہ طبقہ کے مسلمان عوام ان سے بہت متاثر اور مرعوب ہوتے تھے۔ سید عطاءاللہ شاہ بخاری تو فن خطابت کا بادشاہ تھا۔اس کی تقریریں اس قدر دلکش اور مسحور کن ہوتی تھیں کہ لاکھوں کا مجمع انہیں کئی گھنٹے تک انتہائی انہماک اور توجہ سے سنتا تھا اور کسی کو اونچی سانس لینے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ وہ اپنی تقریروں میں حاضرین کو رلاتا بھی تھا اور ہنساتا بھی تھا۔ بہت سے لوگ محض رونے یا ہنسنے کے لئے اس کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔بعض لوگ ایسے بھی ہوتے تھے جو تفریح طبع کے لئے کوئی فلم دیکھنے کی بجائے اس کے جلسے میں چلے جاتے تھے۔

ظفر اللہ خان نے گول میز کانفرنس کے لئے علامہ اقبال کا نام تجویز کیا

جب علامہ اقبال نے جون 1933ء میں قادیانی فرقہ کی مذہبی بنیاد پر اعلانیہ مخالفت کی تھی اس وقت تک گول میز کانفرنس کا تیسرا اور آخری سیشن منعقد ہو چکا تھا۔ یہ مختصر سیشن 17 رنومبر 1932ء سے 24 ردسمبر 1932ء تک ہوا تھا۔ اس سیشن میں بھی پنجاب سے ظفر اللہ خان کے علاوہ ڈاکٹر محمد اقبال شریک ہوئے تھے۔ ظفر اللہ خان ان دنوں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا عارضی رکن تھا اور وہ دعویٰ کرتا ہے کہ گول میز کانفرنس کے آخری سیشن کے لئے مسلم مندوبین کے نام اس نے تجویز کئے تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''وزیر ہند نے میرے تجویز کردہ ناموں میں سے دو کے متعلق اختلاف کیا۔ اس نے (قائداعظم) مسٹر جناح کے متعلق تو لکھا کہ ''وہ ہر بات پر تنقید تو بہت کر دیا کرتے ہیں لیکن کوئی اثباتی حل پیش نہیں کرتے۔ اب انہوں نے مستقل طور پر لندن میں رہائش اختیار کر لی ہے۔ ہندوستان کے معاملات کے ساتھ ان کا براہ راست تعلق نہیں رہا'' علامہ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کے متعلق لکھا کہ ''وہ دوسری گول میز کانفرنس میں تشریف لائے تھے لیکن انہوں نے کانفرنس کے دوران میں ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میں نے دونوں اصحاب کی شمولیت پر پُرزور اصرار کیا اور وائسرائے نے میری معروضات وزیر ہند کی خدمت میں بھیج دیں۔ بالآخر وہ ڈاکٹر صاحب کو شامل کرنے پر تو رضامند ہو گئے لیکن (قائداعظم) مسٹر جناح صاحب کے متعلق میری سعی ناکام رہی۔''[12]

ڈاکٹر اقبال نے لندن میں اپنے اس دوسرے قیام کے دوران گول میز کانفرنس میں کچھ دلچسپی کا اظہار کیا۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ہندوستان میں وحدانی حکومت قائم نہ کی جائے بلکہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جائیں۔ لندن کے ادبی وثقافتی حلقوں نے بھی ان کی آؤ بھگت کی۔ پہلے کی طرح اقبال لٹریری سوسائٹی نے ان کے اعزاز میں ایک دعوت دی جس میں بہت سے ہندوستانی اور انگریز دانشوروں نے شرکت کی۔ کانفرنس نے وزیراعظم ریمزے میکڈانلڈ کے اگست 1931ء کے اعلان کمیونل ایوارڈ کی منظوری دی۔ البتہ اس میں گاندھی۔ امبید کر معاہدے کے مطابق یہ ترمیم کی گئی کہ اچھوتوں کو جداگانہ نیابت نہیں ملے گی۔ گاندھی کانفرنس کے اس آخری سیشن میں شریک ہوا تھا کیونکہ وہ مسلمانوں کو جداگانہ نیابت دینے کے بھی خلاف تھا اور اس بنا پر اس نے اپنی سول نافرمانی کی تحریک جاری رکھی تھی۔

چودھری رحمت علی کا تصور ''پاکستان''

اس صورت حال کے پیش نظر کانفرنس ختم ہونے کے تقریباً دو ہفتے بعد جنوری 1933ء میں کیمبرج یونیورسٹی کے چار پنجابی مسلم طلبا چودھری رحمت علی، محمد اسلم خان، محمد صادق اور عنایت اللہ خان نے لندن میں چار صفحوں کا پمفلٹ تقسیم کیا جس میں برصغیر ہند کی تقسیم کی ایک ایسی تجویز پیش کی گئی جو علامہ اقبال کے دسمبر 1930ء کے خطبہ الہ آباد کی تجویز سے بالکل مختلف تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد چودھری رحمت علی نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ برصغیر کو تقسیم کر کے تین آزاد و خود مختار مسلم ریاستوں۔ پاکستان، بانگ اسلام اور عثمانستان کی تشکیل کی جائے۔ اس نے ایک نقشہ بھی شائع کیا تھا جس میں اس نے اپنی مجوزہ مسلم ریاستوں کی جغرافیائی حدود کی نشاندہی کی تھی۔ اس نقشہ میں یہ ظاہر کیا گیا تھا کہ پاکستان سرحد، پنجاب، کشمیر، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ہوگا۔ لیکن بعد میں اس کی یہ تجویز کس قدر غیر حقیقت پسندانہ اور ناقابل عمل بن گئی تھی اس کا اندازہ اس کی اس تحریر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''پاکستان کی ریاست پنجاب، افغانیہ (صوبہ سرحد)، کشمیر، ایران، سندھ بشمول کچھ اور کاٹھیاواڑ، ٹھاکرستان، افغانستان اور بلوچستان پر مشتمل ہوگی۔'' وہ حیدرآباد دکن کی ریاست کو بھی ایک آزاد و خود مختار اسلامی ریاست بنانا چاہتا تھا حالانکہ اس ریاست کی 90 فیصد آبادی ہندوؤں پر مشتمل تھی۔''[13]

رام گوپال لکھتا ہے کہ چودھری رحمت علی اور بعض دوسرے مسلم طلبا نے ہندوستان کی تقسیم کی یہ تجویز ڈاکٹر اقبال کے 1930ء کے خطبہ الہ آباد سے متاثر ہو کر 1931ء میں پیش کی تھی۔ مگر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے مسلم مندوبین نے انتخابی سسٹم پر بحث کے دوران اس سکیم کو محض ''طلبا کی سکیم'' قرار دے کر مسترد کر دیا تھا۔ مگر یہ طلبا اپنی سکیم پر مصر رہے اور دو سال بعد جنوری 1933ء میں انہوں نے ایک پمفلٹ تقسیم کیا جس میں کہا گیا تھا کہ سر اقبال نے شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریت کے علاقوں کو آل انڈیا فیڈریشن کا ایک یونٹ بنانے کی تجویز پیش کی تھی لیکن ہماری تجویز یہ ہے کہ ان مسلم علاقوں کی ایک الگ فیڈریشن بنائی جائے۔ اگر ہم مسلمانوں کو ایسی فیڈریشن میں شامل کیا گیا جس میں ہندوؤں کا غلبہ ہوگا اور جس میں ہم اپنی تقدیر اور ارواح کے مالک اور کپتان نہیں ہوسکیں گے تو اس سرزمین میں کبھی امن و امان قائم نہیں ہوگا۔

یہ جذبات پاکستان میں رہنے والے تین کروڑ مسلمانوں کی جانب سے پیش کئے گئے ہیں اور پاکستان سے ہمارا مطلب پنجاب، کشمیر، سرحد، سندھ اور بلوچستان سے ہے۔[14] لیکن بعض عناصر، جن میں مشتاق احمد وجدی جیسے ناشکرے پاکستانی بھی شامل ہیں، یہ کہتے ہیں کہ ''1933ء میں چودھری رحمت علی نے انگلستان میں قیام پاکستان کا پروپیگنڈا شروع کیا۔ دروغ برگردنِ راوی، سنا ہے کہ یہ سرکار برطانیہ کے اشارے پر تھا۔ یہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے جداگانہ مفاد کے تحفظ کی ترکیب تھی لیکن مسلمانانِ ہند اس خوش فہمی میں رہے کہ یہ ان کی نجات کا ذریعہ ہے۔''[15] ایسے برخود غلط اور متعصب عناصر کو کسی دلیل سے قائل نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا مؤقف سراسر بے بنیاد ہے۔ انہیں کوئی نہیں سمجھا سکتا کہ اس زمانے میں برطانوی سامراج برصغیر کی تقسیم کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا چہ جائیکہ وہ چند مسلم طلبا سے اس کا پرچار کرواتا۔ ساری سرمایہ دار دنیا بدستور معاشی بحران میں مبتلا تھی اور پورے یورپ میں دوسری عالمی جنگ کی زبردست تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جنوری 1933ء میں ہی جرمنی میں ہٹلر کی زیر قیادت نازی حکومت برسراقتدار آ گئی تھی جبکہ ساری مغربی طاقتیں یہ تسلیم کر چکی تھیں کہ جرمنی سے مزید تاوان جنگ وصول نہیں کیا جائے گا۔ ایسے عالمی حالات میں برطانوی سامراج کے مفاد کا تقاضا یہ تھا کہ ہندوستان سیاسی اور فوجی لحاظ سے متحد رہے تاکہ وہ متوقع جنگ کے دوران برصغیر کے وسائل سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکے۔ اسی وجہ سے سرکار برطانیہ نے اچھوتوں کو جداگانہ نیابت دینے کے خلاف گاندھی کے مرن برت کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور پھر کمیونل ایوارڈ میں اس طرح ترمیم کی تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی کے لئے قابل قبول ہو۔

چودھری رحمت علی اور بعض دوسرے پنجابی طلبا نے لندن میں برصغیر کی تقسیم کی تحریک اس لئے شروع نہیں کی تھی کہ انہیں سرکار برطانیہ کا اشارہ ملا تھا بلکہ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ 1921ء میں تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد پورے برصغیر میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو فرقہ وارانہ خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہوا تھا اس سے وہ قدرتی طور پر متاثر ہوئے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ 1921ء کے بعد پنجاب میں مراعات یافتہ ہندو اقلیت نے پسماندہ و مقروض مسلم اکثریت کو تھوڑے بہت سیاسی، معاشرتی، تعلیمی اور معاشی حقوق دینے کی جس شدت سے مخالفت کی تھی اس سے پنجاب کے شہری تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کی مذہبی عصبیت میں بہت اضافہ ہو

گیا تھا اور علامہ اقبال اور دوسرے بہت سے مسلم دانشور اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ مسلمان اور ہندو کبھی بھی ایک گھاٹ پر پانی نہیں پی سکیں گے۔ خود جواہر لال نہرو بھی اس زمانے میں اس مؤقف کا حامل تھا کہ ہندو۔ مسلم تضاد انگریزوں کا پیدا کردہ نہیں ہے بلکہ اس کی بنیادی وجہ مسلمانوں کی معاشی پسماندگی میں مضمر ہے۔ اس نے اپنے مؤقف کا اظہار دسمبر 1932ء میں اپنی بیٹی اندرا کے نام کئی ایک خطوط میں کیا تھا۔ ہندو سرمایہ دار اور ساہوکار افلاس زدہ مسلم اقلیت کو کوئی سیاسی، معاشرتی اور معاشی رعایات دینے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ وہ سات کروڑ نفوس پر مشتمل اس اقلیت کو ''انڈین نیشنلزم'' کے نام پر ثابت ہی نگلنے کا عزم رکھتے تھے۔

چودھری رحمت علی کے پمفلٹ کی اشاعت کے تقریباً دو ماہ بعد یعنی مارچ 1933ء میں حکومت برطانیہ نے گول میز کانفرنس کی سفارشات پر مشتمل ایک قرطاس ابیض شائع کیا جس میں برصغیر کی تقسیم کا کوئی اشارہ نہیں تھا بلکہ اس میں ہندوستان کے لئے ایک ایسی مرکزی وفاقی حکومت کی تجویز پیش کی گئی تھی جس میں وائسرائے کو وسیع اختیارات دیئے گئے تھے۔ اس قرطاس ابیض پر غور کرنے کے لئے برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی ایک مشترکہ کمیٹی مقرر کی گئی جس کی امداد کے لئے ہندوستان سے بھی 20 نمائندے نامزد ہوئے۔ پنجاب کے ظفر اللہ خان کی نامزدگی ہوئی۔ اس مشترکہ کمیٹی کی کاروائی اپریل 1933ء سے نومبر 1934ء تک جاری رہی اور اس کی رپورٹ 22 نومبر کو پارلیمنٹ میں پیش کی گئی۔ دریں اثنا محمد علی جناح بعض مسلمان زعما کے اصرار پر 1934ء کے اوائل میں ہندوستان واپس آ گئے جبکہ پورے برصغیر میں مسلمانوں کا سیاسی شیرازہ بکھرا پڑا تھا۔ آل انڈیا مسلم لیگ دو دھڑوں میں منقسم تھی۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس عملی طور پر ختم ہو چکی تھی اور پنجاب میں اینٹی قادیانی تحریک کی سٹیج پر احراریوں اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان کانٹے دار سیاسی دنگل ہو رہا تھا۔ مارچ میں مسلم لیگ کے دونوں دھڑے متحد ہو گئے اور محمد علی جناح متحدہ مسلم لیگ کے مستقل صدر منتخب ہو گئے۔ مگر اس کا پنجاب کی سیاست پر کوئی اثر نہ پڑا یہاں چند ماہ بعد 1919ء کے ایکٹ کے تحت جب مرکزی اسمبلی کا انتخاب ہوا تو مجلس احرار کا ایک نومسلم امیدوار خالد لطیف گابا سر فضل حسین کے امیدوار حاجی رحیم بخش کے مقابلے میں کامیاب ہو گیا۔

وائسرائے کی ایگزیکٹوکونسل کی رکنیت پرظفراللہ اورفضل حسین کے خلاف علامہ اقبال اوراحرار کی مہم

تاہم جولائی 1934ء جب ظفراللہ خان ابھی لندن میں ہی تھا وزیر ہند نے اسے پیش کش کی کہ ''دوسال ہوئے تم نے سرفضل حسین کی جگہ کام کیا تھا۔آئندہ اپریل میں ان کی میعاد ختم ہونے والی ہے۔تم دوبارہ خدمت عامہ کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے تیار ہوگے۔'' اس پر ظفراللہ خان نے رضامندی ظاہر کی لیکن ساتھ یہ گزارش کی کہ ''میرا تعلق سلسلہ احمدیہ کے ساتھ ہے۔جس کے بعض عقائد کے ساتھ عام مسلمانوں کو اختلاف ہے۔جب 1932ء میں میں نے سرفضل حسین کی جگہ کام کیا تھا تو اس وقت بھی اس بنا پر مسلمانوں کے ایک طبقے کی طرف سے میرے تقرر پر اعتراض کیا گیا تھا۔اب بھی اعتراض ہوگا کہ جب وہ لوگ مجھے مسلمان ہی نہیں سمجھتے تو میرا تقرر مناسب نہیں آپ اس پر غور فرمالیں۔'' اس پر وزیر ہند کا جواب یہ تھا کہ ''تم نے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے سلسلے میں جو خدمت سرانجام دی ہے اس کے بعد کوئی بہت ہی کوتاہ اندیش مسلمان ہوگا جو تمہارے تقرر پر معترض ہوگا۔''[16]

اس کے دوایک ہفتے بعد وائسرائے لارڈ ولنگڈن نے بھی لندن میں ظفراللہ کو یہی پیش کش کی تھی جبکہ ہندوستان میں سرفضل حسین کے جانشین کے انتخاب کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہوگئی تھیں اور کچھ آوازیں اس کے تقرر کے خلاف اٹھنے لگی تھیں جنہوں نے بہت جلد ایک شور کی صورت اختیار کرلی۔پنجاب میں یہ شور احراریوں کی جانب سے بپا کیا گیا تھا اور انہوں نے اس مقصد کے لئے قادیان میں ایک تبلیغی کانفرنس بھی کی تھی۔ان کے اس شور میں ایک آواز ڈاکٹر سرمحمد اقبال کی بھی تھی جنہوں نے ایک طویل مضمون میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ''قادیانی فرقہ دائرہ اسلام سے باہر ہے۔یہ مسلمانوں کے بنیادی عقائد سے منکر ہے لہٰذا اسے غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔'' 3راکتوبر 1934ء کولندن میں وزیر ہند نے ظفراللہ خان کو بتایا کہ ''مجھے بہت سے تار اور مراسلات ہندوستان سے تمہارے تقرر کی مخالفت میں موصول ہوئے ہیں۔میں نے کروفٹ اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو کہہ دیا ہے کہ ان سب کوردی کی ٹوکری میں پھینکتے جاؤ۔تم سچ کہتے تھے۔بعض عناصر تمارے تقرر کے بہت ہی مخالف ہیں۔یہ کیسے لوگ ہیں جو اپنا مفاد بھی نہیں پہچانتے''

اور پھر وزیر ہند نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری کو بلوا کر کہا ''وائسرائے کو اطلاع کر دو ظفر اللہ رضا مند ہے کہ آئندہ ہفتے میں تقرر کا اعلان کر دیا جائے۔''[17] چنانچہ یہ اعلان ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی احراریوں کے شور میں بھی بے پناہ اضافہ ہو گیا۔

جب اپریل 1935ء میں سر فضل حسین وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے سبکدوش ہو کر واپس لاہور آیا تو صوبہ میں اس کا سیاسی وقار خاصا بلند تھا کیونکہ عام تاثر یہ تھا کہ ''اس نے مسلمانوں کو جداگانہ ''انتخاب اور ویٹیج لے دیا ہے۔ اس نے پنجاب میں مسلم اکثریت قائم کر دی ہے۔ اس نے سندھ کو جداگانہ صوبہ بنا دیا ہے۔ اس نے صوبہ سرحد میں اصلاحات رائج کرا دی ہیں اور اس نے 4رجولائی 1934ء کو امپیریل سروس میں مسلمانوں کا 25 فیصد تناسب بھی مقرر کرا دیا ہے۔'' تاہم مجلس احرار کا اپنی تبلیغی کانفرنسوں میں پروپیگنڈا یہ تھا کہ ''پنجاب میں سر فضل حسین کی وجہ سے قادیانی فرقہ کو ہر شعبۂ زندگی میں مراعات حاصل ہوئی ہیں۔ سر ظفر اللہ خان اسی کی سفارش پر وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن مقرر ہوا ہے۔ دیہاتی اور شہری کا سوال اسی نے پیدا کیا ہے اور دقیانوسی جاگیرداروں کو اسی نے سیاسی بالادستی دلوائی ہے۔'' سر فضل حسین کی سیاسی زندگی کی تصویر کے ان دونوں ہی پہلوؤں میں بہت حد تک صداقت تھی۔ لیکن علامہ اقبال کو احراریوں کے مؤقف سے اتفاق تھا۔ چنانچہ انہوں نے انہی دنوں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''یہ کس قدر افسوس ناک امر ہے کہ پنجاب میں شہری دیہاتی کا جو جھگڑا چل رہا ہے اسے سر فضل حسین کی امداد حاصل ہے۔ فضل حسین کو ابتدا میں منصب اس لئے حاصل نہیں ہوا تھا کہ وہ دیہاتی تھے بلکہ اس لئے کہ وہ صوبہ کے مسلمانوں کے لیڈر تھے۔ لیکن انہوں نے قیادت حاصل کرنے کے بعد جان بوجھ کر شہری دیہاتی جھگڑے کو تیز کرنا شروع کر دیا تا کہ اس طرح ان کا منصب بحال رہے۔ اس جھگڑے سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے بعض ایسے ناکارہ اور تیسرے درجے کے آدمیوں کو اپنا رفیق منتخب کیا جو حکومت کے قطعاً اہل نہ تھے اور جن میں اتنی صلاحیت بھی نہ تھی کہ وہ اس اقتدار و وقار کو برقرار رکھ سکیں جو وزارت کا لازمہ ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ تیسرے درجے کے لوگ، جو اپنے موجودہ عروج کے لئے فضل حسین کے ممنون ہیں، خود ادنےٰ حقیقت کے مالک ہونے کے باعث فضل حسین کو گویا کہ ایک فوق البشر سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ حکومت کے بعض کارندوں نے بھی اس پالیسی کی حمایت کی کیونکہ اس طرح وہ

1919ء کی اصلاحات کا زور توڑنے میں کامیاب ہو سکتے تھے۔ان تمام اسباب ومحرکات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان میں ''صحیح لیڈر شپ'' مفقود ہو چکی ہے۔ اور سیاسی میدان چند حد درجہ نالائق مقدر آزماؤں کے قبضے میں چلا گیا ہے۔''[18]

علامہ اقبال کے 1921ء سے لے کر 1931ء تک کے سیاسی مسلک اور اپریل 1935ء میں ان کی اس تقریر میں ویسا ہی تناقض تھا جیسا کہ احمدیت کے بارے میں اُن کی 1911ء کی تقریر اور اُن کے 1933ء کے رویے میں تھا۔ بقول عاشق بٹالوی، اقبال اور فضل حسین پرانے دوست تھے۔ دونوں کالج میں ہم جماعت وہم سبق رہ چکے تھے۔ اقبال نے بانگِ درا کی ایک بے مثال نظم ''فلسفہ غم'' فضل حسین ہی کی خاطر لکھی تھی۔ اقبال فضل حسین کی قائم کی ہوئی مسلم کانفرنس کے بڑے سرگرم رکن تھے اور آگے چل کر اس کے صدر بھی بن گئے تھے۔ اقبال کو فضل حسین نے ستمبر 1931ء میں دوسری گول میز کانفرنس کا ڈیلی گیٹ بنا کر انگلستان بھیجا تھا'' مزید برآں جب فضل حسین نے 1924ء کے اوائل میں جاگیرداروں کی غیر فرقہ وارانہ یونینسٹ پارٹی قائم کر کے دیہاتی شہری کا جھگڑا کھڑا کیا تھا اس وقت اقبال نے کوئی اعتراض نہیں کیا تھا بلکہ وہ 1927ء سے لے کر 1930ء تک پنجاب کونسل میں اسی یونینسٹ پارٹی کے رکن رہے تھے اور اس دوران میں انہوں نے اپنی کسی تقریر میں دیہاتی شہری جھگڑے کی مذمت نہیں کی تھی۔

1933ء میں علامہ کی جانب سے قادیانیوں کی اعلانیہ مخالفت کی ممکنہ وجوہ کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔اب 1935ء میں اُن کی اپنے دیرینہ دوست فضل حسین کی مخالفت کی بظاہر ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان کو فی الحقیقت فضل حسین کی احمدیت نوازی پر غصہ تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس نے جماعت احمدیہ کے نفس ناطقہ ظفر اللہ خان کو اپنا دست راست بنایا ہوا تھا۔ 1932ء میں ظفر اللہ خان کی وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں عارضی تقرری فضل حسین کی سفارش پر ہوئی تھی حالانکہ عام خیال یہ تھا کہ یہ اسامی سر اقبال کو ملے گی اور روزنامہ ٹریبیون نے تو اس سلسلے میں اقبال کا نام شائع بھی کر دیا تھا لیکن چند دن بعد جب ظفر اللہ کی تقرری کا اعلان ہوا تھا اسی اخبار کے نامہ نگار درگا داس کی رائے یہ تھی کہ یہ عہدہ جلیلہ لاہور کے ایک تیسرے درجے کے وکیل کو دیدیا گیا ہے۔ پھر جب 1934ء میں فضل حسین کی جگہ ظفر اللہ خان کے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں مستقل تقرر کی اطلاعات پر چہ میگوئیاں ہوئیں تو علامہ نے فرقہ قادیانی کے خلاف اپنا پہلا طویل اور مدلل

مضمون لکھا تھا۔ ان دنوں احراریوں کی اینٹی قادیانی تحریک زور شور سے جاری تھی۔ ان کا الزام یہ تھا کہ یہ سب کچھ فضل حسین نے کروایا ہے۔ اس پس منظر میں جب فضل حسین اپریل 1935ء میں ایگزیکٹو کونسل سے سبکدوش ہو کر واپس لاہور آیا تو علامہ اقبال اس کے سیاسی حریف بن چکے تھے۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ جب 1930ء میں فضل حسین وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن مقرر ہوا تھا تو پنجاب میں فیروز خان نون کو اس کی سفارش پر وزیر بلدیات مقرر کیا گیا تھا حالانکہ وہ نوعمر تھا اور اس کا کوئی سیاسی تجربہ نہیں تھا۔ اب اپریل 1935ء میں یہ اطلاع گشت کر رہی تھی کہ جب مئی میں ظفر اللہ خان ایگزیکٹو کونسل کا عہدہ سنبھالے گا تو اس کے فوراً بعد فیروز خان نون کو لندن میں ہندوستان کا ہائی کمشنر مقرر کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ ان تیسرے درجے کے لوگوں کا عروج علامہ اقبال کو کیسے پسند آ سکتا تھا۔ چوتھی وجہ یہ تھی کہ 1935ء میں پنجابی مسلمانوں کے ترقی پذیر شہری درمیانہ طبقہ کے رجعت پسند مسلم جاگیردار طبقہ سے قدرتی تضاد میں شدت پیدا ہو گئی تھی۔ علامہ اقبال خود شہری درمیانہ طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور اُن کی شاعری اسی طبقہ کے جذبات وتمناؤں کی ترجمانی کرتی تھی اس لئے ان کی سیاسی ہمدردی بھی قدرتی طور پر اپنے طبقہ کے ساتھ تھی۔ وہ آئندہ انتخابات میں فضل حسین کی زیر قیادت دقیانوسی جاگیرداروں کی بالادستی کے حق میں نہیں ہو سکتے تھے۔ سیاسی مبصرین کی رائے یہ تھی کہ انتخابات کے دوران کم از کم صوبہ کے شہروں میں مجلس احرار کا بول بالا ہو گا۔ کیونکہ اس جماعت کے زعما اور کارکن بہت فعال وسرگرم تھے اور انہوں نے گزشتہ دو تین برسوں میں اینٹی قادیانی تحریک کے ذریعے شہروں اور قصبوں کی مسلم رائے عامہ کی بھاری اکثریت کو اپنے زیر اثر کر لیا تھا۔

مسجد شہید گنج کا قضیہ اور مجلس احرار کی سیاسی موقع پرستی

جب جولائی 1935ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستان کے لئے نئے آئین کی قطعی منظوری دی تو لاہور میں یکا یک ایک ایسا واقعہ ہوا جس نے چند ہی دنوں میں مجلس احرار کا سیاسی جنازہ نکال دیا۔ یہ واقعہ مسجد شہید گنج کے ہنگامے کی بہی صورت میں پیش آیا تھا۔

سید نور احمد کے بیان کے مطابق اس ہنگامہ کا پس منظر یہ تھا کہ لاہور میں سٹیشن کے نزدیک لنڈا بازار میں ''شہید گنج کے گوردوارے کے ساتھ ایک ہی احاطے میں ایک عمارت تھی جو

گوردوارے کی تعمیر سے پہلے کسی زمانے میں مسجد تھی۔ پھر سکھوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں اس مسجد پر قبضہ کرلیا۔ رنجیت سنگھ کے عہد میں صورت یہ تھی کہ مسجد کی عمارت کے قریب ایک گوردوارہ تھا جس کا گرنتھی مسجد کی عمارت کو رہائش گاہ کے طور پر استعمال کرتا تھا اور ملحقہ دکانوں کا کرایہ وصول کرتا تھا۔ اسی احاطے میں ایک اصطبل بھی تھا جہاں سکھ زائرین گھوڑے باندھتے تھے۔ جب 1848ء میں انگریزوں کی حکومت آئی تو ان عمارتوں کی یہی صورت رہی۔ گوردوارے کے سیوادار کی اولاد مسجد کی عمارت اور ملحقہ جائیدادوں پر قابض رہی اور انہیں اپنی ذاتی ملکیت کے طور پر استعمال کرتی رہی۔ مسجد کی عمارت جو سو سال سے بھی زیادہ پرانی تھی بالکل بوسیدہ حالت میں تھی۔ سکھ مالکوں نے اسے مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کرنے کی پیش کش بھی کی لیکن اس کا کوئی خریدار نہ تھا۔

''پھر انگریزوں کی عملداری قائم ہونے کے پچاس ساٹھ سال کے بعد ایک شخص نے اپنے آپ کو مسجد کا متولی ظاہر کرکے اسے سکھوں کی ملکیت سے واگزار کرنے کے لئے دیوانی دعویٰ کیا۔ جو ایک صدی کے قبضہ کی بنا پر خارج ہوگیا۔ 1925ء میں گوردوارہ ایکٹ بنا جس کے تحت سکھوں کے گوردوارے اور ان کے ساتھ وقف جائیدادیں مہنتوں کے قبضہ سے نکل کر سکھوں کی گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے سپرد کرنے کے لئے ضابطہ مقرر کیا گیا۔ اس ایکٹ کے تحت جو ٹریبونل قائم ہوا اس کے روبرو مسجد شہید گنج پر قابض سکھوں نے اس عمارت اور ملحقہ دکانوں وغیرہ کو اپنی ذاتی ملکیت ظاہر کرکے عذرداری کی۔ جب یہ مقدمہ چل رہا تھا تو انجمن اسلامیہ پنجاب کے سیکرٹری سید محسن شاہ نے بھی ایک درخواست دے دی کہ مسجد کی عمارت گوردوارہ کی ملکیت بھی نہیں اور سکھ قابضین کی ذاتی جائیداد بھی نہیں بلکہ مسجد ہے اسے انجمن کے حوالے کیا جائے۔ ٹریبونل نے تمام عمارتوں کو گوردوارہ کی ملکیت قرار دیا۔ سکھ قابضین نے اس کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل کی۔ انجمن اسلامیہ نے کوئی اپیل نہ کی۔

''ہائی کورٹ کے ڈویژن بنچ نے اپیل نامنظور کردی۔ یہ فیصلہ دسمبر 1934ء میں ہوا اور ضابطے کی کارروائیوں کی تکمیل کے بعد ان عمارتوں کا قبضہ گوردوارہ پربندھک کمیٹی کی مقامی شاخ کے حوالے مارچ 1935ء میں کردیا گیا۔

''اس کے بعد پربندھک کمیٹی نے احاطے کی درستی اور عمارتوں کی شکست و ریخت کا کام شروع کیا۔ ابھی معمار و مزدور مسجد کی عمارت تک نہ پہنچے تھے کہ مسلمانوں کی طرف سے بعض

لوگ احتجاج کرنے لگے اور کئی ٹولیاں وقتاً فوقتاً اس عمارت کے قریب کچھ احتجاج کی خاطر اور کچھ محض تماشائیوں کے طور پر جمع ہونے لگیں۔ اس وقت ایک عجیب واقعہ ہوا۔ احاطے کے اندر کسی بوسیدہ دیوار کو گراتے ہوئے ایک سکھ معمار میلا سنگھ ملبے کے نیچے دب گیا اور ہلاک ہو گیا۔ یہ خبر اخباروں میں چھپی اور اس کی بنا پر یہ افواہ پھیل گئی کہ اس معمار نے مسجد کو گرانے کا ارادہ کیا تھا۔ جس کی سزا اسے ملی۔ اگلے دن مسلمان کافی تعداد میں جمع ہو گئے۔ باہر مسلمان تھے اور احاطے کے اندر سکھ۔ اس صورت حال کے پیش نظر لاہور کا ڈپٹی کمشنر ایس۔ پرتاب (جو سکھ سے عیسائی ہو گیا تھا) اور سٹی مجسٹریٹ (یہ بھی سکھ تھا) خطرے کے پیش نظر موقع پر پہنچے۔ انہوں نے سکھوں کو حکم دیا کہ وہ دوسری عمارتوں پر کام کرتے رہیں۔ مسجد کی عمارت کو ابھی ہاتھ نہ لگائیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو سمجھا بجھا کر منتشر کر دیا اور احاطے کے اردگرد پولیس کا پہرہ لگا دیا۔ یہ حکم سکھوں کو 28رجون 1935ءکو دیا گیا۔

''ڈپٹی کمشنر کے اس حکم کے چند دن بعد گوردوارہ پربندھک کمیٹی نے مسلمانوں کے مظاہرے کے خطرے کے پیش نظر جوابی مظاہرے کے لئے باہر سے مسلح جتھے منگوانے شروع کر دیئے...... حکومت نے ان سکھ جتھوں کی آمد پر کوئی پابندی نہ لگائی جس کی وجہ سے شہر کی فضا بہت کشیدہ ہو گئی۔ سکھ جتھے روزانہ جلوس کی صورت میں نعرے لگاتے ہوئے آتے تھے اور شہر کی کشیدگی میں اضافہ کرتے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کی جانب سے جلسوں اور جلوسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب مسلمانوں کے جلوس شہید گنج کا رخ کرتے تھے تو پولیس انہیں روکتی تھی اور بعض اوقات لاٹھی چارج بھی کرتی تھی جبکہ تلواروں، کلہاڑیوں اور نیزوں سے مسلح سکھ جتھوں کو شہر میں جلوس نکالنے اور اشتعال انگیز نعرے لگانے کی کھلی چھٹی تھی۔ گورنر ایمرسن شملہ میں تھا۔ اسے یہ رپورٹیں ملیں تو 6رجولائی کو وہ بھی لاہور پہنچ گیا۔ مسلمانوں کا ایک وفد اسے ملا۔ وفد کا مؤقف یہ تھا کہ عدالت کے فیصلوں سے انکار کوئی نہیں کرتا لیکن ان سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ سکھ اپنے مالکانہ حقوق کا استعمال مسلم عوام کے جذبات سے بے نیاز ہو کر کریں اور فساد کو دعوت دیں۔ حکومت اس عمارت کو پبلک مفاد میں معاوضہ ادا کر کے حاصل کر سکتی ہے اور محکمہ آثار قدیمہ کے سپرد کر سکتی ہے یا کوئی اور راستہ فساد کے خطرے کو روکنے کے لئے اختیار کر سکتی ہے۔ گورنر نے غور کرنے کا وعدہ کیا لیکن 8رجولائی کو آدھی رات کے وقت سکھوں نے مسجد کی عمارت کو گرا کر ملبے کا

ڈھیر کر دیا۔ اس پر مسلمانوں میں یہ تاثر پیدا ہو گیا کہ گورنر نے سکھوں کو ایسا کرنے کا اشارہ کیا تھا اور حکومت نے اس مقصد کے لئے انہیں سرکاری کرین مہیا کیا تھا۔ 9ر جولائی کو جب یہ خبر عام ہوئی تو مسلمانوں کے اندر غم وغصہ کا ہیجان پیدا ہوا۔ اس پر گورنر نے گورا فوج کی دو پلٹنیں منگوا کر شہید گنج کے آس پاس متعین کر دیں اور آنے والی رات کو کرفیو اور اخباروں پر سنسر لگا دیا لیکن باہر سے مسلح سکھ جتھوں کی آمد پر پھر بھی کوئی پابندی عائد نہ کی گئی۔ تاہم تین چار دن امن وسکون سے گزر گئے۔ 13ر جولائی کو حکومت نے مسلمانوں کے غصے کو فرو کرنے کے لئے یہ اعلان کر دیا کہ شاہ چراغ کی عمارت انجمن اسلامیہ کے حوالہ کر دی جائے گی۔ یہ بھی کسی زمانے میں مسجد اور اس کی ملحقہ جائیداد تھی جو حکومت کے قبضے میں چلی آ رہی تھی۔

''14ر جولائی کو موچی دروازے کے باہر مسلمانوں کا جلسہ ہوا جس میں مولانا ظفر علی خان نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''احرار لیڈروں کو اس جلسہ میں لانے کی بہت کوشش کی گئی لیکن انہوں نے یہاں آنے سے انکار کر دیا...... مسلمان مسجد شہید گنج کی جگہ ضرور لے کر رہیں گے اور اس کے لئے دس ہزار والنٹیئر بھرتی کر کے سول نافرمانی کریں گے۔'' اسی رات کو مولانا ظفر علی خان، سید حبیب، ملک لال خان اور میاں فیروز الدین کو گرفتار کر کے لاہور سے باہر بھیج دیا گیا۔ اگلے دن پبلک جلسوں پر پابندی لگا دی گئی اور اخباروں پر سنسر کی میعاد بڑھا دی گئی۔ تاہم 15 اور 16ر جولائی کو مسلمانوں کے ہجوم اکٹھے ہوئے لیکن انہیں لاٹھی چارج کر کے منتشر کر دیا گیا...... 19ر جولائی کو (یہ جمعہ کا دن تھا) مسلمانوں کا بہت بڑا ہجوم بادشاہی مسجد میں جمع ہو گیا۔ یہاں مولانا ظفر علی خان کے بیٹے اختر علی خان نے بڑی اشتعال انگیز تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''کعبہ کی بیٹی کے بے حرمتی سکھوں کی کدالوں سے ہوئی ہے۔ اب اس کی ناموس مسلمانوں کو پکار پکار کر بلا رہی ہے۔'' اس تقریر کے بعد مسلمانوں کا ایک ہجوم سرفروشی کے جذبات لئے شہید گنج کی جانب چل پڑا۔ دہلی دروازے کے باہر پولیس اور فوج نے اس ہجوم کو روکا لیکن یہ ہجوم منتشر نہ ہوا اور ساری رات وہیں بیٹھا رہا۔ وہیں اس نے نمازیں ادا کیں جبکہ شہر میں وسیع پیمانے پر کرفیو کی خلاف ورزی ہوتی رہی۔ اگلے دن اس مجمع پر لاٹھی چارج ہوا اور گولی چلائی گئی مگر وہ اپنی جگہ پر دو دن اور دو راتیں ڈٹا رہا۔ بالآخر اتوار 21ر جولائی کو اصل مجمع کئی ''ڈپلومیٹک'' کوششوں کے بعد منتشر ہوا...... دو چار دن کے بعد مسلمانوں کا اجتماع پھر مسجد وزیر خان میں ہوا۔ یہاں تحریک شہید گنج کو

زندہ رکھنے کی صورت یہ نکالی گئی کہ پانچ پانچ آدمیوں کا جتھہ ہر روز اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دے۔ یہ تحریک چند دن چلی پھر کمزور پڑ گئی۔ ستمبر میں پیر سید جماعت علی شاہ نے اس تحریک کو اپنے ہاتھ میں لیا اور حکومت اور تحریک کے درمیان مصالحت کی کوشش کی جو کسی حد تک کامیاب بھی ہوئی۔ لیکن یہ تحریک کمزور شکل میں پھر بھی چلتی رہی تا آنکہ فروری 1936ء میں مسٹر جناح نے لاہور آ کر اسے قطعی طور پر ختم کر دیا۔ اس دوران ڈاکٹر عالم نے ایک نیا دیوانی دعویٰ بھی دائر کیا جو کچھ دنوں لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا رہا اور بالآخر خارج ہو گیا۔"[19]

جناح کی کوشش سے فروری 1936ء میں اس تحریک کے سلسلے میں گرفتار شدہ زعما مولانا ظفر علی خان وغیرہ رہا ہوئے اور انہوں نے مل کر مجلس اتحاد ملت کی بنیاد رکھی جس کا سب سے بڑا مقصد یہ تھا کہ مسجد شہید گنج کو سکھوں سے واپس لیا جائے۔ اس واقعہ کی بعد پنجاب میں احرار اور اتحاد ملت دو حریف جماعتیں بن گئیں جن کے درمیان عرصہ دراز تک مخالفت کی آگ بھڑکتی رہی۔

چھ سات ماہ کی اس تحریک سے شہید گنج کی مسجد تو واگزار نہ ہوئی البتہ مجلس احرار سیاسی لحاظ سے اس مسجد کے ملبے کے نیچے ہمیشہ کے لئے دفن ہو گئی۔ اس مجلس نے اپنی گزشتہ پانچ سالہ زندگی میں پہلے تحریک کشمیر کے ذریعے اور پھر اینٹی قادیانی تحریک کے ذریعے پنجاب کے شہروں کی مسلم رائے عامہ پر غلبہ حاصل کر لیا تھا اور سیاسی مبصرین کی رائے یہ تھی کہ جماعت آئندہ انتخابات میں ایک بڑی سیاسی قوت کے حیثیت سے ابھرے گی۔ مگر مولانا ظفر علی خان نے 14 رجولائی 1935ء کو موچی دروازے کے باہر مسلمانوں کے ایک جلسہ عام میں جب یہ بتایا کہ ''احرار لیڈروں کو اس جلسہ میں لانے کی بہت کوشش کی لیکن انہوں نے یہاں آنے سے انکار کر دیا'' تو اس جلسہ ہی میں مجلس احرار کا سیاسی جنازہ نکل گیا کیونکہ ہزاروں مشتعل حاضرین میں یہ تاثر پیدا ہو گیا کہ احراریوں نے مسجد شہید گنج کے حادثہ خونین کے موقع پر مسلمانوں سے غداری کی ہے۔ مجلس احرار کی جانب سے اس مذہبی تحریک سے پہلو تہی کی وجہ اس کے لیڈروں کے اس مؤقف میں مضمر تھی کہ یہ تحریک دراصل قادیانیوں اور سر فضل حسین نے چلوائی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ مجلس احرار اس میں ملوث ہو اور اس کے سارے لیڈر نظر بند ہو جائیں تا کہ انتخابی میدان میں ان کا کوئی سیاسی حریف نہ رہے۔ احراریوں کا یہ مؤقف سراسر بے بنیاد نہیں تھا۔ اگر شہید گنج کے حادثہ کے بارے میں یونینسٹ پارٹی کے نفس ناطقہ سید نور احمد کے متذکرہ بیان کو ذرا غور سے پڑھا

جائے تو اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ اس تحریک میں قادیانیوں اور سر فضل حسین کا تھوڑا بہت ہاتھ ضرور تھا۔ سر فضل حسین نہایت زیرک شخص تھا۔ اس کی سیاسی مہارت اور شاطرانہ صلاحیت مسلمہ تھی۔ وہ جتنی دیر وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن رہا تھا پنجاب میں مجلس احرار قادیانیوں کے حوالے سے اسے ہدف تنقید بناتی رہی تھی اور اس وجہ سے صوبہ میں وہ ایک زبردست سیاسی قوت کے طور پر نمایاں ہو رہی تھی لہٰذا سر فضل حسین کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ اس جماعت کی سیاسی قوت کو توڑنے کی کوئی تدبیر سوچے۔

شہید گنج کے واقعہ میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ 1934ء میں ٹریبونل کے روبرو سید محسن شاہ نے درخواست پیش کر کے سب سے پہلے مسلمانوں کی توجہ مسجد شہید گنج کی واگزاری کے مسئلہ کی طرف مبذول کرائی تھی۔ انجمن اسلامیہ کا سید محسن شاہ ایڈووکیٹ جماعت احمدیہ کے سربراہ مرزا بشیر الدین کی کشمیر کمیٹی کا رکن رہا تھا اور وہ سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی میں بھی شامل تھا۔ لیکن جب ٹریبونل نے فیصلہ گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے حق میں دیا تو انجمن اسلامیہ کی طرف سے ہائی کورٹ میں کوئی اپیل نہیں کی گئی تھی۔

گورنر ایمرسن نے اس تحریک کو ابتدا ہی میں ختم کرنے کے لئے کوئی مؤثر کارروائی غالباً اس خیال سے نہیں کی تھی کہ مجلس احرار اس میں ضرور ملوث ہو گی اور اسے اس کے خلاف تعزیری اقدام کرنے کا موقع مل جائے گا۔ اس طرح نہ صرف سر فضل حسین بلکہ فرقہ احمدیہ کا سربراہ مرزا بشیر الدین بھی خوش ہو جائے گا۔ جو کہ گورنر سے اس لئے ناراض تھا کہ اس نے 1934ء میں احراریوں کو قادیان میں تبلیغی کانفرنس منعقد کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ ان دنوں ظفر اللہ خان وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن تھا اور وہ اس حیثیت سے نہ صرف وائسرائے بلکہ وزیر ہند کا بھی منظور نظر تھا۔ وہ اس قدر بااثر تھا کہ اس نے 1934ء کے اواخر میں گورنر ایمرسن سے ملاقات کر کے حکومت پنجاب سے یہ سرکاری بیان شائع کروایا تھا کہ صوبائی حکومت نے احراریوں کو قادیان میں تبلیغی کانفرنس کی اجازت دے کر غلطی کی تھی۔

سید نور احمد لکھتا ہے کہ 21رجولائی کو دہلی دروازے کے باہر مسلمانوں کا مجمع کئی ''ڈپلومیٹک کوششوں'' کے بعد منتشر ہوا۔ لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ یہ ''ڈپلومیٹک کوششیں'' کس نے کی تھیں؟ غالباً یہ قیاس بالکل بے بنیاد نہیں ہو گا کہ یہ ''ڈپلومیٹک کوششیں'' سر فضل حسین اینڈ

کمپنی نے کی تھیں۔ کیونکہ یہ تحریک کنٹرول سے باہر ہو رہی تھی اور خطرہ تھا کہ یہ پورے صوبے میں پھیل جائے گی۔ جہاں تک مولانا ظفر علی خان وغیرہ کے اس تحریک میں ملوث ہونے کا تعلق ہے شاید یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ انہوں نے اس موقع پر احراریوں کی بے عملی سے فائدہ اٹھا کر اپنی سیاسی دکان چمکانے کی کوشش کی تھی اور اس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔ یہ بات بھی بعید از مکان نہیں کہ سر فضل حسین نے کسی نہ کسی طرح مولانا ظفر علی خان اور اس کے ساتھیوں کو ہلاشیری دی ہو۔

مسجد شہید گنج کے اس حادثہ خونین کے پس منظر میں حقیقت خواہ کچھ ہی ہو مجلس احرار اس میں سیاسی لحاظ سے اس قدر لہولہان ہوئی کہ پھر کبھی اپنے پاؤں پر کھڑی نہ ہو سکی۔ احراریوں نے پنجاب میں اینٹی قادیانی تحریک کے ذریعے مذہبی سیاست کے اژدہا کی پرورش کی تھی۔ انہیں امید تھی کہ یہ اژدھا صوبہ میں یونینسٹ پارٹی، مسلم لیگ، اور اس کے دوسرے سارے مسلم سیاسی حریفوں کو کھا جائے گا مگر 1935ء میں وہ خود اسی اژدھا کا لقمہ بن گئے۔ اس کی وجہ صرف یہی نہیں تھی کہ سر فضل حسین اور قادیانی جماعت نے ان کے خلاف سازش کی تھی بلکہ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ احرار لیڈروں نے اپنی تبلیغی کانفرنسوں کے دوران کبھی افلاس زدہ مسلمانوں کے لئے کوئی سیاسی، معاشرتی اور معاشی پروگرام پیش نہیں کیا تھا۔ یہ کوتاہ اندیش احراری لیڈر محض کھوکھلے مذہبی نعروں کے ذریعے اپنے سیاسی مقاصد پورا کرنا چاہتے تھے۔ ان کی مذہبی سیاست نے پنجاب کے شہری مسلمانوں کو سیاسی طور پر سخت نقصان پہنچایا تھا۔ انہوں نے 1930ء سے قبل تحفظ خلافت کے نام پر پنجابی مسلمانوں کو گمراہ کیا اور پھر 1930ء کے بعد انہیں تحفظ نبوت کے مسئلہ میں الجھائے رکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پنجابی مسلمانوں کا شہری تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ سیاسی، معاشرتی اور معاشی طور پر پسماندہ رہا اور 1937ء کے انتخابات میں دقیانوسی اور سامراج نواز جاگیرداروں نے بآسانی بالادستی حاصل کر لی۔

تحریک شہید گنج کے معاشی محرکات

تحریک شہید گنج میں لاہور کے مسلمانوں کی سرفروشی کی بڑی گہری معاشی بنیاد تھی۔ 1935ء میں سر فضل حسین کی جانب سے شائع کردہ ایک انگریزی پمفلٹ کے مطابق صوبہ کے

سرکاری محکموں کی تمام چھوٹی بڑی اسامیوں پر ہندوؤں اور سکھوں کے مقابلے میں مسلمانوں کا تناسب بہت کم تھا حالانکہ ان کی آبادی تقریباً 56 فیصد تھی۔ پنجاب سول سروس (ایگزیکٹو برانچ) میں مسلمانوں کا تناسب 40 فیصد اور جوڈیشل برانچ میں 34 فیصد تھا۔ پولیس انسپکٹر کی اسامیوں میں مسلمان 38 فیصد تھے البتہ سب انسپکٹری میں انہیں اپنی آبادی کے تناسب سے ملازمتیں حاصل تھیں اور اسسٹنٹ سب انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹیبل کے درجے میں انہیں آبادی کے تناسب سے زیادہ حصہ ملا ہوا تھا۔ پی۔ڈبلیو۔ڈی (محکمہ انہار) کی پراونشل انجینئرنگ سروس میں ہندوؤں اور سکھوں کا تناسب 66 فیصد تھا اور اس کے مقابلے میں مسلمان صرف 18 فیصد تھے۔ سب انجینئرنگ کے درجے میں مسلمان 12 فیصد اور ہندو 87 فیصد تھے۔ سبارڈینیٹ انجینئرنگ سروس میں مسلمان 30 فیصد اور ہندو اور سکھ 70 فیصد تھے۔ کلرک اور ہیڈ کلرک کی اسامیوں پر مسلمانوں کا تناسب 36 فیصد اور ہندوؤں اور سکھوں کا حصہ 66 فیصد تھا۔ پٹواریوں میں مسلمان صرف 38 فیصد تھے حالانکہ یہ محکمہ گزشتہ دس سال سے پہلے سر فضل حسین، پھر سر سکندر حیات اور پھر نواب مظفر خان کے تحت چلا آ رہا تھا۔ محکمہ جنگلات کی پراونشل سروس میں ایکسٹرا اسسٹنٹ کنزرویٹو کے عہدہ پر مسلمانوں کا تناسب 17 فیصد تھا اور ہندوؤں اور سکھوں کا تناسب 83 فیصد تھا۔ محکمہ مال کے پٹواریوں میں البتہ مسلمان 50 فیصد کے قریب تھے۔ محکمہ قانون میں مسلمانوں کی نیابت ایک تہائی سے زیادہ نہ تھی۔ جیل کے محکمہ کی اعلیٰ اسامیوں پر مسلمانوں کی تعداد بے حد قلیل تھی۔ ہائی کورٹ کے کلرکوں میں مسلمانوں کا حصہ 37 فیصد کے قریب تھا اور پنجاب کے سول سیکرٹریٹ میں، جو تمام صوبے کے نظم و نسق کا مرکزی ادارہ سمجھا جاتا تھا، مسلمان کلرکوں کی تعداد صرف 37 فیصد تھی۔ فنانشل کمشنر کے دفتر میں مسلمان صرف 37 فیصد تھے۔ زراعت کے محکمے کی پراونشل سروس کے درجہ اول میں ایک مسلمان بھی نہیں تھا اور ایگریکلچرل اسسٹنٹ کے عہدے پر مسلمانوں کا تناسب صرف 33 فیصد تھا۔ وٹرنری میں ان کا تناسب 40 فیصد کے قریب تھا۔ پی۔ڈبلیو۔ڈی کی پراونشل سروس میں مسلمان 11 فیصد تھے اور سپیشل گریڈ میں ان کا حصہ صرف 7 فیصد تھا۔ سب انجینئر کی اسامی پر ان کا تناسب 11 فیصد کے قریب تھا اور کلرکوں میں وہ صرف 36 فیصد تھے۔ محکمہ تعلیمات کے سپیشل گریڈ میں مسلمان 11 فیصد تھے۔ پراونشل گریڈ کے درجہ دوئم کی ایک سو گیارہ اسامیوں میں سے مسلمانوں کے پاس صرف 36 فیصد حصہ تھا اور 57 فیصد

ہندوؤں اور سکھوں کے قبضہ میں۔ سبارڈینیٹ سروس کی 988 اسامیوں میں سے مسلمانوں کے پاس 39 فیصد اور ہندوؤں اور سکھوں کے پاس 61 فیصد حصہ تھا۔ محکمہ صحت میں سول سرجن کی اسامیوں میں مسلمانوں کا تناسب 22 فیصد، اسسٹنٹ سرجن میں 37 فیصد اور سب اسسٹنٹ سرجن میں 22 فیصد تھا۔ ڈسپنسروں کی معمولی ملازمتوں میں بھی مسلمان صرف 32 فیصد تھے۔ پبلک ہیلتھ کے محکموں میں مسلمانوں کا مجموعی حصہ 30 فیصد تھا۔[20] مختصر یہ کہ مسلمانوں کو صوبہ کی سرکاری ملازمتوں میں ان کا جائز حق نہیں ملتا تھا اور تعلیم یافتہ مسلمان روزگار کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔ تجارت وصنعت پر ہندوؤں اور سکھوں کی اجارہ داری تھی جبکہ دیہات میں مسلمان ہندو ساہوکاروں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ سیاسی بیداری کا صوبے بھر کے مسلمانوں میں نام ونشان نہیں ملتا تھا کیونکہ ایک طرف جاگیرداروں کی یونینسٹ پارٹی اور دوسری طرف نچلے درمیانہ طبقہ کے فرقہ پرست احراریوں نے انہیں صحت منداور ترقی پسند سیاست کی راہ پر گامزن ہونے ہی نہیں دیا تھا۔

تحریک شہید گنج اور سکھ۔مسلم تضاد کا تاریخی پس منظر

لاہور کے مسلمانوں کی جانب سے مسجد شہید گنج کی تحریک میں حصہ لینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ گزشتہ دو سو سال کی تاریخ نے مسلمانوں اور سکھوں کے درمیان معاندانہ تضاد کی ایک وسیع خلیج حائل کر رکھی تھی حالانکہ ان دونوں کے مذہبی عقائد میں خاصی ہم آہنگی تھی۔ پنجاب میں فرقہ سکھاں کی ابتدا پندرہویں صدی میں بابا گورونانک کے امن پسندی اور صلح جوئی کے پیغام سے شروع ہوئی تھی۔ گورونانک، شہنشاہ بابر کے ہندوستان پر حملہ آور ہونے کے کچھ ہی عرصہ بعد انتقال کر گیا مگر اس کا پیغام امن زندہ رہا اور اس کے بعد کے تین گورو اس پیغام کی تبلیغ کرتے رہے۔ اس دوران مغل شہنشاہ جلال الدین اکبر نے سکھوں کو امرتسر میں ایک گوردوارہ بنانے کے لئے زمین دی اور اس گوردوارہ کا سنگ بنیاد حضرت میاں میر نے رکھا۔ پانچویں گورو ارجن سنگھ نے سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ کی تالیف کی۔ اکبر کے انتقال کے بعد جہانگیر اور اس کے بیٹے خسرو کے مابین تخت نشینی کی جنگ میں خسرو شکست کھا کر روپوش ہونے کے لئے ارجن کے پاس بھی مقیم رہا تھا۔ جہانگیر نے اس کی پاداش میں ارجن کو گرفتار کرنے اور موت کی سزا دینے کا حکم دیا۔ چنانچہ

ارجن کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا جہاں سکھوں کے بیان کے مطابق وہ تشدد کے باعث انتقال کر گیا۔ اس واقعہ کے بعد چھٹے گورو ہر گو بند نے مغلوں کے خلاف ایک قسم کی گوریلا لڑائی شروع کر دی۔ بالآخر اس گورو کو بھی گرفتار کر کے دس سال کے لئے قید میں رکھا گیا۔ شہنشاہ اورنگزیب کے عہد میں جب پورے برصغیر میں بغاوتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا تو پنجاب میں سکھوں کی بغاوت نے بھی زور پکڑ لیا۔ چنانچہ نویں گورو تیغ بہادر کو پکڑ لیا گیا۔ اورنگزیب نے اسے اسلام قبول کرنے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا چنانچہ اُسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ دسویں گورو گو بند سنگھ کے ماتحت سکھوں کی فوجی قوت میں بہت اضافہ ہوا جبکہ مغلوں کی سلطنت زوال پذیر تھی۔ اورنگزیب کے 1707ء میں انتقال کے ایک سال بعد یہ گورو دو پٹھان نوجوانوں کے ہاتھوں قتل ہوا جن کے والد کو قبل ازیں اس نے قتل کیا ہوا تھا۔ تاہم دسویں اور آخری گورو گو بند سنگھ کے قتل کے بعد سکھوں کی فوجی قوت بڑھتی ہی چلی گئی تا آنکہ اٹھارہویں صدی کے وسط میں احمد شاہ ابدالی نے سکھوں کی فوجی قوت کو منتشر کر کے پنجاب پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ مغلوں کے عہد میں سکھوں کے خلاف فوجی مہمات کے دوران ان کے بہت سے گوردوارے مسمار کر دیئے جاتے تھے اور درانیوں کے عہد میں بھی امرتسر میں سکھوں کے مشہور گوردوارے کو دو مرتبہ مسمار کیا گیا تھا۔ لاہور میں گوردوارہ شہید گنج ان سکھوں کی یاد میں ہی تعمیر ہوا تھا جو مسلمانوں کے عہد اقتدار میں مارے گئے تھے۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے اواخر میں درانیوں کا زوال ہوا تو پنجاب میں ان کے سکھ گورنر رنجیت سنگھ نے اپنی ایک آزاد سلطنت قائم کر لی جس کی حدود بہت جلد پٹیالہ سے لے کر پشاور تک پھیل گئیں۔ بالآخر 1839ء میں رنجیت سنگھ کے انتقال کے تقریباً نو سال بعد 1848ء میں انگریزوں کے ہاتھوں اس سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ سکھوں نے اپنے اس تقریباً 50 سالہ عہد اقتدار میں مغلوں اور درانیوں کے مظالم کا اپنی مسلم رعایا سے خوب انتقام لیا۔ انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کو معاشی طور پر خستہ حال کر دیا بلکہ بے شمار مساجد کو بھی یا تو مسمار کر دیا یا انہیں بارود خانوں اور اصطبلوں کے طور پر استعمال کیا۔ لاہور کی شاہی مسجد بھی بارود خانے اور اصطبل کے طور پر استعمال ہوتی رہی۔ اس کے علاوہ لاہور میں مسجد مستی دروازہ، سنہری مسجد، مقبرہ جہانگیر، مقبرہ آصف جاہ، مقبرہ نور جہاں، مقبرہ شہزادہ پرویز، مسجد وزیر خان اور مزار سید اسحاق، شاہ بدر کا محلہ، سید شاہ مشرق کا محلہ، قبور تکیہ املی والا، مقبرہ و مسجد مرزا خواجہ محمد سعید لاہوری، مقبرہ شیخ عبدالرزاق،

روضہ خواجہ خاوند، مدرسہ و خانقاہ اسماعیل اور محلہ لنگر خان واقع مزنگ آبادی اور دیگر بہت سی عمارتوں کو مسمار کیا یا انہیں نقصان پہنچایا یا انہیں بارود خانوں اور اصطبلوں کے طور پر استعمال کیا۔ مسلمانوں کو مذہبی آزادی نہیں تھی حتیٰ کہ وہ اذان بھی نہیں دے سکتے تھے۔ ان سے بیگار لی جاتی تھی اور معاشرتی طور پر انہیں نہایت ادنیٰ درجہ دے دیا گیا تھا۔ ہر سکھ انہیں حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ چنانچہ 1848ء میں جب انگریزوں نے پنجاب کا الحاق کیا تو مسلم رعایا نے سکھا شاہی سے نجات حاصل ہونے پر اطمینان وسکون کا سانس لیا۔ اس کا ثبوت اس رپورٹ سے بھی ملتا ہے جو اپریل 1901ء میں لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ ''جو جو سختیاں مسلمانان ہند پر پہلے عہدوں میں اور خاص کر مسلمانان پنجاب پر سکھوں کے زمانے میں ہوئیں ان کے ابھی تک ہمارے بزرگ (جو اس وقت موجود تھے) گواہ ہیں، مسلمانوں کو چین سے بیدار ہونا تو درکنار نماز پڑھنے تک کی اجازت نہیں تھی۔ جہاں کسی مسلمان نے اذان دی، سکھوں کا جھگڑا شروع ہو گیا اور پکڑ کے بے چارے مسلمانوں کے تکے توڑے اور بوٹیاں اڑائیں۔ چمڑا ادھیڑ دیا۔ غرضیکہ ایسے ایسے عذاب مسلمانوں کو پہنچے تھے جن کے بیان کرنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہزار ہزار شکر ہے خدا کی جناب کا کہ اس نے ہم ضعیف الخلقت لوگوں کو جن میں تھوڑا بہت ایمان ہے ان سختیوں سے رہا کر کے ایسی عادل اور منصف حکومت کے ماتحت کر دیا ہے کہ جسے خود ہماری ترقی کا خیال رہتا ہے اور باوجود مختلف مذاہب ہونے کے ہمیں ہر طرح کی آزادی دے رکھی ہے۔'' اس سے قبل 10 رجولائی 1900ء کو قادیانی فرقہ کے بانی مرزا غلام احمد نے بھی ایک اشتہار میں پنجاب کی تاریخ کی اس تلخ حقیقت کی نشاندہی کی تھی۔ اس نے اس اشتہار میں لکھا تھا کہ ''مسلمانوں کو ابھی تک وہ زمانہ نہیں بھولا جب وہ سکھوں کے ہاتھوں ایک دہکتے ہوئے تنور میں مبتلا تھے اور ان کے دست تعدی سے نہ صرف مسلمانوں کی دنیا تباہ تھی بلکہ ان کے دین کی حالت اس سے بدتر تھی۔ دینی فرائض کا ادا کرنا تو درکنار بعض اذان کہنے پر جان سے مارے جاتے تھے۔'' پھر 1857ء میں انگریزوں کے خلاف پہلی جنگ آزادی کے دوران سکھوں نے انگریزوں کی بھرپور امداد کی اور انہوں نے دہلی اور اس کے گرد و نواح میں مسلمانوں کا جی بھر کر قتل عام کیا تھا۔ لاہور کے مسلمانوں کو 1935ء میں تاریخ کے یہ نہایت تلخ واقعات اچھی طرح یاد تھے۔ اور ان دنوں ان کی سیاسی، معاشرتی اور

معاشی حالت بھی نہایت خستہ تھی۔ بے شمار تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان بے روزگار تھے۔ ان کے لئے زندگی ایک ناقابل برداشت بوجھ بن کر رہ گئی تھی۔ وہ آئے دن ریل گاڑی کے نیچے آ کر یا دریا میں ڈوب کر خودکشی کرتے تھے۔ لہٰذا جب مسجد شہید گنج کا واقعہ ہوا ان افلاس زدہ سرفروشوں نے بے پناہ غم وغصہ کا اظہار کیا جس کی پشت پر تاریخی، سیاسی، معاشرتی اور معاشی عوامل کارفرما تھے۔ مسجد شہید گنج کے تحفظ کے لئے جان دینا ریل گاڑی کے نیچے آ کر خودکشی کرنے سے بہرحال بہتر تھا۔ اس طرح کم از کم اگلی دنیا تو سنورنے کی امید کی جا سکتی تھی۔

باب: 7

1937ء کے انتخابات میں لیگ کی ناکامی کے بعد سکندر۔جناح معاہدہ اور اقبال۔جناح تضاد

جناح نے فضل حسین کو لیگ کی صدارت پیش کی جسے فضل حسین نے قبول نہ کیا

آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح نے فروری 1936ء میں شہید گنج کے تنازعہ کا پرامن تصفیہ کرانے کی غرض سے لاہور آنے سے پہلے 5 رفروری کو سر فضل حسین کے نام ایک خط لکھا تھا جس میں اس سے استدعا کی تھی کہ وہ مسلم لیگ کے آئندہ سیشن کی صدارت کرے۔ جناح کے خط کا مضمون یہ تھا کہ" آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے اجلاس میں ہر ایک کی متفقہ رائے یہ تھی کہ آپ سے مسلم لیگ کے آئندہ سیشن کی صدارت کرنے کو کہا جائے۔ جونہی میں نے آپ کا نام تجویز کیا تو اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ میں اور دوسرے بہت سے اصحاب یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس مرحلہ پر ہندوستان کے مسلمانوں کی رہنمائی کے لئے آپ سے زیادہ موزوں شخصیت کوئی نہیں ہے۔ اگر آپ ہمارے اجلاس کی صدارت کریں گے تو یہ امر لیگ کی عزت افزائی کا باعث ہوگا اور مجھے یقین ہے کہ سب لوگ آپ کا خیر مقدم کریں گے۔ مجھے بھروسہ ہے کہ آپ اس مرحلہ پر ہماری دعوت قبول کرلیں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ اس وقت عظیم ترین خدمت سرانجام دے سکتے ہیں جو آپ کے کارناموں میں اضافہ کرے گی اور میری بہت خواہش ہے کہ آپ مجھے اختیار دے دیں کہ میں آپ کے نام کا اعلان کردوں۔ ہمیں آپ کی قابلیت اور تجربے کی ضرورت ہے اور میری نظر میں کوئی ایسا شخص نہیں آتا جو اس نازک موقع پر اپنے فرقہ کی ایسی خدمت سرانجام دے سکتا ہو

جیسی کہ آپ دے سکیں گے۔ شاید میں پوری طرح ظاہر نہیں کر سکا کہ مجھے اس بات کا کتنا احساس ہے کہ محض اپنے فرقہ کے مفاد کے لئے آپ کی موجودگی ضروری ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ سمجھ جائیں گے اور مجھے جواب میں ایک دولفظی تار ''مجھے قبول ہے'' بھیج دیں گے۔ اگر آپ نے انکار کر دیا تو یہ بہت ہی بدقسمتی کی بات ہوگی اور ذاتی طور پر میرے لئے بہت سخت مایوسی ہوگی۔''[1]

جناح کے ذاتی کردار میں خودداری اور عزت نفس بہت نمایاں رہتی تھیں۔ انہوں نے اپنی ساری سیاسی زندگی میں شاید ہی کسی کے نام اس قسم کی ملتجیانہ زبان میں خط لکھا ہوگا۔ بظاہر انہوں نے اپنے اس خط میں سر فضل حسین کی اتنی منت خوشامد محض اس لئے کی تھی کہ اس زمانے میں مسلم اکثریت کے صوبہ پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم نہ ہونے کے برابر تھی، اُن کا خیال تھا کہ سر فضل حسین تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائے تو مسلم لیگ کو زبردست سیاسی تقویت ملے گی اور آئندہ انتخابات کے بعد آل انڈیا کانگرس کے ساتھ بہتر پوزیشن میں کوئی سیاسی سمجھوتہ کر سکے گی۔ مگر پنجاب کے سامراج نواز مسلم جاگیرداروں کے لیڈر نے جناح کی یہ امید پوری نہ کی۔ شاید اسے یہ شعور نہیں تھا کہ آئندہ برصغیر کے سیاسی حالات کیا رخ اختیار کریں گے اور یہ کہ ان مسلم جاگیرداروں کو جب بھی موقع ملا، اس سے غداری کرنے میں کوئی پس و پیش نہیں کریں گے۔ اس کی نظریں صرف پنجاب کی حدود تک محدود تھیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ چونکہ نئے آئین کے تحت پنجاب میں مسلمانوں کو بہت معمولی اکثریت ملی ہے اس لئے اگر مسلم لیگ کے ٹکٹ پر انتخاب لڑا گیا تو صوبہ میں مسلمانوں کی وزارت نہیں بن سکے گی اور ہندو اور سکھ چند مسلمان پٹھوؤں کو ساتھ ملا کر حکومت کریں گے۔ مزید برآں وہ جناح کی ''انڈین نیشنلزم'' کے خلاف تھا اور وہ جناح کے اس مؤقف کے بھی خلاف تھا کہ ''میں پہلے انڈین ہوں اور بعد میں مسلمان ہوں۔''[2] اسے خطرہ تھا کہ جناح کسی وقت بھی کانگرس سے ایسا سمجھوتہ کر لیں گے جو برصغیر کے مسلمانوں کے لئے بالعموم اور پنجاب کے مسلمانوں کے لئے بالخصوص فائدہ مند نہیں ہوگا۔ اس نے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا تھا کہ جناح نے 1927ء کے اوائل میں بعض شرائط کے تحت مخلوط طریقہ انتخاب کا اصول منظور کر لیا تھا اور اس وجہ سے مسلم لیگ دو دھڑوں میں منقسم ہو گئی تھی۔ اس نے اسی لئے یہ انتظام کیا تھا کہ گول میز کانفرنس میں محمد علی جناح کی بجائے سر آغا خان اور ظفر اللہ خان مسلمانوں کے مؤقف کی وضاحت کریں۔

چنانچہ سر فضل حسین نے محمد علی جناح کی متذکرہ التجا کو مسترد کرنے کے بعد 16 رفروری 1936ء کو دہلی میں سر آغا خان کی زیر صدارت آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے ایگزیکٹو بورڈ کے اجلاس میں شرکت کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ آئندہ صوبائی انتخابات کے بعد صوبوں کے منتخب شدہ مسلمان ممبروں کا اور مرکزی اسمبلی اور کونسل آف سٹیٹ کے منتخب شدہ مسلمان ممبروں کا ایک کنونشن طلب کیا جائے تا کہ مسلمانان ہند کی ایک ایسی نمائندہ حیثیت کی مرکزی تنظیم قائم ہو جائے جو مسلم اکثریت کے صوبوں کے مسلمانوں کی ذمہ داریوں کا احساس کرے۔ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لئے مؤثر قدم اٹھائے اور ہر اہم مسئلہ پر پوری مسلم قوم کے نقطۂ نگاہ کی ترجمانی کر سکے۔ اس کی اس رائے کی بنیاد اس مفروضہ پر تھی کہ برصغیر میں برطانوی سامراج کا اقتدار ہمیشہ کے لئے قائم رہے گا لہٰذا مسلمانوں کے چند سر برآوردہ معززین کو اپنے فرقہ کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لئے حسب روایت یادداشتوں اور ملاقاتوں کے ذریعے اپنے سیاسی فرائض سرانجام دیتے رہنا چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے یو۔ پی، سندھ اور سرحد میں مسلم جاگیرداروں کی پارٹیاں بنوائی تھیں جن کے اغراض و مقاصد ویسے ہی تھے جیسے کہ پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کے تھے اور ان صوبوں کے انگریز گورنروں نے اس سلسلے میں اس کی امداد کی تھی۔ قبل ازیں وہ یکم اپریل 1936ء کو ممدوٹ ولا لاہور میں یونینسٹ پارٹی کی تنظیم نو کی رسم افتتاح ادا کر چکا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ یورپ میں فقید المثال معاشی بحران کے باعث دوسری عالمگیر جنگ کا بگل بجنے والا ہے اور یہ کہ اس جنگ کے بعد برطانیہ کو یہاں سے اپنا بستر گول کرنا پڑے گا۔ اس کے مقابلے میں کانگرس کی بورژوا قیادت کو ان امکانات کا شعور تھا اور اسے یقین ہو چکا تھا کہ اب برطانیہ زیادہ دیر ہندوستان میں نہیں رہ سکتا۔ کانگرس کی دسمبر 1929ء کی مکمل آزادی کی قرارداد اور پھر گاندھی کی سول نافرمانی کی تحریک اس پختہ شعور کی آئینہ دار تھی۔ وائسرائے اِرون نے اسی بنا پر وزیر ہند کی ہدایت کے مطابق 1932ء کے اوائل میں گاندھی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے تھے۔

جناح کا دورۂ لاہور اور پنجابی مسلم درمیانہ طبقہ کی مسلم لیگی قیادت

اپریل 1936ء کے اوائل میں محمد علی جناح نے دہلی میں جمیعت العلمائے ہند کے ایک جلسے میں شرکت کی اور انہوں نے اپنی تقریر میں نئے غیر جمہوری آئین کی مخالفت کرتے

ہوئے کہا کہ ''حکومت برطانیہ نے یہ آئین تمام پارٹیوں کی مرضی کے خلاف محض اس وجہ سے ٹھونس دیا ہے کہ ہندوستانی آپس میں متحد نہ تھے اور اپنے خانگی اختلافات کا تصفیہ خود نہ کر سکتے تھے۔ تاہم مسلمان آزادی کی جنگ میں ساتھ چلنے کو تیار ہیں۔ صرف اپنا تحفظ چاہتے ہیں چونکہ وہ اقلیت میں ہیں۔ یہ کوئی مذہبی سوال نہیں ہے بلکہ خالص سیاسی مسئلہ ہے۔ میں ہندوؤں سے اپیل کرتا ہوں کہ کمیونل ایوارڈ پر بحث کا دروازہ بند کر دو تاکہ ہم سب مل کر آگے بڑھ سکیں اور ملک کے بڑے مسئلے کی طرف توجہ دیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ منظم ہونا چاہیے۔ اگر دونوں منظم ہو گئے تو انہیں باہمی مفاہمت کے لئے برسوں تک انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ طعن وتشنیع کی پرواہ مت کرو۔ میں آٹھ کروڑ مسلمانوں کی امداد کر رہا ہوں۔ اگر مسلمان زیادہ منظم ہوں گے تو یہ قومی جدوجہد کے لئے زیادہ فائدہ مند ہوں گے۔'' اس جلسہ سے قبل فروری میں جناح نے جمیعت کے سیکرٹری مولوی احمد سعید کو یہ یقین دلا دیا تھا کہ ''یو۔ پی میں انتخابات کے لئے مسلم لیگ جو پارلیمانی بورڈ تشکیل کرے گی اس میں مسلم یونٹی بورڈ کے ارکان کی اکثریت ہو گی کیونکہ میری خواہش ہے کہ مسلمان متحد ہو کر انتخاب لڑیں اور ان کے ووٹ تقسیم نہ ہوں۔''[3] 12/اپریل کو بمبئی میں سر وزیر حسن کی زیر صدارت مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا جس نے جناح کو مرکزی اور صوبائی پارلیمانی بورڈ قائم کرنے اور ان کے زیر اہتمام انتخابی مہم منظم کرنے کا اختیار دے دیا۔ انہی دنوں لکھنؤ میں کانگرس کے کھلے اجلاس نے بھی جواہر لال نہرو کی زیر صدارت صوبائی انتخاب لڑنے کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا۔

29/اپریل کو جناح لاہور آئے اور یہاں انہوں نے یکم مئی کو سر فضل حسین سے ملاقات کر کے اسے اس موقف سے متفق کرنے کی کوشش کی کہ چونکہ آئندہ انتخابات جداگانہ نیابت کے اصول کے لڑے جا رہے ہیں اس لئے پنجاب میں مسلمانوں کو ایک غیر فرقہ وارانہ یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب نہیں لڑنا چاہیے۔ البتہ انتخابات کے بعد وہ اسمبلی میں کسی بھی غیر مسلم گروپ سے اشتراک وتعاون کر سکتے ہیں۔ لیکن جداگانہ طریقہ انتخاب کا عظیم ترین علمبردار سر فضل حسین اپنے موقف پر اڑا رہا کہ ''چونکہ پنجاب میں مسلمان صرف 51 فیصد ہیں اور جب تک انہیں غیر مسلموں کے کسی قابل اعتماد فریق کا تعاون حاصل نہ ہو وہ وزارت نہیں بنا سکتے اس لئے انہوں نے اسمبلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی چودھری چھوٹو رام کے ساتھ مل کر ایک غیر فرقہ

وارانہ اور مخلوط جماعت یعنی یونینسٹ پارٹی بنالی ہے اور اب اسی پارٹی کے نام پر انتخاب لڑا جائے گا۔'' اس طرح وقتی طور پر تو سر فضل حسین کی فتح ہو گئی لیکن اسے پتہ نہیں تھا کہ صرف ایک ہی سال بعد اس کا جانشین سر سکندر حیات، جناح کے مؤقف کے سامنے سر تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔

جناح نے اسمبلی سے باہر فرقہ وارانہ جماعت سے منسلک ہونے اور اسمبلی کے اندر غیر فرقہ وارانہ جماعت کی تشکیل کرنے کی تجویز اپنے ماضی کے تجربے کی بنا پر پیش کی تھی۔ وہ بمبئی کے مسلم حلقے سے جداگانہ نیابت کے اصول کے تحت مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے اور انہوں نے کبھی کانگرس یا کسی اور غیر فرقہ وارانہ جماعت کا ٹکٹ نہیں لیا تھا لیکن اسمبلی کے اندر انہوں نے اپنی غیر فرقہ وارانہ انڈیپینڈنٹ پارٹی بنائی ہوئی تھی جس میں ہندو، سکھ، پارسی، عیسائی اور مسلمان شامل تھے۔ سر فضل حسین نے 1924ء کے اوائل میں پنجاب کونسل میں یونینسٹ پارٹی گورنر میکلیگن کی اشیر باد سے بنائی تھی۔ کونسل سے باہر اس کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ اب 1936ء میں بھی اس کے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑنے کے فیصلے میں بھی انگریزوں کی رائے کا دخل ہو۔ چودھری خلیق الزماں کی اطلاع کے مطابق ''یو۔ پی میں نواب چھتاری نے نیشنل ایگریکلچرسٹ پارٹی وہاں کے گورنر میلکم ہیلی کے کہنے پر بنائی تھی'' اور سندھ میں سر عبداللہ ہارون اور سرحد میں سر عبدالقیوم سے کسی صورت بھی یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اپنے گورنروں کی اجازت کے بغیر یونائیٹڈ پارٹیاں بنانے کی جرأت کریں۔ اسی لئے جناح کو مسلمان تعلقہ داروں اور جاگیرداروں سے سخت نفرت تھی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ لوگ انگریزوں سے پوچھے بغیر کوئی کام نہیں کرتے۔ انہوں نے جب جمیعت العلمائے ہند کے سیکرٹری مولوی احمد سعید سے انتخابی محاذ بنایا تھا تو انہوں نے مولوی سے ان رجعت پسند اور سامراج نواز عناصر کے بارے میں کچھ اسی قسم کی باتیں کہی تھیں۔ برطانوی سامراج شمالی ہندوستان کے فوجی بھرتی والے علاقوں میں غیر فرقہ وارانہ بنیاد پر جاگیرداروں کی بالادستی اس لئے چاہتے تھے کہ آنے والی جنگ میں یہی وفادار عناصر اس کے کام آسکتے تھے۔ لیکن اس سارے سیاسی کھیل میں جو نہایت دلچسپ بات تھی وہ یہ تھی کہ برطانوی سامراج پورے ہندوستان میں تو ہندو۔ مسلم تضاد کو ہوا دیتا تھا اور یہ کوشش کرتا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی بڑی جماعتوں میں کوئی سیاسی مفاہمت نہ ہونے پائے لیکن شمالی ہندوستان میں جاگیرداروں کو یہ غیر فرقہ وارانہ بنیاد پر منظم کرنے کا خواہاں تھا۔

بالکل ایسے ہی جیسے کہ اس نے والیان ریاست کی غیر فرقہ وارانہ تنظیم میں امداد کی تھی۔ چونکہ جناح بمبئی کے بورژوا لیڈر تھے۔ ان کی سیاست مذہب سے بالاتر تھی اور وہ پورے خلوص سے ہندو۔ مسلم اتحاد کے متمنی تھے۔ اس لئے وہ انگریزوں کی اس سامراجی سیاست کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور اُن کی کوشش یہ تھی کہ اسے ناکام کیا جائے لیکن کانگرس کی جانب سے مسلم اقلیت کو تحفظات دینے سے بالاصرار انکار اور دوسری طرف مسلم تعلقہ داروں اور جاگیرداروں کی سامراج نوازی اُن کے راستے میں حائل تھی۔

سر فضل حسین سے مایوس ہونے کے بعد جناح علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علامہ کے ایک نیاز مند عاشق حسین بٹالوی کا کہنا ہے کہ "ڈاکٹر صاحب ان دنوں کافی پریشان تھے۔ ان کی صحت خراب تھی اور وہ بیماری جس نے بعد ازاں مرض الموت کی صورت اختیار کر لی، شروع ہو چکی تھی۔ سال بھر پہلے ان کی اہلیہ کا انتقال ہو گیا اور دونوں بچوں کی نگہداشت کا سارا بوجھ تنہا ان پر آن پڑا تھا۔ پریکٹس بند ہو جانے کی وجہ سے آمدنی کے ذرائع بھی مسدود ہو چکے تھے...... جب گفتگو شروع ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے امداد کا پورا وعدہ کیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ اگر آپ اودھ کے تعلقہ داروں یا بمبئی کے کروڑ پتی سیٹھوں کی قسم کے لوگ پنجاب میں تلاش کریں گے تو یہ جنس میرے پاس نہیں ہے۔ میں صرف عوام کی مدد کا وعدہ کر سکتا ہوں...... یہ بات سن کر مسٹر جناح کرسی سے دو انچ اوپر اٹھے اور بڑے جوش سے کہنے لگے "مجھے عوام کی مدد درکار ہے"...... اتحاد ملت اور مجلس احرار کے لیڈروں نے بھی مسٹر جناح سے ملاقات کی۔ احرار مسلم لیگ کے پارلیمنٹری بورڈ میں شریک ہونے کو تیار تھے لیکن شرط یہ تھی کہ کسی قادیانی کو لیگ میں شریک نہ کیا جائے دوئم مسلم لیگ کا نصب العین درجہ نو آبادیات کے بجائے مکمل آزادی ہونا چاہیے۔ نصب العین کی تبدیلی کے بارے میں مسٹر جناح نے جواب دیا کہ اس کا فیصلہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں ہو گا۔ قادیانیوں کی شرکت یا عدم شرکت کے متعلق انہوں نے کوئی وعدہ نہ کیا۔ تاہم مجلس احرار اور اتحاد ملت کے رہنماؤں نے پارلیمنٹری بورڈ میں شامل ہونے کی رضامندی کا اظہار کر دیا...... 12 مئی کو میاں عبدالعزیز کے مکان پر مسلم لیگ کا جلسہ ہوا جس کی پہلی قرارداد یہ تھی کہ پنجاب مسلم لیگ کی از سر نو تنظیم کی جائے۔ صدر: علامہ اقبال، نائب صدر: ملک برکت علی اور خلیفہ شجاع الدین، سیکرٹری غلام رسول بیرسٹر، جائنٹ سیکرٹری میاں عبدالمجید

بیرسٹر اور عاشق حسین بٹالوی...... مسٹر جناح ایک ہفتہ لاہور میں ٹھہر کر راولپنڈی تشریف لے گئے اور وہاں چند روز قیام کے بعد کشمیر چلے گئے۔ سرینگر میں 21رمئی کو انہوں نے مرکزی بورڈ کے ناموں کا اعلان کر دیا۔ بورڈ کے تمام ممبروں کی تعداد 56 تھی جن میں ہندوستان کے ہر صوبے کے آدمی شامل تھے۔ پنجاب سے ذیل کے گیارہ اصحاب نامزد کئے گئے تھے۔ علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خان (اتحاد ملت)، مولانا محمد اسحاق مانسہروی (اتحاد ملت)، سید زین العابدین شاہ گیلانی (اتحاد ملت)، میاں عبدالعزیز بیرسٹر، مولانا عبدالقادر قصوری، راجہ غضنفر علی خان، شیخ حسام الدین (احرار)، چودھری افضل حق (احرار)، چودھری عبدالعزیز بیگووال (احرار)، خواجہ غلام حسین ایڈووکیٹ (احرار)۔"[4]

پارلیمانی بورڈ کی اس کی تشکیل سے مولانا ظفر علی خان مطمئن نہ ہوا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس کی جماعت کو کم نمائندگی ملی ہے۔ تاہم اس میں جو نمایاں ترین بات تھی وہ یہ تھی کہ اس میں کسی بڑے جاگیردار کا نام شامل نہیں تھا۔ پنجاب کے تقریباً سارے ارکان شہروں کے درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ 28رمئی کو علامہ اقبال کے مکان پر مسلم لیگ کا ایک جلسہ ہوا جس میں صوبائی پارلیمانی بورڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ 8رجون کو جناح کی زیر صدارت لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے اجلاس ہوئے جہاں مسلم لیگ کا الیکشن مینی فیسٹو باضابطہ منظور کیا گیا لیکن اس کے ساتھ ہی پارلیمنٹری بورڈ کی یکجہتی ٹوٹ گئی۔ مولانا ظفر علی خان اور اس کے دونوں ساتھی پارلیمنٹری بورڈ سے مستعفی ہو گئے۔ استعفیٰ کی وجہ یہ بتائی گئی کہ اتحاد ملت چونکہ مکمل آزادی کا حامل ہے اور مسلم لیگ کا نصب العین درجہ نوآبادیات ہے۔ اس لئے ان دونوں جماعتوں میں اشتراک وتعاون نہیں ہوسکتا۔ عاشق بٹالوی کی رائے میں "مولانا کا یہ عذر محض عذر لنگ تھا۔ حقیقت یہ تھی ڈاکٹر محمد عالم مولانا پر چھائے ہوئے تھے اور چونکہ انہوں نے مسجد شہید گنج کی بازیابی کا دیوانی دعویٰ بھی دائر کر رکھا تھا اس لئے وہ اتحاد ملت کا علیحدہ پارلیمنٹری بورڈ قائم کر کے شہید گنج کے نام پر الیکشن لڑنا چاہتے تھے۔ چنانچہ آگے چل کر من وعن یہی کچھ ہوا اور ڈاکٹر عالم نے نہایت ہوشیاری سے اتحاد ملت، زمیندار، مولانا ظفر علی خان اور شہید گنج کو سراسر اپنے الیکشن کے لئے استعمال کیا۔"

اس امر کا امکان ہے کہ مولانا ظفر علی خان کی علیحدگی میں سر فضل حسین کا بھی ہاتھ ہو۔

1935ء میں مجلس احرار کا الزام یہ تھا کہ مولانا نے سر فضل حسین کے کہنے پر تحریک شہید گنج چلا کر احرار کو بدنام کیا ہے۔ مولانا کا سیاسی وصحافتی کردار اس قسم کی حرکتوں سے بالاتر نہیں تھا۔ فضل حسین نے بھی 6 رمئی 1936ء کو سر سکندر کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ ''جناح نے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ قائم کرنے میں سخت غلطی کی ہے۔ اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا۔ ہم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ بالکل درست ہے۔ جناح نے ہمارے متعلق غلط فہمیاں پھیلانے میں کوئی دقیقہ نہیں رکھا لیکن جن اخبارات نے اس کا پروپیگنڈا کیا ہے وہی اس خبر کے بھی ذمہ دار ہیں کہ جناح کو اپنے مقصد میں کامیابی نہیں ہوسکی۔ ہم نے اس کے بورڈ میں شامل ہونے سے انکار کردیا۔ اتحاد ملت نے بھی انکار کردیا۔ باقی رہ گئے احرار۔ وہ شامل ہوں یا نہ ہوں ان کا رویہ ہمارے متعلق یکساں رہے گا۔ البتہ اقبال، شجاع، تاج الدین، برکت علی جیسے چند متفرق شہری باشندے اس بورڈ سے کچھ لے مرنے کی آرزو میں دوڑ دھوپ کررہے ہیں۔''[5] گویا سر فضل حسین کو مئی کے اوائل میں ہی پتہ تھا کہ اتحاد ملت جناح کے پارلیمانی بورڈ میں شریک نہیں ہوگی حالانکہ بورڈ کا اعلان 21 رمئی کو ہوا تھا اور اسے یہ بھی یقین تھا کہ مولانا ظفر علی خان کی اتحاد ملت کا رویہ یونینسٹ پارٹی کے بارے میں احرار سے مختلف ہوگا۔

سر فضل حسین کا انتقال اور سر سکندر حیات کا عروج

جب سر فضل حسین نے سر سکندر حیات خان کو یہ خط لکھا تھا ان دنوں موخر الذکر بمبئی میں ریزروبنک کا ڈپٹی گورنر تھا لیکن اس کی تمنا یہ تھی کہ وہ جس طرح بھی ممکن ہوسکے، پنجاب کے سیاسی اقتدار پر قبضہ کرلے۔ سر سکندر حیات ضلع کیمبل پور کا جاگیردار تھا اور برطانوی سامراج کا پشتینی پٹھو تھا۔ پنجاب کے دوسرے مسلم جاگیرداروں کی طرح وہ بھی شہر کے درمیانہ طبقہ کے سر فضل حسین کی قیادت کو دل سے قبول نہیں کرتا تھا اور ہمہ وقت اپنے اس محسن کے خلاف جاگیردارانہ جوڑ توڑ اور سازش میں مصروف رہتا تھا۔ چنانچہ وہ 20 رجون 1936ء کو بمبئی سے لاہور پہنچا جبکہ سر فضل حسین ڈلہوزی میں بیمار پڑا تھا۔ وہ لاہور میں ایک طرف راجہ نریندر ناتھ سے ملا اور دوسری طرف اس نے علامہ اقبال سے بھی ملاقات کی۔

22 رجون کے سول اینڈ ملٹری گزٹ کی رپورٹ کے مطابق سر سکندر اور راجہ نریندر

ناتھ کے درمیان اس امر کے متعلق تبادلۂ خیالات ہوا کہ سر فضل حسین کی فرقہ وارانہ پالیسی کو ختم کر کے پنجاب کی سیاسی جماعتوں میں کیونکر اتحاد قائم ہونا چاہیے۔ سر فضل حسین نے جب یہ خبر پڑھی تو اسے سر سکندر کی احسان فراموشی پر بہت صدمہ ہوا جس کا اظہار اس نے 24 ر جون کو چودھری شہاب الدین کے نام اپنے خط میں کیا۔

25 ر جون 1936ء کو ڈاکٹر اقبال نے جناح کو ایک خط میں لکھا کہ ''دو ایک روز ہوئے سر سکندر لاہور سے چلا گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ بمبئی پہنچ کر آپ سے ملاقات کر کے بعض اہم امور کے متعلق گفتگو کرے گا۔ دولتانہ (احمد یار) نے کل شام مجھ سے ملاقات کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلم ارکان یہ اعلان کرنے پر آمادہ ہیں کہ مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے آل انڈیا مسائل کے بارے میں مسلم لیگ جو فیصلہ کرے گی وہ اس کے پابند ہوں گے اور ان مسائل کے متعلق وہ صوبائی اسمبلی میں کسی غیر مسلم گروپ سے کبھی کوئی پیکٹ نہیں کریں گے۔ بشرطیکہ مسلم لیگ یہ اعلان کرے کہ جو لوگ لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوں گے وہ اس گروپ سے تعاون کریں گے جس میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔ از راہِ کرم مجھے پہلی فرصت میں اطلاع دیجئے کہ اس تجویز کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے اور سر سکندر حیات سے گفتگو کے نتیجے سے مجھے ضرور مطلع کیجئے۔ اگر آپ ان کو مطمئن کرنے میں کامیاب ہو گئے تو بہت ممکن ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ملیں۔''[6]

29 ر جون کو سر فضل حسین واپس لاہور پہنچا تو سر سکندر حیات بمبئی جا چکا تھا۔ احمد یار دولتانہ اور سر سکندر کا سازشی منصوبہ مکمل ہو چکا تھا۔ وہ صرف فضل حسین کی موت کا انتظار کر رہے تھے جس کی صحت روز بروز خراب سے خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ 9 ر جولائی 1936ء کو فضل حسین کا لاہور میں انتقال ہو گیا اور 30 ر ستمبر 1936ء کو سر سکندر حیات خان ریزرو بنک سے مستعفی ہو کر واپس لاہور پہنچ گیا۔

ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی لکھتا ہے کہ سر سکندر حیات خان دراصل بڑی دیر سے اپنے محسن سر فضل حسین کے خلاف سازش میں مصروف تھا اور اس سلسلے میں اسے نواب مظفر علی خان، میاں احمد یار خان دولتانہ اور سید مقبول کی درپردہ امداد حاصل تھی۔ وہ سر فضل حسین کے خلاف ایک نئی پارٹی کی طرح ڈالنے کے لئے دوڑ دھوپ کرتا رہتا تھا۔ جب 1935ء کے ایکٹ کے تحت

انتخابات قریب آئے تو اس نے فضل حسین کو نیچا دکھانے کے لئے ایک طرف تو مسلم لیگ سے رابطہ قائم کیا اور دوسری طرف وہ ہندوؤں کے لیڈر راجہ نریندر ناتھ سے بھی در پردہ ساز باز کرتا رہا۔ جب تک فضل حسین کی صحت ٹھیک رہی سر سکندر کو کھلم کھلا اس کی مخالفت کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ لیکن جب اس کی صحت مسلسل خراب رہنے لگی تو سر سکندر کی سازشی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ ''میڈیکل کالج کے پرنسپل کرنل ہارپر فضل حسین کے معالج تھے اور نواب مظفر خان چپکے چپکے ہارپر نیلسن کے پاس جا کر پوچھتے تھے کہ فضل حسین کی زندگی کے کتنے دن باقی ہیں۔ ہارپر نیلسن نے ایک ذمہ دار معالج کی حیثیت سے نواب مظفر خان کو تو کچھ بتانے سے انکار کر دیا لیکن انہوں نے میاں فضل حسین کو اس بات سے فوراً آگاہ کر دیا کہ ان کے حریف اب ان کی زندگی کی گھڑیاں شمار کر رہے ہیں۔ فضل حسین کو نواب مظفر خان کی اس حرکت سے اس قدر صدمہ پہنچا کہ انہوں نے رنج والم کی اس شدت میں خودکشی کر لینے کا ارادہ کر لیا اور آخر ایک کرب انگیز ذہنی کشمکش کے بعد وہ اس مذموم ارادے سے باز آئے۔''[7] چونکہ عاشق بٹالوی نے اس واقعہ کا ذکر فضل حسین کے بیٹے عظیم حسین کی تحریر کردہ سوانح عمری کے حوالے سے لکھا ہے اس لئے اس کی صداقت کے بارے میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

قبل ازیں فضل حسین نے سر سکندر حیات اور دوسرے جاگیرداروں کی سازشوں سے پریشان ہو کر چودھری شہاب الدین کے نام ایک خط میں لکھا تھا کہ ''دوست عزیز اور رشتہ دار اس قدر خود غرض، حاسد اور ناشکرے ہو گئے ہیں کہ ان کی کمینہ حرکات دیکھ کر دل پاش پاش ہو جاتا ہے۔ لیکن کیا کیا جائے صبر وشکر کرنے اور غداریوں کو برداشت کرنے کے سوا کیا چارہ ہے۔ اب تو زندگی کا صرف یہی مقصد رہ گیا ہے کہ جو کام شروع کیا تھا اسے بالخیر انجام تک پہنچایا جائے'' اور پھر اس نے سر سکندر کے نام ایک خط میں لکھا کہ ''اگر آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں تو میں صرف پارٹی کی قیادت ہی سے نہیں بلکہ پبلک زندگی اور سیاسی کاموں سے کلیتہً دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔''[8] گویا پنجابی مسلمانوں کے شہری درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھنے والا عظیم لیڈر، جس نے اپنے طریقے سے فی الحقیقت مسلمانوں کی گرانقدر خدمات سرانجام دی تھیں۔ اتنے اندوہناک حالات میں راہی ملکِ عدم ہوا۔

فضل حسین کی زندگی کے اس قدر کرب انگیز انجام کا پس منظر یہ تھا کہ اگرچہ اس کی

ابتدائی سیاسی تربیت کانگرس، مسلم لیگ اور انجمن حمایت اسلام کے گہوارے میں ہوئی تھی اور اس کی طرز معاشرت اور رہن سہن شہری درمیانہ طبقہ کا سا تھا لیکن جب 23-1921ء میں گورنر میکلیگن کی زیر سرپرستی اسے اقتدار کا چسکا لگا تو وہ اپنے آپ کو موقع پرستی سے بالاتر نہ رکھ سکا۔ اس نے پنجاب میں محض اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے 1924ء کے اوائل میں گورنر میکلیگن کے تعاون سے دقیانوسی اور عوام دشمن جاگیرداروں کو اپنی حمایت میں ایک غیر فرقہ وارانہ یونینسٹ پارٹی کی شکل میں منظم کیا اور اس طرح اس نے صوبہ میں جاگیرداروں کی دھڑے بندی، اندرون خانہ جوڑ توڑ اور سازش کی سیاست کو فروغ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ ان پڑھ اور نیم تعلیم یافتہ جاگیردار اس کی قیادت کو کبھی چیلنج نہیں کریں گے اور وہ ان کی امداد سے نہ صرف شہری ہندوؤں اور سکھوں کا مقابلہ کر سکے گا بلکہ اسے شہری مسلمانوں میں سے بھی کسی سیاسی حریف کے ابھرنے کا خطرہ لاحق نہیں ہوگا۔ جب اس نے ایسا سوچا اور کیا تھا اس وقت وہ تاریخ اور سیاست کے اٹل سائنسی قوانین سے ناواقف تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ طبقاتی مفادات مذہب و رنگ و نسل سے بالاتر ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ رجعت پسند جاگیردار طبقہ ترقی پسند شہری درمیانہ طبقہ کی قیادت کو زیادہ دیر برداشت نہیں کرے گا۔ چنانچہ جن پتوں پر اس نے تکیہ کیا تھا وہی بہت جلد اس کے آشیانہ اقتدار کو ہوا دینے لگے۔ انہوں نے پہلے تو گورنر میلکم ہیلی کی وساطت سے اسے منتخب وزارت کے عہدہ سے ہٹا کر گورنر کی کونسل کا نامزد ریونیو ممبر بنوا دیا اور پھر اسے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن کی حیثیت سے پنجاب سے ہی نکلوا دیا۔ سر سکندر حیات خان پنجاب میں اس موقع پر اس کا جانشین بنا تھا حالانکہ اس کی تعلیم میٹرک سے زیادہ نہیں تھی۔ دہلی میں ایگزیکٹو کونسل سے سبکدوش ہو کر جب وہ اپریل 1935ء میں واپس لاہور پہنچا تو اس وقت اس کی صحت بہت خراب ہو چکی تھی۔ لہٰذا سر سکندر حیات اور دوسرے جاگیرداروں کے لئے اس کے خلاف سازشوں کا جال پھیلانے میں بہت آسانی پیدا ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ دو تین مہینوں میں ہی جاگیردارانہ سیاست کے زہریلے سانپ کا شکار ہو گیا جسے اس نے خود ہی دودھ پلا کر پالا پوسا تھا۔

سر فضل حسین نے مسلمانان ہند اور پنجابی مسلمانوں کی انگریزوں کے تعاون سے جو خدمات سرانجام دی تھیں ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ اس نے پنجاب میں عوام دشمن اور سامراج نواز جاگیرداروں کو سیاسی تقویت دینے میں نمایاں ترین کردار

ادا کیا تھا۔ سید نور احمد نے بھی گھر کے بھیدی کی حیثیت سے اپنی کتاب میں سر فضل حسین کے خلاف 1935ء میں سر سکندر حیات کی سازشوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے اور اس امر کی تصدیق کی ہے کہ سر فضل حسین کو اس صورت حال سے اس قدر ذہنی کوفت ہوئی تھی کہ اس نے خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا۔ لیکن پھر جلد ہی اس کی طبیعت سنبھل گئی اور اس نے ملک فیروز خان نون کو لندن میں ہائی کمشنر کا عہدہ دلا کر سر سکندر کو یہ اطمینان دلا دیا کہ سر فضل حسین کے بعد اس کے لئے وزارت عظمیٰ کا عہدہ ایک یقینی شے ہے۔ اس عہدہ کو حاصل کرنے کے لئے اسے ہندوؤں اور سکھوں کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔

30 ستمبر 1936ء کو سر سکندر حیات خان بمبئی میں ریزرو بنک سے مستعفی ہو کر لاہور پہنچا تو اس کے چند دنوں بعد ہی وہ نہ صرف یونینسٹ پارٹی کا لیڈر بن گیا بلکہ گورنر سر ہربرٹ ایمرسن نے اسے نواب مظفر خان کی جگہ اپنی کونسل کا ریونیو ممبر بھی نامزد کر دیا۔ چنانچہ اکتوبر میں جب اس نے اس دوگانہ حیثیت سے یونینسٹ پارٹی کی طرف سے انتخابی مہم شروع کی تو سارے صوبے کے مسلم جاگیردار جوق در جوق اس کی فوج میں شامل ہو گئے۔ چونکہ سر سکندر کا رہن سہن جاگیردارانہ تھا اس لئے اس کے طبقاتی بھائیوں کو دل و جان سے اس کی قیادت قبول کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا بالخصوص ایسی حالت میں کہ وہ لاٹ صاحب کا بھی منظور نظر تھا۔

1937ء کے انتخابات میں لیگ کی شکست کا سبب یہ تھا کہ جناح اُس وقت تک انڈین نیشنلزم کے حامی تھے

9 اکتوبر 1936ء کو آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح انتخابی مہم کے سلسلے میں لاہور پہنچے تو اُن کی کوئی خاص آؤ بھگت نہ ہوئی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ مولانا ظفر علی خان کی مجلس اتحاد ملت مسلم لیگ سے اس لئے الگ ہو چکی تھی کہ وہ شہید گنج کے نام پر الگ جماعت کی حیثیت سے الیکشن لڑنا چاہتی تھی اور مجلس احرار نے مسلم لیگ سے اس لئے علیحدگی اختیار کر لی تھی کہ صوبائی مسلم لیگ کے پاس انتخاب لڑنے کے لئے سرمایہ نہیں تھا۔ مزید برآں وہ بھی اینٹی قادیانی تحریک کے نام پر الگ جماعت کی حیثیت سے انتخاب میں حصہ لینے کی خواہاں تھی۔ اس کی رائے میں علامہ اقبال کی مالی لحاظ سے مفلس و نادار مسلم لیگ کی انتخابی نقطۂ نگاہ سے کوئی قدر و قیمت نہیں تھی۔

11 راکتوبر کو دہلی دروازہ کے باہر مسلم لیگ کا جلسہ ہوا جس میں حاضرین کی تعداد مشکل سے ہزار ڈیڑھ ہزار تھی۔ علامہ اقبال بھی ناسازیٔ طبع کے باعث غیر حاضر تھے۔ تاہم جناح نے اس جلسہ عام میں طویل تقریر کی جس میں انہوں نے سرسکندر حیات اور اس کی یونینسٹ پارٹی کی پالیسی پر شدید نکتہ چینی کی۔ اس کے بعد جناح نے تقریباً دو ہفتے تک پنجاب کا دورہ کیا مگر وہ پنجاب کی مسلم رائے عامہ پر نمایاں طور پر اثر انداز نہ ہو سکے۔ جبکہ علامہ اقبال اپنی علالت کے باعث انتخابی مہم میں کوئی حصہ ہی نہ لے سکے۔ چنانچہ فروری 1937ء میں عام انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ کے صرف دو امیدوار کامیاب ہوئے۔ ایک ملک برکت علی اور دوسرا راجہ غضنفر علی خان۔ کانگرس کے ٹکٹ پر بھی مسلمان حلقوں سے صرف دو امیدوار کامیاب ہو سکے۔ تین چار شہری مسلم حلقے آزاد امیدواروں کے حصے میں آئے اور باقی اکیاسی مسلم جاگیردار ممبر یونینسٹ پارٹی میں جمع ہو گئے۔ ان میں سے بیشتر اپنے ذاتی اثر و رسوخ سے یا سرکاری امداد و تعاون سے یا برادری کے سہارے سے کامیاب ہوئے تھے۔ راجہ غضنفر علی خان نے لیگ کے ٹکٹ پر اپنی کامیابی کے فوراً ہی بعد سیاسی قلابازی کھا کر اعلان کر دیا کہ وہ مسلم لیگ کو ترک کر کے یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو گیا ہے۔ راجہ غضنفر علی خان نے جس جلسے میں مسلم لیگ سے غداری کا اعلان کیا اسی میں سرسکندر نے تقریر کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ ''راجہ صاحب میری مرضی اور میرے ایما سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے لیکن شروع ہی سے انہوں نے میرے ساتھ وعدہ کر رکھا تھا کہ الیکشن میں کامیاب ہونے کے بعد وہ فوراً یونینسٹ پارٹی میں شریک ہو جائیں گے۔''[9] اپریل میں سرسکندر حیات خان کی وزارت نے حلف اٹھایا اور جولائی میں راجہ غضنفر علی خان سیاسی انعام کے طور پر اس وزارت میں پارلیمانی سیکرٹری کا عہدہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

پنجاب کے ان انتخابات میں مسلم لیگ کی اس قدر ناکامی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پروفیسر کوپ لینڈ کے بقول ''مسلم لیگ کے انتخابی منشور میں جو مسٹر جناح کی زیر صدارت تیار کیا گیا تھا اور کانگرس کے انتخابی منشور میں کسی ضروری اور اہم امر کا اختلاف نہیں تھا۔ مجوزہ فیڈرل حکومت کی سخت مذمت کی گئی تھی اور اگرچہ صوبائی آئین کو بھی قابل اعتراض ٹھہرایا گیا تھا...... بایں ہمہ یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اس آئین سے امکانی حد تک فائدہ اٹھانا چاہیے۔ لیگ کے منشور کا اہم ترین جزو وہ تھا جہاں میثاق لکھنؤ کو ہندوستان کی آئینی و دستوری تاریخ کا سب سے درخشاں باب

قرار دیا گیا تھا......اس سے صاف عیاں ہوتا تھا کہ مسٹر جناح، مسلم لیگ اور کانگرس کے اسی اتحاد کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے تھے جو 1916ء میں قائم ہوا تھا۔"[10] مسٹر جناح نے گول میز کانفرنس میں سر آغا خان اور چودھری ظفر اللہ خان کے غلبہ کے باعث مسلمانوں کے لئے جداگانہ حقوق منوانے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی تھی لہٰذا تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کی رائے میں وہ مخلوط انتخاب اور ہندو کانگرس سے "انڈین نیشنلزم" کی بنیاد پر مفاہمت کے حق میں تھے۔ انہوں نے 1934ء کے اوائل میں بمبئی میں ایک بیان میں کہا تھا کہ "میں پہلے انڈین ہوں اور مسلمان بعد میں ہوں۔"

فروری 1936ء میں جب جناح شہید گنج کا قضیہ چکانے کے لئے لاہور آئے تھے تو 2 مارچ 1936ء کو باشندگان لاہور کی طرف سے جن میں ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی سبھی شامل تھے، انہیں خوش آمدید کہنے کے لئے ٹاؤن ہال میں ایک جلسہ ہوا تھا۔ جس کی صدارت لاہور کے بشپ نے کی تھی۔ اس جلسے میں پنڈت نانک چند بیرسٹر نے، جو پنجاب لیجسلیٹو کونسل میں ہندو پارٹی کا لیڈر تھا، جناح کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا کہ "گول میز کانفرنس کے مباحث میں مسٹر جناح نے دوست دشمن کسی کی پروا نہیں کی اور جس رائے کو وہ دیانت و امانت سے صحیح سمجھتے تھے، اس پر آخر وقت تک قائم رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنوں بیگانوں دونوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ گویا صدا بہ صحرا بن کر رہ گئے۔ لیکن یہ واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مسٹر جناح جس بات کو درست سمجھتے ہیں اس پر چٹان کی طرح جم جاتے ہیں اور دنیا کی کوئی ترغیب و تحریص انہیں اس مقام سے ہٹانے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔" جناح نے اس جلسہ میں نانک چند کی تقریر کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ "میں گول میز کانفرنس میں بالکل یکا و تنہا تھا۔ میں نے مسلمانوں کو ناراض کیا کیونکہ وہ مجھے مخلوط انتخاب کا حامی سمجھتے تھے۔ ہندو مجھ سے الگ ناراض تھے کیونکہ میں چودہ نکات کا موجد تھا۔ میں نے والیان ریاست کو بھی ناراض کیا کیونکہ میں ان کی پس پردہ اور خفیہ کاروائیوں کو قطعاً پسند نہیں کرتا تھا اور میں نے ان کو بے نقاب کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ بھی مجھ سے ناراض تھی کیونکہ میں نے ابتدا ہی سے یہ محسوس کر لیا تھا کہ یہ کانفرنس ایک بہت بڑا فراڈ ہے اور میں کسی شرط پر بھی برطانوی حکومت کی ہاں میں ہاں ملانے کو تیار نہیں تھا۔"[11] جناح نے مزید کہا کہ "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں نے جو کچھ بھی کیا ہے اس سے مجھ میں ذرا سا بھی فرق نہیں آیا۔ میں ویسا ہی ہوں جیسا کہ میں ان دنوں تھا جبکہ میں نے انڈین

نیشنل کانگرس میں شرکت کی تھی۔ یہ ممکن ہے کہ میں نے بعض مواقع پر غلطی کی ہو لیکن میں نے کبھی ایسا جانبدارانہ طریقے سے نہیں کیا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہندوستان کا مفاد آج بھی اور آئندہ بھی میرے لئے مقدس رہے گا اور کوئی چیز مجھے اس مؤقف سے ایک انچ بھی نہیں ہٹا سکتی۔''[12] پھر اکتوبر 1936ء میں جناح انتخابی مہم پر لاہور آئے تو 14 راکتوبر کو ڈی۔اے۔وی کالج، سناتن دھرم کالج، دیال سنگھ کالج وغیرہ کے ہندو طلبا نے مسٹر جناح کے اعزاز میں ایک جلسہ لاجپت رائے ہال میں منعقد کیا جس کی صدارت سر منوہر لال نے کی۔ اس جلسہ میں سر منوہر لال کی تحریک پر حاضرین نے بالاتفاق یہ قرارداد منظور کی کہ ''مسٹر جناح ہندوستان کے بہت بڑے اور قابلِ فخر محبِ وطن لیڈر ہیں۔''[13]

ظاہر ہے کہ ہندوؤں کی جانب سے جناح کی سیاسی زندگی کی اس قسم کی تصویر کشی اور خود اُن کی طرف سے لاہور میں یہ کہنا کہ میں ویسا ہی ہوں کہ جیسا کہ میں اس زمانے میں تھا جب میں نے انڈین نیشنل کانگرس میں شرکت کی تھی، پنجابی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کو پسند نہ آسکتا تھا اور نہ آیا۔ اس طبقہ کو حیرانی تھی کہ علامہ اقبال کو، جسے اس نے حکیم الامت کا خطاب دے رکھا تھا، بھی مسلم لیگ کے انتخابی منشور پر کوئی اعتراض نہیں تھا جس میں یہ اشارہ ملتا تھا کہ مسلم لیگ کانگرس سے میثاق لکھنؤ کی طرز کا سمجھوتہ کرلے گی اور نہ ہی انہیں جناح کی متذکرہ قسم کی سرگرمیوں اور تقریروں پر کوئی اعتراض تھا جن میں ہندو کانگرس کے نظریہ انڈین نیشنلزم کی بو آتی تھی۔ پنجابی مسلمانوں کا درمیانہ طبقہ جناح کی اس قسم کی سیاست کو پسند نہیں کرسکتا تھا کیونکہ اسے 1921ء کے بعد یہ تلخ تجربہ ہوا تھا کہ ہندو سرمایہ دار اور ساہوکار صوبہ کی مسلم اکثریت کو کوئی سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقوق دینے پر آمادہ نہیں۔ بے روزگار تعلیم یافتہ مسلم نوجوانوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ درخواستیں لے کر در در کی ٹھوکریں کھاتے تھے لیکن ان کے لئے سرکاری و غیر سرکاری اداروں میں روزگار کے سارے دروازے بند تھے اور پھر شہید گنج کے حادثہ خونین کی یاد بھی ابھی تازہ تھی لہٰذا وہ جناح کی قوم پرستی کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ انہیں ایک طرف تو نچلے درمیانہ طبقہ کے مجمع باز لیڈروں کی مجلس احرار اور مجلس اتحاد ملت جیسی فرقہ پرست اور مذہب فروش جماعتوں نے گمراہ کن نعروں سے پریشان کیا ہوا تھا۔ دوسری طرف یونینسٹ پارٹی نے ان کے لئے دیہاتی اور شہری کا مسئلہ پیدا کر رکھا تھا اور تیسری طرف جناح کی قوم پرستی انہیں ہندوستانی

نیشنلزم کی طرف دھکیل رہی تھی جہاں انہیں اپنا کوئی مستقبل نظر نہیں آتا تھا۔

علامہ اقبال کی مسلم لیگ واقعی چند متفرق افراد پر مشتمل تھی جن کا مسلم عوام سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ان برآمدہ نشینوں اور خوشامدیوں کی سیاست کا انحصار حکیم الامت کی ہر بات کو کشف یا الہام قرار دینے پر تھا۔ خود علامہ کی صحت بہت خراب رہتی تھی اور انہوں نے انتخابی مہم میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا اور اگر اُن کی صحت نہ بھی خراب ہوتی تو بھی سیاست اُن کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ ایک نہایت اعلیٰ پایہ کے شاعر حقیقت بیان تھے جن کے سینے میں بڑا ہی دردمند دل تھا۔ وہ برصغیر کے مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی اور معاشی زبوں حالی پر اپنی شاعری کے ذریعے خون کے آنسو بہاتے تھے اور پنجابی مسلمانوں کا تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ ان کے ان شاعرانہ افکار و جذبات سے بے حد متاثر تھا۔ لیکن ان ساری خوبیوں کے باوجود علامہ کو 37-1936ء میں انتخابی مہم کے لئے وہ ہتھکنڈے نہیں آتے تھے جو اس زمانے کے پیشہ ور سیاست بازوں کا معمول بن گئے تھے۔ پنجاب کی مسلم لیگ ایسی غیر سیاسی شخصیت کی قیادت میں انتخابات میں کامیابی حاصل نہیں کر سکتی تھی اور نہ اس نے کی۔

مسلم لیگ کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ شہروں کے جن چند وکلا اور دانشوروں نے مسلم لیگ کا پرچم اٹھایا ہوا تھا ان کا دیہاتی عوام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ دیہات میں جاگیرداریت اپنے عروج پر تھی اور اسے سرکاری مشینری کی بھی امداد و اعانت حاصل تھی۔ کوئی مزارع یا کھیت مزدور یا دستکار، تھانیدار اور تحصیلدار کی مرضی کے خلاف ووٹ دینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ بڑے بڑے جاگیردار اسمبلی کی نشست کو اپنی ملکیت سمجھتے تھے اور وہ کسی شہری سیاسی کارکن کو اپنے حلقۂ انتخاب میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

انتخابات اور وزارت سازی کے دوران کانگرس کی کوتاہ اندیشی اور لیگ۔کانگرس تضاد

تاہم جناح کی انڈین نیشنلزم پر کھلم کھلا دلدادگی کے باوجود ان انتخابات کے دوران پنجاب اور برصغیر کے دوسرے علاقوں میں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان خاصی تلخی پیدا ہو گئی کیونکہ نہرو کا اصرار تھا کہ وہ بلا لحاظ مذہب و ملت ہندوستان کے سارے عوام کی نمائندہ ہے اس

لئے وہ مسلم حلقوں سے بھی انتخاب میں حصہ لے گی۔ دوسری طرف جناح کا مؤقف یہ تھا کہ کانگرس خواہ مخواہ مسلم لیگی امیدواروں کے مقابلے میں اپنے امیدوار کھڑے کر رہی ہے۔ کانگرس کو چاہیے کہ مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب میں دخل نہ دے ورنہ بدمزگی پیدا ہوگی۔ نہرو کا اعلان یہ تھا کہ ''ہندوستان میں صرف دو فریق موجود ہیں یعنی نیشنل کانگرس اور برطانوی حکومت۔ باقی جتنی جماعتیں ہیں ان کو یا کانگرس کے پیچھے چلنا پڑے گا یا حکومت کا ساتھ دینا ہوگا۔'' اس پر جناح نے یہ جواب دیا کہ ''ہندوستان میں دو نہیں بلکہ تین فریق ہیں۔ نیشنل کانگرس، برطانوی حکومت اور مسلمان۔ ہم نہ کانگرس کے خیمہ بردار بننے پر تیار ہیں اور نہ حکومت کی کاسہ لیسی کرنے پر آمادہ ہیں۔ ہماری اپنی قومی پالیسی اور ہمارا اپنا قومی پروگرام ہے۔''

کانگرس نے انتخابات میں ہندوستان کے چھ صوبوں میں زبردست کامیابی حاصل کی اور اس نے قدرے پس و پیش کے بعد جولائی 1937ء میں ان صوبوں میں اپنی وزارتیں بنائیں۔ جناح نے ان کی اس وزارت سازی سے قبل بہت کوشش کی کہ ان صوبوں میں کانگرس اور مسلم لیگ کی مخلوط حکومتیں بنیں تاکہ برصغیر میں پائیدار ہندو۔ مسلم اتحاد کے لئے فضا سازگار ہو سکے مگر کانگرس کی کوتاہ اندیش قیادت نے جناح کا دست تعاون قبول کرنے سے انکار کر دیا حالانکہ کانگرس کو انتخابی نتائج کے پیش نظر ہندوستان کے مسلمانوں کی کل 500 نشستوں میں سے صرف 25 نشستیں ملی تھیں اور ان 25 میں سے 15 نشستیں صوبہ سرحد میں شامل تھیں۔ گویا صوبہ سرحد کو چھوڑ کر باقی پورے ہندوستان میں کانگرس کو صرف دس مسلمان اپنے حامی و مددگار مل سکے۔ پنجاب کے کامیاب امیدواروں میں ایک تو میاں افتخار الدین تھا جو اپنے جاگیردارانہ اثر و رسوخ اور ارائیں برادری کی امداد سے کامیاب ہوا تھا اور دوسرا چودھری محمد حسن جو لدھیانہ کے دیہی علاقے سے اپنی برادری کے زور پر منتخب ہوا تھا۔

وزارت سازی سے قبل جواہر لال نہرو مسلم رابطہ عوام کی مہم شروع کر چکا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ہندو۔ مسلم تضاد مصنوعی ہے۔ اصل تضاد غریب اور امیر کے درمیان ہے۔ اگر کانگرس غریب مسلم عوام سے رابطہ قائم کرے گی تو وہ اس کی تائید و حمایت کرنے میں تامل نہیں کریں گے۔ وہ جناح سے نفرت کرتا تھا حالانکہ 21رجنوری سے 9راپریل 1935ء تک مرکزی اسمبلی میں جناح کی انڈیپینڈنٹ پارٹی نے کانگرس پارٹی سے اشتراک و تعاون کر کے حکومت کو

پے در پے شکستیں دی تھیں اور انہوں نے اپنے انتخابی منشور میں بھی کانگرس سے پائیدار سمجھوتے کا ارادہ ظاہر کیا تھا تا کہ 1921ء کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان جو فرقہ وارانہ خانہ جنگی کا سلسلہ شروع ہوا تھا وہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو سکے۔ یہ نہرو ہی تھا جس کے کہنے پر کانگرس نے مسلم لیگ کے دست تعاون کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ حالانکہ لیگ کو مسلم اقلیتی صوبوں میں نمایاں کامیابی ہوئی تھی۔ نہرو اور دوسرے کانگرسی لیڈروں کی خواہش تھی کہ مسلم لیگ اپنی جداگانہ ہستی کو ختم کر کے کانگرس میں ضم ہو جائے۔ جب جناح نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان زبردست سیاسی محاذ آرائی شروع ہو گئی اور یہاں سے جناح کی مسلم عوام میں مقبولیت کا دور شروع ہوا۔

یو۔ پی میں کانگرس نے رفیع احمد قدوائی کو وزارت کا منصب سونپ دیا جو چودھری خلیق الزماں کی امداد سے ایک ضمنی انتخاب میں بلا مقابلہ کامیاب ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ابوالکلام آزاد کے کہنے پر حافظ محمد ابراہیم جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کامیاب ہوا تھا، مسلم لیگ سے مستعفی ہو کر کانگرس کی وزارت میں شامل ہو گیا۔ یہی حربہ کانگرس نے مدراس، بمبئی، صوبجات متوسط اور بہار میں استعمال کیا اور اس طرح اس نے ہندو۔مسلم اتحاد کے امکان کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ پنجاب سمیت برصغیر کے سارے باشعور مسلمانوں میں یہ تاثر پختہ ہو گیا کہ کانگرس دراصل ہندوؤں کی جماعت ہے اور یہ جماعت چند مسلمان پٹھوؤں کو اپنے ساتھ ملا کر برصغیر میں ہندو راج نافذ کرنا چاہتی ہے۔ جواہر لال نہرو کی رابطہ مسلم عوام کی مہم نے یہ تاثر اور بھی پختہ کر دیا کیونکہ وہ اپنی تقریروں میں سات آٹھ کروڑ مسلمانوں کی جداگانہ معاشرتی و ثقافتی ہستی کو تسلیم ہی نہیں کرتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ مسلم لیگ تعلقہ داروں اور سامراجی پٹھوؤں کی جماعت ہے جو مسلمانوں کے جداگانہ حقوق کی آڑ لے کر ہندوستان کی آزادی کے راستے میں حائل ہو رہی ہے۔

جواہر لال نہرو کی اس قسم کی غیر حقیقت پسندانہ تقریروں نے برصغیر میں ہندو۔مسلم اختلافات کی خلیج کو پاٹنے کی بجائے اور وسیع کر دیا اور اس سلسلے میں جو تھوڑی بہت کسر باقی رہ گئی تھی وہ متذکرہ صوبوں میں کانگرس کی وزارتوں کی فرقہ پرستانہ پالیسی نے چند ہی ماہ میں پوری کر دی۔ کانگرسی وزارتوں کی اس فرقہ پرستی نے مسلم عوام کو بہت خوفزدہ کیا اور انہیں یہ محسوس ہوا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت واقعی خطرے میں ہے۔ اگر ابھی سے کل ہند سطح پر

کانگرس کے ہندو راج نافذ کرنے کے منصوبے کی مزاحمت نہ کی گئی تو یہاں مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کو پارلیمانی جمہوریت کا دیو استبداد ہڑپ کر جائے گا۔ الہ آباد یونیورسٹی کا پروفیسر ڈاکٹر بینی پرشاد لکھتا ہے کہ ''1937ء میں جب کانگرس نے ہندو اکثریت کے بل پر خالص کانگرسی وزارتیں مرتب کیں اور اس کے ساتھ مسلم رابطہ عوام کی تحریک بھی جاری کر دی تو مسلمانوں کو صاف نظر آنے لگا تھا کہ آئندہ فیڈریشن میں بھی وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جائیں گے۔ ان اسباب نے مل کر مسلمان قوم میں ایک سخت ہیجان و اضطراب پیدا کر دیا تھا۔ یہ گویا مسلم لیگ کی آزمائش کی گھڑی تھی۔ لیگ نے کانگرس کے اس چیلنج کو، جو اس کے نزدیک تکبر و غرور اور نشۂ اقتدار کا نتیجہ تھا، بخوشی قبول کر لیا...... مسلم لیگ نے مسلمانوں کو ایک پرچم کے نیچے جمع کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ کیا اور کانگرس کو ایک سراسر ہندووانہ جماعت قرار دیا۔''[14]

کانگرس کی اس پالیسی سے پنجاب کے شہری مسلمانوں کے تعلیم یافتہ عناصر کو بالخصوص بہت تشویش ہوئی کیونکہ انہیں ہندو سرمایہ داروں اور ساہوکاروں کی تنگدلی و تنگ نظری کا بہت ہی تلخ تجربہ ہو چکا تھا۔ ان کا یہ خدشہ بے جا نہیں تھا کہ جب بھی ہندوستان پر سے انگریزوں کی گرفت ڈھیلی ہوئی، ہندو اور سکھ سرمایہ دار اپنی دولت کے زور سے مسلم اکثریت کے صوبہ پنجاب میں بھی اپنی سیاسی بالادستی قائم کر لیں گے اور اس طرح وہ مسلمانوں کو سیاسی، معاشرتی اور معاشی طور پر شودر بنائے رکھیں گے۔ انہوں نے مشاہدہ کیا تھا کہ کانگرس کا نصب العین فی الحقیقت مسلمانوں کے قومی شیرازہ کو منتشر کرنا ہے۔ اس کا کوئی سیاسی اخلاق اور اصول نہیں ہے۔ بظاہر یو۔ پی، سی۔ پی، بہار، بمبئی، مدراس اور اڑیسہ میں تو اس کی پالیسی یہ ہے کہ کسی غیر کانگرسی کو وزارت میں جگہ نہیں دی جائے گی کیونکہ پارلیمانی جمہوریت کا تقاضا ہے کہ صرف ایک پارٹی کی ایسی حکومت ہو جس میں مکمل ہم آہنگی پائی جاتی ہو۔ لیکن جب صوبہ سرحد کے مسلمانوں میں انتشار پھیلانے کا موقع ہاتھ آیا تو فوراً یہ ناقابل ترمیم اصول بالائے طاق رکھ دیا گیا اور وہاں اس نے اپنے پٹھوؤں کو مخلوط وزارت بنانے کی اجازت دے دی۔ یہ واقعہ ستمبر 1937ء میں ہوا جبکہ صوبہ سرحد میں خان عبدالقیوم خان کی وزارت کو حزب مخالف کے ہاتھ سے شکست ہوئی۔ اسمبلی کے ارکان کی کل تعداد 50 تھی جن میں کانگرسی ارکان کی تعداد صرف 19 تھی۔ چونکہ تنہا کانگرس اپنے بل بوتے پر

نئی وزارت بنانے کے قابل نہ تھی اس لئے ابوالکلام آزاد نے، جو صوبہ سرحد کا انچارج تھا، ڈاکٹر خان صاحب کو یہ اجازت دے دی کہ وہ غیر کانگرسی عناصر کو ساتھ ملا کر وزارت بنا لے۔ چنانچہ اس نے چار ممبر ڈیموکریٹ پارٹی کے، دو آزاد اور دو مہا سبھائی ممبروں کو اپنے ساتھ ملا کر ''کانگرسی وزارت'' قائم کر لی۔ اس کی وزارت میں ڈیموکریٹ پارٹی کا ایک غیر کانگرسی وزیر بھی شامل تھا۔

سکندر۔جناح معاہدہ، اسباب اور مضمرات

اس صورت حال میں پنجابی مسلمانوں کا درمیانہ طبقہ بڑی تیزی کے ساتھ آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر محمد علی جناح کی طرف مائل ہو گیا جنہیں جواہر لال نہرو اور دوسرے کانگرسی لیڈروں کی فرعونیت و رعونت نے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے دیرینہ نظریہ انڈین نیشنلزم سے انحراف کر کے صرف مسلمانوں کے مفادات و حقوق کے علمبردار بنیں۔ جب پنجاب کے برسر اقتدار مسلم جاگیرداروں نے یہ دیکھا کہ علامہ اقبال کی مسلم لیگ کی بے عملی کے باوجود شہروں کی مسلم رائے عامہ برق رفتاری سے جناح کی طرف مائل ہو رہی ہے تو انہیں بھی اپنے اقتدار کے تحفظ کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کے تعاون کی ضرورت محسوس ہوئی۔ مزید برآں انہیں خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ اگر نئے آئین کے تحت مرکز میں بھی کانگرس کا بلا شرکت غیرے غلبہ ہو گیا تو انہوں نے صوبہ پنجاب میں چند ہندو جاٹوں کے تعاون سے جو حکومت بنا رکھی ہے وہ زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکے گی۔

انگریزوں کو بھی اس موقع پر مسلم جاگیرداروں کے مسلم لیگ کے ساتھ رابطہ پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ کانگرسی لیڈروں کی کوتاہ اندیشی نے جناح کے پروگرام کے مطابق ایسے ہندو۔مسلم اتحاد کا امکان ختم کر دیا تھا جس سے ان کے سامراجی مفادات کو نقصان پہنچ سکتا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ صوبہ سرحد میں کانگرسی وزارت کے قیام کے بعد یہ ضروری ہو گیا تھا کہ پنجابی جاگیرداروں کی حکومت کسی صورت کمزور نہ ہونے پائے۔ برطانیہ میں نیول چیمبرلین کی قومی حکومت بن چکی تھی۔ اس کی کوشش یہ تھی کہ ہٹلر کی جنگی تیاریوں کا رخ کسی نہ کسی طرح سوویت یونین کی طرف موڑ دیا جائے اور سوویت یونین میں سٹالن نے سول انتظامیہ اور فوج میں سے ان عناصر کی تطہیر شروع کر دی تھی جن کی وفاداری مشکوک تھی۔ ایسے حالات میں برطانوی سامراج کو شمالی ہندوستان کے بھرتی والے صوبہ یعنی پنجاب میں اپنے وفادار

جا گیرداروں کی مستحکم وزارت کی ضرورت تھی اور سر سکندر کی وزارت اس وقت تک مستحکم تصور نہیں کی جا سکتی تھی جب تک کہ اسے شہروں کی مسلم رائے عامہ کی پوری تائید وحمایت حاصل نہ ہو جائے۔ اگر سر سکندر کو انگریز گورنر کی اشیر باد حاصل نہ ہوتی تو وہ مسلم رائے عامہ کے دباؤ کے باوجود جناح سے رابطہ پیدا کرنے کی جرأت نہ کرتا۔

ایس۔ایم۔اکرام کے بقول سر سکندر کی وزارت انگریز بیوروکریسی کے رحم وکرم پر تھی اسی لئے وہ سر فضل حسین کے برعکس انگریز افسروں کے ساتھ بڑی نرمی کا برتاؤ کرتا تھا۔ اسمبلی میں مسلمان اور غیر مسلم ارکان کی تعداد تقریباً برابر تھی۔ انگریز گورنر کے کہنے پر یونینسٹ پارٹی کے غیر مسلم ارکان کسی وقت بھی وزیراعظم کا ساتھ چھوڑ سکتے تھے۔ لہٰذا کوئی بھی وزیراعظم گورنر کی خوشنودی کے بغیر اپنے عہدہ پر قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ صوبائی خودمختاری کے تحت پنجاب کی حیثیت ان صوبوں سے بالکل مختلف تھی جن میں کانگرس کی وزارتیں قائم ہوئی تھیں۔"[15]

بظاہر برطانوی سامراج نے اپنے عالمی مفادات کے پیش نظر جولائی 1935ء کے ایکٹ کے تحت پنجاب میں مختلف فرقوں کے درمیان سیاسی قوت کا توازن دانستہ طور پر نازک حالت میں رکھا تھا تاکہ فوجی اہمیت کے اس صوبہ میں جو سیاسی عناصر برسراقتدار آئیں وہ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے انگریز گورنر کی سرپرستی کے محتاج رہیں۔ سر فضل حسین کے برعکس سر سکندر کی نمایاں انگریز پرستی کا راز برطانوی حکومت کے اس سامراجی تدبر میں مضمر تھا۔ سر فضل حسین بھی انگریز افسروں کو ناراض کرنے کے بعد زیادہ دیر تک بااختیار نہیں رہ سکا تھا۔ 1924ء میں نئے گورنر سر میلکم ہیلی نے اسے اپنی کونسل کا ریونیو ممبر نامزد کر کے سیاسی طور پر بے دست و پا بنا دیا تھا اور عملی طور پر یہ بتا دیا تھا کہ ایاز قدرِ خود بشناس۔ سر فضل حسین کی جانب سے انگریزوں کی غیر مشروط تابعداری کا دور اس کے بعد ہی شروع ہوا تھا اور سر سکندر نے یہ بات اپنے سیاسی باپ سے ورثہ میں پائی تھی۔

چنانچہ وزیراعظم سر سکندر گورنر کی اشیر باد لے کر اپنے وفادار لیگ کونسلروں کو ساتھ لے کر 13 اکتوبر کو لکھنؤ پہنچا جہاں 15 اکتوبر کو محمد علی جناح کی زیرِ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا۔ علامہ اقبال اپنی علالت کے باعث لکھنؤ نہیں جا سکے تھے تاہم چند دن قبل یعنی 7 اکتوبر کو وہ بسترِ علالت سے جناح کے نام ایک خط میں لکھ چکے تھے کہ جن یونینسٹ

کونسلروں نے جون 1936ء میں مسلم لیگ سے بغاوت کی تھی انہیں کونسل سے خارج کر دیا جائے اوران کی جگہ اُن کے نامزد کردہ 28افراد کو کونسل میں شامل کیا جائے۔علامہ نے لکھا تھا کہ ''لیگ کونسل کی خالی نشستوں کے لئے میں اٹھائیس آدمیوں کی فہرست تیار کر کے مسٹر غلام رسول کو دے دوں گا۔ وہ یہ فہرست آپ کو دکھائیں گے۔ مجھے امید ہے کہ آپ بڑے غور سے ان اٹھائیس ممبروں کا انتخاب کریں گے۔ ہمارے آدمی 13راکتوبر کو لکھنؤ پہنچیں گے۔'' علامہ کے آدمیوں میں شہری درمیانہ طبقہ کے ملک برکت علی،میاں غلام رسول خان، پیر تاج الدین،میاں عبدالمجید، ملک زمان مہدی،خلیفہ شجاع الدین اور عاشق بٹالوی شامل تھے۔جبکہ سر سکندر کے لشکر میں پنجاب کے پشتینی جاگیردار اور سامراجی پٹھو ملک خضر حیات ٹوانہ،نواب نثار علی خان،میاں احمد یار دولتانہ، بیگم شاہ نواز، میاں امیر الدین، سید امجد علی،نوابزادہ خورشید علی خان، نواب سر شاہ نواز آف ممدوٹ،سر شیر محمد خان اور نواب مظفر خان وغیرہ شامل تھے۔تاہم جناح کی سیاسی مصلحت نے انہیں علامہ اقبال کے مشورے پر عمل کرنے کی اجازت نہ دی۔انہوں نے ایسے ہی حالات کی صحیح پیش بینی کر کے جون 1936ء میں یونینسٹوں کو مسلم لیگ سے خارج نہیں کیا تھا حالانکہ سر فضل حسین نے جناح سے بہت بدسلوکی کی تھی۔اب جناح نے اس توہین آمیز واقعہ کو فراموش کر کے خود ہی سر سکندر اور اس کے 28 یونینسٹ کونسلروں کو دعوت نامے بھجوائے تھے۔ چودھری خلیق الزماں کے بیان کے مطابق جناح لکھنؤ آنے سے پہلے سر سکندر حیات سے تصفیہ کی بات چیت کر چکے تھے۔سر سکندر چاہتا تھا کہ اسے پنجاب میں یونینسٹ پارٹی قائم رکھنے کی آزادی دی جائے تا کہ اسے اقلیتی فرقے کا تعاون حاصل رہے۔جب سر سکندر 13راکتوبر کو اپنے ''اشراف'' سمیت لکھنؤ پہنچا تو جناح نے اس رات علامہ اقبال کے مشورے کے برعکس یونینسٹ لیڈر سے ایک معاہدہ کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ''پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کے تمام مسلم ارکان لیگ میں شامل ہو جائیں گے لیکن ان کا یہ فعل یونینسٹ پارٹی کی موجودہ کولیشن وزارت پر اثر انداز نہیں ہوگا...... یونینسٹ پارٹی کے مسلم ارکان کو اجازت ہوگی کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاسی پالیسی اور پروگرام کے بنیادی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی دوسری پارٹی سے تعاون یا اتحاد کریں۔اس قسم کا تعاون انتخابات کے ماقبل یا مابعد ہر دو صورتوں میں کیا جا سکتا ہے۔'' اس معاہدے کے بعد اگلے دن جب سر سکندر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں آیا تو جناح نے کھڑے ہو کر اس کو

خوش آمدید کہا اور حاضرین کو بتایا کہ سر سکندر اور اس کی جماعت مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں گے۔

جناح کی جانب سے علامہ اقبال کے مشورے پر عمل نہ کرنے اور پنجاب کے دقیانوسی جاگیرداروں کے ساتھ ایک ڈھیلا ڈھالا اور مشروط اتحاد کرنے کی وجہ یہ تھی کہ جناح کل ہند سطح پر مسلمانوں کا وسیع ترین محاذ قائم کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے بنگال کے فضل الحق اور آسام کے سر سعد اللہ کو بھی لیگ کے اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ انہیں تنہا کانگرس سے سیاسی محاذ آرائی کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی کیونکہ انہیں یہ طعنہ دیا جاتا تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلم لیگ کو کوئی پوچھتا نہیں ہے یہ صرف مسلم اقلیت کے صوبوں کے تعلقہ داروں کی جماعت ہے۔ چنانچہ جب ہندوستان کے بازوئے شمشیر زن کے وزیر اعظم سر سکندر نے مسلم لیگ میں شرکت کا اعلان کیا تو مسلم لیگ کو بہت تقویت ملی اور پھر جب اسی اجلاس میں بنگال کے وزیر اعظم مولوی فضل الحق اور آسام کے سر محمد سعد اللہ نے بھی مسلم لیگ میں شرکت کا اعلان کر دیا تو مسلم اقلیت کے صوبوں کے کونسلروں نے بے پناہ مسرت و شادمانی کا اظہار کیا کیونکہ انہیں محسوس ہوا کہ ہندو کانگرس کے استبداد کے مقابلے میں وہ تنہا نہیں ہیں بلکہ مسلم اکثریتی صوبوں کے مسلمان بھی ان کے ساتھ ہیں۔ جناح کا سیاسی وقار آسمان تک پہنچ گیا۔ پروفیسر کوپ لینڈ کے بقول "ان تینوں مسلمان وزرائے اعظم کی شرکت نے مسلم لیگ میں زندگی کی جو روح پھونکی وہ تمام پر جوش تقریروں سے زیادہ تھی۔ مسٹر جناح کا شمار اگرچہ ہمیشہ ہندوستان کے صف اول کے لیڈروں میں ہوتا رہا تھا لیکن انہیں اب تک اپنی قوم کی مجموعی اور غیر مشروط تائید کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کے قائد اعظم ہونے کے بجائے وہ ہمیشہ مسلمانوں کے ایک خاص طبقے کے لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ انہیں سیاسیات کے بائیں بازو کا ایک ایسا لیڈر خیال کیا جاتا تھا جو برطانوی اقتدار کا سخت مخالف اور ہندوستانی قومیت کا بے خوف علمبردار تھا۔ انہی خصائص کی بنا پر قدامت پسند مسلمان انہیں کانگرس کا حامی سمجھنے پر مجبور تھے لیکن اب جناح کی حیثیت یہ نہیں رہی تھی۔ وہ مسلمانوں کے بہت سے لیڈروں میں سے ایک لیڈر نہیں تھے بلکہ وہ پوری قوم کے تنہا اور واحد لیڈر بن گئے تھے۔"[16]

پروفیسر کوپ لینڈ نے یہ نہیں لکھا کہ جناح کو اس سیاسی مقام پر پہنچانے میں جواہر لال نہرو اور کانگرس کے دوسرے فرعون مزاج اور کوتاہ اندیش لیڈروں کا کس قدر ہاتھ تھا۔ کانگرس کے

یہ لیڈر ہندوؤں کے ایسے بورژوا طبقے کی نمائندگی کرتے تھے جو برطانوی سامراج کے نقش قدم پر چل کر اور سات آٹھ کروڑ مسلم اقلیت کو ایک ہی نوالے میں ہڑپ کر کے ایشیا میں ایک عظیم بورژوا سلطنت قائم کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ لیکن مسلم لیگ کے اکتوبر 1937ء کے سیشن نے اس کا یہ سہانا خواب پریشان کر دیا۔ محمد علی جناح مسلمانوں کے قائداعظم بن گئے۔ مسلم لیگ راتوں رات عوامی جماعت بن گئی۔ اس کی رکنیت کا سالانہ چندہ جو 1931ء میں پانچ روپے سے کم کر کے ایک روپیہ کیا گیا تھا اب مزید کم کر کے دو آنے کر دیا گیا۔ اس سیشن کے فوراً بعد یو۔ پی میں مسلم لیگ کی 90 برانچیں قائم ہو گئیں اور پنجاب میں لیگ کی برانچوں کی تعداد 40 ہو گئی۔ برصغیر کے دوسرے علاقوں میں بھی ہر مسلمان کے گھر میں مسلم لیگ کا طوطی بولنے لگا اور کانگرس کی متحدہ ہندوستانی قومیت کے پرخچے اڑ گئے۔

علامہ اقبال کی زیر قیادت پنجاب مسلم لیگ کے جائنٹ سیکرٹری عاشق بٹالوی کا کہنا ہے کہ سر سکندر حیات نے خلوص دل سے مسلم لیگ میں شمولیت نہیں کی تھی۔ اس نے ایسا محض اس لئے کیا تھا کہ اس کی ''یونینسٹ پارٹی کانگرس کے سیاسی و اقتصادی پروگرام کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ اگر اس کے مقابلے میں یونینسٹ پارٹی کے ہندو ممبر کٹ کر کانگرس میں شامل ہو جاتے تو یونینسٹ پارٹی ختم ہو جاتی اور اگر سندھ، سرحد اور آسام کی طرح خود مسلمانوں ہی کا ایک طبقہ کانگرس کا ہم نوا بن جاتا تو بھی یونینسٹ پارٹی کے مٹ جانے میں کوئی شک نہیں تھا۔ سر سکندر گویا ایک مخمصے میں گرفتار تھے اگر وہ کھلے بندوں کانگرس کے مقابلے میں مسلمانوں کو منظم کرنے کے لئے میدان میں اتر آتے تو یونینسٹ پارٹی کا بھرم قائم نہیں رہ سکتا تھا اور اگر وہ خاموشی سے تماشا دیکھتے اور محض اپنے اقتصادی پروگرام پر اعتماد کر کے بیٹھے رہتے تو کانگرس کی یلغار کے سامنے ان کی وزارت کا بہت دنوں تک قائم رہنا محال تھا۔ صوبے کے تمام ہندو اخبار کانگرس کی پشت پر تھے اور ہندوؤں کی بے اندازہ دولت کانگرس کو اپنے پروپیگنڈا کے لئے ہر وقت میسر تھی۔ مسلمان اخباروں میں سے صرف روزنامہ انقلاب یونینسٹ پارٹی کا حامی تھا۔''[17]

لیکن بیگم شاہنواز، جو یونینسٹ پارٹی کی رکن کی حیثیت سے سر سکندر کے ساتھ لکھنؤ گئی تھی، کہتی ہے کہ سر سکندر نے مسلم لیگ میں شمولیت اس لئے اختیار کی تھی کہ مسلم لیگ مسلمانوں میں ہر دلعزیز ہو رہی تھی۔ وہ لکھتی ہے کہ ''جناح کی شخصیت، قیادت، عملی کام اور مسلسل دوروں نے

مسلم لیگ کی قومی تنظیم میں نئی روح پھونک دی تھی۔ چنانچہ یونینسٹ پارٹی کے مسلم ارکان بہت بے چینی محسوس کرنے لگے تھے لیکن کوئی اس سلسلے میں اپنے لیڈر سے بات کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ایک دن یونینسٹ پارٹی مسلم ارکان کے اجلاس میں سر سکندر آیا تو پارٹی کے کم عمر ارکان نے مجھ سے کہا کہ تم اس مسئلہ پر بات کرو۔ ان کی مخلصانہ رائے یہ تھی کہ ہمیں مسلم لیگ سے مفاہمت کر لینی چاہیے۔انتخابات کو ہوئے تقریباً ایک سال گزر گیا تھا اور پنجاب میں بھی مسلم لیگ مقبول ہو رہی تھی۔لوگوں میں قوم کے لئے متحد ہو کر کام کرنے کا بے پناہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔''[18]

یکم ستمبر 1937ء کو یونینسٹ پارٹی کے ترجمان اخبار''انقلاب'' کی تحریک پر آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا قیام عمل میں آچکا تھا جسے علامہ اقبال، ملک برکت علی، مولانا ظفر علی خان، سر شاہنواز آف ممدوٹ اور دوسرے متعدد غیر کانگرسی ہر مکتب فکر کے مسلمان زعما کی اعلانیہ تائید وحمایت حاصل تھی۔ مسلم طلبا نے اس تنظیم کے تحت مسلم لیگ اور جناح کے حق میں زبردست جوش و جذبے کا مظاہرہ کیا۔ حالانکہ اس کے ابتدائی عہدیدار یونینسٹ پارٹی کے جاگیرداروں کے ہی پروردہ تھے۔ بظاہر اس تنظیم کے قیام میں سر سکندر کا بھی ہاتھ تھا کیونکہ اس کا پہلا جنرل سیکرٹری روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر عبدالمجید سالک کا بیٹا عبدالسلام خورشید تھا جس کی یونینسٹ پارٹی سے وفاداری کی استواری میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔تاہم یہ حقیقت دلچسپی سے خالی نہیں کہ سر سکندر کی چھوٹی بیٹی طاہرہ کے منگیتر اور نواب مظفر خان کے بیٹے نوابزادہ مظہر علی خان نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن سے کوئی رابطہ قائم نہ کیا اور وہ بدستور کمیونسٹ نواز سٹوڈنٹس یونین سے ہی منسلک رہا۔ ہندو اخبارات اور کانگرس نواز آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن نے مسلم طلبا کی اس تنظیم کی سخت مخالفت کی اور یہی بات اس تنظیم کی بسرعت مقبولیت کی سب سے بڑی وجہ بنی اور سر سکندر نے اس کا سنجیدگی سے نوٹس لیا۔مسلم طلبا کی تنظیم دراصل پنجاب کے شہری درمیانہ طبقہ کے روز افزوں فرقہ وارانہ جذبات کی آئینہ دار تھی اور اسلامیہ کالج لاہور اس کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز تھا۔

سید نور احمد کی رپورٹ سے عاشق بٹالوی اور بیگم شاہ نواز کے بیانات کی تائید ہوتی ہے۔اس زمانے میں سر سکندر حیات پر نہ صرف شہروں کی مسلم رائے عامہ کا زبردست دباؤ تھا بلکہ اسے کانگرس سے بھی خطرہ محسوس ہوتا تھا۔نور احمد نے اس رپورٹ میں اپنے ممدوح راجہ غضنفر علی

خان کی شرمناک سیاسی قلابازی کا تو کوئی ذکر نہیں کیا البتہ وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ راجہ غضنفر نے اسی زمانے میں سر سکندر سے اس سوال پر گفتگو کی تھی کہ "کیا پنجاب میں اس قسم کا انتظام نہیں ہو سکتا کہ جس کے ذریعے صوبائی اسمبلی کے اندر یونینسٹ پارٹی اپنی پوری پارلیمانی قوت بھی قائم رکھے اور اس پارٹی کے مسلمان ممبر مسلمانوں کی مرکزی تنظیم میں بھی شامل رہیں۔" وہ مزید لکھتا ہے "جب جولائی 1937ء میں شملہ میں پنجاب اسمبلی کا اجلاس ہوا تو یونینسٹ پارٹی کی صفوں میں کئی ممبر ایسے تھے، بالخصوص نواب شاہ نواز ممدوٹ، جو سر سکندر کو مسلم لیگ کے ساتھ مفاہمت کا مشورہ دے رہے تھے۔ اس وقت تک یہ یقین بھی حاصل کیا جا چکا تھا کہ سر سکندر مسلم لیگ کی تنظیم کا حصہ بننے کے راستے میں جو عملی مشکلات محسوس کرتے تھے، مسٹر جناح ان مشکلات کو حل کرنے میں انہیں ہر جائز مدد دینے کو تیار تھے۔ ابھی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کانگرس کی جانب سے مسلم لیگ کے ساتھ عدم تعاون اور اس کے مقاصد کے خلاف سیاسی جنگ نے واضح صورت اختیار کر لی۔ سر سکندر کا تذبذب ختم ہو گیا۔ کانگرس کے خلاف مسلم لیگ کے ذریعے مسلمانوں کا مضبوط محاذ قائم کرنے کا پروگرام ایسا تھا جو سر سکندر کے لئے ہم خرما و ہم ثواب کا مصداق تھا۔ کانگرس کے عزائم کی مزاحمت ان کی اپنی وزارتی سیاست کو بھی راس آتی تھی اور پورے ملک کے مسلمانوں کے مفاد کے نقطۂ نگاہ سے بھی درست تھی۔"[19]

چنانچہ سر سکندر نے لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کے فوراً بعد اس معاہدے کی یہ وضاحت کی کہ یہ پنجاب میں مختلف جماعتوں پر اثر انداز نہیں ہو گا۔ یہاں اس وقت جو جماعتیں جس جس طرح کام کر رہی ہیں ان میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ البتہ یونینسٹ پارٹی کے ان مسلمان ممبروں کو، جو مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں یہ مشورہ دیا جائے گا کہ وہ لیگ کی رکنیت بھی قبول کر لیں۔ سر سکندر کی اس دوغلی پالیسی کی بنیاد یہ تھی کہ اگر اس نے فرقہ وارانہ مسلم لیگ میں شمولیت اختیار نہ کی تو شہروں کی مسلم رائے عامہ کے روز افزوں دباؤ کی وجہ سے یونینسٹ پارٹی کے سارے مسلمان ممبروں کو مجتمع رکھنا محال ہو جائے گا اور اگر غیر فرقہ وارانہ یونینسٹ پارٹی کو قائم نہ رکھا تو اس پارٹی کے ہندو ممبر علیحدہ ہو جائیں گے اور دونوں صورتوں میں اس کی وزارت قائم نہیں رہے گی۔ گویا وہ بیک وقت دو گھوڑوں پر سواری کرنا چاہتا تھا۔ اگرچہ یہ کام ناممکن تھا لیکن انگریز گورنر ایمرسن اور اعلیٰ انگریز افسروں کے تعاون نے اسے ممکن بنا دیا تھا۔ سر سکندر کے

آباؤاجداد نے برطانوی سامراج کی جو گرانقدر خدمات سرانجام دی تھیں انگریزوں نے 1937ء میں اسے اس کا صلہ دیا تھا۔ مزید برآں برطانوی سامراج کے نقطۂ نگاہ سے سرسکندر جیسے وفادار پٹھو کا پنجاب میں برسراقتدار رہنا اس لئے بھی ضروری تھا کہ آئندہ متوقع عالمگیر جنگ کے دوران ''پنجابی سورماؤں'' کی بھرتی میں آسانی ہو گی۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران بھرتی میں بڑی دشواری پیش آئی تھی اور بالآخر جبری بھرتی کا نتیجہ 1919ء کے خونریز بلوؤں کی صورت میں برآمد ہوا تھا۔ ان دنوں لیفٹیننٹ گورنر مائیکل اوڈوائر آمر مطلق تھا اور صوبہ میں سرکاری پٹھوؤں کی کوئی ''نمائندہ'' حکومت اور تنظیم نہیں تھی۔ جاگیرداروں کی یونینسٹ پارٹی کا قیام 1924ء کے اوائل میں گورنر میکلیگن کی منظوری سے عمل میں آیا تھا۔

سکندر۔جناح معاہدہ، اقبال اور جناح کے مابین اختلافات

قدرتی طور پر محمد علی جناح اور سکندر حیات خان کے درمیان اس معاہدے سے علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال اور اُن کے آدمیوں کو خوشی نہیں ہوئی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس معاہدے کی رو سے جاگیرداروں کی یونینسٹ پارٹی کو بالادستی حاصل ہو گئی ہے اور درمیانہ طبقہ کی مسلم لیگ کو ثانوی حیثیت دے دی گئی ہے۔ چنانچہ فریقین کی طرف سے اس معاہدے کی متضاد تاویلیں شروع ہو گئیں۔ یونینسٹ پارٹی کا بانی رکن چودھری چھوٹو رام یہ کہتا تھا کہ ''یہ پیکٹ یونینسٹ پارٹی پر قطعاً اثر انداز نہیں ہوگا۔ آئندہ ضمنی اور عام انتخابات میں وہ متعدد فریق جو یونینسٹ پارٹی کے اجزائے ترکیبی ہیں، متحد ہو کر اُن امیدواروں کی مدد کریں گے جن کو یہ فریق کھڑا کریں گے اور موجودہ مخلوط حکومت قائم رہے گی'' اور علامہ اقبال کی مسلم لیگ کے سیکرٹری غلام رسول خان کا بیان یہ تھا کہ سرسکندر نے مسٹر جناح کو اپنا لیڈر تسلیم کر لیا ہے۔ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی بنے گی اور یہ پارٹی ایوان کی کسی ایسی پارٹی کے ساتھ مل کر، جس کے اغراض و مقاصد مسلم لیگ کے مطابق ہوں گے، ایک کولیشن بنائے گی اور اس کولیشن کا نام یونینسٹ پارٹی ہوگا۔'' خود علامہ نے اس سلسلے میں 30/اکتوبر، یکم نومبر اور 10/نومبر 1937ء کو جناح کے نام تین خط لکھے جن میں بتایا گیا تھا کہ ''افواہ ہے کہ یونینسٹ پارٹی کا ایک حصہ لیگ کے حلف نامے پر دستخط کرنے کو تیار نہیں ہے...... پیکٹ کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں (30/اکتوبر)...... کیا یہ صحیح ہے

کہ آپ نے اس بات پر رضا مندی کا اظہار فرمایا تھا کہ لیگ پروانشل پارلیمنٹری بورڈ پر یونینسٹ پارٹی کا قبضہ ہو جائے گا۔ سر سکندر مجھ سے کہتے ہیں کہ آپ اس بارے میں اپنی منظوری دے چکے ہیں (یکم نومبر)...... سکندر اور ان کے احباب سے متعدد ملاقاتیں کرنے کے بعد میں قطعی طور پر اس نتیجے پر پہنچ گیا ہوں کہ سر سکندر مسلم لیگ اور پراونشل پارلیمنٹری بورڈ پر مکمل قبضہ کرنا چاہتے ہیں...... سکندر جناح پیکٹ نے پنجاب میں مسلم لیگ کو سخت نقصان پہنچایا ہے اور یونینسٹ پارٹی کے موجودہ ہتھکنڈے جاری رہے تو مزید نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ یونینسٹ پارٹی کے ممبروں نے ابھی تک مسلم لیگ کے حلف نامہ پر دستخط نہیں کئے...... ان کا مقصد یہ تھا کہ آہستہ آہستہ ان کی زمیندارہ لیگ کے پاؤں جم جائیں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ لکھنؤ واپس آ کر سر سکندر نے پنجاب میں ایک زمیندارہ لیگ قائم کی ہے اور اب اس زمیندارہ لیگ کی شاخیں صوبے کے طول و عرض میں پھیلائی جا رہی ہیں۔ براہ کرم مجھے اطلاع دیجئے کہ ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اگر تکلیف نہ ہو تو بلا توقف تار دیجئے اور اگر تار ممکن نہ ہو تو جلد از جلد ایک مفصل خط لکھیے (10 نومبر)۔"[20]

لیکن جناح نے اقبال کے ان خطوط کا کوئی جواب نہ دیا۔ انہوں نے کوئی تار نہ بھیجا اور نہ ہی کوئی مفصل خط لکھا اور اگر کوئی خط لکھا تھا تو اس کا کوئی تاریخی ریکارڈ نہیں ہے۔ پنجاب میں سکندر جناح معاہدہ کی جو متضاد تعبیریں کی جا رہی تھیں وہ دراصل پنجابی مسلمانوں کے جاگیرداروں اور شہری تعلیم یافتہ عناصر کے درمیان طبقاتی تضاد کی آئینہ دار تھیں۔ تنازعہ کی نوعیت یہ تھی کہ صوبہ میں سیاسی بالادستی کے لئے مسلم لیگ کس طبقہ کی آلۂ کار بنے گی۔ بظاہر جناح کا فیصلہ پنجابی جاگیرداروں کے حق میں تھا کیونکہ کل ہند سطح پر کانگرس سے ان کی سیاسی محاذ آرائی کا تقاضا یہی تھا۔ انہوں نے اسی مصلحت کے تحت مسلم لیگ کے دروازے یو۔ پی، بنگال، سندھ اور دوسرے صوبوں کے ان مسلم جاگیرداروں کے لئے دوبارہ کھول دیئے تھے جنہوں نے گزشتہ عام انتخابات سے پہلے اُن کے دست تعاون کو ٹھکرا دیا تھا۔ نوابزادہ لیاقت علی خان بھی، جس نے 1936ء میں مسلم لیگ سے علیحدگی اختیار کر لی تھی، اب پھر مسلم لیگ میں شامل ہو کر اس کا دوبارہ جنرل سیکرٹری بن گیا تھا۔

لکھنؤ سیشن کے بعد جناح کے لئے مسلم جاگیرداروں کے تعاون کی ضرورت میں اس لئے اور بھی اضافہ ہو گیا تھا کہ جواہر لال نہرو اور دوسرے کانگرسی لیڈروں کو اپنی مسلم رابطہ عوام کی مہم کی ناکامی کی بنا پر جناح سے مفاہمت کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ اب صوبائی

اسمبلیوں میں مسلم لیگ پارٹی کے علیحدہ وجود کو ختم کرنے کے مطالبہ سے دستبردار ہو گئے تھے اور مسلم لیگ کے ساتھ مخلوط وزارتیں بنانے پر آمادہ تھے۔ چنانچہ پہلے جواہر لال نہرو اور پھر گاندھی نے اس مقصد کے لئے جناح سے خط و کتابت کی مگر اب جناح 1937ء کی شرائط کے تحت کانگرس سے مفاہمت کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اب جناح کا مطالبہ یہ تھا کہ مسلم لیگ کو برصغیر کے مسلمانوں کی بااختیار نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے۔ یہ خط و کتابت جنوری 1938ء میں شروع ہوئی تھی اور تقریباً ایک سال تک جاری رہی تھی۔ سبھاش چندر بوس اور سر تیج بہادر سپرو نے بھی اس سلسلے میں جناح کو خطوط لکھے۔ جناح نے ان ہندو لیڈروں کے نام اپنے جوابات میں کانگرسی وزارتوں کی فرقہ پرستانہ تعلیمی پالیسی پر سخت نکتہ چینی کی اور اپنے اس مؤقف پر اصرار کیا کہ اب کانگرس سے صرف اسی صورت میں سمجھوتہ ہو سکتا ہے کہ ''مسلم لیگ کو برصغیر کے مسلمانوں کی بااختیار نمائندہ جماعت تسلیم کیا جائے۔''

ظاہر ہے کہ ان حالات میں جناح کی سیاسی مصلحت اسی میں تھی کہ انہیں مسلم اکثریت کے صوبہ پنجاب کے جاگیرداروں کا تعاون حاصل رہے جنہوں نے گزشتہ عام انتخابات میں شاندار کامیابی حاصل کی تھی اور صوبائی اسمبلی میں ان کی بھاری اکثریت تھی جبکہ درمیانہ طبقہ کا صرف ایک رکن تھا۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ جناح نے 1938ء کے اوائل میں جب پنجاب کے لئے نئے پارلیمانی بورڈ کی تشکیل کی تھی تو اس میں سر سکندر کے ''اشراف'' کو نامزد کیا تھا اور اقبال کے ''آدمیوں'' کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اقبال کے ممتاز ترین ''آدمی'' ملک برکت نے جناح کے نام اپنے 3/دسمبر 1937ء کے خط میں درخواست کی تھی کہ نئے پارلیمانی بورڈ میں غلام رسول خان، خلیفہ شجاع الدین، میاں عبدالمجید، حافظ محمد عبداللہ اور عاشق بٹالوی کو نامزد کیا جائے مگر اس کی اس درخواست کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا تھا۔ پنجابی مسلمانوں کا درمیانہ طبقہ ابھی بہت کمزور اور غیر منظم تھا۔ صوبائی مسلم لیگ کا صدر مرض الموت میں مبتلا تھا اور اس کے ''آدمیوں'' کے پاس اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ وہ اپنی جماعت کے مرکزی دفتر میں ایک کلرک کو ملازم رکھ سکتے۔ اس کے مقابلے میں سر سکندر حیات خان تندرست و توانا اور ''خاندانی رئیس'' تھا۔ وہ اپنی کسی بھی سیاسی تنظیم پر لاکھوں روپے خرچ کر سکتا تھا۔

اقبال اور نہرو کی ملاقات

شاید اسی مایوس کن صورت حال کے پیش نظر علامہ اقبال نے جنوری 1938ء میں جواہر لال نہرو کو اپنے گھر بلایا تھا جبکہ وہ ایک مقدمہ میں گواہی دینے کے لئے لاہور آیا ہوا تھا۔ نہرو صوبائی اسمبلی کے کانگرسی رکن میاں افتخار الدین کے ہاں ٹھہرا تھا اور وہ اسی کے ہمراہ علامہ سے ملاقات کرنے کے لئے ان کے مکان واقعہ میو روڈ پر گیا تھا۔ نہرو اپنی کتاب ''ڈسکوری آف انڈیا'' میں اقبال سے اپنی اس ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ ''اقبال پاکستان کے اولین حامیوں میں تھا۔ تاہم معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تجویز کی لغویت اور ان خطرات کو محسوس کر لیا تھا جو اس تجویز میں مضمر ہیں۔ ایڈورڈ ٹامسن نے لکھا ہے کہ اقبال نے ایک ملاقات کے دوران اس سے کہا تھا کہ اس نے پاکستان کی تجویز محض اس لئے پیش کی تھی کہ وہ مسلم لیگ کے اجلاس کا صدر تھا لیکن اب اس کا خیال ہے کہ یہ تجویز ہندوستان کے لئے بالعموم اور مسلمانوں کے لئے بالخصوص سخت نقصان دہ ہوگی۔ اقبال نے غالباً بعد میں اپنا نقطۂ نگاہ بدل لیا تھا یا ممکن ہے اس نے ابتدا میں اس مسئلہ کے جملہ پہلوؤں پر اچھی طرح غور نہیں کیا تھا کیونکہ اس وقت اس مسئلہ کو ابھی اتنی اہمیت نہیں ملی تھی۔ زندگی کے متعلق اس کا سارا نظریہ پاکستان یا ہندوستان کی تقسیم کے تصور سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اپنی زندگی کے آخری برسوں میں اقبال کا رجحان سوشلزم کی طرف بڑھتا ہی چلا گیا تھا۔ سوویت روس نے جو زبردست ترقی کی تھی اس نے اسے اپنی جانب مائل کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ اس کی شاعری نے بھی نیا رخ اختیار کر لیا تھا۔ اپنے انتقال سے چند ماہ قبل، جبکہ وہ صاحب فراش تھا اس نے مجھے بلایا اور میں نے بخوشی اس کے بلاوے کی تعمیل کی۔ جب میں نے بہت سے مسائل کے بارے میں اس سے بات چیت کی تو میں نے محسوس کیا کہ اختلافات کے باوجود ہمارے درمیان کس قدر اشتراک موجود ہے اور اس شخص کے ساتھ چلنا کتنا آسان ہوگا۔ وہ اس وقت پرانی یادیں تازہ کر رہا تھا اور اس نے مختلف موضوعات پر گفتگو کی جس میں میں نے بہت کم حصہ لیا بلکہ زیادہ عرصہ اس کی باتیں سنتا رہا۔ میں نے اس کی اور اس کی شاعری کی تعریف کی اور مجھے یہ محسوس کر کے بے حد خوشی ہوئی کہ وہ مجھے پسند کرتا تھا اور میرے بارے میں اچھی رائے رکھتا تھا۔ میری روانگی سے کچھ دیر پہلے اس نے مجھ سے کہا کہ تمہارے اور جناح میں کون سی

چیز مشترک ہے۔ وہ سیاست کار ہے اور تم محب الوطن ہو۔"[21]

عاشق بٹالوی نے راجہ حسن اختر کے حوالے سے نہرو کے اس بیان کی تردید کرنے کی کوشش کی ہے کہ جنوری 1938ء میں اقبال کا رجحان سوشلزم کی طرف ہو چکا تھا اور یہ کہ وہ جناح کو محض ایک سیاست کار سمجھتے تھے۔ پنجاب میں جن عمر رسیدہ لوگوں کی راجہ حسن اختر سے آشنائی تھی انہیں معلوم ہے کہ یہ شخص کس قدر غیر معتبر، موقع پرست اور غیر ذمہ دار تھا۔ ایسے شخص کی گواہی سے نہرو کی کسی تحریر کی تردید کرنا عاشق بٹالوی کو زیب نہیں دیتا۔ بلاشبہ عاشق بٹالوی علامہ اقبال کے قریبی "آدمیوں" میں سے تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے ممدوح کو آزادیٔ فکر سے ہی محروم کر دے اور یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرے کہ ڈاکٹر اقبال سوشلزم کا حامی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ جبکہ وہ جناح کے نام 28 مئی 1937ء کے ایک خط کا حوالہ دے کر تسلیم کرتا ہے کہ "مسلمانوں کے افلاس اور ان کی اقتصادی زبوں حالی کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب کو دولت کی اس غیر مساویانہ تقسیم کی طرف توجہ کرنی پڑی تھی جس نے قوم کے ایک بہت بڑے طبقے کو نان شبینہ کا محتاج بنا رکھا تھا۔ خواہ اسے سوشلزم کہہ لیجئے یا کوئی اور نام دے دیجئے یہ واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب روز بروز اس مسئلہ کی طرف توجہ کر رہے تھے۔" وہ مزید لکھتا ہے کہ "پنجاب کے مسلمان زمینداروں نے جس طرح قومی تحریک سے بے اعتنائی اور بے رخی برتی تھی اور اس کے برعکس جس جرأت و سرفروشی سے پنجاب کے غریب عوام نے قوم کی آواز پر لبیک کہا تھا اس نے ڈاکٹر صاحب کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس غریب، پسماندہ اور فاقہ کش طبقے کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول کریں۔ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت میں ان دنوں ایک اور جذبہ بھی پیدا ہو رہا تھا جسے جذبۂ سرفروشی کہنا چاہیے۔"[22]

جواہر لال نہرو کی یہ کتاب 1945ء میں شائع ہوئی تھی اور عاشق بٹالوی نے 1961ء میں اس کی تردید کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس دوران میاں افتخار الدین زندہ رہا تھا اور اس کے نہرو سے شدید سیاسی اختلافات بھی پیدا ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ اس نے ایک مرتبہ پاکستان پارلیمنٹ میں نہرو کو ہندوستان کا چیانگ کائی شیک قرار دیا تھا لیکن اس نے کبھی نہرو کی متذکرہ تحریر کی تردید نہیں کی تھی اور نہ ہی عاشق بٹالوی نے اس سلسلے میں کبھی اس سے استفسار کیا تھا۔

بلاشبہ ڈاکٹر اقبال نے 1936ء میں جناح سے پہلی ملاقات کے تقریباً ایک سال بعد

ان کے نام 28رمئی 1937ء کو جو خط ارسال کیا تھا اس میں رائے ظاہر کی تھی کہ ''روٹی کا مسئلہ روز بروز زیادہ اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے اور مسلمان یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ وہ گزشتہ دو سو سال سے بتدریج نیچے گرتا جا رہا ہے۔ مسلمان کے خیال میں اس کا افلاس ہندو ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کی کوششوں کا نتیجہ ہے...... جہاں تک جواہر لال نہرو کے اس سوشلزم کا تعلق ہے جس کی بنیاد دہریت پر ہے مسلمان اس پر چنداں توجہ نہیں کریں گے...... میں اسلامی قانون کا طویل اور بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظام قانون کو اچھی طرح سمجھ کر اس کا اطلاق کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم زندہ رہنے کا حق تو مل جائے گا۔ لیکن اس ملک میں اسلامی شریعت کا نفاذ اور ارتقا اس وقت تک ممکن نہیں تا آنکہ یہاں آزاد مسلم ریاست یا ریاستیں قائم نہ ہو جائیں۔ بہت برسوں سے میں دیانتداری سے اس عقیدے کا حامل رہا ہوں اور اب بھی میرا عقیدہ یہی ہے کہ اسی طریقے سے ہی مسلمانوں کی روٹی کا مسئلہ اور ہندوستان میں امن کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اگر ہندوستان میں ایسا ہونا ممکن نہیں تو پھر خانہ جنگی ناگزیر ہے جو کہ درحقیقت ہندو۔ مسلم فسادات کی صورت میں پہلے ہی جاری ہے...... جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اگر سوشل ڈیموکریسی کو کسی مناسب شکل میں اور اسلام کے قانونی اصولوں کے مطابق اختیار کر لیا جائے تو یہ کوئی انقلاب نہیں ہوگا بلکہ اسلام کی ابتدائی اصلیت کی طرف مراجعت ہوگی۔''[23] اقبال کے اس خط سے صاف ظاہر ہے کہ وہ اس سوشلزم کے خلاف تھے جس کی بنیاد دہریت پر تھی۔ وہ ایسے سوشلزم کے خلاف نہیں تھے جس کی بنیاد دہریت پر نہ ہو۔ وہ سوشل ڈیموکریسی کے حق میں تھے کیونکہ ان کی رائے میں یہ نظام اسلامی شریعت کے عین مطابق ہوگا اور اس سے مسلمانوں کی روٹی کا مسئلہ حل ہو سکے گا۔

1937-38ء کے دوران اقبال اور جناح کے مابین اختلاف کیوں اور کیسے رونما ہوا؟

مئی 1937ء سے لے کر جنوری 1938ء کے درمیانی عرصے میں اقبال کو محمد علی جناح اور آل انڈیا مسلم لیگ سے جو پے در پے مایوسیاں ہوئی تھیں ان کے پیش نظر اگر وہ جناح کو محض ایک سیاسی لیڈر تصور کرنے لگے تھے تو اس میں حیرت کی کون سی بات تھی؟ اکتوبر 1937ء میں جناح نے سر سکندر حیات کے ساتھ جو معاہدہ کیا تھا اس کی بنیاد اگر ایک سیاسی لیڈر کی سیاسی مصلحت

پر نہیں تھی تو اور کس پر تھی؟ جناح اس وقت تک برصغیر کی تقسیم کی تجویز کے حق میں نہیں ہوئے تھے۔ وہ 1938ء میں کانگرس سے مفاہمت کے حق میں تھے۔ بشرطیکہ کانگرسی زعما مسلم لیگ کو مسلمانوں کی بااختیار جماعت تسلیم کر لیتے۔ اقبال جیسا غیر سیاسی اور جذباتی شاعر جناح کی اس قسم کی دوغلی پالیسی کو کیسے پسند کر سکتا تھا؟ جناح ہندوستان کے اقلیتی صوبوں میں تو مسلم لیگ پارٹی کو کانگرس میں ضم کرنے پر آمادہ نہیں تھے لیکن پنجاب میں انہوں نے سرسکندر کو یہ اجازت دے دی تھی کہ وہ صوبائی اسمبلی میں اپنی غیر فرقہ وارانہ یونینسٹ پارٹی کو قائم رکھے اور اسمبلی سے باہر یونینسٹ پارٹی کے مسلم ممبروں کو ہدایت کرے کہ وہ مسلم لیگ میں شامل ہو کر آل انڈیا مسلم لیگ کی ایسی پالیسی کی تائید وحمایت کریں جس کا تعلق کل ہند مسائل سے تھا اور پھر جناح نے پنجاب مسلم لیگ کے نئے پارلیمانی بورڈ میں سرسکندر حیات خان کے ''اشراف'' کو نامزد کر کے اقبال کو اور بھی ناراض کر لیا تھا۔ اس پس منظر میں یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ اقبال نے نہرو سے یہ کہا ہو کہ ''تمہارے اور جناح میں کون سی چیز مشترک ہے۔ وہ سیاست کار ہے اور تم محب الوطن ہو۔'' مزید برآں جناح کی ''جاگیردارنوازی'' اقبال کو ایسے سوشلزم کی طرف مائل کر سکتی تھی جو اسلام کے اصولوں سے متصادم نہ ہو۔ چونکہ 1938ء کے اوائل تک یہ واضح ہو گیا تھا کہ نہرو کے سوشلزم کی بنیاد دہریت پر نہیں ہے۔ وہ برطانیہ کی لیبر پارٹی کی طرح محض نظریہ سوشل ڈیموکریسی کا حامل تھا اس لئے عین ممکن ہے کہ اقبال نے اس کے غیر ملحدانہ سوشلزم سے اتفاق کیا ہو۔ کیونکہ اقبال کا دردمند دل مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی اور مقروضیت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا جبکہ لاکھوں تعلیم یافتہ مسلم نوجوان روزگار کی تلاش میں مارے مارے پھرتے تھے۔

عاشق بٹالوی نے نہرو کی کتاب میں ایڈورڈ ٹامسن کے اس حوالے کی بھی تردید کی ہے کہ اقبال نے ایک ملاقات کے دوران میں اس سے کہا تھا کہ انہوں نے پاکستان کی تجویز محض اس لئے پیش کی تھی کہ وہ مسلم لیگ کے صدر تھے لیکن اب اُن کا خیال ہے کہ یہ تجویز مجموعی طور پر ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں کے لئے سخت نقصان رساں ہو گی۔ بٹالوی نے اس سلسلے میں اقبال کے ان خطوط کے بھی حوالے دیئے ہیں جو انہوں نے 28رمئی اور 21رجون 1937ء کو جناح کو لکھے تھے اور جن میں واضح الفاظ میں یہ پختہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ ''ہندوستان میں امن و امان برقرار رکھنے کا تنہا طریقہ یہ ہے کہ ملک کو مذہبی، نسلی اور لسانی اصولوں کے مطابق تقسیم کر دیا

جائے اور ایک یا ایک سے زیادہ آزاد مسلم ریاستیں قائم کی جائیں۔'' اگرچہ عاشق بٹالوی کا یہ مؤقف بے وزن معلوم نہیں ہوتا لیکن اس نے اقبال کے سیاسی رویے میں اس تناقض کی وضاحت نہیں کی جس کا اظہار 37-1936ء میں نمایاں طور پر ہوا تھا۔ اقبال نے 1936ء میں مسلم لیگ کے اس سیکولر انتخابی منشور پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا جو جناح کی زیر ہدایت متحدہ ہندوستان کے نظریے کی بنیاد پر لکھا گیا تھا، جس میں 1916ء کے میثاق لکھنؤ کی تعریف کی گئی تھی اور اس طرح یہ عندیہ دیا گیا تھا کہ مسلم لیگ عام انتخابات کے بعد کانگرس سے اسی قسم کا سمجھوتہ کرنے پر آمادہ ہو گی۔ اقبال نے جناح کی اس تقریر پر بھی کوئی اعتراض نہیں کیا تھا جو انہوں نے یکم مارچ 1936ء کو لاہور کے ٹاؤن ہال میں ہندوؤں، سکھوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کے مشترکہ اجتماع میں کی تھی اور جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ''میں اب بھی سیاسی طور پر وہیں ہوں جہاں میں اس وقت تھا جب میں نے انڈین نیشنل کانگرس میں شمولیت کی تھی۔'' وہ جناح کے اس اشتراک عمل پر بھی معترض نہیں ہوئے تھے جو انہوں نے 1936ء میں مرکزی اسمبلی میں حکومت کو پے در پے شکستیں دینے کے لئے کانگرس کے ساتھ کیا تھا۔ جناح ان دنوں مرکزی اسمبلی میں غیر فرقہ وارانہ انڈیپینڈنٹ پارٹی کے قائد تھے اور اُن کی سیاست سراسر سیکولر اور قوم پرستانہ تھی جبکہ اقبال پنجاب مسلم لیگ کے صدر بن چکے تھے اور کئی برسوں سے اُن کا عقیدہ تھا کہ ہندو۔مسلم تنازعہ کا واحد حل یہ ہے کہ برصغیر کو مذہبی، نسلی اور لسانی بنیادوں پر تقسیم کر کے ایک یا ایک سے زیادہ اسلامی مملکتیں قائم کی جائیں۔

ستمبر 1936ء میں جب جواہر لال نہرو نے جناح پر ناروا حملے کئے اور یہ دعویٰ کیا کہ ''ہندوستان میں صرف ایک قوم آباد ہے جس کا نام ہندوستانی ہے اور تنہا کانگرس اس کی نمائندگی کا حق رکھتی ہے۔ مسلم لیگ مسلمانوں کے صرف اس گروہ کی ترجمانی کرتی ہے جو متوسط طبقے کے بالائی حصے سے تعلق رکھتا ہے۔'' تو علامہ اقبال نے اس کے جواب میں ایک بیان جاری کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ''مسٹر جناح کا آخر قصور کیا ہے جس پر پنڈت نہرو اس قدر طیش میں آ رہے ہیں؟ صرف یہی کہ انہوں نے کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے کانگرس کی اس روش کو غلط قرار دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے حلقوں میں اپنے امیدوار کھڑے کر رہی ہے۔ مسٹر جناح اور آل انڈیا مسلم لیگ اپنے خیالات و عقائد اور اپنے مطمع نظر کے اعتبار سے کانگرس سے بے حد قریب ہیں۔ اس لئے ہر مسلمان بجا طور پر یہ توقع رکھتا ہے کہ جہاں تک مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کے نمائندے

بھیجنے کا سوال ہے کانگرس اس میں دخل نہیں دے گی بلکہ یہ معاملہ کلیتہً مسلم لیگ کی صوابدید سے طے کیا جائے گا۔"[24] ظاہر ہے کہ اقبال نے اس بیان میں اعلانیہ تسلیم کیا تھا کہ مسلم لیگ اپنے خیالات وعقائداوراپنے مطمع نظر کے اعتبار سے کانگرس سے بے حد قریب ہے حالانکہ کانگرس کے خیالات وعقائداوراس کے مطمع نظر کا اقبال کے اس نظریے سے دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا کہ ہندوستان کو مذہبی، نسلی اور لسانی بنیادوں پر تقسیم کردیا جائے۔

پھر فروری 1937ء میں صوبوں میں عام انتخابات کے فوراً بعد جناح نے جو بیانات دیئے ان سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنے انڈین نیشنلزم کے دیرینہ نظریہ پر بدستور قائم ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے تمام صوبوں میں کانگرس اور لیگ مل کر حکومت چلائیں۔ان کا خیال تھا کہ اس طرح فرقہ وارانہ رنجشیں ختم ہوجائیں گی۔ہندواور مسلمان شانہ بشانہ آگے بڑھیں گے اور ہندوستان کی آزادی کی منزل قریب آنا شروع ہوجائے گی۔ان کا 9 رمارچ 1937ء کا بیان یہ تھا کہ "ہماری پالیسی بالکل صاف ہے۔ہم چاہتے ہیں کہ موجودہ آئین سے، چاہے وہ جیسا کچھ بھی ہے حتی الامکان پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔اسی پالیسی کے اندر رہ کر ہم ہر ترقی پسند جماعت کے ساتھ اشتراک کرنے کو تیار ہیں۔مسٹر راج گوپال اچاریہ نے حال ہی میں جس پالیسی کا اعلان کیا ہے لیگ کی پالیسی اس سے مختلف نہیں ہے۔ہم یقیناً یہ چاہتے ہیں کہ مختلف صوبوں میں وزارتیں اور حکومتیں اس طرح چلائی جائیں گویا گورنروں کے خاص اختیارات کا وجود نہیں ہے" اور پھر 20 رمارچ کو ان کا بیان یہ تھا کہ "اس وقت ہم ملک میں قومی حکومت قائم کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ مسلم لیگ اور کانگرس کا اتحاد کچھ مشکل نہیں ہے۔میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں کہ مسلمانوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہونا چاہیے کیونکہ لیگ کا پروگرام قوم پرستی اور محض دوستی کے اصولوں پر مبنی ہے۔ہم کانگرس کے تعمیری پروگرام پر عمل کرنے اور کانگرس کے ساتھ تعاون کرنے کو بخوشی تیار ہیں۔لیکن اگر کانگرس نے انفرادی طور پر اکے دکے مسلمان کو، انعام واکرام کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی تو اس کے نتائج چنداں خوشگوار نہیں ہوں گے۔"[25]

انہی دنوں جناح نے ایک اور بیان میں یہ واضح کیا تھا کہ "مسلم لیگ کا آئین اوراس کی پالیسی اس کے دوسروں کے ساتھ تعاون کے راستے میں حائل نہیں ہیں۔اس کے برعکس ہمارا

بنیادی اصول یہ ہے کہ ہم آزادی سے کسی بھی گروپ یا پارٹی کے ساتھ ابتدا ہی سے تعاون کرنے پر آمادہ ہیں۔ اسمبلی کے اندر بھی اور اسمبلی کے باہر بھی۔ بشرطیکہ اتفاق رائے سے اس تعاون کے بنیادی اصول طے کر لئے جائیں۔''[26] جناح کے یہ بیانات مسلم لیگ کے انتخابی منشور کے عین مطابق تھے۔ مسلم لیگ آل انڈیا کانگرس کے ساتھ 1916ء کے میثاق لکھنؤ کی قسم کا سمجھوتہ کر کے مخلوط وزارتوں میں شامل ہونے پر آمادہ تھی۔ لیکن کانگرسی لیڈروں کی رعونت اس سمجھوتے کے راستے میں حائل ہوئی۔ ڈاکٹر اقبال نے کانگرس۔ لیگ سمجھوتہ اور اتحاد کے بارے میں جناح کے اصرار کے بارے میں کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور نہ ہی انہیں جناح کے اس اعلان پر اعتراض تھا کہ لیگ کا پروگرام قوم پرستی اور وطن دوستی کے اصولوں پر مبنی ہے۔

جناح کا سوانح نگار ایم۔ ایچ۔ سید لکھتا ہے کہ ''کانگرسی لیڈروں کے غیر مصالحانہ رویے کے باوجود جناح ہندو۔ مسلم تصفیہ کے لئے مسلسل کوشش کرتے رہے تھے۔ اُن کی ساری سیاسی زندگی اس قسم کی کوششوں سے بھرپور ہے۔ انہیں جولائی 1937ء میں بھی، جبکہ کانگرس نے صوبائی وزارتیں بنانے کا فیصلہ کیا تھا، امید کی تھی کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان کم از کم کام چلاؤ انتظام تو ہو ہی جائے گا۔''[27] کانگرس نے صوبائی وزارتوں کی تشکیل کا یہ فیصلہ 7/جولائی کو کیا اور جناح نے اس سے اگلے دن ایک بیان میں اس کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ اُن کا بیان یہ تھا کہ ''میں خوش ہوں کہ کانگرس نے صوبائی وزارتیں مرتب کرنے کا فیصلہ کر دیا ہے۔ میں تو گزشتہ ڈیڑھ سال سے بار بار یہ کہہ رہا ہوں کہ بحالات موجودہ صوبائی آئین پر کار بند ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں...... مجھے امید ہے کہ جہاں تک اپنے ابنائے وطن کا سوال ہے، کانگرس اپنے راستے میں کسی بیکار اور غیر ضروری وقار کے احساس کو حائل نہیں ہونے دے گی اور صوبوں کی مجالس قانون ساز میں مسلم لیگ پارٹی کے ساتھ بخوشی اشتراک و تعاون کرے گی۔ میں کئی بار اس امر کا اعادہ کر چکا ہوں کہ ہمارا ہاتھ جو دوستی، تعاون اور اخوت کا ہاتھ ہے ہر وقت حاضر ہے۔ ہم کانگرس کے ہر اس پروگرام میں شریک ہونے کو تیار ہیں جس کا مقصد عوام کی فلاح و بہبود ہے۔ خواہ وہ پروگرام مجالس قانون ساز کے اندر رہ کر چلایا جائے یا مجالس قانون ساز سے باہر اس کا نفاذ کیا جائے۔ آج ہندوستان کو جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم سب مل کر ایک متحدہ محاذ قائم کریں۔''

7رجولائی تک جناح کو اقبال کے 28رمئی اور 21رجون کے خطوط یقیناً مل چکے تھے جن میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان میں امن و امان برقرار رکھنے کا تنہا طریقہ یہ ہے کہ ملک کو مذہبی، نسلی اور لسانی اصولوں کے مطابق تقسیم کر دیا جائے اور یہاں ایک یا ایک سے زائد آزاد اسلامی مملکتیں قائم کی جائیں۔ لیکن جناح نے اقبال کی اس تجویز پر کوئی توجہ نہیں دی تھی اور وہ بالاصرار یہ اعلان کرتے رہے تھے کہ وہ انڈین نیشنلزم کے نظریہ کے تحت کانگرس کے ساتھ متحدہ محاذ بنانے پر آمادہ ہیں۔ بظاہر برصغیر کی تقسیم ان کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھی۔ بایں ہمہ علامہ اقبال آل انڈیا مسلم لیگ کے ساتھ بطور صدر صوبہ لیگ وابستہ رہے اور یہ کوشش کرتے رہے کہ لیگ کی مرکزی کونسل میں ان کے ''آدمیوں'' کو نامزد کیا جائے اور پنجاب لیگ پر یونینسٹ جاگیرداروں کا غلبہ قائم نہ ہونے پائے۔ جنوری 1938ء میں جب انہوں نے جواہر لال نہرو کو اپنے ہاں بلایا تھا، اس وقت ان کی یہ کوشش ناکام ہو چکی تھی، جناح نے سر سکندر کے ''اشراف'' کو صوبائی پارلیمانی بورڈ میں شامل کر لیا تھا اور ان کے ''آدمیوں'' کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اب وہ جناح کے ساتھ اپنے شدید تضاد کی مزید پردہ پوشی نہیں کر سکتے تھے۔ اگر اقبال کی صحت ٹھیک ہوتی تو معلوم نہیں دونوں عظیم شخصیتوں کے درمیان تضاد کا لاوا کس طرح پھٹتا۔

باب: 8

علامہ اقبالؔ پنجابی مسلم درمیانہ طبقہ کا درد مند شاعر

کیا علامہ اقبال کو مافوق البشر سمجھنا چاہیے؟

عاشق بٹالوی اور علامہ اقبال کے بعض دوسرے ''آدمیوں'' کی مشکل یہ ہے کہ یہ اپنے ممدوح کو ایک فوق البشر اور منزہ عن الخطا شخصیت ثابت کرنے کی سرتوڑ کوشش کرتے ہیں اور بعض چھوٹے ''آدمی'' تو ایسے بھی ہیں کہ وہ حکیم الامت کی کچھ اس طرح مدح سرائی کرتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اقبال کو نعوذ باللہ پیغمبری کا درجہ دے رکھا ہے۔ وہ اقبال کی زندگی کے کسی پہلو پر ذرا سی بھی نکتہ چینی کو برداشت نہیں کرتے۔ اس طرح وہ اقبال کی عظمت میں کوئی اضافہ نہیں کرتے بلکہ اپنی غیر ضروری مبالغہ آرائی کے باعث اس میں کچھ کمی ہی کرتے ہیں۔ اس حقیقت سے، یو۔ پی کے دو چار برخود غلط شاعروں اور بعض متعصب مذہبی پیشواؤں کے سوا، کوئی دیانتدار شخص انکار نہیں کرتا کہ اقبال کو اسلامی علوم پر بہت دسترس حاصل تھی۔ انہوں نے اس مقصد کے لئے زندگی میں بڑی ریاضت کی تھی۔ انہوں نے قرآن و حدیث کے علاوہ اسلامی تاریخ، فقہ اور فلسفہ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ان کی اردو اور فارسی شاعری جدت فکر اور ولولہ انگیز پیغامات سے بھرپور تھی اور پنجابی مسلمانوں کا تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ اس سے بہت متاثر ہوا تھا۔ وہ بیسویں صدی میں عالم اسلام کے زوال اور بالخصوص مسلمانان ہند کی زبوں حالی پر بہت اشکباری کرتے تھے۔ ان کے دل میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے بے پناہ درد تھا۔ وہ خلوص دل سے چاہتے تھے کہ عالم اسلام اور مسلمانان ہند کی عظمت رفتہ کسی نہ کسی طرح بحال ہو جائے۔ وہ اس کے ساتھ ہی اقوام مشرق کی پسماندگی پر بھی آنسو بہاتے تھے اور ان کی دلی خواہش تھی کہ ایشیائی اور افریقی اقوام بیدار و منظم ہو کر مغربی سامراجیت سے نجات حاصل کریں۔ بایں

ہمہ اقبال نہ ہی مذہبی مجدد تھے اور نہ سیاسی نظریہ ساز، بلکہ بنیادی طور پر ایک عظیم شاعر اور اعلیٰ پایہ کے مفکر تھے۔ اگرچہ ان کی زندگی میں خوبیوں کا پلہ بہت بھاری تھا لیکن بشریت کے تقاضوں کے تحت ان کی زندگی کا کوئی بھی پہلو خامیوں، غلطیوں اور تناقضات سے مبرا نہیں تھا۔ ازسرتاپا شاعر ہونے کی وجہ سے بہت جذباتی تھے اور اکثر حالات کی زد میں بہہ جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افکار میں بہت سے اتار چڑھاؤ آئے جو ان کے ''منظور شدہ'' اور ''غیر منظور شدہ'' مجموعہ ہائے کلام میں نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ وہ خود بھی اپنی اس شعری کمزوری سے آگاہ تھے چنانچہ انہوں نے 21 / مارچ 1931ء کو لاہور میں منعقدہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس میں اپنے خطبہ میں کہا تھا کہ ''میں آپ کو ایک ایسے شخص کے انتخاب پر مبارکباد نہیں دے سکتا جس کی حقیقت ایک منصوبے باندھنے والے تخیل پسند انسان سے زیادہ نہیں...... کسی ایسے مطمع نظر کا انکشاف کرنا جو دنیاوی حد بندیوں سے آزاد ہو ایک کام ہے اور یہ بتانا کہ کس طرح وہ مطمع نظر زندگی بخش حقائق میں تبدیل ہوسکتا ہے بالکل دوسرا کام ہے...... اگر ایک شخص اول الذکر کام کے لئے طبعاً موزوں ہو تو اس کا مفوضہ فرض منصبی نسبتاً آسان ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ دنیاوی حد بندیوں کو جو عملی سیاستدان کی راہ میں قدم قدم پر رکاوٹیں ثابت ہوتی ہیں ایک صاف جست کے مترادف ہے کہ وہ آدمی جس میں یہ جرأت ہو کہ وہ اول الذکر کام سے مؤخر الذکر کام کی طرف اپنے آپ کو منتقل کرلے۔ اسے بار بار ان حد بندیوں کا جائزہ لینا ہوگا اور بسا اوقات ان کے سامنے جھکنا پڑے گا جنہیں وہ اب تک نظر انداز کرنے کا عادی رہا ہے۔ ایسے آدمی کو بدقسمتی سے مسلسل ذہنی کشمکش میں زندگی بسر کرنی پڑتی ہے اور اس پر بآسانی تناقض بالذات کا الزام عائد کیا جاسکتا ہے۔''[1] مطلب یہ تھا کہ تخیل پسند اقبال کے لئے دنیاوی حد بندیوں سے آزاد ہوکر عملی سیاستدان بننا آسان نہیں تھا۔ یہ کام اسے مسلسل ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیتا تھا اور وہ تناقض بالذات کا شکار ہو جاتا تھا۔ عبدالمجید سالک کے بقول ''اس کی زندگی علی العموم گوشہ نشینی اور خلوت گزینی میں بسر ہوئی تھی اور وہ دنیا و مافیہا سے بے پرواہ ہوکر آغاز سے انجام تک اپنے فکر ہی کی دنیا میں سرگرداں رہا تھا۔'' عملی سیاست کے خاردار میدان میں جست لگانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ تاہم ان کی حساس طبیعت دنیا اور برصغیر کی سیاست میں تغیر و تبدل سے بہت جلدی اثر قبول کرتی تھی اور بسا اوقات وہ اس کا اظہار اپنی شاعری میں کرتے تھے۔ لہٰذا ان کی شاعری میں تناقضات موجود ہیں۔

اقبال کے نظریاتی سفر میں تضادات کا تاریخی پس منظر

علامہ اقبال کی ولادت سیالکوٹ کے ایک درمیانہ طبقہ کے خاندان میں 1877ء میں ہوئی تھی۔ انہوں نے انٹرمیڈیٹ تک سیالکوٹ کے سکاچ مشن کالج میں تعلیم حاصل کی۔ جب 1893ء میں انہوں نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا تو اُن کی شادی گجرات کے ایک دولت مند بزرگ خاندان ڈاکٹر عطا محمد خان کی بیٹی سے ہوئی۔ یہ شادی اُن کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی، اس لئے ناکام ہوئی۔ میاں بیوی میں نباہ نہ ہوسکا۔ تاہم اس بیوی سے ان کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے ایک بیٹی مریم اور ایک آفتاب اقبال۔

خواجہ نذیر احمد اور مرزا بشیر الدین محمود کے بیان کے مطابق اقبال کے والد شیخ نور محمد نے فرقہ قادیانی کے بانی مرزا غلام احمد کی بیعت کی تھی گویا انہوں نے مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کے سامنے سر تسلیم خم کر کے عامۃ المسلمین کے روایتی مذہبی عقیدے کو ترک کر دیا تھا۔ خواجہ نذیر احمد کا مزید بیان یہ ہے کہ خود علامہ اقبال نے بھی 1897ء میں گورنمنٹ کالج سے بی۔اے پاس کرنے کے بعد مرزا غلام احمد کی بیعت کی تھی اور وہ 1930ء تک مرزا کو مذہبی مجدد سمجھتے رہے تھے۔

انہوں نے شاعری گورنمنٹ کالج میں طالب علمی کے زمانے میں ہی شروع کر دی تھی اور 1899ء میں انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں نالہ یتیم کے عنوان سے ایک نظم پڑھی تھی جو بہت مقبول ہوئی تھی۔ اسی سال انہوں نے ایم۔اے کا امتحان پاس کر کے اورینٹل کالج لاہور میں بطور ریڈر ملازمت اختیار کر لی تھی۔ 1901ء میں انہوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک تقریر کی تھی جس میں ہندوستان میں اسلامی قومیت وسیرت کی نشوونما کے مختلف اسلوب کی تاریخ کا ذکر کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ''پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا جسے فرقہ قادیانی کہتے ہیں۔'' 1905ء میں وہ بیرسٹری کرنے کے لئے لندن چلے گئے۔

اس وقت تک اُن کی شاعری زیادہ تر مظاہرِ فطرت، ہنگامہ کائنات اور حسن و جمال کے مطالعہ سے مرتب شدہ محسوسات پر مشتمل تھی اس میں ہندوستانی قوم پرستی اس حد تک تو تھی کہ ترانہ ہندی کی صورت میں اپنے وطن اور اس کی چیزوں سے پیار و محبت کے جذبات کا اظہار کیا

گیا تھا۔ لیکن برطانوی سامراج کے خلاف کسی قسم کا اظہار نہیں ملتا تھا۔ اس کے برعکس علامہ کی نظموں میں انگریزی سرکار کی مکمل اطاعت کا اظہار کیا جاتا تھا۔ 22ر جنوری 1901ء کو ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا تو 24ر جنوری کو لاہور میں ملکہ کی تعزیت میں ایک جلسہ منعقد ہوا جس میں اقبال نے ایک سو دس اشعار پر مشتمل ایک ترکیب بند مرثیہ بعنوان ''اشکِ خوں'' پڑھا جس کے چند اشعار حسب ذیل ہیں:

اے آہ آج برق سر کوہسار ہو
یا تیر بن کے میرے کلیجے کے پار ہو

ہو ٹکڑے ٹکڑے ٹوٹ کے اے رشتۂ نفس
اے مرغ روح ، باز اجل کا شکار ہو

میت اٹھی ہے شاہ کی ، تعظیم کے لئے
اقبال اڑ کے خاک سر راہ گزار ہو

آئی ادھر نشاط ، ادھر غم بھی آ گیا
کل عید☆ تھی تو آج محرم بھی آ گیا

ہاں اے ہلالِ عید خدا کی قسم تجھے
خواہانِ عیش کیا نظر آتے ہیں ہم تجھے؟

اے جامِ بزمِ عید مقدّر یہ تھا ترا
لبریز کرنے آئے مےِ اشک غم تجھے

کہتے ہیں آج عید ہوئی ہے ہوا کرے
اس عید سے تو موت ہی آئے خدا کرے

دل کا تو ذکر کیا ہے کہ دل کا قرار بھی
سیماب کی طرح سے ہوا بے قرار آج

اقلیم دل کی آہ شہنشاہ چل بسی
ماتم کدہ بنا ہے دل داغدار آج

☆ 22ر جنوری 1901ء کو جب ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہوا، لاہور میں عید الفطر کا دن تھا۔

تو جس کی تخت گاہ تھی اے تخت گاہِ دل
رخصت ہوئی جہان سے وہ تاجدار آج

اے ہند تیری چاہنے والی گذر گئی
غم میں تیرے کراہنے والی گذر گئی

اے ہند تیرے سر سے اٹھا سایۂ خدا
اک غم گسار تیرے مکینوں کی تھی، گئی

اے ہند جو فضلیت نسواں کی تھی دلیل
تیرے گھروں کی پردہ نشینوں کی تھی، گئی

لے اے عروس ہند تری آبرو گئی
آنکھوں کو اشک غم سے درخشاں کئے ہوئے

برطانیہ تو آج گلے مل کے ہم سے رو
سامان بحر ریزئی طوفاں کئے ہوئے

اے کوہ نور تو نے تو دیکھے ہیں تاجور
دیکھا ہے اس طرح کا کوئی تاجور کہیں؟

وکٹوریہ نہ مُرد کہ نام نکو گزاشت
ہے زندگی یہی جسے پروردگار دے

اے باغ ہند تیرا خیاباں بجائے گل
موتی بجائے دامن ابر بہار دے

پژ مردہ کر گئی ہے جو بادخزاں تجھے
حد نو بہار ناز تجھے روزگار دے"[2]

انجمن حمایت اسلام لاہور کا سترہواں (17) اجلاس 22,21 اور 23رفروری 1902ء کو اسلامیہ کالج لاہور میں منعقد ہوا۔ 22رفروری کے دوسرے سیشن میں لیفٹینینٹ گورنر پنجاب میک ورتھ ینگ (Mackworth Young) اور ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب ولیم بل (William Bill) بھی موجود تھے۔ اس موقع پر اقبال نے نظم ''خیر مقدم'' پڑھی جس میں

لیفٹیننٹ گورنر کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا:

خوشا نصیب وہ گوہر ہے آج زینت بزم
کہ جس کی شان سے ہے آبروئے تاج و سریر
وہ کون زیب دہِ تختِ صوبۂ پنجاب
کہ جس کے ہاتھ نے کی قصر عدل کی تعمیر
حضور زینت محفل ہیں ناز ہے ہم کو
جھلک رہی ہے نصیبوں میں سبزیٔ کشمیر
دعا نکلتی ہے دل سے حضور شاد رہیں
رہیں جہان میں عظمت طراز تاج و سریر

اور ولیم بل کے لئے کہا:

ہوئے ہیں رونق محفل جناب ولیم بل
ضیائے مہر کی صورت ہے جن کی ہر تدبیر
یہ علم و فضل کی آنکھوں کا نور ہیں واللہ
انہیں کی ذات سے حاصل ہے مہر کو تنویر
خوشا نصیب کہ یہ ہمرہِ حضور آئے
ہماری بزم کی یکبار بڑھ گئی توقیر
بڑھے جہان میں اقبال ان مشیروں کا
کہ ان کی ذات سراپا ہے عدل کی تصویر[3]

لندن میں قیام کے دوران اقبال کو وطنیت سے نفرت ہوگئی غالباً اس لئے کہ انہوں نے بورژوا نیشنلزم کی تاریخ پر نظر نہیں ڈالی تھی اور انہیں یہ بھی احساس نہیں ہوا تھا کہ اس قوم پرستی میں کس قدر پائیداری اور قوت ہے۔ ان کا احساس تھا کہ قوم پرستی مسلمانوں کے مرض کا مداوا نہیں کیونکہ مغرب کی جن قوموں نے اس اصول زندگی کو اختیار کیا ہے وہ انتہا درجے کی خود غرض ہوگئی ہیں، ملک گیری اور استحصال، حرص و آزار نے ان کو بلند اخلاق انسانی سے محروم کر دیا ہے۔ لہٰذا آئندہ کے لئے انہوں نے ہندوستانی قوم پرستی کا نظریہ ترک کر دیا اور یہ مسلک اختیار کیا کہ ملت اسلامی کو بیدار

کیا جائے، اس کو اسلامی اخلاق سے از سر نو آشنا بنایا جائے اور اسے بتایا کہ اسلامی قومیت جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے۔ بالفاظ دیگر وہ لندن میں تین سالہ قیام کے دوران پان اسلام ازم کے علمبردار بن گئے جبکہ خلافت عثمانیہ کا زوال شروع ہو چکا تھا اور روس کے زار کا خیال تھا کہ یورپ کا یہ مرد بیمار کسی وقت بھی اس کے بازو پر دم توڑ دے گا۔

1908ء سے لے کر 1913ء تک اقبال کی لاہور میں ذاتی زندگی کی پریشانیوں کا زمانہ تھا۔ اگرچہ اس زمانے میں وہ اپنی پہلی بیوی سے بہت بیزار تھے اور ان کی خواہش تھی کہ ''جہاں تک جلد ممکن ہو اس بدبخت ملک سے بھاگ جاؤں۔'' تاہم انہوں نے اس خواہش پر عمل نہ کیا اور 1909ء میں انہوں نے موچی دروازے کے کشمیری خاندان میں دوسری شادی کی۔ مگر نکاح کے بعد رخصتی نہ ہوئی کیونکہ علامہ کو چند گمنام خطوط موصول ہونے کی وجہ سے لڑکی کی پاک دامنی پر شبہ ہو گیا تھا۔ ان کی تیسری شادی 1913ء میں لدھیانہ کے خوشحال خاندان میں ہوئی جس سے دو بچے جاوید اقبال اور منیرہ بیگم پیدا ہوئے۔

1914ء میں پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی جس میں انگریز، فرانسیسی اور روسی ایک طرف اور جرمن، آسٹرین اور ترک دوسری طرف صف آرا تھے۔ خلافت عثمانیہ خطرے میں تھی۔ پان اسلام ازم یا اسلامی قومیت کا نظریہ ناپید ہونے والا تھا۔ برطانوی سامراج نے پنجاب میں جبری بھرتی کا سلسلہ شروع کر دیا تھا جس کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے مظفر گڑھ، ملتان، سرگودھا اور بعض دوسرے اضلاع کے غریب کسان بلوے کر رہے تھے۔ تاہم 1918ء میں جبکہ پورے برصغیر میں تحفظ خلافت کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا، علامہ اقبال نے نواب ذوالفقار علی خان کی وساطت سے لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر کی فرمائش پر ایک نظم لکھی جس میں سرکار برطانیہ کے حضور میں اہل وفا کی جانب سے سر کا نذرانہ پیش کیا گیا تھا۔ یہ نظم بعنوان ''پنجاب کا جواب'' دراصل پنجاب کے بدنام ترین لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر کے عہد میں برطانوی سامراج کا قصیدہ تھا جو اقبال نے خود یونیورسٹی ہال کے ایک مشاعرے میں پڑھا تھا۔ نو بندوں پر مشتمل اس قصیدے کے چند بند یہ تھے:

''اے تاجدار خطۂ جنت نشانِ ہند
روشن تجلیوں سے تری خاورانِ ہند

محکم ترے قلم سے نظامِ جہانِ ہند
تیغ جگر شگاف تری پاسبانِ ہند

ہنگامہ وفا میں مرا سر قبول ہو
اہل وفا کی نذر محقر قبول ہو

تلوار تیری دہر میں نقاد خیر و شر
بہروز ، جنگ توز ، جگر سوز ، سیز در

رایت تری سپاہ کا سرمایۂ ظفر
آزادہ، پرکشادہ ، پری زادہ ، یم سپر

سطوت سے تیری پختہ جہاں کا نظام ہے
ذرے کا آفتاب سے اونچا مقام ہے

وقت آگیا کہ گرم ہو میدانِ کارزار
پنجاب ہے مخاطب پیغام شہریار

اہل وفا کے جوہر پنہاں ہوں آشکار
معمور ہو سپاہ سے پہنائے روزگار

تاجر کا زر ہو اور سپاہی کا زور ہو
غالب جہاں میں سطوت شاہی کا زور ہو

ہندوستاں کی تیغ ہے فتاحِ ہشت باب
خونخوار ، لالہ بار ، جگر وار برق تاب

بے باک ، تابناک ، گہر پاک ، بے حجاب
دلبند، ارجمند ، سحرخند ، سیم ناب

یہ تیغ دل نواز اگر بے نیام ہو
دشمن کا سر ہو اور نہ سودائے خام ہو

اخلاص بے غرض ہے ، صداقت بھی بے غرض
خدمت بھی بے غرض ہے ، اطاعت بھی بے غرض

عہد وفا و مہر و محبت بھی بے غرض
تخت شہنشہی سے عقیدت بھی بے غرض

لیکن خیال فطرتِ انساں ضرور ہے
ہندوستاں پہ لطفِ نمایاں ضرور ہے

جب تک چمن کی جلوۂ گل پر اساس ہے
جب تک فروغ لالہ احمر لباس ہے

جب تک نسیم صبح عنادل کو راس ہے
جب تک کلی کو قطرۂ شبنم کی پیاس ہے

قائم رہے حکومت آئیں اسی طرح
دبتا رہے چکور سے شاہیں اسی طرح

اس نظم کے تعارف میں غلام رسول مہر لکھتا ہے کہ پہلی جنگ یورپ کے دوران مائیکل اوڈوائر پنجاب کا گورنر تھا۔ اس نے جہاں جنگی تنظیمات کے سلسلے میں بیسیوں اور تدبیریں اختیار کی تھیں وہاں مختلف اوقات میں مشاعرے بھی کرائے تھے۔ 1918ء کے ایک مشاعرے میں اوڈوائر نے اقبال سے بطور خاص نظم لکھنے اور مشاعرے میں آنے کی فرمائش کی تھی۔ زمانہ ایسا نازک تھا کہ اس فرمائش کو ٹالنے کی کوئی صورت نہیں تھی لہٰذا اقبال نے مندرجہ بالا نظم لکھی اور خود مشاعرے میں جا کر پڑھی۔ 11 رمئی 1918ء کے ''وکیل'' (امرتسر) میں یہ شائع ہوئی تھی۔[4]

اقبال کی یہ نظم کسی تعبیر و تشریح کی محتاج نہیں۔ اس میں پنجاب کے اہل وفا کی طرف سے برطانوی سامراج کو سرکا نذرانہ پیش کیا گیا تھا، ہندوستان کی خونخوار تیغ سے دشمن کے سر اور سودائے خام کا خاتمہ کیا گیا تھا حالانکہ اس دشمن کی صف میں سلطنت عثمانیہ بھی شامل تھی اور پھر برطانیہ کے تخت شہنشہی سے بے غرض عقیدت و اطاعت کا اظہار کر کے یہ دعا کی گئی تھی کہ ہندوستان پر اس کا سایہ ہمیشہ کے لئے قائم رہے۔ اس نظم میں مسلم قومیت یا پان اسلام ازم کا نام و نشان نہیں ملتا بلکہ اس کی تباہی و بربادی کا پیغام موجود ہے۔ اس نظم میں عالم اسلام کی سربلندی کی بھی کسی خواہش کا اظہار نہیں۔ دعا برطانوی سامراج کی فتح و سربلندی کے لئے کی گئی ہے۔ عبدالمجید سالک لکھتا ہے کہ یہ مسدس لکھنے سے قبل ''چار سال تک علامہ زیادہ تر منقار زیر پر ہی رہے۔ اس لئے

کہ بے حد پر آشوب زمانہ تھا، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام، مولانا ظفر علی خان اور بے شمار دوسرے علمبرداران اتحاد اسلامی قید و بند میں تھے۔ اگر اس دور میں کوئی ایسی نظم لکھتے جو حکام وقت کو ناگوار ہوتی تو حکومت کی شدید گرفت میں آ جاتے اور کوئی نتیجہ بھی مرتب نہ ہوتا۔''[5]

گویا اقبال کی عافیت کوشی ان کی اتحاد اسلامی کی علمبرداری کے راستے میں حائل رہی اور اسی عافیت کوشی نے ان کو برطانوی شہنشاہیت کا قصیدہ لکھنے کی ترغیب دی تھی۔ اقبال میں تناقض بالذات کی اس مثال کو کسی صورت میں قابل فخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بلکہ ان کے مخالفین یہ الزام عائد کر سکتے ہیں کہ ان کی عافیت کوشی یا موقع پرستی اُن کی اسلام پسندی سے بالاتر تھی۔ 1918ء میں برطانوی سامراج اور اس کے حلیفوں کے ہاتھوں خلافت عثمانیہ کے پرخچے اڑ چکے تھے اور اتحاد اسلامی کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ مگر 1911ء میں طرابلس پر اٹلی کے حملے کی پرزور مذمت کرنے والے علامہ اقبال 1914ء سے لے کر 1918ء تک منقار زیر پر ہی رہے۔ انہوں نے سرکار برطانیہ کا یہ قصیدہ 27/اپریل 1918ء کو پڑھا تھا حالانکہ اس سے دو ایک دن پہلے دہلی میں ہوم رول لیگ، پراونشل کانگرس کمیٹی، انڈین ایسوسی ایشن اور مسلم لیگ کے مشترکہ زیر اہتمام ایک جلسہ عام ہوا تھا جس میں ہندوستان کے لئے مکمل طور پر ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ یہ مطالبہ کرنے والوں کے لئے زمانہ پر آشوب نہیں تھا اور نہ ہی عافیت کوشی ان کی سیاسی زندگی کا شیوہ تھا اور یہ حقیقت بھی قابل ذکر ہے کہ جس مہینے میں علامہ اقبال نے یہ قصیدہ پڑھا اسی مہینے میں ''اسرار خودی'' کا دوسرا حصہ مثنوی ''رموز بے خودی'' کے نام سے شائع ہوا تھا جس میں اسرار حیات ملت اسلامیہ بیان کئے گئے تھے۔ اس ''رموز بے خودی'' کا ایک نسخہ تاجدار دکن کی خدمت میں بھیجا تھا جس کے ساتھ فارسی میں قصیدہ کے ذیل کے چند اشعار بھی تھے۔

اے مقامت برتر از چرخ بریں
از تو باقی سطوت دین مبیں

جلوہ صدیق از سیمائے تو
حافظ ما تیغ جوشن خائے تو

از تو مارا صبح خنداں شام ہند
آستانت مرکز اسلام ہند

دوش ملت زندہ از روضہ تو
تاب ایں برق کہن از سوز تو
ہند گا نستیم ما تو خواجہ
از پئے فروائے ما دیباچہ
گوہرم را شوخیش بے باک کرو
تاگریباں صدف را پاک کرو

پیش سلطان ایں گہر آورد ام
قطرہ خون جگر آوردہ ام"[6]

خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد یہ کہنا کہ برطانوی سامراج کے "عظیم ترین پٹھو" اور حیدرعلی اور سلطان ٹیپو کے بدترین دشمن کی اولاد "تاجدار دکن" کا آستانہ ہندوستان میں اسلام کا مرکز ہے اور اسلامیوں کا ماضی اس کی وجہ سے زندہ ہے، ستم ظریفی کی انتہا تھی۔ علامہ نے اس مثنوی کا پہلا حصہ اسرار خودی کے نام سے 1914ء میں شائع کیا تھا اور سر علی امام سے معنون کیا تھا۔ عبدالمجید سالک لکھتا ہے کہ اس مضمون کو اکثر لوگوں نے اچھی نظر سے نہ دیکھا۔ معترضین نے کہا کہ جس کتاب میں فلسفہ خودی کی تشریح کی گئی ہے اور ملت کو اعزاز نفس اور خودداری کی تعلیم دی گئی ہے اس کا ایک خطاب یافتہ دنیادار اور ایک ریاست کے وزیر اعظم کے نام پر معنون کرنا کیا معنی؟[7]

11 نومبر 1918ء کو پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تو ساری دنیا کو یہ معلوم ہو گیا کہ جرمنی، آسٹریا اور سلطنت عثمانیہ کو قطعی طور پر شکست ہو گئی ہے اور برطانیہ اور فرانس نے نہ صرف سلطنت عثمانیہ کے مختلف ممالک کو آپس میں بانٹ لیا ہے بلکہ انہوں نے خود ترکی کے بھی حصے بخرے کرنے کا منصوبہ بنالیا ہے۔ چنانچہ 15 دسمبر 1918ء کو پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر مائیکل اوڈوائر نے بریڈلا ہال لاہور میں فتح کا ایک جلسہ منعقد کیا جس میں علامہ اقبال بھی نواب ذوالفقار علی خان کے ساتھ شریک ہوئے اور انہوں نے لاٹ صاحب کی فرمائش پر دو تین نظمیں پڑھیں۔ ان میں چند فارسی کے اشعار بھی تھے جن میں فرانس، روس، برطانیہ اور امریکہ کی تعریف کی گئی تھی۔[8] اس جشن فتح کے چند دن بعد دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بنگال کے مولوی فضل الحق کی زیر صدارت ہوا تھا جس میں ہندوستانی عوام سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ ترکی کے تحفظ کے لئے

جدوجہد کریں۔ دو سال قبل یعنی 1916ء میں مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان ہندو۔ مسلم اتحاد کے لئے لکھنؤ پیکٹ ہوا تھا تو علامہ اس کے خلاف تھے کیونکہ ان کی رائے تھی کہ ہندوستان میں قومیت متحدہ کی تعمیر ناممکن ہے۔ لیکن 1936ء میں مسلم لیگ نے جو انتخابی منشور شائع کیا تھا علامہ نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا حالانکہ اس میں میثاق لکھنؤ کی تعریف کی گئی تھی اور اشارتاً یہ بتایا گیا تھا کہ مسلم لیگ انتخابات کے بعد کانگرس کے ساتھ پھر اسی قسم کا سمجھوتہ کرنے پر آمادہ ہوگی۔

1920ء میں جب برطانیہ، فرانس اور روس نے معاہدہ سیورے کے تحت ترکوں کو پیغام اجل دے کر تھریس اور سمرنا یونانیوں کے حوالے کر دیئے، استنبول کو آرمینیا کے علاقے میں شامل کر دیا تو علامہ اقبال پھر بھی سیاسی طور پر منقار زیر پر ہی رہے حالانکہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کے خلاف زور و شور سے احتجاج کیا تھا۔ علامہ ان دنوں ''پیام مشرق'' کی ترتیب میں مصروف تھے۔ انہیں پرشور سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ البتہ انہوں نے 1921ء میں متحدہ قومیت کے نظریے کے خلاف ہونے کے باوجود گاندھی کی تعریف میں ایک نظم لکھی تھی۔ ان دنوں گاندھی کی زیر قیادت تحریک خلافت زوروں پر تھی۔ پھر 1922ء میں اقبال نے ایک نظم بعنوان خضر راہ میں ترکان آل عثمان کی بے دست و پائی پر گریہ کیا تھا اور پھر 1924ء میں جب ترکوں نے مصطفیٰ کمال کی زیر قیادت اپنے وطن کی آزادی و خودمختاری کا بڑی بہادری سے تحفظ کیا تو علامہ نے ''طلوع اسلام'' کے نام سے بڑی ولولہ انگیز نظم لکھی تھی جس سے پنجابی مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ بہت متاثر ہوا تھا۔ حالانکہ اس سے ایک سال قبل یعنی 1923ء میں جبکہ تحریک ترک موالات کی وجہ سے پورے ہندوستان میں سرکاری خطابات کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی، علامہ کو نواب ذوالفقار علی خان کی سفارش پر سر کا خطاب دیا گیا تھا جسے انہوں نے محض اس لئے قبول کر لیا تھا کہ گورنر میکلیگن کی طبیعت مکدر سی ہوگئی تھی اور وہ یہ سمجھتا تھا کہ اقبال بھی معاملے میں عوام کے ہم خیال ہیں۔

اقبال کی لاہور ہائی کورٹ میں تقرری میں ناکامی اور مہاراجہ کشمیر کی ملازمت کے لئے انگریزوں سے سفارش

1925ء میں جب سر شادی لال ہائی کورٹ کا چیف جج تھا ایک مسلمان جج کے تقرر کا

مسئلہ پیش ہوا اور صوبے کی اسلامی انجمنوں، وکیلوں، اخباروں اور عام تعلیم یافتہ لوگوں نے مطالبہ کیا کہ ''ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی، بیرسٹر ایٹ لاء'' کی بے نظیر قابلیت اور روشن دماغی کی بنا پر عدالت عالیہ کا جج مقرر کیا جائے تو سر شادی لال نے، جو اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر مسلمانوں میں انتہائی بدنام تھا، علامہ کے متعلق یہ رائے ظاہر کی کہ ہم اقبال کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں قانون دان کی حیثیت سے نہیں۔ چنانچہ علامہ جج نہ ہو سکے اور ان کی جگہ یو۔پی سے سید آغا حیدر کا تقرر عمل میں آیا اور اس صوبے کی مسلم رائے عامہ کی جانب سے احتجاج کیا گیا۔

ان حالات میں جبکہ ہندو۔مسلم تضاد شدید تھا، ایک متعصب ہندو چیف جسٹس کے خلاف علامہ کے حوالے سے مسلم رائے عامہ کے احتجاج سے خود علامہ کو یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ اس سے کہیں اُن کی وکالت متاثر نہ ہو جائے۔ چنانچہ وہ اس صورت حال سے بے زار ہو کر کشمیر سٹیٹ کونسل کی رکنیت کا عہدہ حاصل کرنے کی فکر میں لگ گئے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے گورنر پنجاب کے ایک معاون افسر جے۔پی۔تھامپسن (J.P. Thompson) کو 17/اکتوبر 1925ء کو اس مضمون کا خط لکھا: ''میں آپ کو یہ خط ایک ایسی ضرورت سے لکھ رہا ہوں جس کا فوری تعلق میری اپنی ذات سے ہے اور مجھے اُمید ہے کہ ایسے وقت میں میری مدد فرمائیں گے جب کہ مجھے اس کی سخت ضرورت ہے۔ لاہور ہائی کورٹ میں جو جگہ خالی ہوئی تھی اُس کے متعلق حکومت کے فیصلے کی خبر تو آپ کو مل چکی ہوگی۔ میری یہ بدقسمتی ہے کہ لوگوں نے مجھے اس سلسلے میں ملوث کیا۔ مسلم پریس نے یہاں جتنا احتجاج کیا ہے یا آئندہ کرے گا، اُس سے مجھے بہت زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ چیف جج کا خیال ہے کہ چند اشخاص جن میں میرا نام بھی شامل ہے اس احتجاج کی پشت پناہی کر رہے ہیں حالانکہ میرے خیال میں اُن کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جس قسم کی سازشوں میں مجھے ملوث کیا جا رہا ہے میرا اُن سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ بہر حال ان حالات میں میرے لئے یہاں پر ایک وکیل کی حیثیت سے کام کرنا بے حد مشکل ہو جائے گا، خاص کر جب کہ مجھے ماضی میں بھی کئی طریقوں سے نقصان پہنچ چکا ہے۔ اس کے علاوہ چند دیگر ناقابل اظہار اسباب کی بنا پر جن کا اس خط میں تذکرہ مناسب نہیں، میں اس ماحول سے قطعی بیزار ہو چکا ہوں اور دل چاہتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ کر کہیں دور چلا جاؤں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے قلم کی ایک جنبش مجھے ان تمام مشکلات سے نجات دلا سکتی ہے۔ اس وجہ سے اور آپ کی فیاضی اور

ہمدردی پر یقین رکھتے ہوئے میں آپ کی سرپرستی کا خواہاں ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے کشمیر کی سٹیٹ کونسل میں کوئی منصب دلوا سکیں۔ شاید آپ کو علم ہو کہ کشمیر میرا آبائی وطن ہے اور کشمیر کے لئے میرے دل میں ایک خاص لگن موجود ہے۔ یہ ممکن ہے کہ (کشمیر کا) نیا مہاراجہ (ہری سنگھ) اپنی حکومت میں کچھ تبدیلیاں لانے کی سوچ رہا ہو۔ اگر ایسا ہے تو مجھے یقین ہے کہ اس معاملہ میں سلسلہ جنبانی کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ اگر آپ مجھے تھوڑا سا سہارا دے سکیں تو یہ میرے لئے روحانی اور دنیاوی طور پر ایک بہت بڑی نعمت ثابت ہوگی اور میں آپ کے اس لطف وکرم کا ہمیشہ ممنون رہوں گا...... اگر چہ اس معاملہ میں مجھے آپ کی ذات پر مکمل اعتماد ہے لیکن میں یہ بات آپ تک پہنچانا ضروری سمجھتا ہوں کہ پالن پور کے نواب صاحب، جو ہری سنگھ کے قریبی دوستوں میں سے ہیں میرے دوست ہیں۔"[9]

اقبال کے اس خط کے جواب میں جے۔ پی۔ تھامپسن نے 22/اکتوبر 1925ء کو یہ خط لکھا: آج کل حکومت ہند کی پالیسی یہ ہے کہ وہ درباروں میں ملازمتوں کے لئے اس وقت تک سفارش نہ کرے جب تک اسے ایسا کرنے کے لئے خصوصی طور پر نہ کہا گیا ہو۔ میرے خیال میں چونکہ پالن پور کے نواب صاحب آپ کے اور نئے مہاراجہ دونوں کے دوست ہیں، آپ کے لئے بہترین صورت یہ ہوگی کہ آپ اُن (نواب پالن پور) کو خط لکھیں کہ وہ آپ کی سفارش کر دیں...... اگر عہدوں کے تعین کے لئے حکومت ہند کا مشورہ مانگا گیا تو میں آپ کی اس درخواست کا خیال رکھوں گا۔"[10] گویا اُس نے علامہ کی سفارش کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

علامہ کے متذکرہ خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بدستور منقار زیر پر ہی تھے اور مسلم درمیانہ طبقے کی ایجی ٹیشن کے ساتھ خود کو اس حد تک وابستہ نہیں کرنا چاہتے تھے کہ اس سے اُن کو ذاتی زندگی میں کوئی نقصان اٹھانا پڑتا۔ اُن کا تناقض بالذات یہاں بھی نمایاں تھا۔ ایک طرف تو وہ مسلم نوابوں سے وظائف حاصل کرتے اور مہاراجہ کشمیر کے دربار میں ملازمت کی سفارش کی درخواست کرتے تھے تو دوسری طرف فقر وخودی کا فلسفہ بھی پیش کرتے تھے اور کہتے تھے۔ ع

جو فقر ہوا تلخیٔ دوراں کا گلہ مند
اُس فقر میں باقی ہے ابھی بوئے گدائی

اقبال کی پنجاب کونسل کی رکنیت اور ہندو۔ مسلم تضاد

نومبر 1926ء میں علامہ اقبال نے لاہور کے ایک مسلم حلقے سے پنجاب کونسل کا انتخاب لڑا اور ملک محمد دین کے مقابلے میں تین ہزار ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہو گئے۔ چنانچہ وہ 1927ء کے اوائل سے تین سال تک سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کے رکن کی حیثیت سے کونسل کے اجلاس میں شرکت کرتے رہے۔ مگر وہ کونسل کی کاروائی میں سرگرمی سے حصہ نہیں لیتے تھے۔ انہوں نے کونسل کی رکنیت کے تین سال کے عرصے میں آٹھ مختصر سی تقریریں کیں جن میں سے چار پانچ صوبہ میں روز افزوں فرقہ وارانہ کشیدگی کے بارے میں تھیں۔ ان تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ 1921ء کے بعد ہندوستان میں ہونے والے ہندو۔ مسلم فسادات نے سیاسی لحاظ سے انہیں بالکل مایوس کر دیا تھا۔

انہوں نے اپنی 18 رجولائی 1927ء کی تقریر میں کونسل کی توجہ روز افزوں فرقہ وارانہ کشیدگی کی طرف مبذول کرائی اور چودھری ظفر اللہ خان کی اس تجویز کی تہہ دل سے تائید وحمایت کی کہ اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے جلد از جلد ایک راؤنڈ ٹیبل کانفرنس منعقد کی جائے۔ انہوں نے کہا کہ ''اگر یہ فرقہ وارانہ نفرت ملک کے بقیہ حصوں میں پھیل گئی اور دیہات میں رہنے والے لوگ آپس میں متصادم ہو گئے تو خدا ہی جانتا ہے کہ ہماری اس سرزمین میں کیا ہوگا۔'' ان کی 19 رجولائی 1927ء کی تقریر میں اس امر پر افسوس کا اظہار کیا گیا تھا کہ ''فرقہ واریت پنجاب یونیورسٹی جیسے غیر فرقہ وارانہ ادارے میں سرایت کر گئی ہے۔ لہٰذا اس ادارے کے ارباب اختیار نے طلبا کو جعلی رول نمبر دینے شروع کر دیئے ہیں تاکہ ممتحن کو امیدوار کے مذہب اور رنگ و نسل کے بارے میں کچھ پتہ نہ چل سکے اور یہ بھی نہ پتہ چل سکے کہ امیدوار کس کالج سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ طریقہ اس خطرے کی بنا پر اختیار کیا گیا ہے کہ اس امر کا امکان ہے کہ ہندو ممتحن مسلمان امیدواروں کو اور مسلمان ممتحن ہندو امیدواروں کو فیل کر دیں گے۔ یہ بڑی شرمناک بات ہے لیکن اس حقیقت کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔'' علامہ نے فرقہ وارانہ کشیدگی اور بے اعتمادی کا ذکر کرتے ہوئے مزید کہا کہ ''گزشتہ دنوں لاہور میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تو ہر فرقہ کے وفود نے ڈپٹی کمشنر سے ملاقات کر کے مخالف فرقے کے تفتیشی افسر کی جانبداری کی شکایت کی۔ ایک وفد

میں میں بھی شامل تھا۔ یہ بڑی شرمناک بات ہے لیکن بدقسمتی سے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، کیا آپ کو معلوم ہے کہ میرے وفد کو ڈپٹی کمشنر نے کیا جواب دیا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ ''اصلاحات سے قبل پولیس میں 120 برطانوی افسر تھے مگر اب ان کی تعداد کم ہو کر 18 رہ گئی ہے۔ ہمارے پاس برطانوی افسروں کی تعداد کافی نہیں ہے۔ دونوں فرقے برطانوی افسر کے خواہاں ہیں...... جہاں تک میرا تعلق ہے میں برطانوی افسروں کی تعداد میں اضافہ کا خیر مقدم کروں گا۔ میں یہ بات ذمہ داری سے کہہ رہا ہوں۔ میرے لئے اس جھوٹی اور کھوکھلی قوم پرستی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ متحدہ قومیت کی باتیں بے سود ہیں اور غالباً یہ ایک طویل عرصہ تک فضول ہی رہیں گی۔ یہ لفظ گزشتہ 50 سال سے لوگوں کی زبان پر ہے لیکن مرغی کی طرح اس نے کڑاں کڑاں تو بہت کی ہے لیکن انڈہ ایک بھی نہیں دیا...... آج کل صورت حال یہ ہے کہ دونوں فرقے ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کرتے۔ انہیں ایک دوسرے پر بھروسہ نہیں ہے۔ جب ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ہم قوم پرستی، خیرات اور نوع انسان کے لئے محبت کی باتیں کرتے ہیں۔ چند دن ہوئے میرے ایک دوست نے دو ہندو اصحاب کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے سنا۔ ایک نے کہا اب ہماری پالیسی کیا ہونی چاہیے۔ اس پر دوسرے نے جواب دیا کہ ہمیں قوم پرستی کی باتیں کرنی چاہئیں لیکن ہماری نظریں ہمیشہ ہمارے اپنے فرقے پر ہی جمی رہنی چاہئیں۔'' اور پھر 7 مارچ 1930ء کو علامہ کی کونسل میں جو آخری تقریر تھی اس میں بھی صوبہ میں فرقہ پرستی کی مذمت کرتے ہوئے ایوان کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی گئی تھی کہ ''1928-29ء کے سالانہ بجٹ میں کل 21 سکولوں کو سرکاری امداد دی گئی تھی جن میں 13 ہندو تھے چھ سکھ اور دو مسلمان۔ ہندوؤں کے تعلیمی اداروں کو 16973 روپے، سکھ اداروں کو 9908 روپے اور مسلم اداروں کو صرف 2200 روپے سرکاری گرانٹ ملی تھی۔''[11]

اقبال کے نزدیک منتخب قانون ساز اسمبلی کو اجتہاد کا اختیار حاصل ہے

علامہ اقبال نے پنجاب کونسل کی رکنیت کے زمانے میں ہی یعنی 1928-29ء میں مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی درخواست پر مدراس، حیدر آباد اور علی گڑھ میں انگریزی زبان میں وہ مشہور سات لیکچر دیئے تھے جو ''دی ری کنسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام (The

(Reconstruction of Religious Thought in Islam) کے عنوان سے 1930ء میں ایک کتاب کی صورت میں شائع ہوئے تھے۔ ان لیکچروں میں اسلامی فکر کی تشکیل جدید کے مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر فاضلانہ بحث کی گئی تھی اور یہ رائے ظاہر کی گئی تھی کہ اسلامی نظریات اور عقائد دور جدید کے تقاضوں سے متصادم نہیں ہیں۔ ان میں بہت لچک ہے اور مناسب اجتہاد کے بعد دور حاضر پر بھی ان کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ مثلاً انہوں نے اپنے ایک لیکچر بعنوان ''دی پرنسپل آف مومنٹ ان دی سٹرکچر آف اسلام'' (The Principle of Movement in the Structure of Islam) میں یہ مؤقف پیش کیا کہ ''قرآن مجید کی بنیاد جن اصولوں پر رکھی گئی ہے ان سے نہ فکر انسانی پر کوئی روک قائم ہوتی ہے، نہ وضع آئین و قوانین پر۔ برعکس اس کے ان میں جو وسعت، رواداری اور گنجائش موجود ہے اس سے ہمارے غور وفکر کو اور بھی تحریک ہوتی ہے۔ چنانچہ یہی اصول تھے جو فقہائے متقدمین کے پیش نظر تھے اور جن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے متعدد نظامات قانون قائم کئے...... لیکن ان نظامات قانون کی جامعیت کے باوجود ان کے قطعی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ بالآخر یہ افراد ہی کی ذاتی تعبیرات کا نتیجہ ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ علمائے اسلام رائج الوقت محمڈن لاء کی قطعیت کا دعویٰ کرتے ہیں اگرچہ وہ مکمل اجتہاد کے نظری امکان سے انکار نہیں کرتے۔ میں نے ان اسباب کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے جن کی بنا پر ہمارے علما نے یہ رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ لیکن اب جبکہ زمانہ بدل چکا ہے اور دنیائے اسلام ان گونا گوں قوتوں سے متاثر اور دوچار ہو رہی ہے جو فکر انسانی کی ہر سمت میں غیر معمولی نشوونما کے باعث پھیل رہی ہیں تو مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس رویہ کو کیوں برقرار رکھا جائے۔ کیا ہمارے آئمہ کا یہ دعویٰ تھا کہ ان کے استدلال اور تعبیرات حرف آخر ہیں؟ ہرگز نہیں۔ اگر موجودہ نسل کے وسیع المشرب مسلمان یہ دعویٰ کریں کہ انہیں اپنے تجربات اور جدید زندگی کے بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں فقہ وقانون کے بنیادی اصولوں کی ازسرنو تعبیر کرنے کا حق حاصل ہے تو میری رائے میں ان کا یہ دعویٰ بالکل جائز ہے۔ قرآن کی یہ تعلیم کہ زندگی ایک مسلسل تخلیقی عمل ہے بجائے خود اس امر کا مقتضی ہے کہ ہر نسل کو اسلاف کی تخلیقات کی رہنمائی سے فائدہ اٹھا کر اپنے مسائل حل کرنے کی اجازت ہونی چاہیے۔ انہیں ماضی کی تعبیروں سے کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرنی چاہیے...... پنجاب میں اس قسم کی صورتیں پیش آچکی

ہیں جن میں بعض ناپسندیدہ شوہروں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے بیویوں کو مجبوراً مرتد ہونا پڑا...... شریعت اسلامی میں شادی کی حیثیت محض ایک سول معاہدے کی ہے اور بیوی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بوقت شادی واضح شرائط کے تحت خود شوہر کا اختیار اطلاق حاصل کر لے اور اس طرح طلاق کے معاملے میں شوہر کے مساوی درجہ حاصل کر لے۔'' علامہ اقبال نے اسی لیکچر میں آگے چل کر کہا کہ ''محمڈن لاء کا تیسرا ماخذ اجماع ہے اور میرے نزدیک یہ اسلام کے قانونی تصورات میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ عجیب بات ہے کہ اس نہایت ہی اہم تصور پر اگرچہ اسلام کے ابتدائی زمانے میں بہت سے علمی مباحثے ہوتے رہے ہیں لیکن عملاً اس کی حیثیت محض ایک خیال ہی کی رہی اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی محمڈن ملک میں یہ تصور ایک مستقل ادارے کی صورت اختیار کر لے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ خلیفہ چہارم کے بعد جب اسلام میں مطلق العنان ملوکیت نے سر اٹھایا تو یہ اس کے مفاد کے خلاف تھا کہ اجماع کو ایک مستقل قانون ساز ادارے کی شکل دی جاتی۔ اموی اور عباسی خلفاء کا فائدہ اسی میں تھا کہ اجتہاد کا حق بحیثیت افراد مجتہدین ہی کے ہاتھ میں رہے۔ اس کی بجائے کہ اس کے لئے ایک مستقل اسمبلی قائم کی جاتی جو ان سے بھی زیادہ طاقتور بن سکتی تھی۔ بہر حال یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ اس وقت دنیا میں جو نئی نئی قوتیں ابھر رہی ہیں کچھ ان کے اور کچھ مغربی اقوام کے سیاسی تجربات کے پیش نظر دور حاضر کے مسلمانوں کے ذہن میں بھی اجماع کے تصور کی قدر و قیمت اور اس کے امکانات کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ مسلم ممالک میں جمہوری روح کی نشوونما اور قانون ساز اسمبلیوں کا بتدریج قیام ترقی کی جانب ایک بڑے قدم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر مختلف فرقوں کی نمود کے پیش نظر اجتہاد کا اختیار مذاہب اربعہ کے نمائندہ افراد سے مسلم قانون ساز اسمبلی کو منتقل ہو جائے تو قانونی مباحث میں عام آدمی بھی حصہ لے سکیں گے جن کی معاملات پر گہری نظر ہوتی ہے۔ میری رائے میں دور جدید میں اجماع صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے کام لے کر ہم زندگی کی اس روح کو جو ہمارے نظام قانون میں خوابیدہ ہے بیدار کر سکتے ہیں۔ البتہ ہندوستان میں اس سلسلے میں مشکلات پیدا ہونے کا امکان ہے کیونکہ یہ بات مشکوک ہے کہ آیا ایک غیر مسلم قانون ساز اسمبلی کو اجتہاد کا اختیار دیا جا سکتا ہے۔''[12] سادہ اور عام فہم الفاظ میں علامہ اقبال کے اس مؤقف کی یوں وضاحت کی جا سکتی ہے کہ علامہ اقبال اسلامی فقہ میں اجتہاد کے زبردست حامی تھے۔ وہ اس کا

اختیار قدامت پسند فتویٰ فروش ملاؤں کو دینے کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ وسیع المشرب مسلمانوں کی قانون ساز اسمبلی اس اختیار کا دور جدید کے تقاضوں کے مطابق استعمال کرے۔ وہ اسلامی فقہ کی تعبیر بذریعہ اجماع کچھ اس طرح کرنے کے خواہاں تھے کہ یہ بورژوا پارلیمانی جمہوری نظام کے مطابق ہو اور اجماع کی کاروائی پر دقیانوسی ملائیت کا الزام عائد نہ ہو۔ ان کا مؤقف ان کے اپنے دوسرے مذہبی نظریات وعقائد اور قدامت پسند ملاؤں کے روز افزوں سیاسی غلبہ کے پیش نظر قابل عمل تھا یا نہیں اس کے بارے میں ایک سے زیادہ آراء ہوسکتی ہیں اور اس کے متعلق بھی اختلاف رائے ممکن ہے کہ بعض بنیادی اور مسلم اسلامی عقائد کو ممکن العمل بنانے کے لئے مطلوبہ اجتہاد ہوسکتا ہے یا نہیں؟

اقبال ملّاؤں کے سخت خلاف تھے

علامہ اقبال کی جانب سے ملاؤں کو اجتہاد کا اختیار دینے کی مخالفت کی ایک وجہ غالباً یہ بھی تھی کہ تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد برصغیر کے ملاؤں نے وسیع پیمانے پر فتویٰ فروشی کا کاروبار شروع کر دیا تھا۔ ان میں کچھ ملا تو ایسے تھے جو برطانوی سامراج کے ہر فعل کو اسلام کے عین مطابق قرار دیتے تھے۔ ان میں سے چند پنجابی ملاؤں نے پہلی جنگ کے دوران لیفٹیننٹ گورنر اوڈوائر کی خواہش کے مطابق یہ فتویٰ بھی دیا تھا کہ حکم پر گولی چلانا اسلام کی رو سے جائز ہے۔ اس جنگ کے خاتمہ کے چند سال بعد جب نجد کے حکمران ابن سعود نے حجاز پر قبضہ کر کے تطہیر حجاز کے نام پر مدینہ اور مکہ میں صحابہ کرام اور دوسرے دینی اکابر کے مزاروں کو مسمار کیا تو ہندوستانی ملا دو کیمپوں میں تقسیم ہو گئے اور دونوں طرف سے ملاؤں کی تکفیر کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ چونکہ علامہ اقبال نومبر 1924ء میں وہابی سلطان ابن سعود کی حمایت میں یہ کہہ چکے تھے کہ ''میں حجاز کی موجودہ صورت حال سے پورے طور پر مطمئن ہوں اور سلطان ابن سعود پر بلا تذبذب اعتماد رکھتا ہوں۔ سلطان نجد ایک روشن خیال آدمی ہے'' ...... ''ممکن ہے عرب میں ابن سعود کے ماتحت ایک زبردست قومی تحریک نشوونما پا جائے۔'' لہٰذا فرقہ بریلوی کے ملا علامہ اقبال کے سخت خلاف ہو گئے تھے۔ ان کا فتویٰ یہ تھا کہ ''ڈاکٹر صاحب کی زبان پر ابلیس بول رہا ہے'' ...... ''ڈاکٹر صاحب کے مذہب کو سچے دین اسلام سے کیا تعلق ہے۔''[13]

اور جب اکتوبر 1925ء میں ایک شخص نے علامہ اقبال کے بعض اشعار کا حوالہ دے کر استفسار کیا کہ ''کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور شرع متین اس مسئلے میں کہ ایک شخص اشعار میں آفتاب کو خدائی صفات کے ساتھ متصف کرے اور اس سے مرادیں طلب کرے، آخرت پر یقین نہ رکھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر سے استہزا کرے، علمائے کرام اور پیران عظام پر آوازے کسے اور انہیں برے خطابات سے یاد کرے، ہندوؤں کے ایک بزرگ کو جسے وہ خدا کا اوتار مانتے ہیں، ''امام'' اور ''چراغ ہدایت'' کے الفاظ سے یاد کرے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو۔ کیا ایسا آدمی اسلام پر ہے یا کفر پر؟ اس کے ساتھ لین دین، نشست و برخاست اور ہر طرح کا مقاطع کرنا جائز ہے یا ناجائز اور نہ کرنے والوں کے متعلق کیا حکم ہے؟'' تو مسجد وزیر خان لاہور کے خطیب ابو محمد سید دیدار علی شاہ نے یہ فتویٰ صادر کیا۔ ''اسم پروردگار اور یزداں عرفاً مخصوص ذات باری ہے اور اوتار ہنود کے نزدیک خدا کے جنم لینے کو کہتے ہیں اندریں صورت یزداں اور پروردگار آفتاب کو کہنا صریح کفر ہے۔ علیٰ ہٰذا خدا کے جنم لینے کا عقیدہ بھی کفر ہے اور توہین بزرگان دین فسق۔ لہٰذا جب تک ان کفریات سے قائل شاعر مذکور توبہ نہ کرے اس سے ملنا جلنا تمام مسلمان ترک کر دیں ورنہ سخت گنہگار رہوں گے۔ ابو محمد دیدار علی الخطیب فی مسجد وزیر خان المرقومہ۔''[14]

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم علامہ اقبال کے انتہائی عقیدت مند احباب میں سے تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ اقبال ایسے فتویٰ فروش مولویوں کے سخت خلاف تھے۔ ''مولوی تو ہر فروعی اختلاف پر مخالف کو کافر قرار دیتا ہے لیکن اقبال غیر مسلم موحد کو بھی کافر نہیں سمجھتے تھے اور اکثر اکابر صوفیا کی طرح سماع کو روح پرور جانتے تھے...... اقبال نے دیکھا کہ مدعیان دین اور حامیانِ شرع متین میں نہ افکار کی بلندی ہے نہ حوصلہ مندی، نہ دل بے تاب ہے اور نہ مشرب ناب، نہ دل گرم ہے نہ نگاہ پاک تو اس نے اس طبقہ کو دین کے لئے ایک خطرہ سمجھا۔ ایسے لوگوں کو جب سوجھے گی کوئی ادنیٰ بات ہی سوجھے گی۔ کسی بلند مقصد کے لئے قربانی تو در کنار وہ مقصد ہی ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ چنانچہ تاسیس پاکستان کی جدوجہد میں اس کا یہ خیال صحیح ثابت ہوا۔ بڑے بڑے خرقہ و عمامہ والے ملا، محدث، مفسر، فقیہہ اس تحریک کے مخالف ہو کر متعصب اور مسلمان کش لوگوں کے ساتھ ہو کر ملت اسلامیہ سے آمادۂ پیکار ہو گئے...... فقہ کے تمام دفتر کو وہ نظر ثانی کا محتاج سمجھتے تھے اور اس کے خواہش مند تھے کہ زندگی کے بدلے ہوئے علائق کے لئے قرآن کی بنیادی تعلیم کے

مطابق قوانین میں رد و بدل کیا جائے..... تحریک خلافت میں جب بہت سے مولوی صاحبان سیاست کے میدان میں کودے تو پھر ان کی یہ کیفیت تھی کہ ان سیاسی علما نے لاہور میں ایک بہت بڑا اجتماع کیا تا کہ اس مسئلے کا فیصلہ کیا جائے کہ خدا تعالیٰ جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں۔ امکان کذب باری تعالیٰ پر بہت گرما گرم بحثیں ہوئیں اسی پر ایمان و کفر کا مدار ٹھہرا۔ ایک دوسرے سے تعاون یا عدم تعاون کے لئے بھی یہی عقیدہ معیار بن گیا۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ ہمارے ملا جس کام میں مصروف ہیں یہ وہی کام ہے جو ابلیس نے اپنی مجلس شوریٰ میں اپنے ہم کاروں کے سپرد کیا تھا۔ ملا شیطان کی مجلس شوریٰ کے فیصلوں پر عمل کر رہا ہے..... علامہ اقبال ایک روز مجھ سے فرمانے لگے کہ اکثر پیشہ ور ملا عملاً اسلام کے منکر، اس کی شریعت سے منحرف اور مادہ پرست دہریہ ہوتے ہیں..... علامہ نے پاکستان کا تصور پیش کیا اور ملت اسلامیہ کے لئے سیاسی استقلال اور آزاد سلطنت کے طالب ہوئے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اہل دین سب سے آگے بڑھ کر اس کا خیر مقدم کریں لیکن علما میں بڑے بڑے اکابر نے اس کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ امام ہند بننے کا خواب دیکھنے والے ہندوؤں کے وظیفہ خوار اور دین سے ہٹی ہوئی وطن پرستی میں ان کے ہمکلام ہی نہیں بلکہ ابوالکلام یعنی کلام کے باپ ہو گئے۔ جس کے علم و تقویٰ پر مدینہ کی مہر ثبت تھی اس کی بابت جواہر لال نہرو کا ایک خط شائع ہو گیا کہ حسین احمد کو اتنے روپے دے چکا ہوں اب وہ اور مانگتے ہیں۔ نہرو نے ان کے نام کے ساتھ نہ مولانا لکھا نہ جناب اور صاحب، اس سے نتیجہ نکل سکتا ہے کہ وہ ایسے علما کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ بے چارے اقبال کے مقابلے میں عمامہ والوں کی صفیں آمادۂ پیکار ہو گئیں..... اقبال نے ایک مرتبہ ایک بیرسٹر کو جس نے اسلام قبول کر لیا تھا مشورہ دیا تھا کہ اپنی ہندو بیوی کو کسی ملّا کے کہنے پر الگ نہ کرنا۔ وہ بیوی تمہارے لئے بالکل جائز اور حلال ہے۔ وہ اگر اپنا مذہب تبدیل نہیں کرتی تو تم بدستور اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو تا کہ اس کو معلوم ہو کہ مسلمان ہونے سے آدمی زیادہ بہتر انسان ہو جاتا ہے۔ اب تم کسی مولوی سے نہ پوچھنا۔ میں نے تم سے جو کچھ کہا ہے وہ محض اسلام ہے خواہ کسی فقہ کی کتاب میں درج نہ ہو۔"[15]

سائمن کمیشن کے بائیکاٹ پر جناح اور اقبال کا اختلاف

دسمبر 1927ء میں جب کانگرس نے اس بنا پر سائمن کمیشن کا بائیکاٹ کیا کہ اس میں

کوئی ہندوستانی نمائندہ شامل نہیں تھا تو ڈاکٹر سر محمد اقبال، نواب ذوالفقار علی خان اور مولانا محمد علی، امیر جماعت احمدیہ (لاہوری) نے ایک مشترکہ بیان شائع کیا جس میں یہ لکھا کہ ''رائل کمیشن میں ہندوستانی ممبروں کے مقرر نہ کرنے کے جو وجوہ لارڈ برکن ہیڈ نے بیان کئے ہیں، فرقہ وارانہ اختلافات ہم کو مجبور کرتے ہیں کہ ہم ان وجوہ کو بادل ناخواستہ قبول کر لیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ پروگرام سے پہلے فرقہ وارانہ اختلاف کا تصفیہ ہونا ضروری ہے۔ ہم اپنے ہم وطنوں اور مسلمانوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ کمیشن کا بائیکاٹ کرنے سے مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔''[16] علامہ اقبال ان دنوں پنجاب کونسل میں سر فضل حسین کی یونینسٹ پارٹی کے رکن تھے اور جاگیرداروں کی اس سامراج نواز پارٹی کی پالیسی سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے خلاف تھی۔ چنانچہ مارچ 1927ء میں آل مسلم پارٹیز کانفرنس کے چند ماہ بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے جو دو دھڑے بنے تھے اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ محمد علی جناح بھی کانگرسی قیادت کی طرح سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے حق میں ہو گئے تھے۔ لیگ کے یونینسٹ نواز دھڑے کا صدر سر محمد شفیع کو بنایا گیا تھا اور اس کے جنرل سیکرٹری کے طور پر ڈاکٹر اقبال کا انتخاب ہوا تھا۔ دوسرے دھڑے کے صدر محمد علی جناح اور سیکرٹری ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے۔ اس زمانے میں یونینسٹ پارٹی کے ترجمان اخبار ''انقلاب'' کو علامہ اقبال کی اعانت و سرپرستی حاصل تھی۔ مولانا ظفر علی خان کے روزنامہ ''زمیندار'' کی پالیسی کانگرس نواز تھی اس لئے اس میں آئے دن علامہ اقبال کے خلاف زہریلے مقالات چھپتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر نے لاہور آ کر علامہ کو بائیکاٹ کا حامی بنانے کی کوشش کی مگر وہ انتہائی کوشش کے باوجود علامہ کو اس بات پر رضامند نہ کر سکا۔ جماعت احمدیہ کے لاہوری فرقہ کا امیر مولانا محمد علی، جس نے علامہ کے ساتھ مشترکہ بیان پر دستخط کئے تھے، مرزا غلام احمد کو مجدد مانتا تھا اور اسی فرقہ کے ایک سرکردہ رکن خواجہ نذیر احمد کا دعویٰ یہ ہے کہ خود علامہ بھی 1930ء تک مرزا کو مجدد ہی مانتے رہے تھے۔

ٹیپو سلطان اور نظام حیدر آباد کے بارے میں اقبال کا متضاد رویہ

عبدالمجید سالک لکھتا ہے کہ ''حضرت علامہ ٹیپو سلطان کے عاشق تھے متعدد بار ان کی تعریف میں اشعار بھی لکھ چکے تھے۔ جنوری 1929ء میں سفر دکن پیش آیا تو حیدر علی اور ٹیپو سلطان کے مزاروں پر بھی پہنچے۔ سلطان شہید کے مزار پر ایک میسوری شاعر نے ایک نظم سنائی جس سے

علامہ بے حد متاثر ہوئے اور اول سے آخر تک آبدیدہ رہے..... میسور سے حضرت علامہ 14 رجنوری کو حیدرآباد دکن پہنچے۔ سٹیشن پر ہی ان کو بتا دیا گیا کہ آپ اعلیٰ حضرت حضور نظام کے خاص مہمان ہیں۔ پلیٹ فارم پر صدہا اشخاص جمع تھے۔ معززین حیدرآباد، یونیورسٹی کے پروفیسر اور طلبا اور دوسرے اہل ذوق اور مداح، بچے قطار باندھے اقبال کا قومی ترانہ گا رہے تھے۔ علامہ مہمان خانہ شاہی میں تشریف لے گئے اور 18 رجنوری 1929ء گیارہ بجے قبل دوپہر اعلیٰ حضرت کے حضور میں باریاب ہوئے۔''[17] برصغیر کی تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ ریاست حیدرآباد دکن کا ساتواں حکمران رستم دوراں، ارسطوئے زماں، آصف جاہ نواب میر عثمان علی خان بہادر ہزایگزالٹڈ ہائی نیس اور تاج شاہی کے انتہائی وفادار اتحادی کے ''جدامجد'' نظام الملک نے 84-1780ء میں انگریزوں اور مرہٹوں کے ساتھ مل کر حیدرعلی اور ٹیپو سلطان کے خلاف جنگ کی تھی اور پھر 1799ء میں وہ انگریزوں کے انتہائی وفادار اتحادی کی حیثیت سے ٹیپو سلطان کے خلاف اس آخری جنگ میں نبردآزما ہوا تھا جس میں جنوبی ہند کا یہ حریت پسند مسلمان سلطان شہید ہوا تھا۔ لیکن علامہ کے تناقض بالذات کا یہ عالم تھا کہ ایک دن تو وہ سلطان شہید کے مزار پر آبدیدہ ہوتے تھے اور دوسرے دن اسی سلطان کے بدترین دشمن کی اولاد ''اعلیٰ حضرت حضور نظام'' کے مہمان بنتے تھے اور پانچویں دن وہ اسی ''اعلیٰ حضرت'' کی حضور میں باریابی حاصل کرتے تھے۔ یہ ''اعلیٰ حضرت'' برطانوی سامراج کے زیرسایہ ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی آبادی پر مشتمل 82 ہزار مربع میل کی ریاست کا مطلق العنان حکمران تھا۔ اس ریاست کی سالانہ آمدنی تقریباً 26 کروڑ روپے تھی اور برصغیر میں صرف یہی ایک ریاست تھی جس کی اپنی کرنسی اور اپنے ڈاک ٹکٹ تھے۔ 90 فیصد آبادی ہندوؤں کی تھی جن کی بھاری اکثریت غریب، مفلوک الحال اور بے زمین کسانوں کی تھی جبکہ جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کی اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ سرکاری انتظامیہ کے اہم عہدوں پر بھی مسلمانوں کی اجارہ داری تھی۔ ''اعلیٰ حضرت'' کو دنیا کا امیر ترین شخص سمجھا جاتا تھا کیونکہ اس کے پاس سونے اور نادر ہیرے و جواہرات کا ایک انبار تھا۔ وہ اپنی کنجوسی اور زر پرستی کی وجہ سے بھی چار دانگ عالم میں مشہور تھا۔ تاہم اس نے برطانوی تاج کے ''انتہائی وفادار اتحادی'' کی حیثیت سے پہلی جنگ عظیم کے دوران، جس میں برطانوی سامراج عالم اسلام کی خلافت عثمانیہ سے متصادم تھا، حکومت ہند کو دو کروڑ پچاس لاکھ پونڈ کا چندہ دیا تھا۔

چونکہ ریاست میں دس فیصد مسلم اقلیت نہایت مراعات یافتہ تھی، چونکہ وہ اپنی فقید المثال کنجوسی کے باوجود برصغیر کے نامور مسلم شاعروں، دانشوروں اور علماء کو وظائف اور انعام و اکرام سے نوازتا تھا، چونکہ اس نے اپنی عثمانیہ یونیورسٹی میں اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم بنایا ہوا تھا اور چونکہ اس نے انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں کی مشہور کتابوں کا اردو زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا اس لئے برصغیر کے بہت سے مسلم اہل علم بالخصوص علمبرداران اردو، اس کی ریاست کو اسلامی تہذیب وتمدن کا گہوارہ قرار دیتے تھے اور اس کے آستانے کو اسلامی مرکز کہتے تھے۔ تاہم حیرت کی بات یہ تھی کہ علامہ اقبال نے ایک طرف تو اپنے اسی دورۂ جنوبی ہند کے دوران ایک لیکچر میں اموی اور عباسی خلفاء کی مطلق العنان ملوکیت کی مذمت کرتے ہوئے اجماع یا پارلیمانی جمہوریت کی حمایت کی تھی اور دوسری طرف انہوں نے ایک مطلق العنان حکمران کے حضور میں باریابی حاصل کی جو برصغیر میں برطانوی راج کے اہم ترین ستونوں میں سے تھا۔ اس ''تاجدارِ دکن'' کی ریاست میں اجماع یا پارلیمانی جمہوریت کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ وہ حکومت ہند کی زیر سرپرستی مٹھی بھر مسلمان اور انگریز مشیروں کی امداد سے حکومت کرتا تھا۔ اس کی ریاست اسلامی تہذیب وتمدن کا گہوارہ نہیں تھی بلکہ یہ معدودے چند مسلمان جاگیرداروں اور زمینداروں کی زوال پذیر تہذیب کا آخری قلعہ تھی۔ معلوم نہیں کہ اسلامی عدل وانصاف کے عظیم علمبردار علامہ اقبال نے جب ''اعلیٰ حضرت'' کے حضور میں باریابی حاصل کی تھی تو انہیں یہ خیال کیوں نہ آیا کہ اس کی 90 فیصد غیر مسلم رعایا سے سیاسی، معاشرتی اور معاشی لحاظ سے اسی طرح بے انصافی کی جارہی تھی جس طرح کہ ریاست جموں وکشمیر کا جابر وظالم ہندو حکمران اپنی 77 فیصد مسلم رعایا سے کرتا تھا۔ مزید برآں ''اسرارِ خودی'' اور ''رموزِ بے خودی'' کے مصنف کی برطانوی سامراج کے ایک نیم تعلیم یافتہ پٹھو کے حضور میں باریابی کیا معنیٰ؟

اقبال نے مسلمانوں کے لئے علیحدہ مملکت کی بجائے ایک علیحدہ بڑے صوبے کا مطالبہ کیا تھا

دسمبر 1930ء میں علامہ اقبال نے الٰہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں جو خطبہ ☆ پڑھا اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اس میں پاکستان کا تصور

☆ مکمل متن کے لیے دیکھئے ضمیمہ نمبر 1

پیش کیا گیا تھا کیونکہ اس میں علامہ نے کہا تھا کہ ''میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ریاست میں ضم کر دیا جائے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ سیلف گورنمنٹ خواہ یہ سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا سلطنت برطانیہ کے باہر ہو اور ایک مربوط شمال مغربی ہندی مسلم ریاست کی تشکیل بالآخر مسلمانوں کی یا کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کی تقدیر ٹھہرے گی۔''
لیکن اگر اس سارے خطبہ پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ کا یہ تاریخی سیاسی خطبہ تناقضات سے خالی نہیں تھا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس میں ایک مکمل طور پر آزاد و خودمختار (Independent and Sovereign) اسلامی ریاست کا تصور پیش نہیں کیا گیا تھا۔ تجویز یہ تھی کہ آل انڈیا فیڈریشن کے اندر رہتے ہوئے شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریت والے چار صوبوں کا ون یونٹ بنا دیا جائے...... اگر اس یونٹ میں سے انبالہ ڈویژن کو نکال دیا جائے تو اس مجوزہ ریاست کی وسعت اور انتظامی مشکلات میں کمی ہو جائے گی اور اس خطہ میں غیر مسلم اقلیتوں کو تحفظ دیا جا سکے گا...... اس طرح ہندوستان اور بالآخر ایشیا کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ اس سے مسلمانوں میں احساس ذمہ داری پیدا ہوگا اور جذبہ حب الوطنی فروغ پائے گا۔ اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ بھرپور موقع دیا جائے کہ وہ ہندوستان کے نظام سیاست میں رہ کر مکمل نشوونما کر سکیں تو وہ ہندوستان کے خلاف تمام حملوں کی صورت میں خواہ یہ حملہ بزور قوت ہو یا بزور نظریات ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے...... مجوزہ اسلامی ریاست مذہبی نہیں ہو گی۔ اس میں سودی کاروبار کی اجازت ہوگی اور شرح سود پر کوئی پابندی نہیں ہوگی...... اگر صوبوں کی تقسیم کسی صحیح اصول کی بنا پر ہوگی تو اس سے مخلوط اور جداگانہ نیابت کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے گا۔ یہ صوبوں کا موجودہ ڈھانچہ ہے جس کی وجہ سے یہ جھگڑا قائم ہے...... وحدانی طرز حکومت سے مسلمانوں کو اس وقت تک فائدہ نہیں ہو سکتا جب تک انہیں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں سارے اختیارات مابقی کے ساتھ اکثریت کے حقوق نہ دیئے جائیں اور مرکزی اسمبلی میں انہیں 33 فیصد نشستیں نہ ملیں...... مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں وفاقی ریاست کے قیام کے صورت میں مسلم وفاقی ریاستیں ہندوستان کے تحفظ کی خاطر غیر جانبدار بری اور بحری فوجوں کو قائم کرنے کے لئے رضامند ہو جائیں گی اس قسم کی غیر جانبدار فوجی طاقت مغلیہ دور حکومت میں موجود تھی۔ اکبر کے زمانے میں ان تمام سرحدی فوجوں کے افسر ہندو تھے۔ مجھے

کامل یقین ہے کہ وفاقی ہندوستان میں غیر جانبدار فوج کے قیام سے مسلمانوں کی حب الوطنی میں اضافہ ہوگا اور اس سے اس بدگمانی کا بھی ازالہ ہو جائے گا کہ بیرونی حملہ کی صورت میں ہندوستانی مسلمان بیرونی حملہ آور مسلمانوں کے ساتھ مل جائیں گے۔"[18]

اس خطبہ میں علامہ کا مطالبہ یہ تھا کہ اگر آل انڈیا فیڈریشن کے اندر مسلمانوں کو مسلم اکثریت کے علاقوں میں سارے اختیارات مابقی (Residuary Powers) کے ساتھ اکثریتی حقوق دیئے جائیں اور اگر صوبوں کی از سر نو حد بندی کر دی جائے تو مسلمانوں کی حب الوطنی میں اضافہ ہوگا اور وہ مخلوط طریقہ انتخاب پر بھی آمادہ ہو جائیں گے۔ ان کے علاقوں میں سیکولر حکومت ہوگی جو شرح سود پر کوئی پابندی نہیں لگائے گی اور شمالی سرحد کے تحفظ کے لئے ہندو اور مسلمانوں کی مشترکہ فوج کی تشکیل پر رضامند ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ان ساری باتوں کا دو قومی نظریے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ مختصر الفاظ میں علامہ کا مطالبہ یہ تھا کہ اگر فرقہ وارانہ مسئلہ کے مستقل حل کے لئے یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانوں کو اپنی روایات و تمدن کے ماتحت اس ملک میں آزادانہ نشوونما کا حق ہے تو وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔ ان کے اس خطبہ اور سر آغا خان کی زیر صدارت آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ دہلی کی قراردادوں میں فرق صرف یہ تھا کہ علامہ اقبال ان قراردادوں سے ایک قدم آگے بڑھ کر شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریت کے چاروں صوبوں کو یکجا کر کے ون یونٹ بنانے کے خواہاں تھے۔ تاکہ اس مجوزہ صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت قطعی اور واضح ہو۔ پنجاب کونسل میں مسلمانوں کو معمولی اکثریت حاصل تھی اس لئے کسی فرقہ وارانہ مسئلہ کا تسلی بخش حل نہیں ہوتا تھا اور ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان فرقہ وارانہ حقوق کے لئے رسہ کشی جاری رہتی تھی اور فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس، جس کے انعقاد میں علامہ نے سرگرمی سے حصہ لیا تھا، کا تقاضا یہ تھا کہ مختلف فرقوں کے وجود کو فنا کئے بغیر ان سے ایک متوازن اور ہم آہنگ قوم تیار کی جائے۔ علامہ اس مطالبہ کے شدومد سے حامی تھے۔ بالفاظ دیگر اگر کانگرسی زعما اور انگریزی حکومت مسلمانوں کو مطلوبہ تحفظات دینے پر آمادہ ہو جاتی تو علامہ کے لئے متحدہ ہندوستانی قومیت کا نظریہ قابل قبول ہوتا۔ علامہ کے اس خطبہ سے ایک سال قبل یعنی دسمبر 1929ء میں کانگرس مکمل آزادی کی قرارداد منظور کر چکی تھی۔

اقبال بنام تھامپسن ...... پاکستان سکیم سے اقبال کا اظہار لاتعلقی

جب دسمبر 1930ء میں علامہ اقبال نے الہ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں خطبہ دیا تھا تو ان کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ اس خطبہ کے اندر سے ایک آزاد وخودمختار مملکت پاکستان کا تصور نکال لیا جائے گا۔ برصغیر کے شمال مغرب میں پاکستان کے نام سے مسلمانوں کی آزاد مملکت کا مطالبہ کیمبرج یونیورسٹی میں مسلم طلبہ کی ایک جماعت نے چودھری رحمت علی کی سرکردگی میں کیا جب لندن میں گول میز کانفرنسیں منعقد ہورہی تھیں، یہ 1930ء 1931ء اور 1932ء کا زمانہ تھا۔ کیمبرج کے مسلم طلبہ کے اس گروپ نے گول میز کانفرنس کے مسلم مندوبین کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا کہ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ادا نہیں کیا۔ یادرہے ان مندوبین میں علامہ اقبال بھی شامل تھے۔ کچھ عرصہ بعد بعض حلقوں نے علامہ اقبال کے 1930ء کے خطبہ الہ آباد کو بھی چودھری رحمت علی کی پاکستان سکیم کے ساتھ منسوب کرنا شروع کردیا۔ اس کا علامہ نے نوٹس لیا اور تردید کی۔ چنانچہ اس ضمن میں 4 رمارچ 1934ء کو علامہ اقبال نے لاہور سے ای۔ جے۔ تھامپسن کے نام ایک خط ☆ لکھا جس کے مکمل متن کا اردو ترجمہ یہ ہے:

''مائی ڈیر مسٹر تھامپسن!

مجھے اپنی کتاب پر آپ کا ریویو ابھی ابھی موصول ہوا ہے۔ یہ بہت عمدہ ہے اور میں اُن باتوں کے لئے آپ کا بہت ممنون ہوں جو آپ نے اس میں میرے متعلق بیان کی ہیں۔ لیکن آپ نے ایک غلطی کی ہے جس کی میں فوری نشاندہی کرنا ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ یہ ایک فاش غلطی ہے۔ آپ نے میرے بارے میں کہا ہے کہ میں اُس سکیم کا حامی ہوں جسے ''پاکستان'' کہا جاتا ہے۔ جبکہ پاکستان میری سکیم نہیں ہے۔ میں نے اپنے خطبے میں جو تجویز پیش کی تھی وہ ایک مسلم صوبہ کے بارے میں تھی جو شمال مغربی ہندوستان کی مسلم اکثریتی آبادی پر مشتمل تھا۔ میری سکیم کے مطابق یہ نیا صوبہ مجوزہ انڈین فیڈریشن کا حصہ ہوگا۔ پاکستان سکیم میں مسلم صوبوں پر مشتمل ایک علیحدہ فیڈریشن کا قیام تجویز کیا گیا ہے جو ایک علیحدہ ڈومینین کی حیثیت سے انگلستان کے ساتھ براہ راست تعلق رکھے گی۔ اس سکیم نے کیمبرج میں جنم لیا ہے۔ اس سکیم کے مصنفین کا خیال

☆ انگریزی متن کے لیے دیکھئے ضمیمہ نمبر: 2

ہے کہ ہم جو گول میز کانفرنس کے مندوبین ہیں، ہم نے مسلم قوم کو ہندوؤں یا نام نہاد انڈین نیشنلزم کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا ہے۔

خیر اندیش

محمد اقبال۔''[19]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ اقبال بھی جناح کی طرح ایک متحدہ ہند کے دائرے کے اندر رہتے ہوئے مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دلانے کے خواہاں تھے۔ بعد ازاں کانگرس کی ہندو بورژوا قیادت نے یہ خودمختاری دینے کے خلاف اس قدر ہٹ دھرمی کا ثبوت دیا کہ بالآخر ایک علیحدہ مملکت کی صورت میں پاکستان وجود میں آ گیا۔ ☆

پنجابی شاونسٹوں کی جانب سے جس شدومد اور تواتر کے ساتھ اقبال کو تصور پاکستان کے خالق کے طور پر پیش کیا گیا اس کے دو مقاصد تھے۔ ایک تو یہ ثابت کرنا تھا کہ پاکستان کا قیام دراصل پنجابی مسلمانوں کا مرہون منت ہے اس لئے پاکستان میں آباد باقی تمام قومیتیں ان کی بالادستی کو تسلیم کریں۔ دوسرا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ پاکستان ایک ''نظریاتی مملکت'' ہے۔ اس نظریاتی ہتھیار کو بھی انہوں نے پاکستان کی دوسری قومیتوں اور مظلوم طبقوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھنے اور ان پر اپنی بالادستی قائم کرنے کے لئے استعمال کیا۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو دنیا کا کوئی اور ملک اور نہ ہی پاکستان کسی خواب یا نظریے کی پیداوار ہے۔ تاریخ عالم کا اصول یہ رہا ہے کہ سلطنتیں اور ممالک تاریخی جدل کی بدولت وجود میں آتے ہیں اور پھر جدلی عمل کے نتیجے ہی میں زوال پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ پاکستان کسی شاعر کے خواب کی تعبیر نہیں تھا بلکہ برصغیر کے تاریخی جدلی تضاد یعنی ہندو۔ مسلم تضاد کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا۔ بلکہ تقسیم ہند کی زیادہ تر ذمہ داری ہندو اکثریت کے تنگ نظر لیڈروں پر عائد ہوتی ہے جو مسلم اقلیت کو معمولی سی سیاسی، معاشی اور ثقافتی رعایت دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ اقبال آخر وقت تک اپنی قوم کے لئے ان رعایات ہی کے طلب گار رہے۔

اقبال اور سوشلزم

12 نومبر 1930ء کی پہلی گول میز کانفرنس کے نامزد کردہ مسلم مندوبین کی فہرست

☆ اس کی تفصیل کے لیے دیکھئے ''پاکستان کی سیاسی تاریخ۔ پاکستان کیسے بنا؟'' دو جلدیں

میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کا نام شامل نہیں کیا گیا تھا۔ تاہم جب وائسرائے ارون (Irwin) نے وزیر ہند کی ہدایت کے مطابق مارچ 1931ء میں گاندھی کے ساتھ معاہدہ کیا اور اس بنا پر گاندھی اپنی سول نافرمانی کی تحریک کو معطل کر کے دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کرنے پر آمادہ ہو گیا تو دوسرے تعلیم یافتہ مسلمانوں کی طرح علامہ کو بھی یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ برطانیہ کی لیبر حکومت کانگرس کو خوش کرنے کے لئے اقلیتوں کو قربان کر دے گی۔ چنانچہ اس خطرہ کے پیش نظر علامہ نے 30 رجولائی 1931ء کو سر فرانسس ینگ ہسبنڈ (Francis Young Husband) کے نام ایک کھلا مکتوب شائع کیا جس میں اس امر کی وضاحت کی گئی تھی کہ اگر آئندہ گول میز کانفرنس میں برطانیہ نے دونوں قوموں کے اختلافات سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تو آخر کار یہ بات دونوں ملکوں کے لئے تباہ کن ہوگی۔ اگر برطانیہ اپنے کسی مادی مفاد کے پیش نظر ہندوؤں کو سیاسی اختیارات سونپ دے اور انہیں برسر اقتدار رکھے تو ہندوستان کے مسلمان اس پر مجبور ہوں گے کہ سوراج یا اینگلو ہندو سوراج کے خلاف وہی حربہ استعمال کریں جو گاندھی نے برطانوی حکومت کے خلاف کیا تھا۔ مزید برآں اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایشیا کے تمام مسلمان روسی کمیونزم کی آغوش میں چلے جائیں اور اس طرح مشرق میں برطانوی تفوق و اقتدار کو سخت صدمہ پہنچے۔

''میرا ذاتی خیال ہے کہ روسی عوام فطرتاً لا مذہب نہیں ہیں۔ بلکہ میری رائے میں وہاں کے مردوں اور عورتوں میں مذہبی میلان بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ روس کے مزاج کی موجودہ منفی حالت غیر معین عرصے تک نہ رہے گی کیونکہ کسی معاشرے کا نظام زیادہ دیر تک دہریت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ جونہی حالات معمول پر آئے اور لوگوں کو ٹھنڈے دل سے سوچنے کا موقع ملا وہ یقیناً اپنے نظام کے لئے کوئی مثبت بنیاد تلاش کریں گے۔ اگر بالشوزم میں خدا کی ہستی کا اقرار شامل کر دیا جائے تو بالشوزم اسلام کے بہت قریب آ جاتا ہے اس لئے میں متعجب نہ ہوں گا اگر کسی زمانے میں اسلام روس پر چھا جائے یا روس اسلام پر۔ اس چیز کا انحصار زیادہ تر اس امر پر ہوگا کہ نئے آئین میں ہندوستان کے مسلمانوں کی کیا حیثیت ہوگی۔''[20]

بعض حلقے علامہ اقبال کے اس خط سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ وہ مارکسزم کے معاشرتی و معاشی نظام کے خلاف نہیں تھے۔ انہیں اعتراض صرف اس کی دہریت پر تھا۔ اگر علامہ کی اس سے پہلے اور بعد کی تحریروں کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ نتیجہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن

دراصل ایسا نہیں ہے۔ علامہ کی 1931ء سے پہلے اور اس کے بعد کی تحریروں پر نظر ڈالی جائے تو یہ تاثر ملتا ہے کہ انہوں نے مارکسزم کا کوئی باقاعدہ اور گہرا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ ان کے 29-1928ء کے لیکچروں میں یورپ کے بورژوا فلسفیوں اور مفکروں کے حوالے موجود ہیں لیکن ان میں کسی بھی لیکچر میں جدلیاتی مادیت کے حسن و قبح پر کوئی بحث نہیں ہے اور نہ ہی کارل مارکس، لینن اور دوسرے کمیونسٹ مفکروں کے فلسفیانہ نظریات کا کوئی ذکر ہے۔ وہ بلاشبہ روسی انقلاب سے متاثر ہوئے تھے اور بعد میں انہوں نے اس انقلاب کی کامیابیوں کا بھی اعتراف کیا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کے نظریے کے مخالف ہو گئے تھے۔ علامہ درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور اس حیثیت سے ان کی شخصیت میں وہ سارے خصائص موجود تھے جو اس طبقہ میں مجموعی طور پر ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنے 1931ء کے خطبہ لاہور میں خود اپنے آپ کو تخیل پسند قرار دیا تھا۔ ان کا شاعرانہ تخیل یہ تھا کہ معاشرے میں افراط وتفریط نہ ہو اور ہر معاملے میں اعتدال کا راستہ اختیار کیا جائے۔ بالفاظ دیگر سارا معاشرہ معاشرتی اور معاشی لحاظ سے درمیانہ طبقہ بن جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ مغربی یورپ کی سوشل ڈیموکریسی کو پسند کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس نظام کے تحت معاشرتی ومعاشی افراط وتفریط بھی نہیں ہوگی اور دہریت کا بھی غلبہ نہیں ہوگا لیکن یہ محض ان کی ناقابل عمل تخیل پسندی تھی۔ عملاً وہ لیفٹیننٹ گورنر اوڈوائر اور سرکار برطانیہ کا قصیدہ بھی لکھتے تھے اور ''اعلیٰ حضرت تاجدار دکن'' کے حضور میں باریابی بھی حاصل کرتے تھے۔ وہ والیان ریاست اور بڑے جاگیرداروں سے وظیفے اور انعام واکرام بھی لیتے تھے۔ اگرچہ انہیں احساس تھا کہ ''ایسے آدمی کو بدقسمتی سے مسلسل ذہنی کشمکش میں زندگی بسر کرنی پڑتی ہے اور اس پر بآسانی تناقض بالذات کا الزام لگایا جاسکتا ہے۔'' لیکن بدقسمتی سے انہیں یہ احساس نہیں تھا کہ اگر ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کے اصول کو تسلیم کرلیا جائے تو پھر عملاً ارتکاز دولت کی کوئی حد مقرر نہیں کی جاسکتی۔ دنیا کی تاریخ میں کسی بھی زمانے میں اور کسی بھی جگہ ایسا نہیں ہوا اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔

دوسری گول میز کانفرنس میں اقبال کی شرکت اور اکتاہٹ

ستمبر 1931ء میں دوسری گول میز کانفرنس ہوئی تو ڈاکٹر سر محمد اقبال کو سر فضل حسین کی سفارش پر مولانا محمد علی جوہر مرحوم کی جگہ مسلم مندوبین کی فہرست میں شامل کیا گیا مگر ظفر اللہ خان کا

بیان ہے کہ علامہ نے اس کانفرنس کی کاروائی میں کوئی حصہ نہ لیا۔ ان کی طبیعت اکتائی رہی۔ انہوں نے اس کانفرنس میں ایسی کوئی دھمکی نہ دی جو انہوں نے سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام کھلے خط میں دی تھی۔ عبدالمجید سالک لکھتا ہے کہ "علامہ کی اس اکتاہٹ کی وجہ یہ تھی کہ 26 نومبر کو وفاق ہند والی کمیٹی کے مسلم ارکان نے اپنے سابقہ فیصلے کو پس پشت ڈال کر وفاقی کمیٹی میں حصہ لیا اور ان کے سرکردہ نے یہ کہا کہ صوبائی خود مختاری کے ساتھ ہی مرکز میں وفاق قائم کر دیا جائے۔ علامہ کو ان ممبروں کے ناگہانی اور پراسرار فیصلے پر رنج ہوا اور وہ مسلم وفد سے علیحدہ ہو گئے۔ یہاں مشہور ہو گیا کہ علامہ نے کانفرنس سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ لیکن واپسی پر لاہور میں علامہ نے بتایا کہ میں نے کانفرنس سے استعفیٰ نہیں دیا بلکہ مسلم وفد سے علیحدگی اختیار کی ہے اور میرا یہ عمل آل انڈیا مسلم کانفرنس کے فیصلے کے مطابق ہے۔[21] غالباً مسلم وفد سے علیحدگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس وفد پر سر آغا خان اور چودھری ظفر اللہ خان کا غلبہ تھا اور غالباً وفاق کمیٹی کے مسلم ارکان کا سرکردہ چودھری ظفر اللہ خان تھا جس نے یہ تجویز مان لی تھی کہ صوبائی خود اختیاری کے ساتھ ہی مرکز میں وفاق قائم کر دیا جائے جبکہ علامہ کا مؤقف یہ تھا کہ پہلے صوبائی خود اختیاری قائم کی جائے اور جب ان حکومتوں کا تجربہ کامیاب ہو جائے تو مرکز میں وفاق قائم کیا جائے اور اولین مرحلے پر یہ وفاق صرف برطانوی ہند کے صوبوں کا ہو، ریاستیں شریک نہ کی جائیں۔ یہ کانفرنس دسمبر 1931ء میں ختم ہوئی۔ جنوری 1932ء میں کانفرنس کے مندوبین واپس ہندوستان آئے تو تقریباً تین ماہ بعد اپریل میں چودھری ظفر اللہ خان کو سر فضل حسین کی جگہ چار ماہ کے لئے وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن مقرر کر دیا گیا تھا۔ یہ تقرر سر فضل حسین کی سفارش پر ہی ہوا تھا جو بیمار تھا اور چار ماہ کے لئے آرام کرنا چاہتا تھا۔

اقبال فاشزم کے حامی تھے

فروری 1932ء میں علامہ اقبال نے لاہور میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کی صدارت کی اور اپنے خطبہ صدارت میں گاندھی کی سول نافرمانی کے مسلم دشمن مقاصد، صوبہ سرحد میں سرخ پوشوں کے قتل عام، کشمیری مسلمانوں پر ڈوگرہ راج کے جبر و استبداد، پورے برصغیر میں ہندو۔ مسلم فسادات اور اقلیتوں کے اندیشوں کا ذکر کرتے ہوئے صحیح طور پر یہ پیش گوئی کی کہ "یہ

مناظر محض ایک آنے والے طوفان کے آثار ہیں جو سارے ہندوستان اور ایشیا کے باقی حصوں پر بھی چھا جائے گا۔ یہ قطعاً اس سیاسی تمدن کا لازمی نتیجہ ہے جس نے انسان کو ایک ایسی ''چیز'' تصور کر رکھا ہے جس سے جلب منافع کیا جائے حالانکہ انسان ایک شخص ہے جس کو خاص کلچرل طاقتوں سے نشوونما اور ترقی دینی چاہیے۔ اقوام ایشیا یقیناً اس قابو چیانہ اقتصاد کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں گی جس کو مغرب نے ترقی دے کر ایشیا کی قوموں میں عائد کر رکھا ہے۔ ایشیا اپنی غیر منضبط انفرادی کیفیت کے ساتھ زمانہ حال کی مغربی سرمایہ داری کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔''[22]

علامہ نے ان خیالات کا اظہار لندن سے واپسی کے فوراً بعد کیا تھا۔ یورپ ان دنوں فقید المثال معاشی بحران میں مبتلا تھا۔ کروڑوں عوام بے روزگاری کا شکار تھے۔ اٹلی اور جرمنی میں فسطائیت کا بول بالا ہو رہا تھا اور دوسری عالمی جنگ کی تیاریاں زور شور سے شروع ہو چکی تھیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر علامہ کو یہ تو یقین ہو گیا تھا کہ اب سرمایہ دارانہ سامراجیت زیادہ دیر تک اپنی گرفت قائم نہیں رکھ سکے گی لیکن وہ یہ پیش بینی نہیں کر سکے تھے کہ سرمایہ دارانہ سامراجیت کے خاتمہ کے بعد کون سی عالمی قوت ابھرے گی۔ بظاہر وہ فسطائیت سے متاثر تھے۔ چنانچہ جب وہ لندن واپس ہوتے ہوئے موتمر عالم اسلامی کی دعوت پر اسلامی ممالک کا دورہ کرنے کے بعد واپس لاہور پہنچے تو انہوں نے کہا تھا کہ ''شام کے عربوں سے مل کر میں خاص طور پر متاثر ہوا۔ ان نوجوانوں میں اس خلوص و دیانت کی جھلک پائی جاتی ہے جو میں نے اطالیہ کے فاشسٹ نوجوانوں کے سوا کسی میں نہیں دیکھی۔''[23]

اس سفر کے تقریباً ایک سال بعد یعنی 1933ء کے اوائل میں علامہ نے روم میں اٹلی کے فاشسٹ ڈکٹیٹر مسولینی سے بھی ملاقات کی تھی۔ فقیر سید وحید الدین کے بیان کے مطابق اس ملاقات میں رسمی مزاج پرسی کے بعد مسولینی نے ''ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ میری فاشسٹ تحریک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے۔ انہوں نے جواب دیا آپ نے ''ڈسپلن'' کے اس اصول کا بڑا حصہ اپنا لیا ہے جسے اسلام انسانی نظام حیات کے لئے بہت ضروری سمجھتا ہے لیکن اگر آپ اسلام کے نظریہ حیات کو پوری طرح اپنا لیں تو سارا یورپ آپ کے تابع ہوگا۔ مسولینی نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ میں دنیا کے مسلمانوں کی ہمدردی کس طرح حاصل کر سکتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا مفت تعلیم اور رہائش کا انتظام کر کے زیادہ سے زیادہ مسلمان طلبا کو

اٹلی بلا یئے۔''[24] ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے علامہ اقبال کا یہ قول نقل کیا ہے کہ مسولینی نے دوران گفتگو مجھ سے پوچھا تھا۔''افریقہ کے مسلمان مجھ سے ناخوش ہیں۔ان کے اطمینان کے لئے میں کیا رویہ اختیار کروں۔میں نے اس سے کہا کہ ان سے اچھا سلوک کیجئے اور ان کی تعلیم کا معقول انتظام کر دیجئے۔جب آپ ان کی جسمانی و روحانی آسودگی کا بندوبست کر دیں گے تو آپ سے ناخوش نہ رہیں گے۔''[25]

جب علامہ نے اٹلی کے آمر مطلق کو یہ مشورہ دیا تھا اس وقت اٹلی طرابلس پر قابض تھا اور شمالی افریقہ کے دوسرے ممالک پر قبضہ کرنے کے لئے زور شور سے جنگی تیاریاں کر رہا تھا۔ جب 1911ء میں اٹلی نے طرابلس پر قبضہ کر کے خلافت عثمانیہ کے قطعی زوال کے لئے پہلا عملی قدم اٹھایا تھا تو علامہ اقبال نے ''فاطمہ بنت عبداللہ'' کے عنوان سے ایک بہت ولولہ انگیز نوحہ لکھا تھا۔لیکن حیرت ہے 1935ء میں انہوں نے مسولینی کو یہ مشورہ نہیں دیا تھا کہ تم افریقی مسلمانوں کے خلاف سامراجی عزائم ترک کر دو۔ان کا مشورہ صرف یہ تھا کہ ان کی ''معقول تعلیم'' کا انتظام کر دو۔جب ان کی ''جسمانی اور روحانی آسودگی'' کا بندوبست ہو جائے گا وہ تم سے ناخوش نہیں رہیں گے۔معلوم نہیں علامہ ایشیا و افریقہ کے مسلمانوں کی برطانوی سامراجیوں کے ہاتھوں غلامی اور ان کی اطالوی فاشسٹوں کے ہاتھوں غلامی میں اس قسم کا امتیاز کیوں کرتے تھے۔اس سوال کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے کہ انہوں نے فاشزم کا بہت سطحی مطالعہ و مشاہدہ کیا تھا اور وہ ان کے آہنی ڈسپلن سے بہت متاثر ہوئے تھے۔فقیر وحید الدین لکھتا ہے کہ ''ڈاکٹر صاحب مسولینی سے دیر تک گفتگو کرتے رہے۔جب وہ اس سے رخصت ہوئے تو لوگوں نے انہیں گھیر لیا اور تقاضا کرنے لگے کہ آپ ہمارے لیڈر کے متعلق اپنی رائے دیجئے۔ڈاکٹر صاحب اس موضوع پر کچھ نہیں کہنا چاہتے تھے۔لیکن لوگ راستہ روکے کھڑے تھے اور ہجوم سے موٹر نکال کر لے جانا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔آپ سے مسولینی کے سٹاف کے آدمیوں نے کہا کہ ان لوگوں سے جان چھڑانا مشکل ہے اس لئے کچھ نہ کچھ کہہ دیجئے۔یہ سن کر ڈاکٹر صاحب نے ہجوم کو مخاطب کر کے فرمایا۔''مسولینی بغیر بائیبل کے لوتھر ہے۔'' یہ فقرہ اطالوی زبان میں ترجمہ ہوا اور ہجوم میں بار بار دہرایا گیا۔لوگ سن کے خوشی سے ناچنے لگے اور اسی وقت بڑے بڑے پوسٹر جن پر یہ فقرہ درج تھا، چھاپ کر در و دیوار پر چسپاں کر دیئے گئے۔''[26] علامہ نے غالباً روم میں ہی مسولینی کی تعریف میں ایک نظم بھی

لکھی تھی جس کا ایک شعر یہ تھا کہ

رومتہ الکبرے ! دگرگوں ہو گیا تیرا ضمیر
اینکہ می بینم بہ بیداریست یا رب یا بخواب!

اور اس کا آخری شعر یہ تھا کہ

فیض یہ کس کی نظر کا ہے؟ کرامت کس کی ہے؟
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب!

علامہ کے نزدیک کسی زندہ اور صاحب کردار قوم کی پہچان یہ تھی کہ ''جس طرح دنیا میں دوسری اشیاء میں نر اور مادہ کا امتیاز موجود ہے اسی طرح قومیں بھی نر اور مادہ ہوتی ہیں اور اس کا پتہ ان کے قول و عمل، معاشرت، کردار، خصائل اور نفسیات سے چلتا ہے۔''[27]

معلوم نہیں علامہ اقبال نے قوموں کی جنس کے بارے میں یہ عجیب و غریب خیال دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی پر روم میں مسولینی کے نوجوان رضا کاروں کے مسلح جتھوں کی پریڈیں دیکھنے کے بعد قائم کیا تھا یا وہ اس سے پہلے ہی اس خیال کے حامی تھے۔ بہر صورت یوں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے اسی خیال کے تحت اپنے 1932ء کے خطبہ لاہور میں مسلمانوں کو مسولینی کا ''ڈسپلن'' اپنانے کا مشورہ دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ''اسلام اب بھی ایک نئی دنیا پیدا کر سکتا ہے۔ جس میں غریب امیروں سے ٹیکس وصول کریں۔ جس میں انسانی سوسائٹی معدوں کی مساوات پر نہیں بلکہ درجوں کی مساوات پر قائم ہو۔ جس میں ایک اچھوت شہزادی سے شادی کر سکے۔ جس میں ذاتی ملکیت محض ایک وقف ہو اور جس میں سرمائے کو اس طرح المغاعف ہونے کا موقع نہ دیا جائے کہ وہ حقیقی دولت آفریں طبقے پر غلبہ پا جائے...... تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند نظری ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی تھی اور آزادی چاہتی ہے...... مسولینی کا اصول یہ ہے کہ جس شخص کے پاس فولاد ہے اس کے پاس روٹی ہے لیکن میں اس میں ترمیم کر کے کہتا ہوں کہ جو شخص خود فولاد ہے اس کے پاس سب کچھ ہے۔ سخت بن جاؤ اور سخت محنت کرو۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا یہ ہی ایک راز ہے...... مسلمانوں کی ایک ہی سیاسی انجمن ہو۔ ایک ہی قومی سرمایہ ہو جس کے تحت یوتھ لیگیں اور رضا کاروں کے جیش منظم کئے جائیں۔ کلچرل ادارے قائم کئے جائیں۔ ہارٹوگ کمیٹی کی سفارشات کے مطابق تعلیم کی ترویج کا انتظام کیا جائے

اور ایک جمیعت علماء قائم کی جائے جس میں وہ مسلمان قانون دان لازماً شامل ہوں جنہوں نے جدید قانونی تعلیم حاصل کی ہے۔"[28]

فسطائیت کے عروج و زوال کی تاریخ، تاریخ کے ہر طالب علم کو معلوم ہے کہ یورپ میں اس سیاسی، معاشرتی اور معاشی نظام کی بنیاد انتہائی مبالغہ آمیز قوم پرستی پر تھی۔ درمیانہ طبقہ اس تشدد آمیز نظام کا سب سے بڑا ستون تھا اور اس کے مقاصد یہ تھے کہ (1) فقید المثال بحران پر قابو پانے کے لئے بذریعہ تشدد ہڑتالوں اور مظاہروں وغیرہ پر پابندی عائد کی جائے تاکہ اسلحہ سازی کی صنعت اور دوسری صنعتوں کی پیداوار میں اضافہ ہو۔ (2) روس کی جانب سے اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا سدباب کیا جائے۔ (3) دنیا میں برطانیہ، فرانس، امریکہ اور ہالینڈ وغیرہ کے نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ کیا جائے اور ساری دنیا کی ازسرنو تقسیم کی جائے۔ اس نظام کی نظریاتی بنیاد انسانی اخوت و مساوات اور عدل و انصاف پر نہیں تھی بلکہ اس کی بنیاد کھلم کھلا نسلی و قومی برتری کے نظریے پر تھی۔ درمیانہ طبقہ اس نعرے سے بہت متاثر تھا اور سرمایہ دار طبقہ اسے اپنے طبقاتی و سامراجی مفاد کے لئے بہت فائدہ مند سمجھتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے تھوڑی ہی دیر بعد سب سے پہلے اٹلی کے سرمایہ دار طبقے کے نمائندہ مسولینی نے سرمایہ داریت کے تحفظ و فروغ کے لئے اس جابرانہ نظام کی علمبرداری کی۔ کیونکہ نہ صرف اس کے سوا ملک کی معیشت کی بحالی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی بلکہ افریقہ کی چھینا جھپٹی (Scramble for Africa) میں حصہ لینے کی بھی کوئی اور صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے اس مقصد کے لئے غیر سرکاری مسلح رضا کاروں کے جتھوں کی تنظیم کی جو کمیونسٹ اور دوسرے سیاسی مخالفین کو صفحہ ہستی سے مٹاتے تھے۔ جب مسولینی نے اپنے ان رضا کاروں کی مدد سے اکتوبر 1922ء میں اقتدار پر قبضہ کر کے اسے بہت جلد مستحکم کر لیا تو شکست خوردہ جرمنی کے بعض سیاسی عناصر میں بھی اس رجحان نے فروغ پایا۔ چنانچہ ہٹلر کی نازی پارٹی معرض وجود میں آئی اور اس نے تیسرے عشرے کے اوائل میں اقتدار سنبھال لیا۔ اس کا سیاسی نعرہ یہ تھا کہ ملک میں سیاسی طوائف الملوکی کو ختم کرنے کے لئے ایک ہی سیاسی پارٹی ہونی چاہیے اور اس کا ایک قائد ہو جس کی غیر مشروط اطاعت سب پر لازمی ہو۔

1933ء میں علامہ اقبال نے جو خود درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے جب مسولینی کے رضا کاروں کے مسلح جتھوں کو روم میں مارچ کرتے ہوئے دیکھا اور پورے شہر کے سیاسی،

معاشرتی اور معاشی ''امن وسکون'' پر نظر ڈالی تو وہ اس ''ڈسپلن'' سے بہت متاثر ہوئے اور انہوں نے خلوص دل سے سوچا کہ مسلمانان ہند کی ہمہ گیر پسماندگی دور کرنے کا راز بھی اسی طریقے میں مضمر ہے۔ تاہم وہ روم میں اپنے مختصر قیام کے دوران اس جابرانہ نظام کا گہرا مطالعہ ومشاہدہ نہیں کر سکے تھے۔ وہ بہت رقیق القلب تھے اور ہندی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے تہہ دل سے خواہاں تھے چنانچہ جب وہ دوسری گول میز کانفرنس کے بعد واپس لاہور پہنچے تو انہوں نے اسی مخلصانہ خواہش کے تحت پنجابی مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کو مشورہ دیا کہ وہ ایک ہی سیاسی جماعت کے تحت منظم ہو جائیں اور یوتھ لیگوں اور رضا کاروں کے جیش منظم کریں۔ وہ نظریاتی طور پر مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی محبوب ترین اور اس وجہ سے افضل ترین امت تصور کرتے تھے۔ لہٰذا ان کے لئے فسطائی نظریے میں بہت دلکشی تھی۔ غالباً مجلس احرار سے بھی وہ ابتداً اسی لئے متاثر ہوئے تھے کہ اس جماعت کے منظم جتھوں نے داخلہ کشمیر کے امتناعی احکام کی خلاف ورزی کی تھی۔ اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ علامہ کی کتاب ''جاوید نامہ'' بھی فروری 1932ء میں شائع ہوئی تھی اور اس میں مسلمان نوجوانوں کو ولولہ انگیز پیغام عمل دیا گیا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے علامہ کو یہ احساس نہیں تھا کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلم اکثریت کے علاقوں اور باقی عالم اسلام میں فسطائی نظام کی نشوونما کے لئے مطلوبہ صنعتی بنیاد موجود نہیں تھی۔ ان کا شاعرانہ خواب یہ تھا کہ مسلمان خود فولاد بن جائیں تو انہیں زندگی کا راز مل جائے گا۔ معدوں کی مساوات کے بغیر روحوں کی مساوات قائم ہوسکتی ہے اور ذاتی ملکیت محض ایک وقف بن سکتی ہے اور اس طرح دولت آفریں طبقے کا سدباب ہوسکتا ہے۔ چونکہ اس حسین خواب کا زندگی کے ٹھوس حقائق سے کوئی تعلق نہیں تھا اس لئے اس کی تعبیر نہ ہوسکتی تھی اور نہ ہوئی۔ تاہم پنجابی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کے نوجوانوں میں علامہ کے اس خطبہ سے بہت جوش وجذبہ پیدا ہوا۔ اس طرح ان کی نہ صرف مذہبی عصبیت بلکہ ان کے علاقائی شاونزم میں بھی شدت پیدا ہوئی۔

اقبال، کشمیر کمیٹی اور جماعت احمدیہ

مارچ 1932ء میں جماعت احمدیہ کے امیر مرزا بشیر الدین محمود نے کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کمیٹی کسی دستور کی تدوین کے بغیر ہی کام کر رہی

تھی اور مرزا بشیر کو بطور صدر غیر محدود اختیارات حاصل تھے۔لیکن جب تحریک کشمیر نے طول کھینچا تو خیال پیدا ہوا کہ کشمیر کمیٹی کا ایک باضابطہ دستور تیار کیا جائے۔ اس پر احمدیوں نے مخالفت کی کیونکہ وہ اس ترتیب دستور کو شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس سے ہم کو اور ہمارے امام کو بے دخل کرنا مقصود ہے۔ ان دنوں احراریوں کی جانب سے اینٹی قادیانی تحریک زور شور سے جاری تھی۔لہٰذا اختلاف پیدا ہوا اور علامہ اقبال مرزا بشیر کی جگہ عارضی طور پر صدر منتخب ہو گئے۔لیکن مرزا بشیر کے الگ ہو جانے سے اس کے احباب اور مریدین نے جو کمیٹی کے اصل کارکن تھے، کشمیر کمیٹی کے کام میں دلچسپی لینا ترک کر دیا اور یہاں کوئی اور کارکن تھے ہی نہیں لہٰذا علامہ نے بھی 12رجون 1933ء کو کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا اور کمیٹی کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ تاہم اس واقعہ سے یہ حقیقت نمایاں تھی کہ اس وقت تک احراریوں کی شورش کے باوجود علامہ اقبال کی فرقہ قادیانی کے سربراہ سے اختلاف کی بنیاد مذہبی نہیں تھی۔ اس وقت تک انہوں نے ختم نبوت کے مسئلے کو مسلمانوں کی زندگی وموت کا مسئلہ نہیں بنایا تھا۔ چونکہ علامہ نے قادیانیوں کے خلاف پہلا مضمون 1934ء میں لکھا تھا جبکہ مسٹر ظفر اللہ خان کے سر فضل حسین کی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن بننے کی افواہوں اور خبروں پر چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں اس لئے ان کے معترضین کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ علامہ نے محض سیاسی وجہ سے ایک مذہبی تنازعہ کو ہوا دی ہے حالانکہ وہ انیسویں صدی کے اواخر سے مرزا غلام احمد کے کسی نہ کسی صورت میں معتقد رہے تھے اور فرقہ احمدیہ کو پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ سمجھتے تھے۔ جب ایک اخباری نامہ نگار نے علامہ کی توجہ اس نظریاتی تبدیلی کی طرف مبذول کرائی تو ان کا جواب یہ تھا کہ ”اگر احمدیت کے بارے میں 1911ء کی تقریر اور میرے موجودہ رویہ میں کوئی تناقض ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن اپنے آپ کو صرف پتھر نہیں جھٹلاتے۔“

تیسری گول میز کانفرنس میں اقبال نے صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کیا

تیسری گول میز کانفرنس لندن میں 17رنومبر 1932ء سے 24دسمبر 1932ء تک ہوئی۔ علامہ بھی اس میں شرکت کرنے کے لئے لندن گئے۔ اس مرتبہ بھی سر فضل حسین نے ان کی

نامزدگی کی سفارش کی تھی۔ لیکن انہوں نے کانفرنس میں زیادہ تر تماشائی کی حیثیت سے حصہ لیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کانفرنس میں زیادہ تر بحث وفاق ہند اور اس کے متعلقہ مسائل پر ہوتی رہی تھی اور علامہ وفاق کی سکیم کے سخت خلاف تھے۔ ڈاکٹر امبید کر لکھتا ہے کہ مسلمانوں نے 1924ء سے لے کر 1930ء تک برصغیر کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تقسیم کرانے کے لئے نہ کچھ کہا تھا اور نہ کچھ کیا تھا۔ بظاہر مسلمانوں نے اس تجویز کو دفن کر دیا تھا اور وہ روایتی متحدہ قومیت کے نظریے کی بنیاد پر ہندوؤں سے تحفظات حاصل کرنے کے لئے گفت وشنید کرتے رہے تھے۔ لیکن جب 1930ء میں گول میز کانفرنس جاری تھی تو بعض مسلمانوں نے لندن میں اپنی ایک کمیٹی بنالی تھی تا کہ کانفرنس کو پاکستان کے منصوبے کی تیاری پر آمادہ کیا جائے۔ اس کمیٹی نے پاکستان کی حمایت میں اشتہار اور سرکلر لکھ کر کانفرنس کے ارکان کو بھیجے تھے۔ لیکن پھر بھی کسی نے اس میں دلچسپی نہیں لی تھی اور کانفرنس کے مسلم ارکان نے اسے کسی طرح بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا...... اگر مشترکہ مرکزی حکومت کی مخالفت کے اصول کو پاکستان سکیم کی بنیاد تصور کیا جائے تو صرف ایک شخص کا نام لیا جا سکتا ہے جس نے اس کی حمایت کی تھی۔ اس کا نام سر محمد اقبال تھا لیکن اس نے بھی اس سکیم کا نام لے کر اس کی حمایت نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر اقبال نے کانفرنس کے تیسرے سیشن میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ہندوستان میں کوئی مرکزی حکومت نہیں ہونی چاہیے بلکہ صوبوں کو خودمختار اور آزاد ڈومینینوں کا درجہ دے دیا جائے جن کا تعلق براہ راست لندن میں وزیر ہند سے ہو۔[29]

جناح کے نام علامہ کے 21 رجون 1937ء کے خط کے مطابق ان کا خیال تھا کہ ہندوستان میں امن قائم کرنے کا واحد طریقہ یہ تھا کہ برصغیر کو مذہبی، نسلی اور لسانی بنیادوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ 1932ء میں لندن میں اُن کے اس خیال کو عام طور پر قبول کیا گیا تھا البتہ لارڈ لوتھین (Lothian) نے ان سے ایک نجی ملاقات میں رائے ظاہر کی تھی کہ ہندوستان کی مشکلات کا واحد حل تمہاری ہی سکیم ہے لیکن اس کے بارآور ہونے میں ابھی 25 سال کی مدت درکار ہوگی۔[30]

علامہ کی کانفرنس میں عدم دلچسپی کی دوسری وجہ غالباً یہ تھی کہ اس کانفرنس میں بھی سر آغا خان اور چودھری ظفر اللہ خان کا غلبہ تھا جو ہندوستان میں وفاقی حکومت منظور کرنے پر آمادہ تھے۔ قبل ازیں اسی سال کے دوران چودھری ظفر اللہ خان وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا عارضی رکن رہ چکا تھا اور اس کانفرنس کے بعد 34-1933ء میں وہ برطانوی پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی اس

مشترکہ کمیٹی کے روبرو بھی پیش ہوتا رہا جو کانفرنس کی تجاویز پر غور کرنے کے لئے تشکیل کی گئی تھی۔ اور جب جولائی 1934ء میں اس کمیٹی کی کاروائی ختم ہوئی تو وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ اس سے اس قدر متاثر ہو چکا تھا کہ اس نے اسے سرفضل حسین کی جگہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی مستقل رکنیت کی پیش کش کر دی اور علامہ اقبال نے ایک طویل مضمون میں یہ مطالبہ کر دیا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔اس کا مطلب یہی نکل سکتا تھا کہ ظفر اللہ خان مسلمانوں کا نمائندہ نہیں ہے۔

اقبال کے مسلم فرمانرواؤں، نوابوں و جاگیرداروں کے ساتھ گہرے روابط

اکتوبر 1933ء میں افغانستان کے حکمران ''اعلیٰ حضرت امیر المومنین نادر شاہ غازی'' کی دعوت پر علامہ اقبال، سید سلیمان ندوی اور سر راس مسعود کے ہمراہ کابل پہنچے۔بظاہر اس دعوت نامے کا مقصد یہ تھا کہ نادر شاہ کابل میں یونیورسٹی قائم کرنے اور تعلیمات کو جدید اصول پر منظم کرنے کے سلسلے میں ان تینوں سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔''وہاں یہ تینوں شاہی مہمان رہے۔اعلیٰ حضرت نے ان کو باریابی سے مشرف فرمایا۔امراء وزراء سے ملاقاتیں رہیں۔انجمن ادبی کابل نے تمام اکابر ادبا و فضلائے افغانستان کے ایک شاندار اجتماع میں معزز مہمانوں کو سپاس نامہ پیش کیا۔ کوئی تین ہفتے کے قیام کے بعد علامہ اقبال غزنی اور قندھار گئے۔غزنی کے آثار میں سلطان محمود غزنوی، حکیم سنائی اور حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کے والد محترم کے مزارات پر بطور خاص فاتحہ خوانی کی۔پھر قندھار پہنچ کر خرقہ شریف کی زیارت کی۔واپسی پر علامہ نے مثنوی ''مسافر'' میں اپنے سفر افغانستان کے جذبات و احساسات نظم کئے اور افغانستان کی ایک مجوزہ یونیورسٹی اور افغانستان کے حالات وکوائف کے متعلق نہایت حوصلہ افزا اور خیر خواہانہ بیان شائع کئے۔''[31]

انہوں نے نادر شاہ افغان کی تعریف میں بھی تھوڑی سی خامہ فرسائی کی۔ان کی اس مختصر مدح سرائی کا آخری شعر یہ تھا:

سرشکِ دیدہ نادر بہ داغ لالہ فشاں!
چناں کہ آتش او را دگر فروز نشاں!

علامہ کی جانب سے افغانستان اور اس کے حکمران کی یہ مدح سرائی اس لئے تعجب انگیز تھی کہ اکتوبر 1933ء میں کسی کو نہیں معلوم تھا کہ امیر امان اللہ خان نے 21-1919ء میں تیسری افغان

جنگ کے بعد حکومت برطانیہ سے معاہدہ راولپنڈی کے تحت باقاعدہ یہ تسلیم کروالیا تھا کہ افغانستان برطانوی سامراج کے زیر سایہ ایک طفیلی بفر سٹیٹ نہیں ہے بلکہ یہ ایک آزاد وخود مختار ملک ہے۔ اسی بنا پر اس نے 1926ء میں بادشاہ کا لقب اختیار کر کے برطانیہ کے بادشاہ جارج پنجم کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اسے ہز میجسٹی کے طور پر خطاب کرے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے پہلے سوویت یونین اور بعض دوسرے یورپی ملکوں سے معاہدے کئے اور پھر 1928ء میں یورپ اور سوویت یونین کا دورہ کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ افغانستان واقعی ایک آزاد وخود مختار ملک ہے۔ برطانوی سامراج یہ صورت حال کیسے برداشت کر سکتا تھا چنانچہ اس نے پہلے تو امان اللہ خان کی بعض سیاسی، معاشرتی اور ثقافتی اصلاحات کے خلاف مقامی دقیانوسی ملاؤں سے ایک زہریلی پروپیگنڈا مہم چلوائی جبکہ امان اللہ خان یورپ کے دورے پر تھا اور پھر برطانوی سامراج نے 1928ء میں ایک ادنیٰ فوجی افسر حبیب اللہ المعروف بچہ سقہ کی وساطت سے امان اللہ کے خلاف کامیاب بغاوت کرا دی تھی۔ پھر 1929ء میں نادر خان کو فرانس سے بلا کر اسے دہلی میں مہمان رکھا گیا اور اس کے لئے محمودی اور وزیری قبائل پر مشتمل فوج منظم کی گئی جس نے بچہ سقہ کو شکست دے کر پہلے تو کابل میں خوب لوٹ مار کی اور پھر نادر خان کو تخت پر بٹھا دیا۔ یہ نادر خان اسی سردار سلطان محمد خان کا پوتا تھا جس نے 1835ء میں امیر دوست محمد خان سے غداری کر کے وادیٔ پشاور رنجیت سنگھ کے حوالے کر دی تھی اور اس کے انعام کے طور پر کوہاٹ کے نزدیک ایک جاگیر حاصل کی تھی۔ نادر خان نے 1933ء میں علامہ اقبال اور اس کے دونوں ساتھیوں کو ہندوستان سے اس لئے نہیں بلایا تھا کہ وہ کابل میں یونیورسٹی کے قیام کے سلسلے میں ان سے مشورہ کرنا چاہتا تھا بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کا تعاون حاصل کر کے اپنی مسند اقتدار کا تحفظ کرے جو ان دنوں ڈانواں ڈول ہو رہی تھی۔ چنانچہ بعد ازاں وہ اسی سال یعنی 1933ء کے اواخر میں اپنے ہی خاندان کے افراد کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

علامہ ایک طرف تو اپنی اعلیٰ پایہ کی تخلیقات میں مطلق العنان ملوکیت کی شدید مخالفت کرتے تھے اور سلطانی جمہور کے گیت گاتے تھے لیکن دوسری طرف وہ نہ صرف ہندوستان کے مطلق العنان والیان ریاست کے قصیدے لکھتے تھے بلکہ انہوں نے افغانستان کے پشتینی غدار اور سامراجی پٹھو ”اعلیٰ حضرت شہید امیر المومنین غازی نادر شاہ غازی“ کی تعریف وتوصیف سے بھی

گریز نہ کیا۔ افغانستان میں نادر خان کا چار سالہ اقتدار انتہائی جبر و تشدد اور تاریکی کا عہد تھا۔ امان اللہ خان نے جو تھوڑی بہت اصلاحات کی تھیں اس نے وہ سب منسوخ کر کے ملک میں پھر فتویٰ فروش ملاؤں اور عوام دشمن جاگیرداروں و سرداروں کا غلبہ قائم کر دیا تھا۔ معلوم نہیں وہ کون سی مصلحتیں تھیں جو علامہ جیسی جلیل القدر ہستی کو اس قسم کے کھلے تناقضات میں مبتلا کرتی تھیں۔

پنجاب میں علامہ اقبال بعض رجعت پسند جاگیرداروں اور برطانوی سامراج کے پشتینی پٹھوؤں کے بھی گہرے دوست تھے۔ نواب سر ذوالفقار علی خان علامہ کے قدیم ترین دوستوں میں سے تھا اور اسے برطانیہ کے ایوان اقتدار میں بھی رسائی حاصل تھی۔ چنانچہ جب بھی بعض شرارت پسند عناصر انگریز حکام اعلیٰ کو علامہ سے بدظن کرنے کی کوشش کرتے تھے تو نواب ذوالفقار علی خان ان فتنہ انگیزیوں کا سدباب کرتا تھا۔ علامہ کو 1923ء میں سر کا خطاب نواب ذوالفقار علی خان کی سفارش پر ہی ملا تھا۔ اسی طرح ملتان کے ایک جاگیردار احمد یار خان دولتانہ کو بھی علامہ سے ''نہایت گہری عقیدت'' تھی۔ احمد یار خان وقتاً فوقتاً علامہ کو تحائف بھیجا کرتا تھا اور بعض اوقات بہت اچھی دودھ دینے والی گائے، بھینس تک پیش کر دیتا تھا۔ علامہ کو احمد یار خان کے ساتھ ان کے خلوص کی وجہ سے ''بے حد لگاؤ'' تھا۔ وہ یونینسٹ پارٹی کے شاکی ہونے کے باوجود اس کے مقتدر رکن یعنی احمد یار خان کو ہمیشہ محبت سے یاد کرتے تھے۔

قدرتی طور پر علامہ کا بعض جاگیرداروں کے ساتھ یہ ''بے حد لگاؤ'' ان کے معترضین کی نظر میں کھٹکتا تھا کیونکہ اس بات سے ان کے تناقض بالذات کا ایک اور ثبوت ملتا تھا۔ وہ اپنے اشعار میں تو غریب بے زمین دہقانوں کے حقوق کے علمبردار تھے اور دیہہ خداؤں کو متنبہ کرتے تھے کہ یہ زمین ان کی ملکیت نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے لیکن عملی طور پر وہ نہ صرف جاگیرداروں کی سیاسی پارٹی کے رکن بنے تھے بلکہ بعض جاگیرداروں سے ان کے نہایت گہرے دوستانہ و برادارانہ تعلقات تھے اور وہ ان کے ممنون احسان ہوتے تھے۔ دراصل علامہ کے مخالفین کا یہ اعتراض اس لحاظ سے بے جا تھا کہ آج کل کی طرح اس زمانے میں بھی پنجاب کی معاشرت و ثقافت کلی طور پر جاگیردارانہ تھی لہٰذا صوبہ کے درمیانہ طبقہ کی اخلاقی اقدار اور طرز معاشرت پر بھی جاگیردارانہ چھاپ لگی ہوئی تھی اور درمیانہ طبقہ کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے علامہ دوستی کے جاگیردارانہ تصور سے بالاتر نہیں ہو سکتے تھے۔

علامہ کے سرحمید اللہ خان نواب آف بھوپال سے بھی گہرے روابط تھے۔ چنانچہ مئی 1935ء میں جبکہ علامہ کی طبیعت خاصی علیل ہوگئی تھی۔ بیگم کا انتقال ہوگیا تھا۔ کتابوں سے جو روپیہ وصول ہوا تھا وہ میوروڈ پر سات کنال کی ''جاوید منزل'' کی تعمیر پر صرف ہوگیا تھا۔ بچوں کی دیکھ بھال اور تعلیم وتربیت کا مسئلہ بظاہر لاینحل نظر آتا تھا اور روزمرہ کی معیشت تک دشوار ہوگئی تھی تو نواب بھوپال نے اپنے وزیر تعلیم سر راس مسعود کی سفارش پر اور اپنے ''تعلق خاطر اور قدر دانی خدمت اسلامی'' کے باعث جیب خاص سے حضرت علامہ کا پانچ سو روپے ماہانہ وظیفہ حسن لیاقت مقرر کر دیا۔ اس سے قبل جنوری میں سرسید کے پوتے ڈاکٹر سر راس مسعود کی دعوت پر بغرض علاج بھوپال گئے تھے جہاں اوائل مارچ تک ان کا قیام رہا تھا اور اس کے بعد 5 رجولائی کو علامہ پھر برقی علاج کروانے کے لئے بھوپال گئے اور سر راس مسعود کے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ وہاں سے وہ اکتوبر میں پانی پت آئے جہاں نواب بھوپال کی زیر صدارت مولانا حالی کی برسی کی تقریب تھی۔ علامہ نے اس جلسے میں نواب صاحب کے سامنے چار اشعار پڑھے جن میں سے ایک شعر یہ تھا:

حمید اللہ خان اے ملک و ملت را فروغ از تو
زالطاف تو موج لالہ خیز د از خیابانے

سر راس مسعود نے اس زمانے میں سرآغا خان کو بھی آمادہ کر لیا تھا کہ وہ بھی علامہ کو پانچ سو روپے ماہانہ وظیفہ دے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ سرآغا خان کے وظیفہ کی ادائیگی شروع ہوتی سر راس مسعود ڈاکٹر صاحب کی زندگی ہی میں ''رفیق اعلیٰ'' سے جا ملے اور یہ بساط ہی الٹ گئی۔''[32] علامہ مارچ 1936ء میں بغرض علاج پھر بھوپال گئے۔ وہ 9 راپریل کو وہاں سے واپس آئے تو ان کی طبیعت خاصی بہتر تھی۔ لہٰذا انہوں نے اسی مہینے میں آخری دفعہ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں شرکت کی۔ وہ اپنی ناسازی طبع کے باعث خود کوئی اشعار نہ پڑھ سکے اور حاضرین کے سامنے کرسی پر بیٹھے رہے اور پھر ان کے کہنے پر محمد صدیق اور محمد امین نے ان کے چند اشعار گا کر سنائے جن کا مطلع ہے:

خودی کا سر نہاں لا الہ الا اللہ
خودی ہے تیغ فساں لا الہ الا اللہ[34]

پنجابی مسلم درمیانہ طبقہ کا عظیم شاعر جو میدان سیاست میں مات کھا کر دنیا سے رخصت ہوا

اپریل 1936ء کے اواخر میں آل انڈیا مسلم لیگ کے مستقل صدر محمد علی جناح لاہور آئے۔ انہوں نے پہلے سر فضل حسین کو آئندہ انتخابات کے لئے لیگ کا صوبائی پارلیمانی بورڈ بنانے کی دعوت دی مگر جب وہ نہ مانا تو علامہ اقبال نے جناح کی درخواست پر صوبائی لیگ کی قیادت سنبھالی۔ 30 رمئی کو پنجاب لیگ کونسل کا جلسہ ہوا جس میں علامہ صدر اور خان غلام رسول خان جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ قبل ازیں علامہ سر محمد شفیع کی مسلم لیگ کے صدر تھے لیکن اب وہ جناح کی زیر قیادت آل انڈیا مسلم لیگ کی صوبائی شاخ کے صدر بن گئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ مسلم لیگ اونچے طبقے کی نمائندہ بنی رہے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ یہ ایک عوامی جماعت بنے اور جاگیرداروں کی بجائے مسلم عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں ہو۔ انہوں نے فروری 1937ء میں صوبہ پنجاب کے عام انتخابات میں پنجاب مسلم لیگ کے بری طرح شکست کھا جانے کے بعد 28 رمئی کے مشہور و معروف خط میں اور پھر 21 رجون کو جناح کے نام ایک اور خط میں لکھا تھا کہ ''آج ہندوستان میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کی ذات سے مسلمان قوم اس طوفان بلا میں صحیح محفوظ رہنمائی کی توقع رکھ سکتی ہے جو شمال مغربی ہندوستان بلکہ شاید سارے ملک کو اپنی لپیٹ میں لینے والا ہے۔'' اقبال نے محمد علی جناح کے بارے میں اس رائے کا اظہار اس حقیقت کے باوجود کیا تھا کہ گزشتہ ایک سال کے دوران جناح نے اپنی تقریروں اور بیانات میں متحدہ ہندوستانی قومیت کا پرچار کیا تھا۔ انہوں نے مارچ 1936ء میں لاہور میں جو دو تقریریں کی تھیں ان میں اس بات پر فخر کا اظہار کیا تھا کہ وہ بدستور کانگرس کے انڈین نیشنلزم کے نظریے کے حامل ہیں۔ ان کی زیر ہدایت لیگ کا جو انتخابی منشور لکھا گیا تھا اس کی بنیاد بھی متحدہ قومیت کے نظریے پر تھی۔ لیکن علامہ اقبال اگرچہ سالہا سال سے متحدہ قومیت کے نظریے کے شدید خلاف تھے مگر اس سارے عرصے میں بالکل خاموش رہے تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ بھی اس امر کا اعلان نہیں کیا تھا کہ ان کے لئے جناح کا متحدہ قومیت کا نظریہ قابل قبول نہیں۔ البتہ انہوں نے اپنے 28 رمئی اور 21 رجون کے خطوط میں یہ ضرور لکھا تھا کہ ہندو۔ مسلم تنازعہ کا واحد حل یہ ہے کہ برصغیر

کو مذہبی، نسلی اور لسانی بنیادوں پر تقسیم کر دیا جائے۔ مگر جب جناح نے اس تجویز کو نظر انداز کر کے جولائی 1937ء میں کانگرس کو پھر اتحاد و تعاون کی پیشکش کی تھی تو علامہ منقار زیر پر ہی رہے۔

علامہ کے اس متناقض سیاسی رویے کی وجہ یہ تھی کہ ان کا پہلے سر فضل حسین سے اور پھر سر سکندر حیات سے تضاد تھا اور وہ اس تضاد کا اظہار اپنے آپ کو محمد علی جناح کی مسلم لیگ سے وابستہ کر کے ہی کر سکتے تھے۔ لیکن جب انتخابات کے بعد محمد علی جناح اور سر سکندر کے درمیان کل ہند سطح پر اتحاد و تعاون کے لئے سلسلہ جنبانی ہوا اور بالآخر اکتوبر 1937ء میں اس کا نتیجہ سکندر۔ جناح معاہدہ کی صوررت میں برآمد ہوا تو علامہ کو بہت صدمہ ہوا۔ دسمبر میں نئے صوبائی پارلیمانی بورڈ کے لئے سر سکندر کے اشراف کی نامزدگی ہوگئی تو علامہ کو اور دھچکا لگا۔ جنوری 1938ء میں ان کی جواہر لال نہرو سے اس ملاقات کا پس منظر یہی تھا جس میں انہوں نے نہ صرف یہ تاثر دیا تھا کہ اُن کا رجحان سوشلزم کی طرف ہو گیا ہے بلکہ انہوں نے نہرو سے یہ کہا تھا کہ ''جناح سیاست کار ہے، تم محب الوطن ہو۔''

علامہ نے 4راپریل 1938ء کو یعنی اپنی موت سے صرف 17 دن پہلے ایک بیان لکھوایا جس میں کہا گیا تھا کہ اکتوبر 1933ء کے سر سکندر۔ جناح معاہدہ کو کالعدم سمجھا جائے۔ یہ بیان برائے منظوری جناح کو بھیجا گیا مگر انہوں نے بذریعہ تار یہ خواہش ظاہر کی کہ اس کی اشاعت ملتوی کر دی جائے۔ چنانچہ یہ بیان کسی اخبار کو بھی نہ دیا گیا۔ اس غیر مطبوعہ بیان کا پس منظر یہ تھا کہ ملک برکت علی نے مارچ 1938ء میں مالی مشکلات کے پیش نظر ایک دولت مند جاگیردار نواب شاہنواز خان آف ممدوٹ کو جو دراصل سر سکندر کا معتمد خاص تھا، علامہ اقبال کی منظوری سے صوبائی لیگ کا صدر بنوا دیا تھا اور اس کے بعد اقبال کے ''آدمیوں'' اور سر سکندر حیات کے ''اشراف'' کے درمیان لیگ پر قبضہ کرنے کی رسہ کشی میں بہت اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کشمکش میں سر سکندر حیات کی فتح ہوئی۔

8راپریل کو آل انڈیا مسلم لیگ کی طرف سے پنجاب مسلم لیگ کو اطلاع دی گئی کہ پنجاب مسلم لیگ کا الحاق آل انڈیا لیگ سے نہیں ہوسکتا۔ 17راپریل کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس کلکتہ میں منعقد ہوا جس میں پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم نو کے لئے سر سکندر کی زیر صدارت ایک آرگنائزنگ کمیٹی مقرر کی گئی جس میں اقبال کے ''آدمیوں'' کی تعداد صرف دس تھی

جبکہ سر سکندر کے ''اشراف'' کی تعداد 25 تھی۔ 19 راپریل کو مسلم لیگ کا خاص سیشن ہوا مگر اقبال کے جو چھ ''آدمی'' کلکتہ گئے تھے وہ اسی روز عازم لاہور ہو گئے۔ جب 21 راپریل کو وہ واپس لاہور پہنچے تو اسی دن علامہ نے دمہ قلبی کی دیرینہ بیماری کا باعث 61 سال کی عمر میں اپنی جان عزیز جان آفرین کے سپرد کر دی۔ پنجابی مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کو حکیم الامت کے انتقال پر بے پناہ صدمہ ہوا۔ تمام سرکاری دفاتر، عدالتیں، کالج، سکول اور تعلیمی ادارے بند کر دیئے گئے۔ چنانچہ ان کے جنازے میں ہزاروں لوگوں نے شرکت کی اور ان کی تدفین مسلمانوں کی خواہش کے مطابق شاہی مسجد کی بڑے دروازے کے قریب عمل میں آئی۔

بقول ایس۔ ایم۔ اکرام ''اقبال متضاد قوتوں کی پیداوار تھے لہٰذا اونچے درجے کے مسلم سوشلسٹ اور انتہائی رجعت پسند عناصر ان کے کلام میں سے اپنے اپنے متضاد نظریات کی تائید میں اشعار نکال سکتے ہیں۔''[34] تاہم یہ حقیقت ہے کہ علامہ اقبال نے اپنی زندگی کے بہت سے تناقضات کے باوجود 1908ء کے بعد اپنی شاعری کے ذریعے ہر لحاظ سے پسماندہ مسلمانان ہند کو ولولہ انگیز پیغام دے کر انہیں ہمہ گیر مایوسی اور ناامیدی کے گہرے گڑھے سے نکالنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ بالخصوص پنجابی مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کی معاشرتی اور ثقافتی نشوونما میں علامہ اقبال نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا اور اس طبقہ نے بھی اپنے محسن کے لئے جذبہ عقیدت کا اجتماعی اظہار اس کی زندگی میں ہی شروع کر دیا تھا۔ 1937ء کے بعد لاہور، لائل پور، جالندھر اور پنجاب کے بعض دوسرے شہروں میں کئی جلسے اور تقریبات منعقد ہوئیں جن میں حکیم الامت کو خراج تحسین پیش کیا گیا تھا۔ کئی تقریبات میں ہندو اور سکھ شاعروں اور دوسرے دانشوروں نے بھی شرکت کی تھی۔ 1938ء کے آغاز میں آل انڈیا پیمانے پر پہلا یوم اقبال منایا گیا تھا۔ ان تقریبات میں علامہ کو بطور شاعر مشرق خراج عقیدت پیش کیا جاتا تھا۔ مسلمانان ہند کے لئے ان کی سیاسی خدمات پر بالعموم کوئی تبصرہ نہیں ہوتا تھا۔ ان کی کتاب ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' اسی زمانے میں مسولینی کے حبشہ پر قبضہ کے دو اڑھائی سال بعد شائع ہوئی تھی۔

دسمبر 1938ء میں جب پٹنہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تھا تو محمد علی جناح نے بھی اپنی صدارتی تقریر میں ڈاکٹر سر محمد اقبال کے انتقال پر تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے مرحوم کی سیاسی خدمات کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا بلکہ انہیں اپنے

''ذاتی دوست'' اور ''دنیا کے بہترین شاعر'' کی حیثیت سے خراج تحسین پیش کیا تھا۔ جناح نے مزید کہا تھا کہ ''جب تک اسلام زندہ ہے اقبال زندہ رہے گا۔ ان کی پاکیزہ شاعری ہندوستان کے مسلمانوں کی امنگوں کی صحیح تعبیر کرتی ہے۔ ان کی یہ شاعری ہم میں اور ہماری آئندہ نسلوں میں ولولہ پیدا کرتی رہے گی۔''[35]

جب پٹنہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تھا تو کانگرس کی بورژوا قیادت کی رعونت اور تنگ نظری، ہندوؤں کے سرمایہ دار و درمیانہ طبقہ کی تنگدلی، 1938ء میں مسلم لیگ کے صدر کا غیر مصالحانہ رویہ، مسلمان تعلقہ داروں و جاگیرداروں کی مفاد پرستی اور مسلم درمیانہ طبقہ کے نوجوانوں کی بے روزگاری و معاشی زبوں حالی اور برطانوی سامراج کی فرقہ وارانہ تفرقہ انگیزی کے باعث ہندو۔ مسلم تضاد میں اس قدر شدت پیدا ہو چکی تھی کہ اجلاس میں پنجاب کے درمیانہ طبقہ کے مندوبین نے اس امر کا نوٹس ہی نہ لیا کہ جناح نے علامہ اقبال مرحوم کی سیاسی نظریہ سازی کا اعتراف ہی نہیں کیا۔ نہ صرف یہ کہ ان مندوبین نے جناح کی اس ''کوتاہی'' کو نظر انداز کیا بلکہ لاہور کے ایک نوجوان میاں فیروز الدین احمد نے اسی اجلاس میں زندہ باد کے نعرے لگواتے ہوئے محمد علی جناح کے نام کے ساتھ قائداعظم کے الفاظ استعمال کئے اور اس کے بعد یہ لقب اتنا مقبول ہو گیا کہ یہ جناح کے نام کا ایک حصہ بن گیا۔

باب: 9

قراردادِ لاہور کس طرح قراردادِ پاکستان بنی؟

کنفیڈرل ہندوستان کے دائرے کے اندر مسلمانوں کی فیڈریشنوں پر مبنی سکیمیں

1939ء کے اوائل میں پنجاب مسلم لیگ کے صدر نواب سر محمد شاہ نواز خان آف ممدوٹ نے درمیانہ طبقہ کے ایک نوجوان میجر کفایت علی سے کنفیڈریشن آف انڈیا کے زیر عنوان ایک کتاب لکھوائی۔ یہ کتاب ''ایک پنجابی'' کے نام سے شائع ہوئی اور اس میں ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں یہ سکیم پیش کی گئی تھی کہ برصغیر کو ذیل کے پانچ ممالک میں تقسیم کر دیا جائے۔ (1) انڈس ریجن۔ (2) ہندو انڈیا۔ (3) راجستھان (راجپوتانہ اور وسطی انڈیا)۔ (4) دکن سٹیٹس (حیدرآباد اور میسور) اور (5) بنگال (اس میں ہندو اکثریت کے اضلاع شامل نہیں کئے گئے تھے البتہ آسام کے بعض علاقے شامل تھے)۔ اس میں تجویز کیا گیا تھا کہ پانچ ممالک کی الگ الگ فیڈریشنیں ہوں گی اور پھر ان فیڈریشنوں پر مشتمل ایک کنفیڈریشن کی تشکیل ہوگی۔ اس سکیم میں مسلم اکثریت کے علاقوں کا باقی ہندوستان سے علیحدگی کا کوئی ذکر نہیں تھا بلکہ یہ کہا گیا تھا کہ بالآخر ہماری تقدیر ہندوستان کے اندر ہے اس کے باہر نہیں ہے۔ مسلمان علیحدگی کے بارے میں صرف اسی وقت سوچیں گے جبکہ ہندو انہیں ایسا کرنے پر مجبور کر دیں گے۔ مسلمانوں کو بیک وقت علیحدگی پسند اور کنفیڈرل ہونا چاہیے۔ تاہم ان پانچوں ملکوں کی کنفیڈرل حکومت مالیاتی پالیسی کو کنٹرول نہیں کرے گی۔ پانچوں ملک دفاع کے اخراجات مساوی طور پر برداشت کریں گے۔

جولائی 1939ء میں، آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اس فیصلے کے بعد کہ لیگ کا آئندہ سالانہ اجلاس دسمبر 1939ء میں لاہور میں ہوگا، پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خان نے ایک پمفلٹ بعنوان ''آؤٹ لائن آف اے سکیم آف انڈین فیڈریشن'' (Outline of Scheme of Indian Federation) شائع کیا جس میں یہ سکیم پیش کی گئی تھی کہ برصغیر کو ذیل کے سات علاقوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ (1) آسام، بنگال، بنگالی ریاستیں اور سکم۔ (2) بہار اور اڑیسہ۔ (3) یو۔پی اور یو۔پی کی ریاستیں۔ (4) مدراس، ٹراونکور، مدراسی ریاستیں اور کورگ۔ (5) بمبئی، حیدر آباد، ویسٹرن انڈین سٹیٹس، بمبئی سٹیٹس، میسور اور سی۔پی سٹیٹس (6) راجپوتانہ ریاستیں، گوالیار سنٹرل انڈین سٹیٹس، وسطی صوبے اور برار۔ (7) پنجاب، سندھ، سرحد، کشمیر، پنجابی ریاستیں، بلوچستان، بیکانیر اور جیسلمیر۔ ہر زون کی اپنی قانون ساز اسمبلی کے ایک تہائی ارکان مسلمان ہوں گے۔ فیڈرل ایگزیکٹو کا ڈھانچہ گورنر جنرل اور اس کی وزارتی کونسل پر مشتمل ہوگا اور کونسل کے کم از کم ایک تہائی ارکان مسلمان ہوں گے۔ فیڈرل ایگزیکٹو کے پاس دفاع، امور خارجہ، مواصلات، کسٹمز اور سکہ و کرنسی کے محکمے ہوں گے۔ سر سکندر کی رائے تھی کہ اس قسم کی متحدہ انڈین فیڈریشن کو بہت جلد ڈومینین سٹیٹس مل جائے گا۔''[1]

پنجاب کے مسلم جاگیرداروں کی طرف سے اس قسم کی سکیمیں پیش کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ 38-1937ء میں ہندو اکثریت والے صوبوں میں کانگرسی وزارتوں کی فرقہ پرستانہ تعلیمی پالیسی نے پورے برصغیر کی مسلم اقلیت کو فی الحقیقت خوفزدہ کر دیا تھا۔ انہیں یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ اگر 1935ء کے ایکٹ کے تحت ہندوستان میں مجوزہ وفاق قائم ہو گیا تو ہندو راج قائم ہو جائے گا اور ان کی جداگانہ ہستی مٹ جائے گی۔ بالخصوص پنجابی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کو بہت خوف معلوم ہوتا تھا۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ ہندو۔مسلم تنازعہ متحدہ ہندوستانی قومیت کے تصور کے تحت حل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا برصغیر کی مذہبی، نسلی اور لسانی بنیادوں پر تقسیم ضروری ہے۔ پنجابی مسلمانوں کے اس علیحدگی پسندانہ رجحان کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ صوبہ کے مسلم جاگیردار اسے نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ پنجابی جاگیردار عمر رسیدہ برطانوی سامراج سے ورثے میں ملنے والی جائیداد کی تقسیم کچھ اس طرح کروانا چاہتے تھے کہ جواہر لال نہرو اور دوسرے کانگرسی لیڈروں کی ''سوشل ڈیموکریسی'' یا ان کا ''سوشلزم'' ان کے ورثہ کے علاقے میں سرایت نہ کر سکے۔

تیسری وجہ یہ تھی کہ برطانوی سامراج کے مختصر المیعاد اور طویل المیعاد منصوبوں کے لئے یہ سکیمیں فائدہ مند تھیں۔ یورپ میں دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ ہٹلر مشرقی یورپ کے کئی علاقوں پر قبضہ کر چکا تھا اور اس نے پولینڈ کے ساتھ 1934ء کا معاہدہ امن منسوخ کر دیا تھا۔ مسولینی نے شمالی افریقہ میں اپنا سامراجی اقتدار مستحکم کرنے کے بعد البانیہ پر حملہ کر دیا تھا۔ ہٹلر اور مسولینی کے درمیان دس سالہ سیاسی وفوجی معاہدے پر دستخط ہو چکے تھے اور اسپین میں جنرل فرانکو نے خانہ جنگی میں قطعی فتح حاصل کر لی ہوئی تھی۔ اس صورت حال کے پیش نظر سوویت یونین نے اپریل 1939ء میں برطانیہ کے ساتھ فوجی معاہدے کی پیش کش کی تھی اور جولائی میں ونسٹن چرچل نے اس مجوزہ معاہدہ کی اعلانیہ تائید وحمایت شروع کر دی تھی۔ کیونکہ وزیر اعظم نیول چیمبر لین (Neville Chamerlain) کی ہٹلر اور مسولینی کے ساتھ گٹھ جوڑ کی پالیسی ناکام ہو گئی تھی۔ برطانوی سامراج کا مختصر المیعاد منصوبہ یہ تھا کہ اگر جنگ میں اسے ملوث ہونا پڑا تو ہندوستان میں اس کی جنگی تیاریوں میں کانگرس کی طرف سے کوئی رکاوٹ حائل نہ ہو۔ حکومت برطانیہ اس قسم کی سکیمیں سامنے رکھ کر کانگرس سے بہتر سودا بازی کر سکتی تھی۔ اور اس کا طویل المیعاد منصوبہ یہ تھا کہ اگر جنگ کے بعد اسے ہندوستان سے رخصت ہونا پڑا تو اس قسم کا کنفیڈرل نظام اس کے عالمی مفادات کے لئے بہتر رہے گا۔ 1939ء میں برطانیہ میں لیبر پارٹی کی حکومت نہیں تھی بلکہ ایک مخلوط قومی حکومت قائم تھی جس میں ایسے عناصر موجود تھے جو بعض لیبر لیڈروں کے برعکس ہندوستان کی عنان اقتدار صرف کانگرس کے حوالے کرنے کے خلاف تھے۔ سر آغا خان نے 1928ء میں آل پارٹیز کنونشن کی کلکتہ میٹنگ میں ہر صوبہ کے لئے آزادی کی تجویز پیش کی تھی۔[2] اس کے مقابلے میں سر سکندر کی سکیم نئے حالات میں زیادہ قابل عمل نظر آتی تھی۔

چوتھی وجہ تھی کہ یہ جاگیردار اس قسم کی سکیمیں پیش کر کے کانگرس سے بہتر پوزیشن میں سودا بازی کرنا چاہتے تھے۔ یو۔ پی کے ایک تعلقہ دار نواب سر محمد یامین خان کے بیان کے مطابق اس وقت صدر مسلم لیگ محمد علی جناح بھی برصغیر کی تقسیم کے اصول کو محض کانگرس سے سودا بازی کرنے کی غرض سے اپنانے پر مائل ہو گئے تھے۔ نواب یامین خان اپنی یکم مارچ 1939ء کی ڈائری میں لکھتا ہے کہ "ڈاکٹر ضیا الدین نے مجھ کو، مسٹر جناح، سر ظفر اللہ خان، سید محمد حسین بیرسٹر الہ آباد کو بلایا۔ میرے ایک طرف مسٹر جناح بیٹھے تھے اور دوسری طرف مسٹر ظفر اللہ خان، مسٹر

جناح کی دوسری طرف سید محمد حسین تھے اور سر ظفر اللہ خان کی دوسری طرف ڈاکٹر ضیا الدین احمد۔ لنچ کھاتے میں سید محمد حسین نے چیخ چیخ کر جیسے کہ ان کی عادت ہے کہنا شروع کیا کہ چودھری رحمت علی کی اسکیم کہ پنجاب، کشمیر، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان کو ملا کر بقیہ ہندوستان سے علیحدہ کر دیئے جائیں۔ ان سے پاکستان اس طرح بنتا ہے کہ پ سے پنجاب، الف سے افغان، یعنی صوبہ سرحد، ک سے کشمیر، س سے سندھ اور تان بلوچستان کا اخیر ہے۔ چونکہ سید محمد حسین زور زور سے بول رہے تھے سر ظفر اللہ خان نے آہستہ سے مجھ سے کہا کہ اس شخص کا حلق بڑا ہے مگر دماغ چھوٹا ہے۔ مسٹر ظفر اللہ ان کی مخالفت کر رہے تھے کہ یہ ناقابل عمل ہے۔ مسٹر جناح دونوں کی تقریر غور سے سنتے رہے اور پھر مجھ سے بولے کہ اس کو ہم کیوں نہ اپنا لیں اور اس کو مسلم لیگ کا کریڈ (Creed) بنائیں۔ ابھی تک ہماری کوئی خاص مانگ نہیں ہے اگر ہم اس کو اٹھائیں تو کانگرس سے مصالحت ہو سکے گی ورنہ وہ نہیں کریں گے۔ میں نے کہا کہ مغربی علاقہ کے واسطے یہ کہہ رہے ہیں مشرقی علاقے کا کیا ہو گا۔ مسٹر جناح نے ذرا غور کیا اور بولے کہ ہم دونوں طرف کے علاقوں کو علیحدہ کرنے کا سوال اٹھائیں گے۔ بغیر اس کے کانگرس قابو میں نہ آئے گی۔ میں نے کہا کہ ابھی کئی دن ہوئے بھائی پرمانند نے یہی اندیشہ ظاہر کیا تھا اور آپ نے جواب ٹھیک دیا تھا۔ اگر بارگیننگ یعنی سودے بازی کے لئے یہ مسئلہ لیگ کا کریڈ یعنی اصولی مانگ بنا کر اٹھایا جائے تو پھر ہٹنا مشکل ہو گا۔ مسٹر جناح نے کہا کہ ہم کانگرس کا ردعمل دیکھیں گے۔ اس پر یہ معاملہ ختم ہو گیا چونکہ یہ کھانے کی میز کی گفتگو تھی۔''[3] نواب یامین خان کی یہ کتاب 1970ء میں شائع ہوئی تھی۔ مسٹر ظفر اللہ خان اس کے پندرہ برس بعد تک زندہ رہا لیکن اس نے کبھی اس واقعہ کی تردید نہیں کی۔

غالباً اسی خیال کے تحت سندھ کے سر عبداللہ ہارون نے اکتوبر 1938ء میں حیدر آباد (دکن) کے ڈاکٹر سید عبداللطیف کی کتاب کے دیباچے میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندوستان کو دو فیڈریشنوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک فیڈریشن مسلم اکثریت کی آئینہ داری کرے اور دوسری ہندو اکثریت کی آئینہ دار ہو۔ مسلم فیڈریشن ہندوستان کے شمال مغربی صوبوں اور کشمیر پر مشتمل ہو۔ اس کی اس تجویز میں بنگال اور آسام کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ جبکہ ڈاکٹر لطیف نے اپنی کتاب میں ہندوستان کو 15 ثقافتی زونوں میں تقسیم کیا تھا۔ گیارہ ہندوؤں کے اور چار مسلمانوں کے اس کا خیال تھا کہ تبادلۂ آبادی ناگزیر ہے تاکہ ہر زون میں ہم آہنگی ہو۔ ہر زون میں خود مختار حکومت ہو

گی جس کے اختیارات وسیع ہوں گے لیکن وہ آل انڈیا فیڈریشن کے ساتھ بھی منسلک ہوگی۔ اس کے مجوزہ چار زون یہ تھے:۔ (1) سندھ، بلوچستان، پنجاب، سرحد اور خیر پور و بہاولپور کی ریاستیں۔ (2) مشرقی بنگال اور آسام۔ (3) دہلی، لکھنؤ بلاک۔ (4) دکن بلاک، ساری ہندوستانی ریاستیں اپنے ثقافتی تقاضوں کے مطابق مختلف زونوں میں ضم ہو جائیں گی۔[4] سر عبداللہ ہارون نے نومبر اور دسمبر 1938ء میں سر آغا خان کے نام اپنے خطوط میں بتایا تھا کہ ''مسلم لیگی حلقوں کا رجحان اب مسلم ریاستوں اور صوبوں کی علیحدہ فیڈریشن کی طرف ہو رہا ہے تا کہ ہم ہندوؤں کی دست درازی سے ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جائیں۔''[5]

متحدہ ہند کے دائرے میں مسلم لیگ کی مختلف آئینی تجاویز اور کانگرس کا غیر مصالحانہ رویہ

اسی زمانے میں سندھ مسلم لیگ کی کانفرنس منعقدہ کراچی نے ایک قرارداد میں یہ حتمی رائے ظاہر کی کہ ''ہندوستان کے وسیع و عریض علاقے میں امن و امان قائم رکھنے کے لئے اور مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں ہی قوموں کی آزادانہ ثقافتی ترقی، معاشی و معاشرتی بہتری اور سیاسی حق خود اختیاری کے لئے یہ قطعی طور پر ضروری ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ اس سارے سوال پر نظر ثانی کرے کہ ہندوستان کے لئے کس قسم کا آئین مناسب ہوگا جس کے تحت انہیں باعزت اور جائز حیثیت مل سکے۔ لہٰذا یہ کانفرنس آل انڈیا مسلم لیگ سے سفارش کرتی ہے کہ وہ ایک ایسی آئینی سکیم مرتب کرے جس کے تحت مسلمانوں کو مکمل آزادی مل سکے۔''[6] اس قرارداد کو جناح کی تائید و حمایت حاصل تھی یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا البتہ یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اکتوبر 1938ء میں جناح کراچی میں موجود تھے اور انہوں نے 12 / اکتوبر کو سر سکندر حیات خان کی امداد سے سندھ اسمبلی کے مسلم ارکان میں اتحاد و یک جہتی پیدا کروانے کی کوشش کی تھی۔ اس مقصد کے لئے اتفاق رائے سے ایک سمجھوتے کا مسودہ بھی تیار ہوا تھا لیکن خان بہادر اللہ بخش اس سے منحرف ہو گیا تھا کیونکہ سردار پٹیل نے بذریعہ تار کانگرسی ارکان کو ہدایت کی تھی کہ وہ صوبہ میں مسلم لیگ کی وزارت قائم نہ ہونے دیں اور خان بہادر اللہ بخش کی تائید و حمایت کریں۔ اس پر خان بہادر اللہ بخش کی نئی شرط یہ تھی کہ وہ مسلم لیگ پارٹی میں صرف

اس صورت میں شامل ہوگا کہ اسے پہلے سے یقین دلایا جائے کہ وزیر اعلیٰ وہی رہے گا اور یہ عہدہ سر غلام حسین ہدایت اللہ کو نہیں دیا جائے گا۔"[7]

اس واقعہ کے تقریباً دو ماہ بعد جب ستمبر 1938ء میں پٹنہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تو اس میں ایک قرارداد کے ذریعے جناح کو اختیار دیا گیا تھا کہ وہ کسی ایسے متبادل آئین کے امکان پر غور کریں جس کے تحت ہندوستان میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو مکمل تحفظ حاصل ہو سکے اور لیگ کی مجلس عاملہ نے اس قرارداد کے مطابق یکم مارچ 1939ء کو ڈاکٹر ضیاالدین احمد کے متذکرہ لنچ کے بعد جناح کی زیر صدارت ایک کمیٹی مقرر کی تھی جس کے ذمے یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ ان ساری آئینی سکیموں کا جائزہ لے جو اب تک پیش کی گئی ہیں اور آئندہ پیش کی جائیں گی اور اپنی قطعی رائے کے بارے میں مجلس عاملہ کو رپورٹ پیش کرے۔[8] مختصر یہ کہ مارچ 1939ء میں سر شاہنواز اور سر سکندر کی سکیموں کے علاوہ چودھری رحمت علی کی سکیم بھی جناح کے ذہن میں تھی جسے وہ بقول یامین خان محض کانگرس سے سودے بازی کے لئے استعمال کرنا چاہتے تھے۔

11 راگست 1939ء کو لاہور میں سر سکندر حیات خان کی زیر صدارت پنجاب مسلم لیگ کی نئی آرگنائزنگ کمیٹی کی میٹنگ ہوئی جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے لئے ایک استقبالیہ کمیٹی کی تشکیل کی گئی۔ آرگنائزنگ کمیٹی کی اس میٹنگ میں علامہ اقبال مرحوم کے "آدمیوں" کو نہیں بلایا گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ سر سکندر نے صوبائی لیگ پر پوری طرح قبضہ کر لیا تھا حالانکہ اس وقت تک پنجاب میں لیگ کی کوئی صوبائی شاخ قائم نہیں ہوئی تھی۔ علامہ اقبال کی لیگ کا الحاق ختم ہو چکا تھا اور کوئی نئی لیگ وجود میں نہیں آئی تھی۔

سر سکندر کی جاگیردارانہ دھڑے بندی کی سیاست کے اس مظاہرے کے دو اڑھائی ہفتے بعد یعنی یکم ستمبر 1939ء کو عالمی سیاست کی بساط بالکل ہی درہم برہم ہوگئی جبکہ جرمنی کے آمر مطلق اوڈلف ہٹلر نے برطانیہ کے وزیر اعظم نیول چیمبرلین کے انتباہ کو پائے حقارت سے ٹھکراتے ہوئے پولینڈ پر بھرپور حملہ کر کے دوسری جنگ عظیم کا آغاز کر دیا۔ 3 رستمبر کو برطانیہ اور فرانس نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور اسی دن ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لنلتھگو (Linlithgo) نے بھی یہ اعلان کر دیا کہ یہ ملک بھی جرمنی کے خلاف جنگ میں شریک ہوگا۔

وائسرائے نے اپنے اس اعلان میں ہندوستان کی ساری سیاسی جماعتوں سے تعاون کی اپیل کی۔ اس پر کانگرس کا جواب یہ تھا کہ وہ جنگ میں برطانیہ سے تعاون اسی صورت میں کرے گی کہ (1) ہندوستان کی آزادی کے حتمی وعدے کے طور پر یہ اعلان کر دیا جائے کہ جنگ کے بعد عوام کی منتخب کردہ دستور ساز اسمبلی کو آزادی کا آئین بنانے کا حق دیا جائے۔ (2) وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کو فوری طور پر ایک ''قومی حکومت'' کی عملی شکل دی جائے یعنی کونسل میں ایسے ممبروں کو شامل کیا جائے جنہیں مرکزی اسمبلی کے منتخب شدہ ممبروں کی تائید وحمایت حاصل ہو۔ چونکہ کانگرس کے ان مطالبات سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے نہ صرف گزشتہ 18 سالہ ہندو۔ مسلم فسادات سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا تھا بلکہ اس نے جولائی 1937ء میں ہندو اکثریت کے صوبوں میں کانگرسی وزارتوں کے قیام کے بعد سات آٹھ کروڑ کی مسلم اقلیت کی اس سے برملا بیگانگی سے کوئی مثبت نتیجہ اخذ نہیں کیا تھا۔ وہ اپنے اس دیرینہ مؤقف پر قائم تھی کہ ہندوستان کو برطانوی طرز کی خالص پارلیمانی جمہوریت کے تحت مکمل آزادی دی جائے اور اس کا خیال تھا کہ جنگ کے زمانے میں حکومت برطانیہ کو طوعاً وکرھاً یہ مطالبہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو کانگرس کے اس مؤقف میں نہ صرف اپنی جداگانہ معاشرتی وثقافتی ہستی کی موت نظر آتی تھی بلکہ اسے ہندو راج کے ماتحت اپنا معاشی مستقبل بھی تاریک نظر آتا تھا۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے ستمبر 1939ء میں یہ قرارداد منظور کی کہ وہ ہندوستان کے لئے ایسی وفاقی سکیم کے سخت خلاف ہے کہ ''جس کے تحت ایک مستقل اکثریت کی ایک مستقل اقلیت پر حکومت قائم ہو اور اس طرح جمہوری اور پارلیمانی نظام حکومت ایک مذاق بن کر رہ جائے۔ ایسا نظام ہندوستان کے عوام کے مزاج کے منافی ہے کیونکہ یہ ملک مختلف قومیتوں پر مشتمل ہے اور یہ ایک قومی ریاست کی حیثیت نہیں رکھتا۔''

جب وائسرائے لنلتھگو (Linlithgow) نے 18 اکتوبر کو یہ بیان دیا کہ حکومت برطانیہ ہندوستان کو ڈومینین سٹیٹس (Dominion Status) دینے کے وعدے پر قائم ہے اور یہ کہ مرکز میں سیاسی پارٹیوں اور والیان ریاست کے نمائندوں کے ایک مشاورتی گروپ کی تشکیل ہوگی تو لیگ کی مجلس عاملہ نے 22 اکتوبر کو ایک اور قرارداد میں مطالبہ کیا کہ حکومت ہندوستان کو یہ حتمی اعلان کر دینا چاہیے کہ اس ملک میں کوئی ایسا آئین نافذ کرنے کی کوشش نہیں کی جائیگی جو

مسلمانوں کے لئے من حیث الجماعت قابل قبول نہ ہو۔ مسلمانان ہند کسی آئین کو منظور نہیں کریں گے جب تک کہ 1935ء کے موجودہ آئین کو منسوخ نہیں کیا جاتا اور جب تک کہ مسلم لیگ نئے آئین کی منظوری نہیں دے گی اور پھر اسی مہینے میں 1939ء میں صدر مسلم لیگ محمد علی جناح نے مانچسٹر گارڈین سے ایک انٹرویو میں یہ رائے ظاہر کی کہ ہندوستان میں پارلیمانی نظام حکومت چلانا ممکن نہیں کیونکہ جمہوریت کا مطلب یہ ہوگا کہ پورے ہندوستان میں ہندو راج نافذ ہو جائے گا اور مسلمان یہ پوزیشن کسی صورت بھی قبول نہیں کریں گے...... لہٰذا مسلم لیگ بڑے غور و خوض کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ہندوستان کے آئین کے مسئلہ پر از سر نو غور کیا جائے اور حکومت برطانیہ کو مسلم لیگ کی منظوری کے بغیر کوئی اعلان یا وعدہ نہیں کرنا چاہیے کیونکہ مسلم لیگ ہی مسلمانان ہند کی واحد با اختیار اور نمائندہ جماعت ہے۔[9]

کانگرس کی مجلس عاملہ کا اجلاس بھی 22/اکتوبر کو منعقد ہوا اور اس میں ایک قرارداد کے ذریعے وائسرائے کی یقین دہانی اور پیش کش کو مسترد کر دیا گیا اور کانگرس کی صوبائی وزارتوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ ماہ رواں کے اواخر تک مستعفی ہو جائیں۔ چنانچہ 31/اکتوبر کو کانگرس کی ساری صوبائی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اس صورت حال میں وزیر ہند سیموئل ہور (Semuel Hoare) نے کانگرس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں توسیع کر کے اس میں بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کو بھی شامل کیا جائے۔ وائسرائے نے نومبر میں اس تجویز کو جامۂ عمل پہنانے کے لئے کانگرس اور مسلم لیگ کے نمائندوں سے گفت و شنید کی۔ جب اس گفت و شنید کا سلسلہ جاری تھا، جناح نے کانگرس کے ساتھ مفاہمت کے لئے یہ پانچ نکاتی فارمولا پیش کیا۔ (1) صوبوں میں کانگرس اور مسلم لیگ کی مخلوط وزارتیں بنائی جائیں۔ (2) کانگرس اس فارمولے کو منظور کرے کہ دو تہائی مسلمان نمائندوں کی منظوری کے بغیر صوبائی ایوان زیریں میں کوئی ایسا قانون منظور نہیں کیا جائے گا جس کا اثر مسلمانوں پر پڑتا ہوگا۔ (3) کانگرس یہ یقین دلائے کہ وہ سرکاری عمارتوں پر کانگرسی جھنڈا نہیں لہرائے گی۔ (4) بندے ماترم کے ترانے کے بارے میں مفاہمت کی جائے۔ (5) کانگرس یہ یقین دلائے کہ وہ مسلم لیگ کے خلاف معاندانہ مہم ختم کر دے گی۔ جناح نے کانگرسی لیڈروں کو اس بات پر آمادہ کرنے کی بھی کوشش کی کہ وہ صوبائی سطح پر لیگ سے تصفیہ کرنے کے بعد وائسرائے کی

ایگزیکٹوکونسل میں توسیع کی تجویز بھی منظور کر لیں مگر کانگرس اپنے مؤقف پر بضد رہی۔[10]

چنانچہ 2 / دسمبر کو جناح نے ایک بیان میں ہندوستان کے مسلمانوں سے اپیل کی کہ وہ کانگرسی وزارتوں کے مستعفی ہوجانے کے پیش نظر 22 / دسمبر کو یوم نجات منائیں۔ اس پر جواہر لال نہرو نے ایک بیان میں کہا کہ ''جناح کی اپیل کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے درمیان کوئی مشترکہ چیز نہیں اور ہمارے مقاصد مختلف ہیں اور یہ بات بحث و تمحیص کو مشکل اور بے سود بنانے والی ہے۔'' لہٰذا 22 / دسمبر کو جناح کی اپیل کے مطابق پورے برصغیر میں یوم نجات منایا گیا جگہ جگہ جلسے ہوئے جن میں مرکزی لیگ کی ہدایت کے مطابق اس مضمون کی قرارداد منظور کی گئی کہ'' کانگرس نے اپنی مسلم دشمنی سے اپنے اس وعدے کو قطعی طور پر غلط ثابت کر دیا ہے کہ وہ سارے مفادات کی منصفانہ طور پر نمائندگی کرتی ہے۔ کانگرسی وزارتوں نے انتظامیہ اور قانون سازی کے کام کے دوران مسلم رائے عامہ کی مخالفت کرنے اور مسلم ثقافت کو تباہ کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ معاشی و سیاسی حقوق کو پامال کیا ہے۔ جہاں کہیں اختلافات اور تنازعات ہوئے کانگرسی وزارتوں نے اکثر و بیشتر مسلمانوں کے مفادات کو کلی طور پر نظر انداز کر کے اور ان کے مفادات کے خلاف ہندوؤں کا ساتھ دیا ہے اور ان کے نصب العین کی تائید و حمایت کی ہے۔ کانگرسی حکومتوں نے ڈسٹرکٹ افسروں کے معمول کے اور جائز فرائض میں، حتیٰ کہ بہت معمولی معاملات میں ہمیشہ مداخلت کر کے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچایا اور ہندوؤں میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ ہندو راج نافذ ہو گیا ہے اور طرح ہندوؤں، بالخصوص کانگرسیوں، میں مختلف مقامات پر مسلمانوں سے بد سلوکی کرنے اور ان کی آزادی کے ابتدائی حقوق میں مداخلت پیدا کرنے کا حوصلہ پیدا کیا۔ لہٰذا یہ اجتماع مختلف صوبوں میں کانگرسی راج کے خاتمہ پر اظہارِ اطمینان کرتا ہے اور اڑھائی سال کی بے انصافیوں اور ظلم و تشدد سے نجات کے حصول کا دن منانے میں خوشی محسوس کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں میں اتنی قوت ڈسپلن اور تنظیم پیدا کرے کہ وہ آئندہ ایسی وزارتوں کے قیام کا کامیابی سے سدباب کر سکیں۔[11]

مسلم لیگ کے اس یوم نجات سے جواہر لال، گاندھی اور بعض دوسرے کانگرسی زعما بہت ناراض ہوئے لیکن خلاف توقع اس سے فرقہ وارانہ کشیدگی میں کوئی نمایاں اضافہ نہ ہوا کیونکہ لیگ کے پبلک جلسوں میں عیسائیوں، پارسیوں اور دوسری اقلیتوں کے افراد کے علاوہ بعض

ہندوؤں نے بھی شرکت کی تھی۔ وائسرائے لنلتھگو نے اس صورت حال کو غنیمت سمجھا اور اس نے 1940ء کے اوائل میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان اتحاد کے لئے بمبئی میں بھولا بھائی ڈیسائی سے بات کی جس کے بعد یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ شاید کوئی سمجھوتہ ہو جائے مگر گاندھی کے غیر مصالحانہ رویے کی بنا پر یہ امید پوری نہ ہوئی۔ وی۔ پی۔ مینن کے بیان کے مطابق گاندھی کا خیال تھا کہ "مسلم لیگ کے ساتھ مخلوط وزارتیں قائم کرنے سے کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔[12] اس نے ایک امریکی اخبار نیوز کرانیکل کے نامہ نگار سے انٹرویو میں کہا ہندوستان میں صرف ایک ہی پارٹی ہے جو کوئی نتیجہ خیز کام کر سکتی ہے۔ جب اسے بتایا گیا کہ مسلم لیگ کے نام کی بھی ایک پارٹی ہے؟ اس نے کہا کہ میں کانگرس کے سوا کسی دوسری پارٹی کو منظور نہیں کروں گا۔ پھر جب اسے بتایا گیا کہ اگر ہندوستان میں ایک ہی پارٹی ہوئی تو حکومت فاشسٹ ہوگی جمہوری نہیں ہوگی۔ اس پر گاندھی کا جواب یہ تھا کہ "دفع کرو جو نام چاہے دے لو۔ ہندوستان میں صرف ایک ہی پارٹی ہو سکتی ہے اور وہ کانگرس ہے۔"[13] بظاہر گاندھی کے اس رویے کی بنیاد اس کا یہ تاثر تھا کہ حکومت برطانیہ جنگ کے باعث بڑی مشکل میں مبتلا ہے۔ اسے زود یا بدیر کانگرس سے اس کی خواہش کے مطابق سمجھوتہ کرنا ہی پڑے گا اور اس بنا پر کانگرس نے مسلم لیگ کے ساتھ اتحاد و تعاون کا ایک اور موقع کھو دیا۔ جناح کے پانچ نکاتی فارمولے میں اہم ترین نکتہ مخلوط وزارتوں کے بارے میں ہی تھا لیکن کانگرسی قیادت کی رعونت اور کوتاہ اندیشی پھر ان کے راستے میں حائل ہوئی اور اس طرح اس نے مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ، آل انڈیا مسلم لیگ اور محمد علی جناح کو مجبور کر دیا کہ وہ ہندو انڈیا سے مکمل علیحدگی کا موقف اختیار کریں۔

پنجابی مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ نے ستمبر 1939ء کے بعد کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان سیاسی معرکہ آرائی میں بڑی دلچسپی لی تھی۔ انہوں نے جناح کی اپیل پر 22 دسمبر کو یوم نجات بڑے جوش و خروش سے منایا تھا حالانکہ انہیں کانگرسی وزارتوں کا براہ راست تجربہ نہیں ہوا تھا۔ صدر مسلم لیگ محمد علی جناح نے دو تین ماہ کے اس نازک دور میں کانگرسی لیڈروں اور وائسرائے کے ساتھ گفت و شنید اور بیان بازی میں جس اعلیٰ سیاسی تدبر و صلاحیت کا مظاہرہ کیا تھا اس سے انہیں یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کا سیاسی مستقبل ان کی زیر قیادت محفوظ رہے گا اور وہ واقعی قائداعظم ہیں۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے 2 جولائی کے فیصلے کے مطابق

لاہور میں لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد کرنے کی زور شور سے تیاریاں شروع ہوگئیں۔ یہ اجلاس طے شدہ پروگرام کے مطابق 29,28 اور 30/دسمبر 1939ء کو ہونا تھا لیکن اسے 23,22 اور 24/مارچ 1940ء تک ملتوی کر دیا گیا تھا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک پنجاب میں نئی مسلم لیگ کی تشکیل ہی نہیں ہوئی تھی۔ بالآخر 10/جنوری 1940ء کو سر سکندر حیات خان کی زیر صدارت پنجاب اسمبلی کے مسلمان ارکان کا ایک اجتماع ہوا جس میں پنجاب پراونشل مسلم لیگ کی ایک باضابطہ شاخ قائم کر دی گئی۔

19/جنوری کو لندن کے ہفت روزہ اخبار ٹائم اینڈ ٹائڈ میں جناح کا ایک مضمون شائع ہوا۔ یہ ان کی سیاسی زندگی کا پہلا اور آخری اخباری مضمون تھا جس میں انہوں نے اپنے اس مؤقف کا اعادہ کیا تھا کہ ”ہندوستان میں جمہوری پارلیمانی نظام نہیں چل سکتا۔ کیونکہ جس ملک میں دو قومیں، ہندو اور مسلمان آباد ہوں، ایک کی دائمی، مستقل اور ناقابل تبدیل اکثریت اور دوسری کی دائمی، مستقل ناقابل تبدیل اقلیت ہو وہاں اس قسم کی حکومت اصولاً قائم نہیں ہونی چاہیے۔ ہندوستان میں جماعتی حکومت موزوں نہیں ہے۔ مرکز اور صوبوں کی ساری حکومتوں میں سارے فرقوں کے نمائندے شامل ہونے چاہئیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء کے نفاذ کے بعد کانگرسی وزارتوں کا ہمیں جو تلخ تجربہ ہوا ہے اس کی روشنی میں ہندوستان کے آئندہ آئین کے بارے میں ازسرِ نو غور ہونا چاہیے۔ کانگرس اس عرصے میں طاقت کے نشے سے بدمست ہوگئی تھی اور کانگرس کی مجلس عاملہ نے ایک متوازی مرکزی حکومت کی پوزیشن اختیار کر لی تھی جس کے سامنے اس کی صوبائی حکومتیں جوابدہ تھیں۔ کانگرس نے ریجنل ڈائریکٹر مقرر کئے تھے اور صوبائی حکومتیں مکمل طور پر ان کے احکام کی تابع تھیں۔ ان کی منظوری کے بغیر کوئی قانون سازی نہیں ہوسکتی تھی پھر انہوں نے جو تھوڑی بہت مخالفت تھی اس کو کچلنا شروع کیا۔ مسلم لیگ ہندوستان کی آزادی کی حامی ہے لیکن وہ ایسے وفاق کے قطعی خلاف ہے جس میں جمہوریت اور پارلیمانی نظام کے نام پر اکثریت کی ایک دائمی حکومت قائم ہوجائے۔ برطانیہ کو آئندہ مسلم لیگ کی منظوری کے بغیر کوئی آئین نہیں بنانا چاہیے اور نہ موجودہ آئین میں کوئی تبدیلی کرنی چاہیے۔ ہندوستان کے لئے ایسا آئین بننا چاہیے جس میں یہ تسلیم کیا جائے کہ اس ملک میں دو قومیں آباد ہیں۔ ہندو اور مسلمان۔ دونوں کو اپنے وطن کا نظام، حکومت چلانے میں برابر کا حصہ ملنا چاہیے۔ اس قسم کا آئین بنانے کے لئے مسلمان، برطانوی حکومت، کانگرس یا کسی بھی فریق سے تعاون

کرنے پرآمادہ ہیں تا کہ موجودہ تلخیاں ختم ہوں اور ہندوستان اقوام عالم میں اپنا مقام حاصل کر سکے۔''[14] اس مضمون سے ظاہر ہے کہ جناح نے 19 رجنوری 1940ء تک اپنے ذہن میں برصغیر کی تقسیم کا کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ ان کا مطالبہ صرف یہ تھا کہ ہندوستان میں اکثریت کی ناقابل تبدیل حکومت قائم نہ کی جائے اور مسلمانوں کو آئندہ کی مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں جائز حصہ دیا جائے۔ 15 رفروری کو جناح نے دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں پھر یہی مطالبہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ ''ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ ہم برطانیہ اور گاندھی میں سے کسی کو بھی مسلمانوں پر حکومت نہیں کرنے دیں گے۔ ہم آزادی چاہتے ہیں۔ میں مسلمانوں سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو منظم کریں اور لیگ کونسل کے ممبروں سے کہتا ہوں کہ جاؤ مسلم لیگ کا پیغام بچے بچے تک پہنچادو۔''

دراصل مسلم لیگ کا پیغام مسلمانان ہند کے بچے بچے تک پہلے ہی پہنچ چکا تھا۔ یہ مسلم لیگ کونسل کی کوششوں کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ کانگرسی لیڈروں کی کوتاہ اندیشی کا ثمر تھا۔ محمد علی جناح کو لاہور کے ایک نوجوان میاں فیروز الدین احمد نے قائداعظم نہیں بنایا تھا بلکہ کانگرسی لیڈروں نے اپنی رعونت کے باعث انہیں یہ اعلیٰ مقام بخشا تھا۔ جناح تو نومبر 1939ء میں بھی مخلوط وزارتوں کی بنیاد پر کانگرس سے سمجھوتہ کرنے پر آمادہ تھے لیکن جواہر لال نہرو کو ''کانگرس اور مسلم لیگ میں کوئی چیز مشترک نظر نہیں آتی تھی'' اور گاندھی کو ''مخلوط وزارتوں میں کوئی فائدہ نہیں دکھائی نہیں دیتا تھا۔'' ان حالات میں پنجابی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ عناصر مسلم لیگ کے سوا کسی اور جماعت کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ سر سکندر حیات خان کی یونینسٹ پارٹی اور زمیندارہ لیگ جاگیرداروں کی تنظیمیں تھیں۔ ان کا شہری مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ سے قدرتی تضاد تھا۔ مجلس احرار چار پانچ سال تک قادیانی فرقہ کے خلاف شورش برپا کرنے کے بعد مسجد شہید گنج کے ملبے میں دفن ہو چکی تھی۔ مجلس اتحاد ملت کا وجود اس کے بانی مولانا ظفر علی خان کی سیاسی متلون مزاجی کے باعث، تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ البتہ عنایت اللہ مشرقی کی خاکسار جماعت کا کچھ چرچا تھا کیونکہ اس کے نچلے طبقہ کے بیلچہ بردار رضا کار نہ صرف شہری مسلمانوں میں ولولہ پیدا کرتے تھے۔ بلکہ وہ عامۃ المسلمین میں راشٹریہ سیوک سنگھ، اکالی دل اور اس طرح کی دوسری متعدد غیر مسلم مسلح تنظیموں کے خلاف احساس تحفظ بھی پیدا کرتے تھے۔

عنایت اللہ مشرقی کی خاکسار تحریک۔پنجابی مسلم نچلے درمیانہ طبقہ کی فسطائی تنظیم

عنایت اللہ مشرقی نے پنجابی مسلمانوں کے دہاڑی دار مزدوروں، چھوٹے دکانداروں، خوانچہ فروشوں اور نچلے درمیانہ طبقہ کے بعض عناصر پر مشتمل یہ تنظیم 1931ء میں قائم کی تھی جبکہ یورپ میں فقید المثال معاشی بحران نے فسطائی تحریک کو جنم دے دیا تھا اور ہندوستان میں نہرو رپورٹ کے بعد محمد علی جناح اور دوسرے مسلمان لیڈروں کی مایوسی کے باعث مسلم سیاست کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔عنایت اللہ مشرقی نے، جو بعد میں علامہ مشرقی کے نام سے مشہور ہوا، ہندوستان اور انگلستان میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے انڈین ایجوکیشنل سروس میں ملازمت اختیار کی تھی۔ اس نے 1924ء میں ایک کتاب بعنوان ''تذکرہ'' لکھی تھی جس میں ہندوستان کے دقیانوسی ملاؤں پر سخت تنقید کی گئی تھی اور یہ الزام عائد کیا گیا تھا کہ یہ ملا نئے تحریک ہجرت کا فتویٰ صادر کر کے ہزاروں مسلمانوں کی ہلاکت اور لاکھوں مسلمانوں کی خانماں بربادی کا باعث بنے تھے۔ چنانچہ جمیعت العلمائے ہند نے اس کتاب کو غیر اسلامی اور ملحدانہ قرار دے کر اس کی سخت مذمت کی تھی۔

علامہ مشرقی نے 1926ء میں ہٹلر سے ملاقات کی تھی اور پھر 1931ء میں ایک اور کتاب بعنوان ''اشارات'' لکھی تھی جس میں خاکسار تحریک کے اصول بیان کئے گئے تھے اور ہٹلر کی کتاب ''مین کیف'' (Mein Kampf) کے بعض حصوں کا ترجمہ بھی شامل کیا گیا تھا اور اس نے چند ماہ بعد اپنی خاکسار تحریک شروع کر دی تھی جس کی تنظیم کا ڈھانچہ سراسر فسطائی تھا۔ خاکسار اعظم علامہ مشرقی اس تحریک کا آمر مطلق تھا۔ وہ اپنی مشاورتی کونسل بنام ادارۂ علیہ کے ہر فیصلے کو مسترد کر سکتا تھا اور اسے تحریک کی قیادت سے کسی صورت میں الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کا نصب العین نہ صرف پورے برصغیر میں بلکہ سارے عالم میں بزور قوت اسلام کا بول بالا کرنا تھا۔ اس کی تحریک کے ارکان ضلع سے لے کر محلہ تک بیلچہ بردار جتھوں میں منقسم تھے اور ہر جتھہ کا ایک سالار ہوتا تھا جس کی اطاعت لازمی ہوتی تھی۔ تحریک کا کوئی رکن اپنے سالار کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کی کسی بھی صورت میں جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ تحریک کا ایک حصہ جانبازوں پر مشتمل تھا جو ذہنی طور پر سرفروشی یا خودکشی کے لئے ہر لمحہ آمادہ رہتے تھے۔

جب علامہ اقبال نے 1932ء میں روم میں مسولینی کے مسلح رضا کاروں کی پریڈیں دیکھنے کے بعد واپس لاہور آ کر مسلمانوں کو ایک ہی سیاسی جماعت کے تحت یوتھ لیگیں اور رضا کاروں کی تنظیمیں قائم کرنے کی تلقین کی تھی اس وقت خاکسار تحریک میں جانبازوں کی خاصی تعداد وجود میں آ چکی تھی اور پھر کچھ عرصہ بعد ان کی تعداد 1300 تک پہنچ گئی تھی۔ خاکساروں کے جتھے ہر روز مختلف محلوں میں فوجی نوعیت کی پریڈ کرتے تھے اور فلاحی کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان میں اتحاد، نظم وضبط، مساوات، انکساری اور سوشل سروس کا جذبہ پیدا ہو۔ علامہ مشرقی کی عامۃ المسلمین کو تلقین یہ تھی کہ وہ اسلام کے ابتدائی دور کے دینی اکابر کی طرح بے لوث زندگی بسر کریں تا کہ وہ ایک مرتبہ پھر کرۂ ارض کے مقتدر اعلیٰ، فاتح، حکمران اور بادشاہ بن سکیں۔ "یہی ہمارا مذہب، ہمارا اسلام، ہمارا اصول اور ہمارا عقیدہ ہے۔" ان پڑھ اور نیم تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کے لئے اس نعرے میں بڑی دلکشی تھی کیونکہ ان کے خیال میں اس نعرے کی تکمیل میں ان کی ساری معاشرتی ومعاشی مشکلات کا حل مضمر تھا۔

علامہ مشرقی انڈین نیشنل کانگرس کی مذمت کیا کرتا تھا اور اسے "نامزد بابوؤں" کی ایک مجلس مذاکرہ قرار دیتا تھا۔ وہ گاندھی کو مردمیت کا درجہ نہیں دیتا تھا اور کہتا تھا کہ یہ شخص عدم تشدد کے ایک ایسے ہندو فلسفہ کی تبلیغ کرتا ہے جو اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کی روح کے منافی ہے۔ اور کانگرسی لیڈر جواباً اسے اور اس کی تحریک کو فاشسٹ کہتے تھے۔

علامہ مشرقی نے ستمبر 1936ء سے لے کر جولائی 1938ء تک "مولویوں کا غلط مذہب" کے عنوان سے 15 مضامین لکھے تھے جن میں مولویوں کے "بدمعاشی کے مراکز" کو تباہ کرنے کے عزم کا اظہار کیا گیا تھا۔ جواباً احراری اور دوسرے مولوی اپنی تحریروں اور تقریروں میں خاکسار تحریک کو غیر اسلامی قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ اتنا ہی بڑا فتنہ ہے جتنا کہ "قادیانی فتنہ" ہے۔ لیکن مسلم لیگ کے بارے میں علامہ مشرقی کا رویہ قدرے نرم ہی رہا۔ وہ جناح اور مسلم لیگ کے خلاف بدزبانی نہیں کرتا تھا بلکہ اس نے خاکساروں کو اجازت دے رکھی تھی کہ مسلم لیگ میں شامل ہو سکتے ہیں۔ بظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ 1937ء سے قبل پنجاب میں مسلم لیگ کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا اور 1937ء کے بعد وہ یکایک اتنی مقبول ہو گئی تھی کہ علامہ نے اس کے ساتھ محاذ آرائی خلاف مصلحت سمجھی تھی۔ علامہ کا طریقہ کار یہ ہوتا تھا کہ وہ مسلم رائے عامہ

کے بہاؤ کے خلاف نہیں جاتا تھا بلکہ اس کے ساتھ چل کر اس کا رخ اپنی طرف موڑنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس نے 1939ء میں یو۔ پی میں مدح صحابہ اور قدح صحابہ کے مسئلے پر شیعہ سنی تنازعہ کا تصفیہ کرانے کے لئے اپنے بیلچہ بردار جتھوں کو لکھنؤ بھیجا جہاں ان کا پولیس سے تصادم ہو گیا۔ جس میں متعدد خاکسار ہلاک وزخمی ہوئے۔

پھر مارچ 1940ء کو جبکہ لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی زور شور سے تیاریاں ہو رہی تھیں علامہ نے فیصلہ کیا کہ اس کے رضا کار سر سکندر حیات خان کی حکومت کی طرف سے نیم فوجی تنظیموں پر عائد کردہ پابندی کی خلاف ورزی کریں گے۔ چنانچہ 19؍مارچ کو 313 بیلچہ بردار خاکساروں کے ایک جیش نے اندرون بھاٹی دروازہ فوجی نوعیت کی پریڈ شروع کر دی۔ جب یہ جیش ہیرا منڈی کے چوک کے نزدیک پہنچا تو اس کا تصادم پولیس سے ہو گیا۔ جانباز خاکساروں نے اپنے بیلچوں کے ساتھ رائفلوں سے مسلح پولیس کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی جس میں پولیس کے چند افسر بری طرح زخمی ہوئے اور ایک انگریز پولیس افسر مارا گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد جب مسلح پولیس کی کمک موقع پر پہنچ گئی تو اس نے خاکساروں پر اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی جس سے حکومت کے اعلان کے مطابق 36 خاکسار جاں بحق ہوئے لیکن غیر سرکاری اندازہ پچاس سے کم نہ تھا۔ اس واقعہ کے بعد شہر میں ہڑتال ہو گئی۔ دفعہ 144 نافذ کر دی گئی اور کرفیو لگا دیا گیا۔ اخبارات پر سنسر بٹھا دیا گیا اور پورے شہر میں فوج گشت کرنے لگی اور اس طرح چاروں طرف دہشت طاری ہو گئی۔ حکومت پنجاب نے خاکسار جماعت کو خلاف قانون قرار دے دیا اور 184 سرکردہ خاکساروں کو گرفتار کر لیا۔ ادارہ علیہ پر حکومت نے قبضہ کر لیا اور علامہ مشرقی کو کراچی سے گرفتار کر کے لاہور لایا گیا جبکہ سنہری مسجد اور شہر کی بعض دوسری مسجدوں میں خاکساروں نے جمع ہو کر حکومت کے خلاف تقریروں کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ انہیں کھانا وغیرہ عوام الناس کی طرف سے مہیا کیا جاتا تھا اور وہ کبھی کبھی شہر کے کسی نہ کسی علاقے میں پریڈ بھی کرتے تھے۔ بالآخر جولائی 1940ء میں پولیس نے آدھی رات کے بعد چھاپے مار کر مسجدوں میں سے سارے خاکساروں کو گرفتار کر لیا اور اس طرح پنجاب میں دس سالہ خاکسار تحریک کا زور ٹوٹ گیا اور بالآخر یہ تنظیم تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کی مخالفت کی وجہ سے مفلوج ہو گئی۔

28؍اکتوبر 1941ء کو جب مرکزی اسمبلی کے ایک رکن محمد احمد کاظمی نے یہ تحریک التوا

پیش کی کہ خاکساروں کو غیر قانونی جماعت قرار دے کر کیوں ممنوع کیا گیا ہے تو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ہوم ممبر سر ریجنلڈ میکسول نے اس تنظیم کے کردار اور اس کی سرگرمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ ایسوسی ایشن 1931ء میں قائم ہوئی اور 1939ء میں یو۔پی کی کانگرس گورنمنٹ سے مقابلہ کیا۔ پھر 1940ء میں لاہور میں کشت و خون ہوا اور خود اپنی ہندوستانی گورنمنٹ سے مقابلہ پر آئی اور اس کو دھمکی دی اور اس کے لیڈر نے اعلان جاری کیا کہ ہم سر سکندر کے بستر ے کے چاروں طرف لاشوں کا ڈھیر لگا دیں گے۔ لہٰذا پنجاب و دہلی میں اس جماعت پر پابندی لگا دی گئی۔ ان کا اصول جوان کے ہفت روزہ اخبار ''الاصلاح'' میں چھپا تھا وہ یہ تھا کہ

1۔ مولویوں کی تعلیم غلط ہے۔ خاکسار سپاہی اس غلط تعلیم کا جو مولوی دیتا ہے خاتمہ کرے گا اور اصل تعلیم کو جو قرآن پاک کی ہے، اس پر عمل کرے گا۔
2۔ مولویوں کو مولوی یا مولانا نہ کہا جائے بلکہ شیخ یا فاضل کے لقب سے پکارا جائے۔
3۔ خاکسار اس کو ہر مسلمان کا مذہبی فرض سمجھتا ہے کہ وہ رسول اللہ کی تعلیم پر عمل کرے اور ان کے لئے اپنی جان کی قربانی دینے کو تیار رہے۔
4۔ خاکسار دغاباز لیڈروں کے جانی دشمن ہیں اور مخالف اخباری ایڈیٹروں اور اخباروں کے اور فرقہ وارانہ فساد پھیلانے والوں کے بھی جانی دشمن ہیں اور ان سے بدلہ لیں گے، چاہے جان جائے۔

''کیا محمد احمد کاظمی نے کانگرس چھوڑ دی ہے۔ اگر نہیں چھوڑی تو خود بھی ان سے حفاظت رکھیں۔ تمام اخبارات اس جماعت کے خلاف ہیں۔ اس پر ایک رکن اسمبلی سردار سنت سنگھ نے کہا کہ کیا واقعہ نہیں ہے کہ لاہور کی ایک جرمن فرم جو بجلی کا کاروبار کرتی تھی وہ اس جماعت کو تین ہزار روپے ماہوار دیتی تھی۔''[15]

قرارداد لاہور کا مسودہ کیسے مرتب اور منظور ہوا؟

خاکساروں اور پولیس کے درمیان اس خوفناک تصادم کے صرف دو دن بعد یعنی 21 رمارچ کو صدر مسلم لیگ محمد علی جناح لاہور پہنچے تو پروگرام کے مطابق ان کے اعزاز میں جلوس نہ نکل سکا کیونکہ شہر کی فضا بڑی سوگوار تھی۔ اسی دن شام کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا

جس میں ایک سبجیکٹس کمیٹی کے تشکیل کی گئی۔ دوسرے دن یعنی 22 ر مارچ کو لیگ کا کھلا اجلاس ہوا جس میں جناح نے اپنی طویل صدارتی تقریر میں پہلے تو جولائی 1937ء سے لے کر اکتوبر 1939ء تک کانگرسی وزارتوں کی فرقہ پرستانہ کاروائیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور پھر اپنے اس مؤقف کا اعادہ کیا کہ مسلمان اقلیت نہیں ہیں۔ وہ ہندوؤں سے الگ ایک قوم ہیں اور ان کی گیارہ میں سے چار صوبوں میں اکثریت ہے۔ مسلمانوں میں ایک علیحدہ قوم کے سارے اوصاف موجود ہیں لہٰذا ان کے لئے ایک الگ وطن، الگ علاقہ اور الگ ریاست کا ہونا ضروری ہے۔ جناح نے اپنے اس مؤقف کی تائید میں پنجاب کے ایک سرکردہ ہندو لیڈر لالہ لاجپت رائے کا ایک خط پڑھ کر سنایا جو اس نے 1924ء میں بنگال کے ایک وسیع المشرب لیڈر سی۔ آر۔ داس کو لکھا تھا۔ لاجپت رائے کے اس خط کا مرکزی نکتہ یہ تھا کہ مسلمان اور ہندو دو الگ الگ قومیں ہیں جنہیں ایک دوسرے میں مدغم کر کے ایک قوم بنانا ممکن نہیں۔[16] عاشق بٹالوی لکھتا ہے کہ ''لاجپت رائے چونکہ ہندو قوم کی ذہنیت کے صحیح علمبردار سمجھے جاتے تھے، ان کے اس خط نے لوگوں کو ششدر کر دیا۔ ملک برکت علی سٹیج پر بیٹھے تھے۔ ان کے منہ سے نکل گیا کہ لالہ لاجپت رائے نیشنلسٹ ہندو تھے۔ قائداعظم نے زور سے کہا کہ کوئی ہندو نیشنلسٹ نہیں ہوسکتا۔ ہر ہندو اول و آخر ہندو ہے۔ اس پر پنڈال میں خوب تالیاں بجیں۔''[17]

22 ر مارچ کی شام کو سبجیکٹس کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نوابزادہ لیاقت علی خان نے مشہور ومعروف قرارداد پاکستان پیش کی۔ عاشق بٹالوی کی اطلاع کے مطابق اس قرارداد کا مسودہ 21 ر مارچ کی رات کو نواب ممدوٹ کے مکان پر لکھا گیا تھا۔ قرارداد کی ترتیب و تدوین وتصنیف میں چار آدمیوں یعنی قائداعظم، نواب محمد اسماعیل خان، سر سکندر حیات خان اور ملک برکت علی نے حصہ لیا تھا۔ سر سکندر حیات خان ایک بنی بنائی قرارداد کا مسودہ اپنے ساتھ ورکنگ کمیٹی میں لائے تھے جو کم وبیش ان کی زونل سکیم کے خاکے پر مرتب کیا گیا تھا۔ لیکن ورکنگ کمیٹی نے اسے منظور نہ کیا۔ منظور شدہ قرارداد کا مسودہ یہ تھا: ''آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور ورکنگ کمیٹی نے 27 راگست 18,17 ر ستمبر، 22 ر اکتوبر 1939ء اور 3 ر فروری 1940ء کو آئینی امور کے بارے میں جو قراردادیں منظور کی تھیں آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس ان کی تائید وتصدیق کرتے ہوئے نہایت پرزور طریقے سے واضح کرتا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا

ایکٹ 1935ء میں جس فیڈریشن کی سکیم پیش کی گئی ہے وہ موجودہ حالات میں قطعی بے سود اور ناقابل عمل ہونے کے باعث مسلمانان ہند کے لئے ناقابل قبول ہے۔ یہ اجلاس مزید پرزور اعلان کرتا ہے کہ وہ اعلان تسلی بخش ہے جو ملک معظم کی حکومت کی طرف سے وائسرائے نے 18راکتوبر 1939ء کو کیا تھا اور جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ ہندوستان کی مختلف جماعتوں، فرقوں اور مفادات سے مشورہ کرنے کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء پر غور کیا جائے گا۔ بایں ہمہ مسلم انڈیا اس وقت تک مطمئن نہیں ہوگا جب تک تمام دستوری خاکے پر از سر نو غور نہیں کیا جاتا۔ مسلمان کسی دستوری خاکے کو، جو ان کی رضامندی اور مرضی کے بغیر مرتب کیا جائے گا، منظور نہیں کریں گے۔ قرار دیا جاتا ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی یہ سوچی سمجھی ہوئی رائے ہے کہ مسلمانان ہند صرف اس دستوری خاکے کو قبول کریں گے جو زیادہ بنیادی اصولوں پر مرتب کیا جائے گا۔

''جغرافیائی طور پر متصلہ وحدتوں (یونٹ) کے منطقے اس طرح وضع کئے جائیں کہ ضروری علاقائی ردوبدل کے ساتھ جن خطوں میں مسلمانوں کی عددی اکثریت ہے مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی زون، ان کو باہم ملا کر خود مختار ریاستیں بنادی جائیں جن کے ترکیبی یونٹ آزاد وخود مختار ہوں گے۔ وحدتوں (یونٹ) اور منطقوں میں رہنے والی اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی اور انتظامی حقوق اور دیگر مفادات کے لئے ان اقلیتوں کے مشورے سے دستور میں مناسب قانون اور پرزور تحفظات رکھے جائیں گے۔ یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کو اختیار دیتا ہے کہ ان بنیادی امور کے مطابق ایک دستور کی سکیم مرتب کرے جس کی رو سے انجام کار یہ جملہ منطقے ان تمام اختیارات کو اپنے قبضے میں لے لیں جن کا تعلق دفاع، امور خارجہ، مواصلات، کسٹم اور دیگر ضروری محکموں سے ہے۔''

یہ قرارداد اگلے دن یعنی 23رمارچ کو 3 بجے سہ پہر منٹو پارک میں لیگ کے کھلے

اجلاس میں تقریباً ایک لاکھ حاضرین کے سامنے بنگال کے مولوی اے۔ کے۔ فضل الحق نے پیش کی اور یو۔ پی کے چودھری خلیق الزماں نے اس کی تائید کی۔ تائید مزید پنجاب سے مولانا ظفر علی خان، سرحد سے سردار اورنگزیب خان، سندھ سے سر عبداللہ ہارون، مدراس سے عبدالحمید خان، سی۔ پی سے عبدالرؤف شاہ، بمبئی سے اسماعیل ابراہیم چندریگر اور بہار سے نواب محمد اسماعیل خان نے کی اور اگلے روز یعنی 24 / مارچ کو یہ قرارداد متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔ اس طرح برصغیر کی سیاست میں ایک بالکل نیا باب کھل گیا۔

یہ قرارداد 1921ء کے بعد تاریخی ہندو۔ مسلم تضاد کی شدت میں مسلسل اضافے، جولائی 1937ء کے بعد کانگرس کی ہندو قیادت کی رعونت، غلط اندیشی، تنگدلی، مسلم اقلیت کی روز افزوں معاشرتی اور معاشی پسماندگی اور برطانوی سامراج کی تفرقہ انگیزی کا منطقی نتیجہ تھی۔ اگر کانگرس کی بورژوا قیادت میں قدرے سیاسی دور اندیشی، دریا دلی اور انصاف پسندی کا جذبہ ہوتا تو مسلم لیگ کی جانب سے اس قسم کی قرارداد کی منظوری کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ 1939ء سے قبل صدر مسلم لیگ محمد علی جناح کے سیاسی نظریے کی بنیاد کبھی بھی دو قومی نظریے پر نہیں رہی تھی۔ وہ ہندو۔ مسلم اتحاد اور متحدہ ہندوستانی قومیت کے عظیم علمبردار تھے۔ وہ کھلم کھلا کہا کرتے تھے کہ ''میں پہلے انڈین ہوں اور اس کے بعد مسلمان ہوں۔'' وہ نومبر 1939ء تک یہ کوشش کرتے رہے تھے کہ مخلوط وزارتوں کے اصول کی بنیاد پر کانگرس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ ہو جائے۔ لیکن کانگرس کی کوتاہ اندیش قیادت نے بالآخر انہیں مجبور کر دیا کہ وہ برصغیر کی مسلم اقلیت کے درمیانہ طبقہ کی علیحدگی پسندی کے قائداعظم بن جائیں۔ مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ میں علیحدگی پسندی کا رجحان تحریک خلافت کی ناکامی کے بعد گزشتہ تقریباً پندرہ سال سے پروان چڑھ رہا تھا۔ محمد علی جناح 1938ء میں مسلم درمیانہ طبقہ کے قائداعظم اس وقت بنے تھے جب انہوں نے اپنی تقریروں اور بیانات میں اس رجحان کو اپنانے کا عندیہ دیا تھا۔

کیا قرارداد لاہور کے الفاظ کی بدولت پاکستان وجود میں آیا تھا؟

چودھری خلیق الزماں، عاشق بٹالوی اور نواب یامین خان جیسے بعض عناصر یہ کہتے ہیں کہ اس قرارداد کے الفاظ مبہم اور ناقص تھے۔ اس میں شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کے مسلم

اکثریت والے صوبوں کے نام نہیں لکھے گئے بلکہ یہ لکھا گیا ہے کہ ''ضروری علاقائی ردوبدل کے بعد جن خطوں میں عددی اکثریت ہے ان کو باہم ملا کر خودمختار ریاستیں بنادی جائیں۔'' چودھری خلیق الزماں کا دعویٰ ہے کہ قرارداد میں یہ ابہام ونقص محض اس لئے رہ گیا تھا کہ قرارداد اس نے نہیں لکھی تھی اگر حسب سابق قرارداد لکھنے کا کام اسے دیا جاتا تو قرارداد کا مفہوم نہ بگڑتا۔ اسے افسوس ہے کہ کاش ورکنگ کمیٹی کے ارکان اس کی آمد کا انتظار کرتے کہ وہ اپنے وسیع سیاسی تجربے کی بنا پر قرارداد صحیح الفاظ میں مرتب کرسکتا۔ وہ اپنی بیٹی کی شادی کی وجہ سے 21/ مارچ سے پہلے لکھنؤ سے روانہ نہیں ہوسکتا تھا۔''[18]

عاشق بٹالوی کہتا ہے کہ میں نے لیگ کونسل کے اجلاس میں اس قرارداد میں ترمیم پیش کی تھی اور یہ کہا تھا کہ ''اگر آپ لوگ پنجاب اور بنگال کے صوبوں کو مجوزہ مملکتوں میں شامل کرنا چاہتے ہیں تو جہاں آپ نے ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی منطقوں کا ذکر کیا ہے وہاں صاف لفظوں میں ان صوبوں کے نام لیجیے تاکہ ہمارے غاصب اور مخالف دونوں ہمارے مطالبے کی حقیقت ابھی سمجھ جائیں ورنہ علاقائی ردوبدل کے بعد پنجاب و بنگال کا تقریباً نصف حصہ کٹ جائے گا۔ میری اس ترمیم کا جواب نوابزادہ لیاقت علی خان نے یہ دیا کہ ہم علاقائی ردوبدل کے تحت دہلی اور علی گڑھ کو، جو ہماری تہذیب وتعلیم کے مرکز ہیں، مجوزہ مملکت میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ آپ مطمئن رہے علاقائی ردوبدل کا یہ مطلب نہیں کہ پنجاب کا کوئی حصہ ہاتھ سے دینا پڑے گا۔ نوابزادہ صاحب کے اس جواب پر ایوان میں خوب تالیاں بجیں۔''[19]

نواب یامین خان کہتا ہے کہ اس ریزولیشن کے بنانے میں سرسکندر حیات کا کافی ہاتھ تھا اور انہوں نے اپنی زونل سکیم کو بھدے الفاظ میں درج کیا تھا۔[20] سید نور احمد لکھتا ہے کہ ''سرسکندر حیات نے اس قرارداد کا ابتدائی مسودہ دراصل مارچ کے دوسرے ہفتے میں ہی تیار کرلیا تھا۔ اس نے اس مسودے میں اس وقت کے حالات اور قائداعظم کے خیالات کا رجحان دیکھتے ہوئے ملک کی تقسیم کے مطالبہ کو ایک نرم شکل میں اور اپنی پسند کی اصطلاحوں میں پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے یہ مسودہ میر مقبول محمود کے ہاتھ قائداعظم کی منظوری کے لئے دہلی بھیج دیا۔ قائداعظم نے اسے سبجیکٹس کمیٹی (Subjects Committee) کے سامنے رکھنا منظور کرلیا۔ اسی مسودے نے مزید کانٹ چھانٹ اور تبدیلیوں کے بعد ''قرارداد لاہور'' کی صورت اختیار کر

لی...... سبجیکٹس کمیٹی نے سر سکندر کی عدم موجودگی میں صوبوں کی جگہ ''مسلم اکثریت کے علاقوں'' کی اصطلاح استعمال کی کیونکہ قائداعظم مسلمانوں کے قومی مطالبے کو صاف اور واضح طور پر مسلم قوم کے حق خود ارادیت کی منطق پر مبنی کرنا پسند کرتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق اس منطق کے سوا کسی اور منطق کی بنا پر ملک کی تقسیم کا کوئی جواز نہ تھا...... پھر بھی ترمیم شدہ مسودے میں ایک آدھ لفظ ایسا رہ گیا جو اصل مسودے میں درست تھا لیکن ترمیم شدہ عبارت میں آج بھی عجیب معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً اکثریت کے علاقوں کی آزاد مملکتوں کے یونٹوں کے لئے Sovereign (حاکمانہ حیثیت) کی اصطلاح کا استعمال...... سر سکندر نے اپنے ابتدائی مسودے میں یہ لفظ اس لئے استعمال کیا تھا کہ وہ مسلم لیگ کے مقصد کو صوبائی خود مختاری کی اصطلاح میں بیان کرنا چاہتے تھے اور ایک ایسے نعرے کی شکل دینا چاہتے تھے جس کی تائید وہ ایک پنجابی کی حیثیت سے صوبائی حب الوطنی کے نام پر کر سکیں اور اسے اپنے غیر مسلم یونینسٹ ساتھیوں کے لئے بھی قابل قبول بنا سکیں۔''[21] یہ عناصر الزام عائد کرتے ہیں کہ اگر اس قرارداد کے الفاظ مبہم اور ناقص نہ ہوتے اور اس میں علاقائی رد و بدل کا ذکر نہ ہوتا تو 1947ء میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم نہ ہوتی، لاکھوں بے گناہ لوگوں کا قتل عام نہ ہوتا اور کروڑوں لوگوں کا جبری تبادلۂ آبادی نہ ہوتا۔

ایسے تخیل پسند عناصر اس قسم کی احمقانہ باتیں محض اس لئے کہتے اور لکھتے ہیں کہ ان کے خیال میں قوموں کی تقدیر کا فیصلہ قرارداد کے الفاظ کے صحیح یا غلط ہونے پر ہوتا ہے۔ انہیں معلوم نہیں کہ تاریخ کا ارتقا متعلقہ معاشرے کے سیاسی و معاشی تقاضوں کے تحت ہوتا ہے اگر کسی قرارداد کے الفاظ ان تقاضوں کے مطابق ہوں تو اس کی تعمیل ہوتی ہے اور اگر اس کے الفاظ غیر مبہم اور صحیح ہونے کے باوجود ان تقاضوں کے خلاف ہوں تو اس پر عملدرآمد نہیں ہو سکتا۔ برصغیر میں کون نہیں جانتا کہ 1947ء میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا فیصلہ اس قرارداد کو پیش نظر رکھ کر نہیں کیا گیا تھا بلکہ اس کا فیصلہ اکالی دل کے تبادلۂ آبادی کے منصوبے اور کانگرس کی مارچ 1947ء کی قرارداد کے مطابق ہوا تھا اور اس فیصلے کو قطعی شکل مئی 1947ء میں شملہ میں نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کے درمیان خفیہ ملاقاتوں میں دی گئی تھی۔ وائسرائے ماؤنٹ بیٹن کی سیاسی لیڈروں سے گفتگو کے سرکاری ریکارڈ، جس کا کچھ حصہ ''پاکستان کی سیاسی تاریخ، پاکستان کیسے بنا؟'' جلد اول و دوئم میں بیان کیا گیا ہے، کے مطابق جناح آخری وقت تک پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی مخالفت کرتے

رہے تھے اور یہ التجائیں کرتے تھے کہ انہیں کرم خوردہ پاکستان نہ دیا جائے۔ انہوں نے جون 1947ء میں ماؤنٹ بیٹن کو اکالی دل کے پر تشدد منصوبے سے آگاہ کر دیا تھا۔ تاہم کانگرسی لیڈروں اور ماؤنٹ بیٹن کی ملی بھگت کی وجہ سے اُن کو مجبوراً پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر رضامند ہونا پڑا۔ 23 / مارچ 1940ء کی قرارداد کے الفاظ خواہ کیسے ہی ہوتے 1947ء کے اوائل میں برصغیر کے فرقہ وارانہ حالات کچھ اس طرح کے ہو گئے تھے کہ پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مسلمانوں کے اصرار کی وجہ سے ہندوستان متحد نہیں رہ سکتا تھا اور ہندوؤں اور سکھوں کی ضد کی وجہ سے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بغیر برصغیر کی تقسیم نہیں ہو سکتی تھی۔ قتل و غارت اور خون خرابہ دونوں صورتوں میں ہی ناگزیر تھا۔

جیسا کہ عاشق بٹالوی نے بتایا ہے اس قرارداد کی ترتیب و تدوین میں محمد علی جناح اور ملک برکت علی جیسے اعلیٰ پایہ کے وکلاء نے حصہ لیا تھا۔ لہٰذا قرارداد کے الفاظ کے نقائص ان کے نظر سے اوجھل نہیں رہ سکتے تھے۔ انہوں نے اس کے الفاظ کو مبہم اس لئے رکھا تھا کہ وہ اس وقت سنجیدگی سے اس پر عملدرآمد کی توقع نہیں کرتے تھے۔ نواب یامین خان کے بیان کے مطابق جناح نے یکم مارچ 1939ء کو ڈاکٹر ضیا الدین احمد کے مکان پر ایک کھانے کے دوران مطالبہ پاکستان کو محض کانگرس سے سودے بازی کے لئے اپنانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس کے بغیر کانگرس قابو میں نہیں آئے گی۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ کی کتاب سے یامین خان کے اس بیان کی تائید ہوتی ہے۔ وہ لکھتی ہے کہ ''اکثر مسلمانوں کے نزدیک پاکستان ایک تصور تھا حقیقت نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ پاکستان گویا ان کا ناقابل تردید حق ہے۔ جسے اب تک انہوں نے استعمال نہیں کیا۔ مسلمانوں کے بڑے بڑے لیڈروں کا بدستور یہ خیال تھا کہ کسی قسم کا باہمی سمجھوتہ ہو جائے گا اور وہ متحدہ ہندوستان کے اندر اپنی جداگانہ کلچرل ہستی برقرار رکھ سکیں گے۔ قائداعظم کا بھی یہی خیال تھا۔ مجھے بخوبی یاد ہے جب میں پہلی بار (اکتوبر 1941ء) میں ان سے ملی تھی تو انہوں نے کہا تھا کہ کینیڈا کا آئین ہمارے مسائل کا بہترین حل ہے۔ قرارداد پاکستان کے بعد وہ سات سال تک ایک طرف برطانوی حکومت اور دوسری طرف کانگرس سے باہمی سمجھوتے کی بات چیت کرتے رہے اور اس دوران میں ایک سے زائد بار تقریباً سمجھوتہ ہو بھی گیا تھا جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ دوٹوک بٹوارا نہیں چاہتے تھے۔ باہمی سمجھوتے میں ناکامی ہوئی تو اس کی ذمہ

داری قائداعظم پر نہیں کانگرسی لیڈروں کی تنگ دلی اور تعصب پر تھی۔''[22]

پاکستان کی بیوروکریسی کے ایک اعلیٰ رکن سید ہاشم رضا کے بیان سے اس مؤقف کی تائید مزید ہوتی ہے۔ یہ شخص 14 راگست 1947ء کو انتقال اقتدار کے موقع پر کراچی کا ایڈمنسٹریٹر تھا اور اس حیثیت سے اس نے افسر تقریبات کے فرائض بھی سرانجام دیئے تھے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب قائداعظم تقریب گاہ میں تشریف لائے تو مہمانوں سے ان کی ملاقات کرانے کا شرف بھی مجھ کو ہی حاصل ہوا۔ جب میں بابائے قوم کو لے کر اس میز پر پہنچا جس پر غیر ملکی اخباری نمائندے بیٹھے تھے تو نیویارک ٹائمز کے نمائندہ خصوصی نے بڑھ کر بابائے قوم کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور وفورِ عقیدت سے ان کا ہاتھ زور سے دبا کر بے ساختہ پکار اٹھا۔ قائداعظم میں مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آخرکار آپ نے پاکستان لے ہی لیا۔ قائداعظم نے یہ جملہ سن کر امریکی صحافی کا ہاتھ جھٹک دیا اور اپنے مخصوص لہجے میں جواب دیا۔ ''میں نے اکیلے پاکستان حاصل نہیں کیا۔ پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں میرا، ایک روپے میں دو آنے حصہ تھا۔ اس تگ و دو میں برصغیر کی مسلم قوم کا حصہ روپے میں چھ آنے کے برابر تھا اور قیام پاکستان میں اس برصغیر کی ہندو قوم کا حصہ روپے میں سے آٹھ آنے کے برابر تھا۔ امریکی صحافی قائداعظم کے اس غیر متوقع ارشاد سے چونک اٹھا مگر بابائے قوم نے اس کی حیرت اپنی وضاحت سے دور کر دی۔ بابائے قوم نے فرمایا۔ جس زمانے میں مصر میں سعد زاغلول پاشا کی حکومت تھی۔ مصر کے عیسائیوں نے اپنے حقوق کے تعین کے لئے تحریک شروع کر دی۔ ان کا تناسب آبادی 13 فیصد تھا۔ لیکن وہ 20 فیصد کے تناسب سے حقوق مانگتے تھے اور یہ قضیہ روز بروز سنگینی اختیار کر رہا تھا۔ سعد زاغلول پاشا نے اپنی پارٹی کا اجلاس طلب کیا اور اس میں اپنا یہ فیصلہ منظور کروالیا کہ عیسائیوں کے ساتھ وہ خود اس مسئلے کا تصفیہ کر لیں گے۔ چنانچہ اپنی پارٹی سے یہ اختیار حاصل کر کے انہوں نے عیسائیوں کے مطالبے کا فیصلہ کرنے کے لئے گول میز کانفرنس طلب کی۔ یہ گول میز کانفرنس قاہرہ میں منعقد ہوئی۔ ابھی اس کانفرنس میں ایک ہی عیسائی نمائندے نے تقریر کی تھی کہ سعد زاغلول پاشا نے اسے ٹوک دیا اور کھڑے ہو کر اعلان کیا کہ عیسائی حقوق کے سلسلے میں 20 فیصد تناسب کا مطالبہ کر رہے ہیں لیکن ہم انہیں تیرہ فیصد کی بجائے 25 فیصد تناسب کا حق دیتے ہیں۔ سعد زاغلول پاشا کا یہ اعلان عیسائیوں کے لئے عید کی خوشی کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ انہوں نے مسلمان حکمران لیڈر کو بے حد خراج تحسین پیش کیا۔

گول میز کانفرنس ختم ہوگئی۔ یہ 1923ء کا زمانہ تھا۔ اس کو اب ربع صدی گزر چکی اور مصر میں اس دن کے بعد مسلمانوں اور عیسائیوں کے مابین کوئی بدمزگی یا کسی قسم کی کشیدگی پیدا نہیں ہوئی۔ کیونکہ عیسائی 25 فیصد تناسب حاصل کر کے بھی 75 فیصد مسلمانوں کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ قائداعظم نے فرمایا۔ بعینہ یہی مسئلہ برصغیر کا بھی تھا۔ مسلمان بلحاظ تناسب آبادی ہندوقوم سے کہیں زیادہ اقلیت میں تھے۔ اگر ہندو قیادت بھی سعد زاغلول پاشا جیسی فراخدالی کا عملی ثبوت پیش کرتی تو مسلمانان برصغیر کو علیحدہ اور خودمختار وطن حاصل کر کے اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی۔"[23] جناح کی اس بات سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ہندوؤں کی قیادت مسلم اقلیت کے ساتھ فراخدلانہ سلوک کرتی اور مسلم لیگ کے ساتھ مناسب سمجھوتہ کر لیتی تو قرارداد پاکستان کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی اور اگر یہ قرارداد منظور ہو ہی گئی تھی تو اس پر عملدرآمد کی نوبت نہ آتی۔ بیگم شائستہ اکرام اللہ کے بیان کے مطابق اس قرارداد کے بعد جناح سات سال ایک طرف برطانوی حکومت اور دوسری طرف کانگرس سے باہمی سمجھوتے کی بات چیت کرتے رہے تھے۔

برصغیر کی مذہبی بنیادوں پر تقسیم کا نظریہ سب سے پہلے 1924ء میں لالہ لاجپت رائے نے پیش کیا تھا اور اسی سال اس نے بنگال کے لیڈر سی۔ آر۔ داس کو لکھا تھا "ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں۔ جنہیں ایک دوسرے میں مدغم کر کے ایک قوم بنانا ممکن نہیں۔" قرارداد پاکستان، لاجپت رائے کے نظریے کے اس اظہار کے 16 سال بعد منظور ہوئی تھی اور اس کے الفاظ بھی اس طرح غیر مبہم نہیں تھے جس طرح کہ لاجپت رائے کے تھے۔ اشتیاق حسین قریشی بھی لکھتا ہے کہ جناح نے 1939ء کے اواخر میں مطالبہ پاکستان کو درخور اعتنا سمجھا تھا جبکہ ہندوؤں نے مسلمانوں کو علیحدگی پر مجبور کر دیا تھا۔ چودھری خلیق الزماں کہتا ہے کہ جناح نے ابتداً اپنی تقریروں اور بیانات میں لفظ پاکستان کا استعمال نہیں کیا تھا۔ انہوں نے یہ لفظ اس وقت استعمال کرنا شروع کیا تھا جبکہ یہ مسلمانوں کے ہر گھر میں بولا جانے لگا تھا۔ مسلم عوام میں اس لفظ کے بہت جلد مقبول ہو جانے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ گزشتہ پندرہ بیس سال سے مسلمانوں کے لئے ایک آزاد مملکت کا خواب دیکھ رہے تھے۔ لہٰذا انہوں نے اس قرارداد کے الفاظ پر غور کئے بغیر اسے اپنے سہانے خواب کی تعبیر کی طرف ایک فیصلہ کن پیش قدمی تصور کیا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس قرارداد کی منظوری کے بعد ہندو لیڈروں اور ہندو اخبارات نے اسے "قرارداد پاکستان" قرار

دے کراس کے خلاف اس قدر زوردار پروپیگنڈا مہم چلائی کہ ہندو ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے استحصال کے بوجھ تلے دبے ہوئے مسلمانوں نے از خود یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ اس قرارداد میں ضرور کوئی مسلمانوں کے فائدے کی بات ہوگی۔ ہندو۔مسلم تضاد کے طویل پس منظر میں ان کا یہ اندزفکر غیر متوقع اور رنا قابل فہم نہیں تھا۔

قرارداد لاہور کے محرکات کے متعلق ولی خان کی غلط بیانی......ایک علمی بددیانتی

پاکستان کے ایک سیاستدان عبدالولی خان نے یہ ثابت کرنے کے لئے کہ انگریزوں نے برصغیر کو اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کی خاطر تقسیم کیا تھا اور پاکستان انگریزوں کی سازش کے نتیجے میں وجود میں آیا تھا، دسمبر 1981ء میں پاکستان کے اخبارات میں دعویٰ کیا کہ اُس نے انڈیا آفس لائبریری میں ایک ایسی دستاویز دیکھی ہے جس سے اُس کے دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے پھر اُس نے اپنی کتاب Facts are Facts میں اس دستاویز کو نقل کیا اور ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مسلم لیگ نے دراصل انگریزوں کے ایماء پر قرارداد لاہور منظور کی تھی۔ ولی خان کے مطابق برصغیر کو دوریاستوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ وائسرائے کے کہنے پر اس کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن ظفر اللہ خان نے تیار کیا تھا۔ اس کے مسودے کی نقل جناح کو بھیجی گئی اور وزیر ہند کو برطانیہ بھی بھیجی گئی۔ اس سارے فسانے کی بنیاد وہ ایک خط کو بناتا ہے جو قرارداد لاہور کی منظوری سے 12 روز پیشتر 12 ر مارچ 1940ء کو وائسرائے لارڈ لنلتھگو (Linlithgow) نے وزیر ہند لارڈ زٹلینڈ (Zetland) کو لکھا تھا۔ ولی خان نے اپنی کتاب میں اس کا متن یوں نقل کیا ہے:

"Upon my instruction Zafarullah wrote a memorandum on the subject, Two dominion states. I have already sent it to your attention. I have also asked him for further clarification, which, he says, is forthcoming. He is anxious, however, that no one should find out that he has prepared this plan. He has, however, given me the right to do with it what I like, including sending a copy to you. Copies have been passed on

to Jinnah, and, I think to Sir Akbar Hydari. While he, Zafarullah, cannot admit its authoriship, his document has been prepared for adoption by the Muslim League with a veiw to giving it the fullest publicity."[24]

(ترجمہ)''میری ہدایت پر ظفراللہ نے دوڈومینین ریاستوں کے عنوان سے ایک یادداشت تحریر کی ہے۔میں اسے آپ کے ملاحظہ کے لئے پہلے ہی ارسال کر چکا ہوں۔میں نے اس سے مزید وضاحتیں طلب کی ہیں جو وہ کہتا ہے کہ مہیا کر دی جائیں گی۔تاہم وہ اس بارے میں متردد ہے کہ کسی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ یہ منصوبہ اس نے تیار کیا ہے۔البتہ اس نے مجھے یہ اختیار دیا ہے کہ میں اس مسودے کو جس طرح چاہوں استعمال میں لے آؤں اور یہ کہ اس کی نقل آپ کو بھیج دوں۔اس کی نقلیں جناح اور میرا خیال ہے اکبر حیدری کو بھی بھیجی گئی ہیں۔اب جبکہ ظفراللہ اپنی دستاویز کی تصنیف کا اعتراف نہیں کر سکتا، یہ دستاویز اس لئے تیار کی گئی ہے کہ مسلم لیگ اس نقطۂ نگاہ کے ساتھ اختیار کر لے گی کہ اس کی خوب تشہیر کی جائے۔''

اب حقیقت حال یہ ہے کہ 12رمارچ1940ءکو وائسرائے لنلتھگو کی جانب سے وزیر ہند زٹلینڈ کے نام لکھا گیا اصل خط جو انڈیا آفس لائبریری کے ریکارڈ میں موجود ہے اس کا متن ولی خان کے نقل کردہ متن سے بہت زیادہ مختلف ہے۔اصل خط کی عبارت یوں ہے:۔

"I sent you by the last bag a copy of Zafurllah's note on dominion Status, which I remarked purported to be a statement of the position from the extremer point of view. I introduced that qualification because I had not at that time had an opportunity of discussing its precise nature with him and certain of the propositions contained in it, were they to appear formally under the name of a Member of my council, might, I think, have justified a description in those terms, I aksed him yesterday to put me a little more in the picture and he told me

first that his is a first draft only; secondly that, provided he is protected on that point and the paper is not used publicly, I may do what I like with it including sending a copy to you; thirdly that copies have been passed to Jinnah and I think to Hydari; and fourthly that while he, Zafrullah cannot, of course, admit its authorship, his document has been prepared for adoption by the Mulism League with a view to its being given the fullest publicity. I cannot claim even yet to have had time to absorb it fully and I would prefer to suspend my comment on it until later. But it is a substantial and trenchant piece of work and I shall be greatly interested in your reactions to it."[25]

(ترجمہ) ''میں نے پچھلی مرتبہ بیگ میں ڈومینین کے درجہ کے بارے میں ظفر اللہ کے نوٹ کی نقل بھیجی تھی اور میں نے اس کے بارے میں لکھا تھا کہ اس دستاویز سے نسبتاً انتہا پسندانہ نقطۂ نظر مترشح ہوتا ہے۔ یہ بات میں نے اس لئے کہی تھی کہ اُس وقت تک مجھے اس کی صحیح نوعیت کے بارے میں اس کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور اس میں شامل بعض تجاویز، اگر میری کونسل کے ایک رکن کے نام سے رسمی طور پر پیش ہوتیں تو میرے خیال میں ان الفاظ میں وضاحت کا جواز مہیا کرتی تھیں۔ میں نے کل اس سے کہا کہ مجھے اس کے بارے میں ذرا کچھ تفصیل سے آگاہ کرو تو اس نے مجھے بتایا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ ابھی ابتدائی مسودہ ہے، دوسرے یہ کہ اگر اس معاملے میں اسے تحفظ دیا جائے اور اس دستاویز کا استعمال مشتہر کر کے نہ کیا جائے تو پھر میں جیسے چاہوں اس کو استعمال میں لاسکتا ہوں اور اس کی نقل آپ کو بھی بھیج سکتا ہوں، تیسرے یہ کہ اس دستاویز کی نقول جناح اور غالباً حیدری کو بھی دی گئی ہیں، اور چوتھے یہ کہ اب جبکہ وہ یعنی ظفر اللہ بلاشبہ اس دستاویز کے مصنف ہونے کا اعتراف نہیں کرسکتا، یہ دستاویز اس لئے تیار کی گئی ہے کہ مسلم لیگ اس کی خوب تشہیر کرنے کے نقطۂ نگاہ سے اسے اختیار کرے۔ میں اب

بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اسے پوری طرح سمجھ گیا ہوں اور میں بہتر سمجھوں گا کہ اس پر اپنی رائے مؤخر کردوں۔ تاہم یہ خاصا قابل قدر کام ہے اور میں اس کے بارے میں آپ کے ردعمل میں دلچسپی رکھتا ہوں۔"

ولی خاں کے متن اور اصل متن کی عبارتوں کا موازنہ کرنے سے ولی خاں کی بددیانتی خودبخود کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ ولی خاں کی پہلی بددیانتی یہ ہے کہ اُس نے تحقیق کے مروجہ قواعد کے مطابق اپنی کتاب میں نقل کردہ متن کا حوالہ ہی نہیں دیا جبکہ انڈیا آفس لائبریری اینڈ ریکارڈز کی تمام فائلوں اور ان میں شامل دستاویزات کے باقاعدہ نمبر لگے ہوئے ہیں اور ان کا حوالہ دینا بہت آسان ہے۔ اُس کی دوسری بددیانتی یہ ہے کہ اس نے اصل عبارت سے پوری کی پوری سطریں حذف کر کے ان کی جگہ اپنی طرف سے سطریں لکھ دی ہیں اور پھر ان ہی سطروں کو بنیاد بنا کر ایک خیالی سازش کا محل کھڑا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے انتہائی بے شرمی کے ساتھ Dominion Status یعنی "ڈومینین کا درجہ" کے الفاظ کو Two Dominion States یعنی "ڈومینین ریاستوں" کے الفاظ سے تبدیل کر دیا ہے اور پھر اپنے پاس سے یہ اضافہ بھی کر دیا ہے کہ Upon my instruction Zafarullah wrote a memorandum حالانکہ اصل متن میں کہیں یہ نہیں کہا گیا کہ وائسرائے کی ہدایت پر ظفر اللہ نے یہ دستاویز تیار کی تھی۔ بلکہ اس کے برعکس وائسرائے اس دستاویز کے مندرجات کا پوری طرح احاطہ ہی نہیں کر سکا تھا۔ گویا خود ہی ترمیم و اضافہ کر کے یہ لکھا کہ "وائسرائے کے کہنے پر ظفر اللہ نے دو ڈومینین ریاستوں کے قیام کا منصوبہ تیار کیا" اور پھر اس کو بنیاد بنا کر یہ ڈھنڈورا پیٹنا شروع کر دیا کہ قرارداد لاہور کے پس پشت انگریزوں اور قادیانیوں کی سازش کارفرما تھی۔

ولی خاں کی تیسری اور سب سے بڑی بددیانتی یہ ہے کہ اُس نے ظفر اللہ کی دستاویز کا کوئی حوالہ دے کر یہ نہیں بتایا کہ اس نے اس دستاویز میں کیا لکھا تھا۔ اس نے اس دستاویز سے ایک لفظ بھی نقل نہیں کیا جس پر اس نے اتنا طومار باندھا ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں اس دستاویز میں کیا لکھا گیا ہے۔ 32 صفحات پر مشتمل ظفر اللہ خاں کا یہ نوٹ ہندوستان اور برطانوی دولت مشترکہ میں رہتے ہوئے ایک ڈومینین کی حیثیت سے خودمختار درجہ دیئے جانے کے بارے میں ان مباحث کا ایک حصہ تھا جو اس وقت ہندوستان اور برطانیہ میں جاری و ساری تھے۔ ان مباحث کا

پس منظر یہ تھا کہ دوسری عالمی جنگ سے بہت پہلے 1929ء میں برطانوی حکومت نے ہندوستان کو ڈومینین کی حیثیت دیئے جانے کا حق تسلیم کرلیا تھا اور پھر 1935ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں بھی اس کے لئے گنجائش رکھی گئی تھی۔ تاہم کانگرس جس نے 1928ء کی نہرو رپورٹ میں ڈومینین کی حیثیت کا مطالبہ کیا تھا بعد میں مکمل آزادی کا نعرہ بلند کرنے لگی تھی۔ چنانچہ 30 کے عشرے میں برطانوی حکومت کی جانب سے ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ دیئے جانے کی یقین دہانیاں کرائی جاتی رہیں۔ جبکہ کانگرس مکمل آزادی کا مطالبہ کرتی رہی۔ 26/اکتوبر 1939ء کو لارڈ پریوی سیل یعنی وزیر مہر شاہی سر سیموئل ہور (Samuel Hoare) نے دارالعوام میں بیان دیا کہ ہندوستان کو ویسا ہی ڈومینین کا درجہ دیا جائے گا جیسا کہ برطانوی دولت مشترکہ میں دوسری ڈومینینوں کو حاصل ہے۔ اس کے بعد 10/جنوری 1940ء کو وائسرائے لنلتھگو نے اورینٹ کلب بمبئی میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان کی ڈومینین کی حیثیت وہی ہوگی جو برطانوی دارالعوام کا قانون یعنی (Statute of Westminister) میں رکھی گئی ہے۔ اور یہ کہ جنگ کے خاتمہ کے فوراً بعد جس قدر جلد ممکن ہوا ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ دے دیا جائے گا۔ اس تمام عرصے کے دوران مسلم لیگ کی جانب سے یہ سوال اٹھایا جاتا رہا کہ ڈومینین ہندوستان کے اندر مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے مقابلے میں کیا تحفظات حاصل ہوں گے اور یہ کہ جب تک یہ تحفظات حاصل نہیں ہوں گے مسلم لیگ کسی آئین کو تسلیم نہیں کرے گی اور یہ تمام بحث متحدہ ہندوستان کے دائرے ہی میں رہی۔ فروری 1940ء میں ظفر اللہ خاں نے اسی بحث کے تسلسل میں متذکرہ نوٹ تیار کیا اور ایک نقل جناح کو بھیج دی۔ ہندوستان کو ڈومینین کی حیثیت سے آزادی ملنے کی صورت میں مسلمانوں کو ہندو اکثریت کی جانب سے ممکنہ خطرات کے پیش نظر اس وقت مسلمانوں کے مابین کئی سکیموں پر بحث جاری وساری تھی جیسا کہ اس باب کے اوائل میں ذکر کیا گیا ہے۔ دیگر سکیموں کے علاوہ ان میں ایک پاکستان سکیم تھی، دوسرے مشرقی ومغربی خطوں میں علیحدہ علیحدہ وفاق بنانے کی سکیم تھی اور تیسرے ڈومینین ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ صوبائی خودمختاری پر مبنی سکیم تھی۔ یہ تمام سکیمیں مسلم رائے عامہ کے حلقوں میں پہلے سے کھلے عام زیر بحث تھیں، انہیں ظفر اللہ نے خفیہ طور پر پیش نہیں کیا تھا۔ اس نے متذکرہ نوٹ میں ان سکیموں کا فقط موازنہ پیش کیا اور اپنے حتمی تجزیے میں متحدہ ہندوستان کے دائرے میں رہتے ہوئے فریقین

کے مابین ہم آہنگی کی صورت میں کسی حل کی توقع ظاہر کی۔

ظفر اللہ نے اس نوٹ میں پاکستان سکیم کو مکمل طور پر رد کرتے ہوئے لکھا ''مسلم رہنماؤں نے مایوسی اور اضطراب سے دو چار ہو کر متعدد منصوبے وضع کئے ہیں۔جن میں سے بعض کو انہوں نے اس مشکل اور انتہائی پیچیدہ صورت حال کے مداوئی کے طور پر پیش بھی کیا ہے جس کا ان کو سامنا ہے۔مثلاً ایک پاکستان سکیم ہے جس کا وسیع معنوں میں مقصد ہندوستان کو مسلم اور غیر مسلم حصوں میں تقسیم کرنا ہے۔اس میں مسلم حصے کو پاکستان قرار دیا گیا ہے۔اس سکیم کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ بھاری تعداد میں تبادلۂ آبادی کو عمل میں لایا جائے گا۔اس پر عملدرآمد کی صورت میں جو اخراجات ہوں گے، جو پریشانی، اذیت اور ہولناک دہشت درپیش ہو گی اور ہندوستان میں جس وسیع پیمانے پر یہ سب کچھ ہونا ناگزیر ہوگا، فقط اس کا تصور ہی اس سکیم کو رد کرنے کے لئے کافی ہے......ہم وثوق سے سمجھتے ہیں کہ یہ سکیم بالکل ناقابل عمل ہے اور اس سے سوائے پریشانی اور مصیبت کے اور کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا اور یوں ہندوستان کے مسائل کے حل میں اس سے کوئی مدد نہیں ملے گی۔وہ لوگ جو اس سکیم کی وکالت کر رہے ہیں، انہوں نے تصویر کے صرف ایک رخ کو مدنظر رکھا ہے، وہ بعض ایسی چیزوں کو تحفظ دینے کی واحد خواہش سے مغلوب ہو گئے ہیں جو مسلمانوں کو بہت عزیز ہیں مگر وہ اس سکیم کے قابل عمل ہونے کے پہلو کو نظر انداز کر گئے ہیں۔اس سکیم پر ایک اور بڑا سنگین اعتراض یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہندوستان میں مسلم عقیدے اور ثقافت کا فروغ چند جغرافیائی حدود کے اندر محدود ہو کر رہ جائے گا، اس سے بڑھ کر مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچایا جا سکتا۔یہ ہندوستان کی ہندو آبادی کے اُن افراد کے لئے کوئی حل مہیا نہیں کرتا جو ملک کی دو حصوں میں تقسیم اور تبادلۂ آبادی پر عملدرآمد مکمل ہونے کے بعد مشرف بہ اسلام ہوں گے۔ہم ضروری نہیں سمجھتے کہ اس سکیم پر تفصیلی تنقید کی جائے کیونکہ ہم وثوق کے ساتھ سمجھتے ہیں کہ اگر اس کا تنقیدی جائزہ ان لوگوں کی جانب سے لیا جائے جنہوں نے اسے پیش کیا ہے تو اس سکیم کے پورے طور پر ناقابل عمل ہونے کو ظاہر کرنے کے لئے کافی ہوگا۔'' یہ تھے ظفر اللہ خان کی اس دستاویز میں پاکستان کے بارے میں خیالات جس کو ولی خاں قرارداد پاکستان کا موجب قرار دیتا ہے۔چہ خوب؟ ناطقہ سر بہ گریباں ہے اسے کیا کہیے؟

ایک دوسری سکیم جس کا ظفر اللہ خاں نے اپنے نوٹ میں جائزہ لیا، برصغیر کے شمال

مشرقی اور شمال مغربی خطوں میں ڈومینین کی حیثیت میں علیحدہ وفاق وضع کرنے سے متعلق تھی۔ جسے اس نے ''علیحدگی کی سکیم'' قرار دیا۔اس کا پاکستان سکیم سے موازانہ کرتے ہوئے اس نے لکھا کہ ''ان دونوں سکیموں میں بڑا فرق یہ ہے کہ پاکستان سکیم کا اہم جزو ترکیبی تبادلۂ آبادی ہے جبکہ علیحدگی کی سکیم میں اس قسم کا کوئی ناممکن اور نا قابل عمل عنصر شامل نہیں ہے۔ مختصراً علیحدگی کی سکیم یہ ہے کہ ایک شمال مشرقی وفاق ہو جس میں بنگال اور آسام کے موجودہ صوبے شامل ہوں اور ایک شمال مغربی وفاق ہو جو پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان اور سرحدی قبائلی علاقوں پر مشتمل ہے۔ باقی ماندہ ہندوستان اپنی سہولت کے مطابق ایک یا ایک سے زیادہ وفاق بنا سکتا ہے۔'' پھر وہ ان تمام وفاقوں کے مابین کسٹمز، ریلوے، ڈاک وتار، نشریات اور شہری ہوا بازی سے متعلق سمجھوتوں کی تفصیل بیان کرتا ہے۔ وہ برصغیر کے مشترکہ دفاع کے لئے ان وفاقوں کے مابین ایک میثاق طے کرنے کی تجویز دیتا ہے۔ جس کے مطابق برصغیر کے خلاف بری حملوں کا دفاع شمال مغربی شمال مشرقی وفاقوں کی اور بحری حملوں کے خلاف دفاع بقیہ ہندوستان پر مشتمل وفاق یا وفاقوں کی ذمہ داری قرار پانا تھی۔ اس سکیم کی تعریف کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ ''اس سکیم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں تبادلۂ آبادی کے سوال کو یکسر ختم کر دیا گیا ہے اور کسی حد تک ہندوستان کے اتحاد کو برقرار کیا گیا ہے بالخصوص ان معاملوں میں کہ جن میں اتحاد ضروری ہے اور فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے۔'' یاد رہے کہ قرارداد لاہور میں برصغیر کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں ڈومینینوں کے بجائے آزاد خود مختار ریاستوں (Independent and Sovereign States) کے قیام کا مطالبہ کیا گیا ہے اور ''ہندوستان کے اتحاد'' کو کسی حد تک بھی برقرار رکھنے کا ذکر نہیں کیا گیا۔

ظفر اللہ خاں اپنے نوٹ میں بیان کردہ دوسری سکیم کو اگرچہ مسلمانوں کے نزدیک سب سے پسندیدہ تجویز قرار دیتا ہے لیکن ساتھ ہی اس اندیشے کا بھی ذکر کرتا ہے کہ ''ہم اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس مرحلے پر اندازہ لگا سکیں کہ اس قسم کی سکیم کو ہندوستان کے دوسرے فرقوں اور برطانیہ کی طرف سے کس حد تک حمایت حاصل ہو سکے گی۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ بالآخر کل ہند اتحاد کے اصول کے ساتھ پر جوش عقیدت ہی اتنی مضبوط ثابت ہو گی کہ جس سے عقل و دور اندیشی کو صورت حال پر غالب آ جانے کا موقع مل سکے گا۔'' اور پھر وہ اس تیسری سکیم کی تفصیلات میں چلا جاتا ہے جو ڈومینین کی حیثیت سے ایک آل انڈیا فیڈریشن پر مشتمل تھی۔ اس

نے اپنے نوٹ کا قریباً تین چوتھائی حصہ اس سکیم کی نذر کیا ہے۔ اس نے اسے مسلمانوں کے لئے قابل قبول بنانے کے لئے متحدہ ہند کے دائرے میں رہتے ہوئے تحفظات اور ترغیبات دلانے کی مختلف تجاویز دی ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ''......ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ نہیں چاہیے کہ وہ ایسی تجاویز کو سرے سے ہی رد کر دیں اور یہ کہ قابل قدر ہوگا کہ اس سکیم کا جائزہ لیا جائے اور ایسے راستے تلاش کئے جائیں کہ جن پر چل کر فرقوں کے مابین سمجھوتہ طے پا جائے۔'' اور پھر اس نے تفصیل کے ساتھ ان راستوں کی نشاندہی کی ہے۔ متحدہ ڈومینین کی قانون ساز اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے ایک تہائی نشستیں تفویض کرنے سے لے کر مسلمانوں کے لئے دیگر سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی تحفظات کی جزئیات تک کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تاہم وہ اپنے اس اندیشے کا اظہار بھی کرتا ہے کہ ''......اگرچہ ہمیں یہ خدشہ ہے کہ ایسا کرنے سے ہم یہ خطرہ بھی مول لے رہے ہیں کہ کہیں ہمارے اپنے فرقے کے لوگ ہمیں غلط نہ سمجھ بیٹھیں کیونکہ وہ نہ تو کسی ایسی سکیم کے ساتھ وابستگی کے لئے تیار ہیں اور نہ ہی کسی اور ایسی سکیم کے ساتھ کہ جس میں شمال مشرقی اور شمال مغربی فیڈریشنوں کی تشکیل کا منصوبہ نہ شامل کیا گیا ہو۔'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم رائے عامہ پہلے ہی سے شمال مشرقی اور شمال مغربی فیڈریشنوں کے قیام کے بارے میں اپنے دباؤ کا اظہار کر رہی تھی۔ تاہم ظفر اللہ نے اسے خارج از امکان قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو متحدہ ہند کے دائرے میں ہی فرقہ وارانہ تضاد کے حل کی ترغیب دلانے کی کوشش کی اور متحدہ ہند کے دائرے میں رہتے ہوئے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ پر زور دیا۔ اختتامی پیراگراف میں وہ لکھتا ہے کہ ''ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ فرقہ وارانہ مسئلے کا اصل حل فرقوں کے اپنے ہاتھ میں ہے اور آئین کی شقیں تو زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتی ہیں کہ وہ مرض کی شدت میں تخفیف کی دوا بن جائیں یا جزوی افاقہ کر دیں۔ اس لئے ہم تہہ دل سے ہندوستان کے عوام کے مختلف حلقوں سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے بارے میں اپنے رویوں میں تبدیلی لائیں اور ایک دوسرے کے ساتھ ایسا طرز عمل اختیار کریں کہ موجودہ بے اعتباری اور عدم اعتماد کی انتہائی افسوسناک اور قابل مذمت صورت حال میں شدت پیدا ہونے کے بجائے برادرانہ اعتماد اور تعاون کے جذبہ کی نشوونما ہو۔''[26]

12 رمارچ کو وائسرائے کی جانب سے وزیر ہند کو لکھے گئے خط کی اصل عبارت اور ظفر اللہ کی تیار کردہ دستاویز کے مکمل متن کے مطالعہ سے یہ بالکل واضح ہو جاتا ہے:۔

1۔ اس دستاویز کو وائسرائے کی ہدایت پر نہیں بلکہ از خود ظفر اللہ نے تیار کیا تھا اور جناح کو اس کی نقل بھیجی تھی۔

2۔ اس دستاویز کا عنوان Two Dominion States نہیں بلکہ Dominion States تھا۔

3۔ اس دستاویز میں کوئی نئی یا خفیہ تجویز پیش نہیں کی گئی تھی بلکہ جو سکیمیں کھلے عام مسلم رائے عامہ کے حلقوں میں زیر بحث تھیں، ان کا جائزہ اور موازنہ پیش کیا گیا تھا۔

4۔ اس دستاویز میں پاکستان سکیم کو بالکل نا قابل عمل قرار دیا گیا اور اسے مسلمانوں کے لئے پریشانی، مصیبت اور ہولناک نتائج کا شاخسانہ قرار دیتے ہوئے رد کر دیا گیا۔

5۔ اس دستاویز میں اگرچہ شمال مغربی اور شمال مشرقی خطوں میں علیحدہ علیحدہ وفاق تشکیل دینے اور بقیہ ہندوستان کے لئے الگ ایک یا زیادہ وفاق وضع کرنے کی تجویز کو مسلمانوں کے لئے سب سے عمدہ حل سمجھا گیا ہے لیکن اس خدشہ کے پیش نظر کہ اس کو نہ تو دوسرے فرقہ اور نہ ہی برطانوی حکومت منظور کرے گی، اس سکیم کو بھی خارج از امکان قرار دے دیا گیا۔ حالانکہ دفاع اور بعض دیگر امور میں ہندوستان کے اتحاد کو کسی حد تک برقرار رکھنے کی بات بھی اس سکیم میں کی گئی تھی۔

6۔ اس دستاویز میں حتمی طور پر ڈومینین کی حیثیت کی حامل ایک آل انڈیا فیڈریشن میں رہتے ہوئے زیادہ سے زیادہ صوبائی خودمختاری اور مسلمانوں کے لئے مختلف تحفظات پر مبنی حل کو اختیار کرنے کی تائید کی گئی ہے اور ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے پر زور دیا گیا ہے۔

7۔ اس دستاویز اور قرارداد لاہور کا موازنہ کیا جائے تو دونوں ایک دوسرے کی ضد نظر آتی ہیں۔

8۔ قرارداد لاہور میں برصغیر کے شمال مغرب اور شمال مشرق میں ضروری علاقائی رد و بدل کے ساتھ مسلم اکثریت کی آزاد و خودمختار ریاستوں کے قیام کا مطالبہ نہ تو وائسرائے اور ظفر اللہ کی سازباز کا نتیجہ تھا اور نہ ہی اسے کسی مسلم لیگی رہنما کے تخیل کی پرواز نے جنم دیا تھا بلکہ یہ مطالبہ پہلے ہی مسلم عوام الناس کی امنگوں کا حصہ بن چکا تھا۔ مسلم لیگی رہنماؤں نے 23 / مارچ 1940ء کو اسے فقط قرارداد کے الفاظ کا جامہ پہنایا تھا۔ یہ

قرارداوان تاریخی عوامل کا نتیجہ تھی جن کا تذکرہ اس سے پہلے کیا جا چکا ہے۔

9۔ ولی خان جیسے برخود غلط لوگ تاریخی عمل کو محض چند افراد کی سازش کا نتیجہ قرار دیتے ہیں لیکن تاریخ کا سائنسی نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کرنے والوں کے نزدیک عوام الناس تاریخی عمل میں فیصلہ کن کردار ادا کرتے ہیں۔ مقبول عوامی رہنما بھی دراصل عوام کی رہنمائی نہیں بلکہ عوام کی امنگوں کی پیروی کر رہے ہوتے ہیں۔

باب: 10

مطالبۂ پاکستان کی مخالفت۔ سر سکندر اور جماعت اسلامی کی قدر مشترک

سر سکندر حیات خان۔ مطالبۂ پاکستان کا مخالف اور پنجابی شاونزم کا علمبردار

پنجاب کے مسلم عوام الناس میں لفظ ''پاکستان'' مقبول ہو جانے کے باوجود پنجاب کے وزیر اعظم سکندر حیات خان نے صوبائی اسمبلی میں کوئی مسلم لیگ پارٹی تشکیل نہیں کی تھی اور اس نے کبھی اپنی تحریر یا تقریر میں ''پاکستان'' کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے ذہنی طور پر اس منطق (مسلم قوم کا حق خود ارادیت) کو تسلیم نہیں کیا تھا جسے اس کی اپنی منطق (صوبائی خود مختاری) کی جگہ تقسیم ملک کے مطالبے کی بنیاد بنایا گیا تھا۔ اس نے 8 ستمبر 1940ء کو لاہور کے ایک ہندو اخبار ٹریبیون کے نامہ نگار سے انٹرویو میں کہا تھا کہ میں آج بھی فرقہ وارانہ بنیادوں پر ہندوستان کی تقسیم کے خلاف ہوں۔ پنجاب پر کسی خاص فرقے کی حکومت نہیں چل سکتی۔ پنجاب پر صرف پنجابیوں کی حکومت ہو گی۔ مسلم لیگ کی قرارداد کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ہندوستان کو تقسیم کیا جائے۔''[1]

پھر 11 مارچ 1941ء کو صوبائی اسمبلی میں جب ایک سکھ ممبر سردار لال سنگھ نے سر سکندر سے ہندوستان کے آئندہ آئین کے بارے میں اپنے موقف کی وضاحت کرنے کو کہا تو اس نے اس مسئلہ پر طویل تقریر کی۔ اس نے کہا کہ ''یہ کہنا نہایت غلط ہو گا کہ ہماری حکومت مسلم لیگ کی حکومت ہے۔ ہم نے کبھی ایسا دعویٰ نہیں کیا۔ یہ مسلم حکومت بھی نہیں ہے کیونکہ اس کے نصف ارکان غیر مسلم ہیں۔ ہماری حکومت خالصتاً پنجابی حکومت ہے۔ اس پنجابی حکومت میں

یونینسٹ شامل ہیں جن کی اس ایوان میں قطعی اکثریت ہے۔اس اکثریت میں خالصہ نیشنل پارٹی کا ایک رکن اور آزاد ہندو رکن بھی شامل ہے...... مجھ سے پوچھا گیا ہے کہ پاکستان کے بارے میں میرا کیا خیال ہے؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں یہ پوچھتا ہوں کہ آپ کون سی پاکستان سکیم کے بارے میں میری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں۔کیا آپ کو معلوم ہے کہ اس سلسلے میں کتنی سکیمیں ہیں؟...... میں نے پاکستان کی کوئی سکیم مرتب نہیں کی تھی۔ پاکستان کی بہت سی سکیمیں ہیں۔ایک سکیم جمال الدین افغانی کی تھی۔کیا آپ نے اس کا مطالعہ کیا ہے اور کیا آپ اس کے بارے میں میری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں...... لاہور میں پاکستان کی کوئی سکیم منظور نہیں کی گئی تھی۔تاہم میں قرارداد لاہور کا بعد میں ذکر کروں گا...... جمال الدین افغانی کے علاوہ پاکستان کی ایک سکیم علامہ اقبال مرحوم کے نام سے بھی منسوب کی جاتی ہے لیکن اس تھیوری کو باطل ثابت کرنا مشکل نہیں ہے اور قطعی طور پر یہ ثابت کرنا بھی مشکل نہیں ہے کہ علامہ کا اسلامی یکجہتی وعالمگیر اخوت کے بارے میں جو تصور تھا وہ ہندوستانی حب الوطنی سے متصادم نہیں تھا۔

''ان کا تصور اس نظریے سے بالکل مختلف تھا جو بعض جوشیلوں کی جانب سے ان کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔میرا خیال ہے کہ میرے معزز دوست ایسی سکیم کے بارے میں میری رائے دریافت کرنا نہیں چاہتے جس کا کوئی وجود ہی نہیں اور جو شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال سے منسوب کی جاتی ہے۔ایک اور سکیم چودھری رحمت علی کی بھی ہے۔اس کی سکیم یہ تھی کہ پ پنجاب سے، الف افغانستان بشمول پٹھانستان یعنی شمال مغربی صوبہ سرحد سے، ک کشمیر سے، س سندھ سے اور تان بلوچستان سے۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ ایران بھی اس سکیم میں شامل ہے یا نہیں۔ یہ ہے چودھری رحمت علی کی سکیم جو اس نے چند سال قبل پیش کی تھی جسے اس ملک میں وسیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا تھا اور جس کی اخبارات میں بھی تشہیر ہوئی تھی۔بعض برطانوی اخبارات نے بھی اسے بڑی پبلسٹی دی تھی۔لیکن ایک اور سکیم بھی ہے جو ایک انگریز نے برطانوی جریدے ''راؤنڈ ٹیبل'' میں شائع کی تھی۔اگر میرے معزز دوست ان میں سے کسی سکیم کے بارے میں بھی میری رائے معلوم کرنا نہیں چاہتے تو وہ پاکستان کی ایک ایسی سکیم کے بارے میں مجھ سے پوچھتے ہیں جس کا وجود ان کے تخیل سے باہر نہیں ہے۔آج کل قرارداد لاہور کو عام طور پر پاکستان سکیم کہا جاتا ہے۔ جب یہ قرارداد منظور کی گئی تھی تو اسے قرارداد لاہور کہا گیا تھا اور اس میں لفظ پاکستان استعمال نہیں

کیا گیا تھا۔ لیگ کے اجلاس میں پاکستان کے لفظ کا استعمال نہیں ہوا تھا اور کسی نے بھی لیگ کی قرارداد کے لئے یہ اصطلاح استعمال نہیں کی تھی تا آنکہ ہندو اخبارات نے اس پر پاکستان کا ٹھپہ لگا دیا۔ یہ کہا گیا ہے کہ قرارداد لاہور میں نے لکھی تھی۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ قرارداد کا ابتدائی مسودہ میں نے ہی لکھا تھا۔ لیکن ورکنگ کمیٹی نے اس میں بنیادی طور پر تبدیلی کر دی تھی۔ میری تحریر کردہ قرارداد اور اس قرارداد میں بہت فرق ہے جو بالآخر منظور کی گئی تھی۔ دونوں قراردادوں میں بڑا فرق یہ ہے کہ میری قرارداد کے آخری حصہ کو، جس کا تعلق مرکز اور مختلف یونٹوں کے درمیان تال میل سے تھا، حذف کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا غلط ہوگا کہ جو قرارداد بالآخر منظور ہوئی تھی وہ میری تھی۔ اسے مسلم لیگ کی آفیشل قرارداد تصور کرنا چاہیے جس کی مسلم لیگ نے توثیق کی تھی۔ میرے دوست اسے پاکستان کہہ سکتے ہیں یا جو چاہیں نام دے سکتے ہیں۔ انہوں نے اس پر پاکستان کا ٹھپہ لگایا اس لئے اب یہ پاکستان کے نام سے ہی مشہور ہوگئی ہے۔ سادہ لوح عوام الناس نے اب اس نعرے کو اپنا لیا ہے جو ہندو اور سکھ اخبارات کے کوتاہ اندیشانہ تعصب نے انہیں دیا ہے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے یہ شوشہ چھوڑ کر سنگین غلطی کی ہے۔ غالباً وہ اس طرح ہندو اور سکھ عوام میں اس قرارداد کے خلاف جذبات پیدا کرنا چاہتے تھے اور شاید وہ اپنے اس مقصد میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ لیکن انہوں نے اس حقیقت کو نظرانداز کر دیا کہ اس طرح مسلم عوام میں لفظ پاکستان کے لئے بڑی دلچسپی پیدا ہو جائے گی۔ یہ دلکش اصطلاح ہے۔ اب یہ مشہور ہوگئی ہے اور اس طرح الجھن میں اضافہ ہو گیا ہے۔ سادہ لوح عوام مختلف سکیموں میں امتیاز نہیں کر سکتے اور مجھے یقین ہے کہ ایک عام مسلمان کو یہ احساس نہیں ہے کہ پاکستان میں کیا پیچیدگیاں مضمر ہیں اور اسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون سی سکیم کی حمایت کر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیاسی طالع آزماؤں کو سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانے کے وسیع مواقع مل گئے ہیں۔ ہر ایک اپنے رجحانات اور مصلحتوں کے مطابق عوام کا سیاسی استحصال کرتا ہے۔ کچھ لوگ علامہ اقبال کے پاکستان کی اور بعض دوسرے جمال الدین افغانی کے پاکستان کی تبلیغ کرتے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ لاہور کے ایک ممتاز مسلم اخبار نے اپنے ''پاکستان نمبر'' میں مولانا جمال الدین کی سکیم سے ابتدا کی ہے اور پھر اس نے لیگ کی قرارداد لاہور کے بارے میں بے تکا لیکچر لکھ دیا ہے۔ اس کی حیثیت ادھر ادھر سے جمع کردہ مبہم سے ملغوبہ کی سی ہے۔ تاہم

تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت ان سکیموں کو نہیں مانتی۔ لیگ کے صدر کو ہی لے لیجئے وہ علاقائی حدود سے باہر کسی سکیم کا قائل نہیں ہے۔ وہ قرارداد لاہور کا علمبردار ہے جس کو ہمارے ہندو دوستوں نے پاکستان کا نام دے دیا ہے۔ مسٹر جناح کو بھی، ہر شخص کی طرح، اس دلکش فقرے کو اپنانے میں فائدہ نظر آتا ہے کیونکہ یہ عوام الناس کی طرح دلکش ہے۔ اگر ہندو اور سکھ اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں تو مسلم لیگ اس سے کیوں فائدہ نہ اٹھائے۔ اسے مسلمان پسند کرتے ہیں اس لئے یہ مسلم عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ایک آسان نعرہ ہے۔

''ہندوؤں اور سکھوں نے پاکستان کے بارے میں واویلا کی ابتدا کی تھی اب مسلمانوں نے یہ نعرہ اپنا لیا ہے۔ چنانچہ دونوں ہی فریق پاکستان کے بھوت کو مقبول عام کرنے کے ذمہ دار ہیں جس کا اس وقت تک کوئی وجود نہیں تھا جب تک کہ لیگ کے مخالفین نے اسے جنم نہیں دیا تھا اور اب دونوں ہی عوام الناس کا استحصال کرنے کے لئے اسے استعمال کر رہے ہیں۔
ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ جن تجاویز پر ان کی اچھائی برائی کو پیش نظر رکھ کر غور کرنا چاہیے ان کی محض لفظ پاکستان کی بنیاد پر مخالفت یا حمایت کی جا رہی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں قرارداد لاہور کو کوئی نام دینا بڑی سنگین غلطی ہے جو ہندوؤں اور سکھوں کے نقطۂ نگاہ سے اشتعال انگیز ہے اور مسلمانوں کے نقطۂ نگاہ سے بھی ناپسندیدہ ہے کیونکہ اس کی وجہ سے مسلمانوں میں پہلے ہی دماغی الجھن پیدا ہو گئی ہے۔ بھائی پرمانند کی بھی ایک سکیم تھی۔ تاہم ہمیں نام کے پیچھے نہیں جانا چاہیے۔ اصل بات نفس مضمون کی ہے...... جیسا کہ میں پہلے کئی بار اعلان کر چکا ہوں میرا پختہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کی تقدیر یہ ہے کہ برطانوی کامن ویلتھ کے اندر رہ کر آزادی لی جائے۔ میں یہ بات پہلے کئی بار کہہ چکا ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل کے زمانے میں جبکہ طاقتور قومیں اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے نئے اتحاد قائم کر رہی ہیں اگر ہندوستان نے کامن ویلتھ سے رابطہ منقطع کیا تو یہ اس کی حمایت ہوگی کیونکہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے کامن ویلتھ ہی جارحیت کے خلاف بڑا اور شاید واحد ذریعۂ تحفظ ہے...... جنگ کے بعد ہم برطانوی حکومت اور برطانوی عوام سے کہیں گے کہ ہمیں کامن ویلتھ کا پورا ممبر بنایا جائے اور ان پر یہ شرط بھی عائد کریں گے کہ یہ ان کا فرض ہے کہ وہ غیر ملکی جارحیت کے خلاف ہمارا اس وقت تک دفاع کریں گے جب تک ہم اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو جاتے۔ یہ ہے میرا موقف کہ جنگ کے بعد ہندوستان کی حیثیت کیا ہونی

چاہیے۔ جہاں تک نئے آئین کے اصولوں کا تعلق ہے ان کے بارے میں میرا نقطۂ نگاہ کسی سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ اگرچہ جب میری سکیم شائع ہوئی تھی اس وقت سے اب تک بہت سے واقعات رونما ہوئے ہیں تاہم میں اپنے اس خیال پر قائم ہوں کہ آئینی مسئلہ کے حل کے لئے میری تجاویز منصفانہ بنیاد اور شاید واحد بنیاد مہیا کرتی ہیں...... یہ خوش قسمتی کی بات ہے کہ ہندوستان کی آبادی مختلف یونٹوں میں کچھ اس طرح منقسم ہے کہ گیارہ صوبوں میں سے چار صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اگرچہ ان میں سے دو صوبوں میں مسلم اکثریت بہت معمولی ہے۔ سات صوبوں میں ہندوؤں کی اکثریت ہے...... مسلمانوں کی خواہش یہ ہے کہ جہاں ان کی اکثریت ہے وہاں ان کی جانب سے اکثریتی حقوق کے استعمال کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے جبکہ وہ اقلیتوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لئے آئینی ضمانتیں دینے پر آمادہ ہیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ یہ بات بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ہندو اکثریت والے صوبوں میں ہندوؤں کو بھی اسی قسم کی مراعات و حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔ یقیناً ان کی یہ خواہش کوئی غیر منصفانہ نہیں ہے...... مزید برآں مسلمانوں کو یہ خطرہ لاحق ہے کہ اگر صوبوں کو آزادی و خود مختاری نہ دی گئی تو مرکز سے، جہاں ہندوؤں کا غلبہ ہوگا، ناجائز مداخلت ہوتی رہے گی۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ مرکز میں ہندو اکثریت کی وجہ سے ہندو اکثریت والے صوبے تو آرام و سکون سے رہیں گے جبکہ اس امر کا امکان رہے گا کہ ہندو اکثریت والی مرکزی حکومت اپنا اثر اور اختیار استعمال کر کے ہندو اکثریت والے صوبوں کو سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی میدانوں میں تقویت دے گی اور مسلم اکثریت والے صوبوں کو پسماندہ اور کمزور رکھا جائے گا۔ مرکزی حکومت مسلم اکثریت والے صوبوں میں ناجائز مداخلت کر کے اور ان پر غیر منصفانہ پابندیاں عائد کر کے ان کے اختیارات و حیثیت کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گی۔ ہوسکتا ہے کہ ان کے یہ شکوک و شبہات بے بنیاد ہوں۔ باہمی عدم اعتماد افسوناک اور المناک ہے لیکن بدقسمتی سے ہم اس کی موجودگی سے انکار نہیں کر سکتے۔ اس کا اظہار صرف اسی صورت ہوسکتا ہے جیسا کہ میں نے تجویز کیا ہے۔ آج کل کوئی بھی بڑی پارٹی کسی سکیم یا تجویز کی اچھائی و برائی کو پیش نظر رکھ کر غور کرنے کے قابل نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم سیاسی دلدل میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس تعطل کو دور کرنے کی کوشش کریں اور یہ صرف اسی صورت ممکن ہوسکتا ہے کہ ہم حقیقت پسند انسانوں کی طرح حقائق سے روگردانی نہ کریں......

میں اپنی سکیم کے تحت یونٹوں کو مکمل خودمختاری و آزادی دوں گا اور انہیں یہ اجازت دوں گا کہ وہ اپنے منطقوں یا زونوں کی علاقائی حد بندی کر لیں۔ ہر زون میں یونٹوں کے نمائندے کو مرکز میں اپنے یونٹ کے علاوہ اپنے منطقے کی بھی نمائندگی کرنی چاہیے۔ اس طرح جس مرکز کی تشکیل ہوگی وہ صوبائی حکومتوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا بلکہ وہ ایک ایسی ہمدرد ایجنسی ہوگی جس کو صوبوں کی تائید وحمایت حاصل ہوگی۔ وہ یونٹوں کا قائم کردہ ایک ایسا ادارہ ہوگا جو مرکزی انتظامی مشینری کو کنٹرول کرے گا اور اس امر کی نگرانی کرے گا کہ صوبوں نے جو کام اس کے سپرد کیا ہے وہ عمدگی، رواداری اور انصاف کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ آپ اسے مرکزی حکومت یا تال میل کی کمیٹی یا کوئی اور ایسا نام دے سکتے ہیں جو آپ کے لئے پسندیدہ ہو...... اگر ایک مرتبہ غلبہ اور مداخلت کا خیال ترک کر دیا جائے تو مسئلہ بہت آسان ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں مسلمان ہندوستان سے علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب نہیں ہوں گے۔ اگر وہ اس کے باوجود بھی اصرار کریں تو میرے خیال میں انہیں پاگل خانے میں بھیجنا مناسب ہوگا۔ وہ یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ مرکز ایسا طاقتور نہ ہو کہ وہ مسلم اکثریت والے صوبوں کے اختیار اور اقتدار کو نقصان پہنچا سکے۔ میرے بعض معزز احباب کا خیال ہوگا کہ اگر مرکز کو اہم محکمے دے دیئے گئے تو اسے صوبوں کو دھونس دینے کی ترغیب ملے گی۔ میں کہتا ہوں کہ ایسا نہیں ہوگا۔ مرکز میں لچک ہوگی یعنی اس کو دفاع، جہاز رانی، کسٹم، کرنسی اور سکہ سازی اور امور خارجہ کے علاوہ صرف وہی محکمے دیئے جائیں گے جن پر سارے یونٹوں کا اتفاق ہوگا۔ اور یہ ضروری کہ نہیں مرکز کے فیصلے اکثریت کے اصول کے تحت ہوں۔ اس مقصد کے لئے کوئی مناسب فارمولا تیار کیا جاسکتا ہے جس کے تحت دو تہائی یا تین چوتھائی کی شرط عائد ہوسکتی ہے...... ہم ایسی آزادی نہیں مانگتے کہ یہاں مسلم راج ہو اور وہاں ہندو راج ہو۔ اگر پاکستان کا مطلب یہ ہے تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ اگر پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ پنجاب میں خالص مسلم راج ہو تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب اس ایوان میں پھر کہتا ہوں۔ اگر آپ پنجاب کے لئے حقیقی آزادی چاہتے ہیں یعنی ایسا پنجاب جس میں ہر فرقے کو معاشی اور انتظامی شعبوں میں اس کا جائز حصہ ملے تو ایسا پنجاب پاکستان نہیں ہوگا بلکہ وہ صرف پنجاب ہوگا یعنی پانچ دریاؤں کی سر زمین۔ پنجاب، پنجاب ہے اور یہ پنجاب ہی رہے گا خواہ کوئی کچھ بھی کہے۔

''ملک برکت علی:۔قرارداد لاہور میں بھی یہی کہا گیا ہے۔

''سر سکندر:۔تو پھر اس کی غلط تعبیر کیوں کی جاتی ہے اور عوام الناس کو گمراہ کیوں کیا جاتا ہے۔ میرا صوبہ کے باہر کے لوگوں سے کوئی جھگڑا نہیں۔ انہیں یہاں آنے کا پورا حق ہے اور وہ ہمیں مشورے دے سکتے ہیں۔لیکن لائحہ عمل وہی اختیار کریں گے جو ہم اپنے لئے موزوں سمجھیں گے۔ہم غیر پنجابی احباب کے خیالات سننے پر تیار ہیں لیکن ہم ان کے خیالات کو منظور یا مسترد کرنے کا فیصلہ خود کریں گے۔مختصر یہ کہ ہم پنجاب کے لئے ویسا ہی حق خود اختیاری چاہتے ہیں جیسا کہ دوسرے چاہتے ہیں۔حق خود اختیاری جو مسٹر گاندھی چاہتے ہیں، جو مسٹر جناح چاہتے ہیں، جو کانگرس چاہتی ہے، جو مسلم لیگ چاہتی ہے اور جو دوسرے چاہتے ہیں۔ میں خود اختیاری سے زیادہ کچھ نہیں مانگتا۔فرض کیجئے کہ سات صوبوں کی ہندو اکثریت یہ کہے کہ ہم پنجاب کے لئے ان کا تجویز کردہ آئین قبول کرلیں گے اور اگر میں ان کے مجوزہ آئین کو موزوں نہیں سمجھتا تو ان سے یہ کہوں گا کہ مشورے کا شکریہ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں اسے منظور نہیں کرسکتا کیونکہ یہ پنجاب کے لئے موزوں نہیں ہے۔ اسی طرح اگر ان صوبوں کے مسلمان ہم پر اپنا نظریہ مسلط کرنے کی کوشش کریں اور ہم یہ محسوس کریں کہ ان کی تجاویز پنجاب کے مفادات کے خلاف ہیں تو ہم انہیں وہی جواب دیں گے جو ہندوؤں کو دیں گے۔

''نواب سر شاہنواز خان (ممدوٹ):۔کیا میں وزیر اعظم کو اس بنا پر مبارکباد دے سکتا ہوں کہ اس نے نہایت قابلیت اور دیانت کے ساتھ آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد لاہور کی وضاحت کی ہے۔

''سر سکندر:۔ مجھے امید ہے کہ میرے معزز دوست نواب صاحب قرارداد میں ترمیم کرائیں گے اور میں نے مرکز کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس کی روشنی میں اس کی مزید توضیح کریں گے۔

''نواب سر شاہنواز خان:۔ میں نے 8رفروری کو مسٹر جناح کو ایک سکیم بھیجی ہے جس میں تقریباً ویسے ہی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جن کا آنریبل وزیر اعظم نے اس ایوان میں اظہار کیا ہے۔''[2]

سر سکندر کی تاریخی تقریر تعبیر وتشریح کی محتاج نہیں۔اس تقریر میں یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ پنجاب کے جاگیرداروں کا یہ سرغنہ قرارداد پاکستان کی منظوری کے تقریباً ایک سال

بعد بھی نہ صرف وہ خود برصغیر کی دوٹوک تقسیم کے خلاف تھا بلکہ اس کا دعویٰ یہ تھا کہ جناح بھی اس کے حق میں نہیں تھے۔ وہ پاکستان کو محض ایک نعرہ سمجھتا تھا جسے اس کے بیان کے مطابق جناح نے محض اس لئے اپنا لیا تھا کہ یہ نعرہ ہندو اخبارات کی سنگین غلطی کے باعث مسلم عوام میں بے مقبول ہو گیا تھا۔ وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ صوبوں کو خود مختار اور حاکمانہ حیثیت رکھنے والی مملکتوں کا درجہ دیا جائے اور چند محکمے یعنی دفاع، امور خارجہ، مواصلات اور کرنسی وغیرہ ایک مرکزی ادارے یا بورڈ کی تحویل میں رہیں جس کی حیثیت خود مختار صوبوں کے ایجنٹ کی ہو۔ وہ برصغیر کی تقسیم اس طرح نہیں چاہتا تھا کہ یہاں مسلم راج ہو اور وہاں ہندو راج ہو۔ وہ اپنے مجوزہ یونٹوں اور منطقوں میں غیر فرقہ وارانہ سیکولر حکومتیں قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے پیش رو سر فضل حسین کی طرح پنجابی شاونزم کا عظیم علمبردار تھا اور وہ پنجاب کو مادر وطن کہتا تھا اور پنجابیت کو مذہب وملت سے بالاتر سمجھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اگر پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ پنجاب میں خالص مسلم راج ہو تو میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ وہ پانچ دریاؤں کی اس سرزمین کے معاملات میں کسی غیر پنجابی، بشمول قائداعظم محمد علی جناح، کی مداخلت برداشت نہیں کرتا تھا اور کہتا تھا کہ پنجاب پنجاب ہے اور یہ پنجاب ہی رہے گا خواہ کوئی کچھ ہی کہے۔ وہ پنجاب کے مفادات کو اولین حیثیت دیتا تھا باقی ساری چیزیں اس کی نظر میں ثانوی حیثیت رکھتی تھیں یا ان کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔

بایں ہمہ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ صدر آل انڈیا مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناح نے اپریل 1941ء میں مسلم لیگ کے مدراس سیشن میں سر سکندر کی اس تقریر کا کوئی نوٹس نہیں لیا تھا حالانکہ پنجاب کے اس سامراجی پٹھو نے مرکزی لیگ کے ایک غیر مبہم فیصلے کی برملا خلاف ورزی کی تھی۔ بظاہر اس کی وجہ یہ تھی کہ جناح ان دنوں کل ہند سیاست میں الجھے ہوئے تھے اور انہوں نے کانگرس کے ساتھ سیاسی محاذ آرائی کے لئے مسلمانان ہند کا جو وسیع ترین متحدہ محاذ بنایا ہوا تھا اس میں کوئی رخنہ نہیں ڈالنا چاہتے تھے۔ پنجابی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کو سر سکندر کی یہ تقریر پسند نہ آئی تاہم اس طبقہ نے بھی کوئی خاص احتجاج نہ کیا۔ یہاں تک کہ اس طبقہ کے سب سے بڑے ترجمان ملک برکت علی نے بھی ایوان میں سر سکندر کی تقریر کو قرارداد لاہور کے عین مطابق قرار دیا تھا۔ لیکن بعد میں اس نے ایک اخباری بیان میں اس تقریر پر نکتہ چینی کی اور کہا کہ یہ ٹھیک ہے کہ پہلا ریزولیوشن سر سکندر نے ہی مرتب کیا تھا جس میں ایجنسی سنٹر کا ذکر موجود تھا

لیکن مسلم لیگ نے اس ایجنسی سنٹر کو مسترد کر دیا تھا اور انجام کار قرارداد لاہور مرتب کی گئی تھی۔اب اس قرارداد میں ترمیم کا کوئی امکان نہیں۔ مسلم لیگ ایجنسی سنٹر کی تجویز پر اچھی طرح غور کر کے اسے مسترد کر چکی ہے اب مردے کو قبر سے نکالنے کا کچھ فائدہ نہیں۔

لاہور کے مسلمان اخبارات نے سر سکندر کی تجویز کی مخالفت میں اور ملک برکت علی کی نکتہ چینی کی تائید میں کوئی تبصرہ نہ کیا۔لیکن سر سکندر کے پنجابی شاونزم کے نعرے کو بھی پنجابی مسلمانوں نے اس وقت قابل توجہ نہ سمجھا اور وہ بدستور پاکستان کا نعرہ ہی لگاتے رہے اور انہوں نے جناح کی حسب ہدایت 23/مارچ 1941ء کو پہلا یوم پاکستان زور شور سے منایا۔تاہم پنجاب میں پہلے سر فضل حسین اور پھر سر سکندر حیات خان نے مقامی جاگیرداروں اور برطانوی سامراج کے مفادات کے تحفظ کے لئے صوبائی شاونزم کا جو بیج بویا تھا اس نے قیام پاکستان کے بعد یہاں کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقہ کے لئے ایک بارآور درخت کی صورت اختیار کر لی۔ساری دنیا میں علاقائی شاونزم یا مبالغہ آمیز قوم پرستی میں مراعات یافتہ،مفاد پرست درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے لئے بڑی دلکشی ہوتی ہے۔

سر سکندر حیات خان کے منظور نظر اور راز دان نور احمد نے اپنے ممدوح کی اس تقریر کا ذکر چار سطروں میں کیا ہے۔البتہ اس نے آگے چل کر یہ بتایا ہے کہ سر سکندر نے قرارداد لاہور کو ذہنی طور پر تسلیم نہیں کیا تھا۔اگر آل انڈیا مرکز کو بالکل حذف کرنا مقصود ہوتب بھی ان کی کوشش یہ تھی کہ ہندو اور مسلمان کے امتیاز کو درمیان میں لائے بغیر تقسیم کا مقصد پنجاب اور اس کی ''مارشل قوموں'' کو ''بنیوں اور پنڈتوں'' کے زیر اثر آنے والی مرکزی حکومت سے آزاد رکھنا قرار دیا جائے۔شاید انہیں توقع تھی کہ ہندوؤں اور سکھوں کا کم از کم ایک طبقہ اس مقصد کی ہمنوائی کرنے کو تیار ہوگا۔انہوں نے اس مقصد کے لئے مسلم لیگ سے بالا بالا ایک عجیب کوشش کی۔حکومت کے کہنے پر وہ دو مرتبہ جنگ کے محاذوں پر ہندوستانی (بیشتر پنجابی) سپاہیوں کی ہمت بڑھانے کے لئے گئے۔دوسرے دورے میں جو 42-1941ء کے موسم سرما میں ہوا انہیں قاہرہ میں چرچل کے ساتھ ملاقات اور گفتگو کا موقع ملا۔انہوں نے واپسی پر اپنی کابینہ کے بعض ساتھیوں کو (ان میں چودھری چھوٹو رام بھی شامل تھے) اور بعض دوسرے دوستوں کو بتایا کہ چرچل کے ساتھ ان کی گفتگو کا ایک موضوع ہندوستان کا آئینی مسئلہ بھی تھا۔سر سکندر کے قول کے مطابق انہوں نے

چرچل پر دو باتیں واضح کرنے کی کوشش کی:

1۔ برطانوی دولت مشترکہ کی جنگوں کو جیتنے کے لئے ہندوستان کا جو صوبہ حقیقی امداد دیتا ہے وہ پنجاب ہے اور جو طبقہ دلی وفاداری کے ساتھ تعاون کرتا ہے وہ پنجاب کی ''مارشل قومیں'' ہیں۔ لہذا اگر ہندوستان کی آزادی کے نام پر ایسا آئین بنا دیا گیا جس کے تحت کانگرس کے پنڈت اور مہاشے مرکزی حکومت کے ذریعے پنجاب اور اس کی مارشل قوموں پر راج کرنے لگیں تو یہ بے انصافی اور احسان فراموشی کی انتہا ہوگی۔

2۔ وفادار پنجاب اس بات کا مستحق ہے کہ اسے ایک الگ ڈومینین (Dominion) بنا دیا جائے یا ایسی ڈومینین میں شامل کر دیا جائے جس میں سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد بھی شامل ہوں۔ سر سکندر کی اس گفتگو سے چرچل نے کیا اثر قبول کیا یہ کہنا مشکل ہے لیکن یہ بات دلچسپ ہے کہ چند مہینوں کے بعد (مارچ 1942ء میں) چرچل نے مختلف سمتوں سے دباؤ کے تحت ہندوستان کے لئے بعد از جنگ آزادی کی ایک سکیم اپنی جنگی کابینہ کے ایک رکن سر سٹیفورڈ کرپس کے ہاتھ یہاں بھیجی۔ اس سکیم کی بنیاد یہی تھی کہ صوبوں کو اس بات کا موقع دیا جائے گا کہ اگر چاہیں تو ہندوستان کی یونین سے الگ ہو جائیں۔ حکومت انہیں الگ ڈومینینوں کا درجہ دینے کو تیار ہوگی۔''[3]

اگر اس زمانے کے ہندوستانی اور بین الاقوامی حالات کو پیش نظر رکھ کر نور احمد کی اس اطلاع کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات تقریباً وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ سر سکندر نے اپنی کابینہ کے بعض ارکان اور دوسرے دوستوں کو جو کچھ بتایا تھا اس میں اس نے غلط بیانی کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں برطانوی سامراج کی پالیسی یہ تھی کہ ہندوستان میں مذہبی، لسانی، نسلی اور علاقائی اختلافات کو ہوا دی جائے تاکہ کانگرس کی بورژوا قیادت، جس کا رجحان کھلم کھلا جرمنی اور جاپان کی طرف تھا، اس کی جنگی کارروائیوں میں کوئی مؤثر روڑا نہ اٹکا سکے۔ پنجاب کو ''بازوئے شمشیر زن'' کا لقب انگریزوں نے ہی دے رکھا تھا اور انہوں نے ہی پنجابی عوام میں یہ فسطائی نظریہ پھیلانے کی کامیاب کوشش کی تھی کہ وہ ''مارشل قوم'' ہیں اور باقی ہندوستان کے سب لوگ ''غیر مارشل، بنئے، پنڈت اور مہاشے'' ہیں۔ سر سکندر نے جنگ عظیم شروع ہونے سے ایک ڈیڑھ ماہ قبل یعنی جولائی 1939ء میں اپنی زونل سکیم انگریزوں کے ہی کہنے پر پیش کی تھی۔ اس کا

ثبوت یہ ہے کہ اگر یہ سکیم حکومت ہند کے لئے ناپسندیدہ ہوتی تو پنجاب میں سر سکندر کی حکومت ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ جن چند سامراج نواز ہندو اور سکھ عناصر کی حمایت سے اس نے یہ حکومت بنائی ہوئی تھی۔ وہ انگریز گورنر کے ایک اشارے پر اس کی حمایت سے دستبردار ہو جاتے اور سر سکندر اسمبلی کے صرف مسلم ارکان کی حمایت سے کوئی وزارت نہیں بنا سکتا تھا۔ 1935ء کے آئین کے تحت پنجاب اسمبلی میں مختلف فرقوں کی سیاسی قوت کا توازن اس طرح کا تھا کہ صوبائی گورنر کی منظوری اور سر پرستی کے بغیر کوئی وزارت نہیں بن سکتی تھی۔ اس نے 11 رمارچ 1941ء کو صوبائی اسمبلی میں جو تقریر کی تھی اس میں بھی صوبائی گورنر کی مرضی کا دخل تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حکومت ہند نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا تھا اور کسی برطانوی اخبار نے اس پر غیر موافق تبصرہ نہیں کیا تھا۔

لاہور کے روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ نے 13 رمارچ کو نیا پاکستان، کے زیرعنوان ایک اداریہ میں سر سکندر کی اس تجویز پر تنقید بھی کی اور تعریف بھی کی۔ لیکن ساتھ یہ بھی کہا کہ سر سکندر حیات خان کو چاہیے کہ اپنے لئے ایک مستقل مقام معین کر لیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد لاہور کی تائید کریں یا آئندہ آئین کے بارے میں کوئی اور محکم سکیم مرتب کر کے اس کی پابندی کریں۔ یہ بار بار پہلو بدلنا اور روز روز نئی نئی سکیمیں پیش کرنا مناسب نہیں۔ لاہور کے مسلمان اخباروں زمیندار، انقلاب، شہباز اور احسان وغیرہ نے اس تجویز پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا۔ سر چھوٹو رام کا تبصرہ یہ تھا کہ میں گزشتہ 20 سال سے سر سکندر حیات کے خیالات وعقائد سے اچھی طرح واقف ہوں۔ وہ پکے نیشنلسٹ ہیں۔ گاہے گاہے مسلم لیگی بن ضرور جاتے ہیں لیکن اس سے ان کا نیشنلزم کمزور ہونے کی بجائے اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

جنوری 1942ء میں قاہرہ میں برطانوی وزیراعظم چرچل نے ہی سر سکندر کو بتایا ہوگا کہ اس کی حکومت ہندوستان کے لئے متذکرہ آئینی تجاویز پر غور کر رہی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہو سکتا تھا کہ پنجاب کی ''مارشل قوم'' کو جنگ کی بھٹی میں دھکیلے جاؤ اور ساتھ ہی علاقائی شاونزم کو بھی ہوا دو تا کہ کل ہند سطح پر کانگرس اور مسلم لیگ دونوں ہی قابو میں رہیں۔ سر سکندر برطانوی سامراج کا پشتینی پٹھو تھا اور اپنے صوبائی جاگیرداروں کا سرغنہ تھا جو ہر کام اپنے ضلع کے انگریز ڈپٹی کمشنر سے پوچھ کر کرتے تھے لہٰذا اس کی جانب سے انگریزوں کی مرضی کے خلاف کچھ کہنے یا کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ہز ماسٹرز وائس تھا۔

مسلمان مذہبی جماعتوں کی طرف سے مطالبہ پاکستان کی مخالفت

مسلمانان ہند کے درمیانہ طبقہ کے مطالبہ پاکستان کی مخالفت پنجابی جاگیرداروں کے اس سرغنہ تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ مسلمانوں کے ہر فرقہ کے مذہبی پیشوا بھی اس کے ہمنوا تھے۔ ان کانگرس نواز مذہبی پیشواؤں نے اپریل 1940ء میں جمیعت العلمائے ہند، مجلس احرار، شیعہ پولیٹکل کانفرنس اور چار دوسری علاقائی پارٹیوں کے مشترکہ اہتمام کے تحت دہلی میں ایک ''آزاد مسلم کانفرنس'' منعقد کی۔ انہوں نے اپنی قرارداد میں پہلے تو جناح کے اس دعوے کو چیلنج کیا کہ مسلم لیگ مسلمانان ہند کی واحد با اختیار نمائندہ جماعت ہے اور پھر قرارداد لاہور کی مخالفت کرتے ہوئے یہ تفرقہ انگیز الزام عائد کیا کہ قرارداد لاہور میں مسلم لیگ نے صرف ''مسلم اکثریت کے علاقوں'' کے مفاد کو پیش نظر رکھا ہے اور ہندو اکثریت والے صوبوں میں بسنے والے مسلمانوں کے مفاد اور مستقبل کو توجہ کا مستحق نہیں سمجھا۔ سندھ کے خان بہادر اللہ بخش کی زیر صدارت اس چار روزہ کانفرنس میں اعلان کیا گیا کہ پاکستان کی سکیم ناقابل عمل ہے اور ملک کے لئے نقصان دہ ہے۔ ہندوستان کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بلالحاظ مذہب و نسل سارے لوگوں کا وطن ہے۔ تاہم کانفرنس کی رائے یہ تھی کہ ہندوستان میں ایک کمزور وفاقی حکومت قائم کی جائے جس کے تحت صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیئے جائیں۔

یکم مئی کو جمیعت العلمائے ہند کے جنرل سیکرٹری مولوی احمد سعید نے فرقہ وارانہ تصفیہ کے بارے میں مسلم لیگ کے رویے کی مذمت کی۔ 17 رمئی کو صوبہ سرحد کی جمیعت العلماء کے صدر حفظ الرحمن نے پاکستان کی سکیم پر نکتہ چینی کی اور پھر 9 رجون کو جام پور میں جمیعت کی تین روزہ کانفرنس میں دہلی کی آزاد مسلم کانفرنس کے فیصلوں کی تائید و حمایت کی گئی اور ان عناصر کی مذمت کی گئی جو اسلامی اتحاد کو پارہ پارہ کر رہے تھے۔ گویا مسلم اکثریت والے صوبہ پنجاب کے جاگیرداروں کا سرغنہ تو یہ کہتا تھا کہ غیر پنجابی جناح کو پنجاب کے معاملے میں مداخلت کا کوئی حق نہیں اور مطالبہ پاکستان پنجاب کے مفاد کے منافی ہے۔ اور مذہبی پیشوا یہ کہتے تھے کہ جناح نے ہندو اکثریت والے صوبوں میں رہنے والے مسلمانوں کو قربانی کا بکرا بنا دیا ہے اور اسلامی اتحاد کو نقصان پہنچایا ہے۔

ابوالاعلیٰ مودودی کا سیاسی پس منظر

پنجاب میں مجلس احرار، خاکسار جماعت، جمعیت العلمائے ہند اور جماعت احمدیہ کے علاوہ جس تنظیم نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اس کا نام جماعت اسلامی تھا جو قرارداد پاکستان کی منظوری کے 17 ماہ بعد اور سرسکندر حیات خان کی 11 ر مارچ 1941ء کی متذکرہ تقریر کے پانچ ماہ بعد پٹھانکوٹ میں وجود میں آئی تھی۔ اس جماعت کا سربراہ ایک شخص ابوالاعلیٰ مودودی تھا جو 25 ر ستمبر 1903ء کو بمقام اورنگ آباد (دکن انڈیا) پیدا ہوا تھا۔ اس کی ابتدائی تعلیم کسی جدید سکول یا روایتی مدرسے میں نہیں ہوئی تھی بلکہ اس کی زندگی کا یہ مرحلہ اس کے گھر میں گزرا تھا۔ لہٰذا یہ جدید علوم سے ناآشنا رہا اور مسلمانوں کے روایتی علوم پر بھی اسے واجبی سی دسترس حاصل ہوئی۔ اس نے کسی دینی مدرسے میں قرآن مجید، حدیث، فقہ اور تاریخ اسلامی کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ تاہم چونکہ یہ اردو زبان اچھی لکھ لیتا تھا اس لئے یہ 17 سال کی عمر میں ہی صحافت کے پیشہ سے منسلک ہو گیا۔ اس وقت یہ ابوالکلام آزاد کے پان اسلام ازم سے بہت متاثر تھا۔ 1919ء میں جب خلافت اور ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز ہوا تو اس نے اس میں حصہ لیا۔ گویا اس کی سیاسی زندگی کی ابتدا مہاتما گاندھی کی زیر قیادت ہوئی تھی اور یہ مہاتما سے اس قدر متاثر ہوا تھا کہ اس نے گاندھی کی سیرت پر ایک کتاب لکھی مگر ابھی وہ زیر طبع تھی کہ اس کے ایک عزیز نے پولیس سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی اور اسے ضبط کرا دیا۔

1920ء میں مودودی جبل پور میں ایک نیشنلسٹ اخبار ''تاج'' کا ایڈیٹر بن گیا۔ کچھ مدت تک یہ اخبار ہفتہ وار نکلتا رہا، پھر روزانہ ہو گیا اور یہ تنہا اس کو چلاتا رہا۔ اس کے ساتھ اس نے وہاں عملاً سیاسی کام بھی کیا۔ جبل پور میں خلافت کی تحریک کا آغاز اور وہاں کے مسلمانوں کو کانگرس کے ساتھ شریک کرنے والوں میں ایک یہ بھی تھا۔ لیکن احراری لیڈر علی بہادر خان کے بیان کے مطابق جب اس تحریک کی بنا پر جبل پور میں پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو یہ گرفتاری سے بچنے کے لئے اس اخبار کو لاوارث چھوڑ کر یکایک دہلی چلا گیا۔ چنانچہ وہاں کے قوم پرست مسلمانوں اور کانگرسی ہندوؤں نے روزنامہ ''تاج'' کی ادارت علی بہادر خان کے سپرد کر دی۔ دہلی میں یہ پہلے ایک جریدے مسلم سے منسلک ہوا اور پھر 1924ء میں جمعیت العلمائے ہند کے اخبار الجمیعہ سے

وابستہ ہو گیا۔ وہ 1929ء تک اس اخبار سے وابستہ رہا۔ اس کے بعد جب اس اخبار کی مالی حالت خراب ہوئی تو وہ حیدر آباد دکن چلا گیا جہاں اس کا بڑا بھائی ابوالخیر مودودی سر رشتہ تالیف و ترجمہ سے وابستہ تھا۔ اس نے 1932ء میں حیدر آباد سے اپنا ایک ماہنامہ ترجمان القرآن شائع کرنا شروع کیا جس میں اس نے اس نظریے کی تبلیغ شروع کی کہ مسلم قومیت جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے اور جس قومیت کی بنیاد وطنیت پر ہے وہ غیر اسلامی ہے۔ چونکہ اس کا یہ نظریہ ابوالکلام آزاد کے نظریہ قوم پرستی کے منافی تھا اور چونکہ ان دنوں علامہ اقبال متحدہ قومیت کے نظریے کے سخت خلاف تھے اس لئے پنجابی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کے ایک حلقے میں ترجمان القرآن کو پسند کیا گیا چنانچہ علامہ اقبال کا ایک نیازمند غلام احمد پرویز بھی اس رسالے میں مضامین لکھا کرتا تھا۔

1938ء میں پٹھانکوٹ کے ایک مسلمان جاگیردار چودھری نیاز علی خان نے، جو غلام احمد پرویز کے بیان کے مطابق علامہ اقبال کا والہانہ عقیدتمند تھا، ایک ادارہ بنام دارالسلام قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ علامہ کی تجویز کے مطابق دنیائے اسلام کے ممتاز اہل علم و تحقیق مختلف موضاعات پر ریسرچ کریں، مذاکروں اور خطبات کا اہتمام کریں اور مسلمان طلبا تعطیلات گزارنے وہاں آئیں اور علمی فضا سے بہرہ یاب ہوں۔ عبدالمجید سالک نے اپنی کتاب ''ذکر اقبال'' میں علامہ کی اس تجویز کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ چودھری نیاز علی خان اس ادارے کے ذریعے اپنی عاقبت سنوارنا چاہتا تھا اس لئے اس نے اپنی جاگیر اس کے لئے وقف کر دی۔ جب اس ادارے کے قیام کی تجویز زیر غور تھی تو خیال تھا کہ علامہ اقبال خود اس ادارے کے سربراہ ہوں گے۔ لیکن 1938ء میں جب علامہ اقبال مرض الموت میں مبتلا ہو گئے تو چودھری نیاز علی نے غلام احمد پرویز کے مشورے کے مطابق اس کام کے لئے ابوالاعلیٰ مودودی کو حیدر آباد سے بلا لیا۔ اس طرح ایک پیشہ ور اخبار نویس مسلمہ عالم دین بن گیا۔ اس نے پٹھانکوٹ آنے سے پہلے اپنے ماہنامے میں ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا۔ جس میں اس نے کانگرس نواز قوم پرست علماء کو ہدف تنقید بنا کر یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ''ہندوستانی قومیت کا جو نقشہ ان کے پیش نظر ہے اس میں مذہبی جماعتوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں۔ وہ تمام امتیازی حقوق کو توڑ کر وطنیت کی بنیاد پر ایک ایسی قوم بنانا چاہتے ہیں جس کی اجتماعی زندگی ایک ہی طرز پر تعمیر ہو...... اس مرحلہ پر مسلمانوں کو کانگرس کی طرف دعوت دینا دراصل ان کو خودکشی کا مشورہ دینا ہے۔

''مسلمانوں کی حیات قومی کو برقرار رکھنے کے لئے وہ چیز بالکل ناگزیر ہے جس کو آج کل سیاسی اصطلاح میں سلطنت کے اندر سلطنت، کہتے ہیں۔ ان کی سوسائٹی جن بنیادوں پر قائم ہے وہ استوار ہی نہیں رہ سکتیں جب تک کہ خود ان کی اپنی جماعت میں کوئی قوت ضابطہ اور ہیئت حاکمہ موجود نہ ہو۔ ایسی ایک مرکزی طاقت کے بغیر کسی غیر مسلم نظام حکومت میں رہنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کا اجتماعی نظام رفتہ رفتہ مضمحل ہو کر فنا ہو جائے گا اور وہ بحیثیت ایک مسلم قوم زندہ ہی نہ رہ سکیں گے...... ہندوؤں کا پہلا حملہ اسلامی قومیت پر ہے۔ وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ تم سرے سے کوئی قوم ہی نہیں ہو۔ یہ محض برطانوی سامراج کا ایک داؤ اور چند سامراجی ایجنٹوں کا پروپیگنڈا ہے جس نے تمہارے دماغ میں یہ ہوا بھر دی ہے کہ تم ایک قوم ہو۔ حالانکہ سیاسی اور معاشی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں صرف ہندوستانی قوم ہی پائی جاتی ہے اور اس قوم کے اندر ایک دوسری قوم کا موجود ہونا سراسر ایک لغو تخیل ہے (لیکن انہیں معلوم ہونا چاہیے) مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ ایک قومیت بنانے اور اس میں جذب ہو جانے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے...... یہاں نظام حکومت کا نشوو ارتقا واحد قومیت کے مفروضے پر جمہوری طرز کے ادارہ کی صورت میں ہو رہا ہے...... حالانکہ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ یہاں واحد قومیت موجود نہیں ہے اور واحد قومیت جن بنیادوں پر تعمیر ہو سکتی ہے وہ بھی موجود نہیں ہیں...... ایسا جمہوری نظام جب ایک چھوٹی اور ایک بڑی قوم کو ملا کر بنایا جائے گا تو عملاً وہ چھوٹی قوم کو بڑی قوم کا محکوم بنا دے گا۔ اس میں بڑی قوم کو خود اختیاری ملے گی اور چھوٹی قوم کو بے اختیاری...... واحد قومیت کا مفروضہ اور اس پر جمہوریت کی تعمیر ہی دراصل خرابی کی جڑ ہے...... یہ بات آفتاب نصف النہار کی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ ہمارے اور (آزادیٔ ہند کی وطن پرستانہ) تحریک کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں۔ ہماری موت اس کی زندگی ہے اور اس کی موت ہماری زندگی۔ ہمارے اور اس کے درمیان اصول میں، مقاصد میں اور طریق کار میں نہ صرف یہ کہ کسی قسم کا اتحاد نہیں ہے بلکہ درحقیقت کلی اختلاف ہے۔ ایسا شدید اختلاف کہ کہیں کسی ایک نقطہ پر بھی ہم اور وہ جمع نہیں ہو سکتے...... مسلمانوں کو اپنے نام مسلم پر فخر ہے۔ خدا کا رکھا ہوا نام اور وہ نام جس سے بڑھ کر عزت و افتخار کا نام آج تک دنیا کی کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا۔''[4]

مودودی کی ان تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شخص 38-1937ء میں کانگرس کے

متحدہ قومیت کے نظریے کے سخت خلاف تھا اور مسلمانانِ ہند کے تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ کے اس نظریے کا حامی تھا کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور یہ ایک دوسرے میں کسی صورت ضم نہیں ہو سکتیں۔ اگر ہندوستان میں متحدہ قومیت کے نظریے کی بنیاد پر پارلیمانی جمہوری نظام قائم کیا گیا تو مسلمانوں کی جداگانہ معاشرتی و ثقافتی ہستی ختم ہو جائے گی۔ ہندوؤں کی بڑی قوم مسلمانوں کی چھوٹی قوم کو کھا جائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہ نظریہ اس کے اس متحدہ قومیت کے نظریے کے بالکل برعکس تھا جس کا پرچار وہ 1919ء سے لے کر 1929ء تک نیشنلسٹ اخبارات تاج، مسلم اور الجمیعۃ میں کرتا رہا تھا۔ اس کی اس نظریاتی قلابازی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ جب یہ 1929ء میں الجمیعۃ (دہلی) سے فارغ ہو کر اپنے بڑے بھائی کے پاس حیدرآباد دکن گیا تھا تو وہاں برصغیر کے سیاسی حالات کا مزید مطالعہ کرنے کے بعد اس پر یہ حقیقت آشکارا ہوئی تھی کہ اس کا 1929ء تک کا متحدہ قومیت کا نظریہ غلط تھا، دراصل ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں جو ایک دوسرے میں ضم نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ اس کی اس قلابازی کی وجہ یہ تھی کہ "اعلیٰ حضرت" میر عثمان علی خان" "تاجدارِ دکن" کی ریاست میں کانگرس کے متحدہ قومیت کے نظریے کی بنیاد پر پارلیمانی نظام کے پرچار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ "اعلیٰ حضرت" کی 90 فیصد رعایا ہندو تھی۔ ریاست کے تمام شعبہ ہائے زندگی پر مسلمان تعلقہ داروں اور جاگیرداروں کا غلبہ تھا اور 10 فیصد مسلم آبادی کو غیر معمولی مراعات حاصل تھیں۔ ان حالات میں اگر ابوالاعلیٰ مودودی کی جانب سے حیدرآباد میں متحدہ قومی اور پارلیمانی جمہوری نظام کا پرچار کیا جاتا تو نہ صرف اسے وہاں سے نکلنا پڑتا بلکہ اس کے بڑے بھائی کو بھی ملازمت سے چھٹی مل جاتی کیونکہ ایسے نظام میں نواب میر عثمان علی خان کی مطلق العنان حکومت کی تو کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی تھی۔

"تاجدارِ دکن" کے لئے ایسا دو قومی نظریہ ہی قابلِ قبول تھا جس کے تحت 10 فیصد مسلم آبادی 90 فیصد ہندو آبادی پر سیاسی، معاشرتی، معاشی اور ثقافتی طور پر غالب رہے اور اس طرح اس کی تاجداری قائم رہے۔ ان دنوں ابوالاعلیٰ مودودی جیسے متعدد دوسرے مسلم دانشور اور صحافی حیدرآباد میں "اعلیٰ حضرت تاجدارِ دکن" کی استبدادی حکومت کے لئے نظریاتی بنیاد استوار کرنے میں مصروف تھے۔ وہ حیدرآباد کو اسلامی تہذیب و ثقافت کا گہوارہ کہتے تھے۔ جب یہ 1938ء میں چودھری نیاز علی خان کا تنخواہ دار "عالمِ دین" بن کر پٹھانکوٹ آیا تو یہاں بھی اس نے اپنے

ماہنامے میں متحدہ قومیت کی مخالفت جاری رکھی۔ اس لئے کہ اس کے بغیر پنجاب میں اس کی نئی دکانداری کو فروغ حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اول تو چودھری نیاز علی خان، علامہ اقبال کا والہانہ عقیدتمند ہونے کی وجہ سے متحدہ قومیت کے نظریے کے پرچار کی اجازت نہیں دے سکتا تھا، دوئم پنجابی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو 1921ء کے بعد ہندو ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کی تنگدلی اور تنگ نظری کا جو تلخ تجربہ ہوا تھا اس کی بنا پر وہ کسی ایسے نظریے کے خریدار نہیں بن سکتے تھے جس کا مطلب یہ ہوتا کہ وہ اکثریت میں ہونے کے باوجود بدستور ہندو اقلیت کے زیردست رہیں۔ مزید برآں 39-1938ء میں ہندو اکثریت والے صوبوں میں کانگرسی وزارتوں کی فرقہ پرستانہ تعلیمی و انتظامی پالیسی کی وجہ سے مسلمانان ہند میں غم و غصہ کی جو لہر دوڑ گئی تھی اس نے پنجابی مسلمانوں کو بہت متاثر کیا تھا۔ اتنا متاثر کیا تھا کہ پنجاب کے جاگیرداروں کے سرغنہ وزیر اعظم سر سکندر حیات خان کو بھی اکتوبر 1937ء میں صدر مسلم لیگ محمد علی جناح سے سمجھوتہ کرنا پڑا تھا۔ اگر سر سکندر حیات خان کے اتنے بڑے سیاسی کاروبار کو صوبہ کی مسلم رائے عامہ کے روز افزوں دباؤ کی وجہ سے خطرہ لاحق ہو سکتا تھا تو بے چارے مودودی کی مذہب فروشی کی چھوٹی سی دکان اس رائے عامہ کو نظر انداز کر کے کیسے چل سکتی تھی۔ ویسے بھی ایک تجربہ کار اخبار نویس ہونے کی وجہ سے اسے یہ احساس تھا کہ کسی اخبار یا جریدے کو چلانے کے لئے قارئین کے رائے کے رجحان کو ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس کا ماہنامہ ترجمان القرآن ہندوؤں اور سکھوں کے لئے بالکل بے سود تھا۔ اس کے خریدار صرف مسلمان ہی ہو سکتے تھے اور مسلمانوں کی رائے متحدہ قومیت کے خلاف تھی۔

پنجاب میں جماعت اسلامی کی تاسیس کا پس منظر

جب مارچ 1940ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی اس وقت پٹھانکوٹ میں مودودی کی دکانداری کو خاصا فروغ حاصل ہو چکا تھا اور اس نے چودھری نیاز علی خان کی وقف کردہ جاگیر کے سہارے درمیانہ طبقہ کے نیم تعلیم یافتہ وقدامت پسند عقیدتمندوں یا صالحین کا چھوٹا سا حلقہ بھی بنا لیا تھا۔ اس کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ پنجابی جاگیرداروں کو زمین کی ملکیت کے بارے میں اس کا ''اسلامی نظریہ'' بہت پسند تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پنجاب میں اس نظریے کی تبلیغ جاری رہے اور وہ غریب کسانوں کی خون

پیشے کی کمائی سے رنڈیوں کے مجرے کراتے رہیں۔ مودودی کا زمین کی ملکیت کے بارے میں نظریہ یہ تھا کہ ''اسلام تمام دوسری مملکتوں کی طرح زمین پر انسان کی شخصی ملکیت تسلیم کرتا ہے۔ جتنی قانونی شکلیں ایک چیز پر کسی شخص کی ملکیت قائم وثابت ہونے کے لئے مقرر ہیں ان ساری شکلوں کے مطابق زمین بھی اس طرح ایک آدمی کی ملکیت ہوسکتی ہے جس طرح کوئی دوسری چیز۔ اس کے لئے حد مقرر نہیں ہے۔ ایک گز مربع سے لے کر ہزار ہا ایکڑ تک، خواہ کتنی ہی زمین ہو، اگر کسی قانونی صورت سے آدمی کی ملکیت میں آئی ہے تو بہرحال وہ اس کا جائز مالک ہے۔ اس کے لئے خود کاشت کرنے کی قید بھی نہیں ہے۔ جس طرح مکان اور فرنیچر کرائے پر دیا جا سکتا ہے اور تجارت میں شرکت کی جاسکتی ہے اسی طرح زمین بھی کرائے پر دی جاسکتی ہے اور اس میں بھی شرکت کے اصول پر زراعت ہوسکتی ہے۔ بلا کرایہ کوئی شخص کسی کو دے یا بٹائی لئے بغیر کسی کو اپنی زمین کاشت کر لینے دے تو یہ صدقہ ہے مگر کرایہ ولگان یا بٹائی پر معاملہ طے کرنا ایسا ہی ایک جائز فعل ہے جیسے تجارت میں حصہ داری یا کسی دوسری چیز کو کرایہ پر دینا۔ رہیں ''نظام جاگیرداری'' کی وہ خرابیاں جو ہمارے ہاں پائی جاتی ہیں تو نہ وہ خالص زمینداری کی پیداوار ہیں اور نہ ان کا علاج یہ ہے کہ سرے سے زمین کی شخصی ملکیت ہی اڑا دی جائے یا اس پر مصنوعی حد بندیاں عائد کی جائیں جو زرعی اصلاحات کے نام سے آج کل کے نیم حکیم تجویز کر رہے ہیں بلکہ اسلامی اصول پر ان کا علاج یہ ہے کہ (1) زمین کی خرید وفروخت پر سے تمام پابندیاں اٹھا دی جائیں۔ (2) زراعت پیشہ اور غیر زراعت پیشہ طبقوں کی مستقل تفریق ہر شکل اور ہر حیثیت سے قطعی ختم کر دی جائے۔ (3) مالکان زمین کے امتیازی حقوق ختم کر دیئے جائیں۔ (4) مالک زمین اور کاشتکار کے درمیان حقوق وفرائض از روئے قانون مقرر کر دیئے جائیں۔ (5) مالک، زمین اور مزارع کے درمیان تجارت کے شریکوں جیسا تعلق ہو۔ (6) زرعی جائیدادوں کے معاملے میں اسلام کا قانون میراث ٹھیک نافذ کیا جائے۔ (7) زمین بیکار ڈال رکھنے پر پابندی عائد کر دی جائے۔ (8) زمینداروں اور کاشتکاروں سے زکوٰۃ وصول کی جائے۔ (9) نئے سائنٹیفک طریقے سے اگر بڑے پیمانے کی کاشت کرنی ہو اس کے لئے امداد باہمی کے ایسے ادارے قائم کیے جائیں جن میں چھوٹے چھوٹے مالکان زمین بھی شریک ہوسکیں۔''[5]

''خدا کی بنائی ہوئی فطرت خود اس بات کی متقاضی ہے کہ انسانوں کے درمیان رزق

میں تفاوت ہو لہٰذا وہ تمام تدبیریں اسلامی نقطۂ نظر سے مقصد اور اصول میں غلط ہیں جو انسانوں کے درمیان ایک مصنوعی معاشی مساوات قائم کرنے کے لئے اختیار کی جائیں۔ اسلام جس مساوات کا قائل ہے وہ رزق میں مساوات نہیں بلکہ حصول رزق کی جدوجہد کے مواقع میں مساوات ہے۔ فطرت سے قریب تر نظام وہی ہوسکتا ہے جس میں ہر شخص معیشت کے میدان میں اپنی دوڑ کی ابتدا اسی مقام اور اسی حالت سے کرے جس پر خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔"[6] نیز یہ کہ "جو موٹر لئے ہوئے آیا ہے وہ موٹر ہی پر چلے۔ جو صرف دو پاؤں لایا ہے وہ پیدل ہی چلے اور جو لنگڑا پیدا ہوا ہے وہ لنگڑا کر ہی چلنا شروع کر دے۔"[7]

پنجاب کے جاگیرداروں کے لئے "اسلامی مساوات" کا اس قسم کا نظریہ بہت پسندیدہ تھا اور جو "عالم دین" غریب مسلم عوام میں اس نظریے کی تبلیغ کرے اس کے کیا کہنے! سر سکندر حیات خان کے چائے کے باغات پٹھانکوٹ سے تھوڑے ہی فاصلے پر واقع تھے لہٰذا اسے ضرور معلوم ہوگا کہ زمین کی ملکیت اور اسلامی مساوات کے بارے میں اس "عالم دین" کے نظریات کیا ہیں اور اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ جاگیرداریت کی نظریاتی خدمت گزاری اس "مفکر اسلام" کا خاندانی پیشہ ہے۔ حیدر آباد دکن مسلمان تعلقہ داروں اور جاگیرداروں کا گڑھ تھا اور اس کے خاندان نے انہی کے زیر سایہ پرورش پائی تھی۔

مودودی کی طرف سے جناح، مسلم لیگ اور مطالبہ پاکستان کے خلاف زہر افشانی

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے پنجاب کے جاگیرداروں کے سرغنہ وزیر اعظم سر سکندر حیات خان نے ذہنی طور پر قرارداد پاکستان کو کبھی قبول نہیں کیا تھا۔ وہ صرف صوبائی خودمختاری چاہتا تھا تا کہ اس صوبہ کے جاگیردار ہر قسم کی بیرونی مداخلت سے بے نیاز ہو کر غریب عوام کا استحصال جاری رکھ سکیں۔ وہ پورے پنجاب کو اپنی جاگیر سمجھتا تھا اور اس نے 11 مارچ 1941ء کو یہ اعلان کیا تھا کہ پانچ دریاؤں کی اس سرزمین کے معاملات میں کسی غیر پنجابی کو مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ پنجاب پنجاب ہے اور یہ پنجاب ہی رہے گا۔ چنانچہ ابوالاعلیٰ مودودی نے 1941ء کے اوائل میں یعنی فروری اور مارچ 1941ء میں اپنے ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں ایک اور سلسلۂ مضامین شروع کیا جن میں اس مرتبہ کانگرس کی بجائے مسلم لیگ اور اس کے

مطالبہ پاکستان کو ہدف تنقید بنایا گیا تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ ''اگر ہندوستان کے مسلمانوں نے دین سے بے بہرہ لوگوں کی قیادت میں ایک بے دین قوم کی حیثیت سے اپنا علیحدہ وجود برقرار بھی رکھا (جیسا کہ ترکی اور ایران میں برقرار رکھے ہوئے ہیں) تو ان کے اس طرح زندہ رہنے میں اور کسی غیر مسلم قومیت کے اندر فنا ہو جانے میں آخر فرق ہی کیا ہے؟ ہیرے نے اگر اپنی جوہریت کھو دی تو پھر جوہری کو اس سے کیا دلچسپی کہ وہ کم بخت پتھر کی صورت میں باقی رہے یا منتشر ہو کر خاک میں رل مل جائے...... افسوس کہ لیگ کے قائداعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز تک رکھتا ہو...... ایسے لوگوں کو محض اس لئے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر یا مغربی طرز تنظیم کے استاد فن ہیں اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں، سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے...... ان لوگوں کی عملی زندگی اور ان کے خیالات، نظریات، طرز سیاست اور رنگ قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جا سکتی...... ان میں سے اکثر کے گھروں میں آپ جائیے تو آپ کو نماز کے وقت کوئی بتانے والا نہ ملے گا کہ سمت کعبہ کدھر ہے اور اسباب عیش و عشرت سے بھری ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک جانماز بھی فراہم نہ ہو سکے گی۔ سارے لیڈروں کو بٹھا کر اسلام کے بنیادی اور ابتدائی مسائل کے متعلق امتحان لیجئے تو شاید کوئی صاحب دو فیصد سے زیادہ نمبر نہ لے سکیں گے...... اگر یہ آپ کی قومیت ہے اور یہ آپ کا کلچر ہے اور یہ آپ کے قومی مقاصد ہیں تو آپ اپنی قوم کا جو نام چاہیں تجویز فرما لیں، اسلام کا نام استعمال کرنے کا آپ کو حق نہیں ہے...... اس نام کو بدل دینے کی ضرورت صرف اس لئے نہیں کہ آپ کے یہ نظریات جن پر آپ اپنی قومیت کی بنا رکھے ہوئے ہیں اولاً اسلام کے خلاف ہیں بلکہ اس کی ضرورت اس لئے بھی ہے کہ ان نظریات کے ساتھ آپ جو کچھ کریں گے وہ اسلام کے لئے رسوائی و بدنامی کا موجب ہوگا...... نہ ان کی جماعت، اسلامی مفہوم کے اعتبار سے جماعت ہے نہ ان کی امارت، اسلامی اصطلاح کی رو سے امارت ہے، نہ ان کی اس امارت کو کسی حیثیت سے بھی سمع و سماعت کا حق پہنچتا ہے۔ محض لفظ مسلمان سے دھوکہ کھا کر جو لوگ جاہلیت کی پیروی کرنے والوں کی تنظیم کو تنظیم سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس نوعیت کی کوئی تنظیم اسلامی نقطہ نظر سے مفید ثابت ہوگی، ان کی کند ذہنی ماتم کی مستحق ہے...... مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے لئے اس مسئلہ میں بھی کوئی

دلچسپی نہیں کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے......
مسلمان ہونے کی حیثیت سے میری نگاہ میں اس سوال کی بھی کوئی اہمیت نہیں کہ ہندوستان ایک
ملک رہے یا دس ٹکڑوں میں تقسیم ہو جائے۔ تمام روئے زمین ایک ملک ہے۔ انسان نے اسے
ہزاروں حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔

''مسلمان ہونے کی حیثیت سے میرے نزدیک یہ امر بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا
کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کر دیا جائے...... یہ آزادیٔ وطن کے نعرے اور
پنڈت نہرو کی سروں میں امپیریلزم کی مخالفت یہ سب ہمارے لئے بکری کی بولیاں ہیں...... مسلم
لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں آج تک یہ بات
واضح نہیں کی گئی کہ ان کا آخری مطمع نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے...... جو لوگ
یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور
یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔
دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی بلکہ اس سے
بھی زیادہ قابل لعنت...... بعض لوگ یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غیر اسلامی طرز ہی کا سہی،
مسلمانوں کا قومی اسٹیٹ قائم تو ہو جائے پھر رفتہ رفتہ تعلیم و تربیت اور اخلاقی اصلاح کے ذریعے
سے اس کو اسلامی اسٹیٹ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ مگر میں نے تاریخ، سیاسیات اور اجتماعیات کا
جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے اس کی بنا پر میں اس کو ناممکن سمجھتا ہوں اور اگر یہ منصوبہ کامیاب ہو جائے
تو میں اس کو ایک معجزہ سمجھوں گا...... نہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی جھگڑا ہے نہ انگریزوں سے وطنیت
کی بنیاد پر ہماری لڑائی ہے۔ نہ ان ریاستوں سے ہمارا کوئی رشتہ ہے جہاں نام نہاد مسلمان خدا
بنے بیٹھے ہیں۔ نہ اقلیت کے تحفظ کی ہمیں ضرورت ہے نہ اکثریت کی بنیاد پر قومی حکومت مطلوب
ہے۔ ہمارے سامنے تو صرف ایک مقصد ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کے بندے، اللہ کے سوا کسی کے
محکوم نہیں ہوں گے...... آج جو لوگ اسلام کے تحفظ کی بس یہی ایک صورت دیکھتے ہیں کہ
مسلمانوں کو ہر طرف سے سمیٹ کر چند گوشہ ہائے عافیت میں پہنچا دیا جائے۔ افسوس ہے کہ وہ
اسلام کے ان امکانات (سارے ہندوستان کو دارالسلام بنانے کے) سے ناواقف ہیں۔''[8]

مطالبہ پاکستان کی مخالفت میں مودودی اور سر سکندر کے یکساں نظریات

قطع نظر اس کے کہ مولوی مودودی کی ان تحریروں میں تبحر علمی کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے 1941ء میں صحافتی انداز میں فرقہ خارجیہ کی زبان استعمال کر کے مسلمانان ہند کو مطالبہ پاکستان سے دستبردار ہونے کی بار بار کیوں تلقین کی تھی جبکہ وہ 38-1937ء میں متحدہ قومیت کے نظریے کا بدترین دشمن تھا اور کہتا تھا کہ ہندوستان میں واحد قومیت کے نام کی کوئی چیز نہیں اور اگر یہاں جمہوری نظام بنا دیا گیا تو عملاً وہ چھوٹی قوم (مسلمان) کو بڑی قوم (ہندو) کا محکوم بنا دے گا۔ اس میں بڑی قوم کو خود اختیاری ملے گی اور چھوٹی قوم کو بے اختیاری۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنا مشکل نہیں۔ وہ 1938ء سے قبل حیدر آباد دکن کے جاگیرداروں کا خدمت گزار تھا۔ چونکہ وہاں کے جاگیرداروں کا مفاد اس میں تھا کہ کانگرس کے متحدہ قومیت کے نظریے کی مخالفت کی جائے اس لئے وہ اسلام کی رو سے یہ ثابت کرتا تھا کہ مسلمانوں کو کانگرس کی طرف دعوت دینا دراصل ان کو خودکشی کا مشورہ دینا ہے۔ 1941ء میں پنجاب کے جاگیرداروں کا مفاد اس میں تھا کہ دوقومی نظریے کی بنیاد پر پیش کردہ مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی جائے اس لئے وہ اسلام کی رو سے یہ ثابت کرتا تھا کہ تحریک پاکستان کے قائدین مسلمان نہیں اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسے اس مسئلہ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ہندوستان میں جہاں مسلمان کثیر التعداد ہیں وہاں ان کی حکومت قائم ہو جائے۔ سر سکندر حیات خان بھی یہی کہتا تھا کہ اگر پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ پنجاب میں مسلم راج ہو گا تو میں اسے کبھی قبول نہیں کروں گا۔ 1941ء میں مودودی کے نزدیک یہ امر بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا کہ ہندوستان کو انگریزی امپیریلزم سے آزاد کر دیا جائے۔ وہ آزادیٔ وطن کے نعروں کو بکری کی بولیاں تصور کرتا تھا۔ سر سکندر حیات کا بھی یہی موقف تھا وہ کہتا تھا کہ برطانوی امپیریلزم کی بیساکھی کے بغیر ہندوستان اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ مودودی کی آئینی تجویز یہ تھی کہ ''مسلمانوں کی قومی ریاستوں کا علیحدہ وفاق ہو اور ہندو ریاستوں کا جداگانہ وفاق ہو اور پھر ان میں کنفیڈریشن پیدا کر لی جائے جس کی رو سے دفاع، مواصلات، تجارتی تعلقات کے لئے باہمی تعاون کر لیا جائے۔ بالفاظ دیگر یہ شعبے مشترک ہوں۔''[9] بالکل یہی سکیم سر سکندر حیات خان نے جولائی 1939ء میں ایک پمفلٹ کی

صورت میں پیش کی تھی اور پھر اس نے اسی سکیم کا اعادہ 11 رمارچ 1941ء کو پنجاب اسمبلی میں کیا تھا۔

سر سکندر اور مودودی کی ہم خیالی اور ہمنوائی محض اتفاقی نہیں تھی۔ یہ دراصل جاگیرداروں اور مذہبی پیشواؤں کے درمیان غریب عوام کے خلاف ناپاک گٹھ جوڑ کی علامت تھی اور اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ مسلمانوں کے مذہبی پیشواؤں نے محمد علی جناح کی وسیع المشرب بورژوا قیادت کے خلاف دقیانوسی جاگیرداروں کے ساتھ اتحاد کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مودودی کو قائداعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آتا تھا جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھتا ہو۔ وہ کہتا تھا کہ ایسے لوگوں کو محض اس لئے مسلمانوں کی قیادت کا اہل قرار دینا کہ وہ مغربی سیاست کے ماہر ہیں یا مغربی طرز تنظیم کے استاد فن ہیں اور اپنی قوم کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں، سراسر اسلام سے جہالت اور غیر اسلامی ذہنیت ہے۔ بورژوا اور جاگیردار کے درمیان طبقاتی کشمکش میں مُلّا مودودی جاگیردار کے ساتھ تھا۔ اس کا فتویٰ یہ تھا کہ بورژوا مسلمان ہی نہیں ہے۔ مودودی کو نہ اقلیت کے تحفظ کی ضرورت تھی اور نہ ہی اسے اکثریت کی بنیاد پر قومی حکومت مطلوب تھی۔ اس کے سامنے تو صرف ایک مقصد تھا اور وہ یہ تھا کہ ''اللہ کے بندے اللہ کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں گے۔'' اس کا مطلب یہ تھا کہ پٹھانکوٹ میں اپنی دکان چمکانے کے بعد اس کے اپنے سیاسی عزائم بھی تھے یعنی وہ خود بھی پنجاب کے جاگیرداروں سے گٹھ جوڑ کر کے اور درمیانہ طبقہ کے قدامت پسند عناصر کے تعاون سے مقتدر و مختار بننے کا متمنی تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے کہ چودھویں صدی سے قبل یورپ میں عیسائیوں کے مذہبی پیشوا تھے۔ ان مذہبی پیشواؤں نے ہر جاگیردارانہ سلطنت کے اندر اپنی ایک سلطنت بنائی ہوتی تھی اور کوئی جاگیردار حکمران ان کے ساتھ اتحاد و تعاون کے بغیر برسر اقتدار نہیں رہ سکتا تھا۔ مودودی بھی اپنے لئے کچھ ایسی ہی پوزیشن چاہتا تھا کہ اگر میں ''امیر المومنین'' نہیں بن سکتا تو کم از کم یہ تو ہو کہ حاکم وقت میری بارگاہ میں حاضری دے۔

چنانچہ اس نے اس مقصد کی تکمیل کے لئے اپنی ایک الگ سیاسی جماعت بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس نے پہلے تو اپنے مضامین میں یہ اعلان کیا کہ ''اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں، اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں۔ اگر فی الواقعہ اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنس کا سد نکلیں گی۔ خواہ مغربی تعلیم و

تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علمائے دین اور مفتیان شرح مبین۔ دونوں قسم کے رہنما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔ دونوں راہ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں...... انسانیت کو اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایک صالح نظریہ اور صالح جماعت کا برسر اقتدار آنا ہے...... اس کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے۔ صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔'' اور پھر اگست 1941ء میں جماعت اسلامی کی داغ بیل ڈال دی جس کے متعلق یہ کہا گیا کہ ''اس جماعت میں کوئی شخص اس مفروضے پر شامل نہیں کرلیا جائے گا جب وہ مسلمان گھر میں پیدا ہوا ہے اور اس کا نام مسلمانوں کا سا ہے تو ضرور مسلمان ہوگا...... جو شخص سب کچھ جاننے اور سمجھنے کے بعد کلمہ شہادت کہنے کی جرأت کرے صرف وہی اس جماعت میں داخل ہوسکتا ہے۔''[10] گویا مسلمان کہلوانے کے لئے ملا مودودی کا سرٹیفکیٹ ضروری تھا۔ اس کے بغیر کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہہ سکتا تھا۔ فرقہ خارجیہ کی رکنیت کے لئے بھی کچھ اسی قسم کی شرائط تھیں اور اس انتہا پسند فرقہ نے نہ صرف حضرت علیؓ کو ایک منصوبہ کے تحت قتل کیا تھا بلکہ بعد میں اس کی فتنہ انگیزیوں کے باعث کئی مسلمان حکمرانوں کا زوال ہوا تھا۔

جماعت اسلامی کا نصب العین یہ تھا کہ ''دنیا بھر میں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کی جائے گی یعنی ایک ''دینی سیاسی'' نظام قائم کیا جائے گا جو اسلام کے عین مطابق ہوگا۔ اس نصب العین کے حصول کے لئے نہ صرف پروپیگنڈا کیا جائے گا بلکہ آئینی ذرائع سے (اور جہاں ممکن ہو وہاں قوت سے) سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔'' وہ مسلم لیگ کے تصور پاکستان کے علی الاعلان خلاف تھی کیونکہ ''مسلم لیگ کے کسی ریزولیوشن اور لیگ کے ذمہ دار لیڈروں میں سے کسی کی تقریر میں یہ بات واضح نہیں کی گئی تھی کہ ان کا آخری مطمع نظر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم کرنا ہے۔''

شاید یہ حقیقت محض اتفاقی نہیں تھی کہ جن دنوں مودودی نے اپنے صالحین پر مشتمل جماعت اسلامی کی تشکیل کی تھی انہی دنوں مولوی شبلی نعمانی کے ان خطبات کو کتابی صورت میں شائع کیا گیا تھا جو اس نے انیسویں صدی کے اواخر میں دیئے تھے۔ اس نے 1894ء میں اپنے خطبہ بعنوان ''علماء کے فرائض'' میں ہندوستان کے مولویوں کو پہلی مرتبہ یہ تلقین کی تھی کہ وہ

سیاسیات سے الگ رہ کر محض مذہبی مسائل میں نہ الجھے رہیں بلکہ متحد ومنظم ہو کر سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی کوشش کریں اور ندوۃ العلما کو سیاسی اقتدار حاصل کرنے کی خواہاں علماء کی تنظیم کا مرکز بنائیں۔ مولوی شبلی کا خیال تھا کہ اگر ندوۃ العلما اتفاق واتحاد کے ٹھیک اصول پر قائم ہو جائے تو وہ بڑی عظیم الشان طاقت بن سکتا ہے۔ ''اس وقت ندوہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اوقاف کے لاکھوں روپے جو متولیوں کے ہاتھ سے نہایت بیدردی سے برباد ہو رہے ہیں، ندوہ کے ہاتھ میں دے دیئے جائیں اور گورنمنٹ نہایت خوشی سے اس دعویٰ کو قبول کرلے...... ندوہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ جس طرح زمانہ قدیم میں عدالت صدر میں فقہی مسائل کے لئے قاضی وفقیہہ مقرر کئے جاتے تھے، وہ قاعدہ از سرنو قائم کیا جائے۔ ندوہ کو اس وقت یہ قوت حاصل ہو گی کہ تمام جماعت اسلام کی ہدایتوں کی پابند ہو۔ اس کے فتوؤں کے آگے سر جھکائے اور اس کے فیصلوں سے سرتابی نہ کر سکے۔ اس صورت میں ندوہ قوم کو تمام بیہودہ مراسم سے، خلاف شرع باتوں سے، ناجائز امور سے بزور روک سکتا ہے اور جماعت اسلام کو نماز کا، روزہ کا، حج کا، زکوٰۃ کا بزور پابند کر سکتا ہے۔ یہ زور تلوار کا نہیں ہوگا بلکہ اتباع سنت کا اور اتفاق باہمی کا ہوگا...... ندوہ کو یہ قوت اس وقت حاصل ہو گی جب تمام علماء اس کو اپنا ذاتی کام سمجھیں، بغیر کسی درخواست کے، تقاضے کے، صفت کے، دور دور سے سفر کر کے آئیں اور سال بھر اس کی ادھیڑ بن میں رہیں۔''[11]

غالباً مولوی شبلی کے اس مشورے ہی کا اثر تھا کہ ہندوستان بھر کے مولویوں نے دسمبر 1919ء میں جمیعت العلمائے ہند کی بنیاد رکھی تھی۔ اس جماعت کا نصب العین یہ تھا کہ مسلمانان ہند کی مذہبی نقطۂ نگاہ سے سیاسی وغیر سیاسی امور میں رہنمائی کی جائے گی۔ یہ ہندوستانی مولویوں کی پہلی سیاسی تنظیم تھی اور مودودی نے اسی تنظیم کے اخبار الجمیعۃ میں 1924ء سے لے کر 1929ء تک کام کیا تھا۔ گویا اس کی سیاسی تعلیم وتربیت شبلی کے مشورے کے مطابق جمیعت کے گہوارے میں ہی ہوئی تھی اور 1941ء میں بظاہر اس نے اسی نصب العین کے تحت پٹھانکوٹ کے دارالسلام میں اپنی ''جماعت اسلامی'' کی بنیاد رکھی تھی۔ فرق یہ تھا کہ جمیعت العلمائے ہند کو کانگرس کی بورژوا قیادت کی جانب سے ہر قسم کی امداد واعانت ملتی تھی اور مودودی کی جماعت اسلامی کو پنجاب کے جاگیرداروں، درمیانہ طبقہ کے نیم تعلیم یافتہ وقدامت پسند چھوٹے مالکان اراضی کی سرپرستی وحمایت حاصل تھی۔

سکندر۔جناح تضاد میں اضافہ

اگست 1941ء میں یورپ میں برطانوی سامراج اور اس کے اتحادیوں کی حالت بڑی پتلی تھی۔ہٹلر نے مشرقی یورپ کے کئی علاقوں پر قبضہ کر کے ناروے، ڈنمارک، بیلجیئم، ہالینڈ اور فرانس کو اپنے زیر تسلط کر لیا تھا اور پھر اس نے 22رجون کو سوویت یونین پر چڑھائی کر دی تھی۔ چنانچہ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے جولائی 1941ء میں یکا یک اپنے اس منصوبے کو ترک کر دیا جو اس نے اگست 1940ء میں اپنی کونسل میں توسیع کے لئے کانگرس اور مسلم لیگ کے روبرو پیش کیا تھا۔ چونکہ یہ دونوں ہی جماعتیں مختلف وجوہ کی بنا پر اس منصوبے کو مسترد کر چکی تھیں اس لئے وائسرائے نے ازخود اپنی ایگزیکٹو کونسل میں توسیع اور ایک دفاعی مشاورتی کمیٹی یا ڈیفنس کونسل کے قیام کا اعلان کر دیا تھا۔ ایگزیکٹو کونسل میں صدر مسلم لیگ محمد علی جناح کی منظوری کے بغیر مسلمانوں کے نمائندوں کے طور پر سر سلطان احمد، سر اکبر حیدری اور سر فیروز خان نون کو شامل کیا گیا تھا اور ڈیفنس کونسل میں سر سکندر حیات خان وزیر اعظم پنجاب، مولوی فضل الحق وزیر اعظم بنگال، سر محمد سعد اللہ وزیر اعظم آسام، خان بہادر اللہ بخش وزیر اعظم سندھ، نواب چھتاری، بیگم شاہ نواز، سر محمد عثمان اور ملک خدا بخش لئے گئے تھے اور اس واقعہ نے قائداعظم محمد علی جناح اور سر سکندر حیات خان کے درمیان تضاد کی شدت میں اضافہ کر دیا تھا کیونکہ جناح نے 22رجولائی کو اپنے ایک بیان میں اعلان کیا تھا کہ مسلم لیگ کے جو ممبر وائسرائے کی توسیع شدہ ایگزیکٹو کونسل اور ڈیفنس کونسل میں شامل ہوئے ہیں انہوں نے مسلم لیگ کے ضابطے کی خلاف ورزی کی ہے۔اس پر سر سکندر حیات نے 19راگست کو راجہ غضنفر علی خان کی وساطت سے ایک بیان میں یہ مؤقف اختیار کیا تھا ''اس نے ڈیفنس کونسل کی ممبری یونینسٹ کولیشن وزارت کے سربراہ کی حیثیت سے قبول کی ہے۔ یہ پارٹی پنجاب کی ان ''مارشل اقوام'' کی نمائندگی کرتی ہے جس کا مسلمانوں سمیت ہندوستان کی فوج میں اسی فیصد حصہ ہے۔''

تاہم جب 24راگست کو اس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے بمبئی میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا تو جناح نے دستاویزی ثبوت پیش کر کے سر سکندر کے اس مؤقف کو غلط ثابت کر دیا کہ اسے پنجاب کی مخلوط وزارت کے سربراہ کی حیثیت سے ڈیفنس کونسل میں شامل کیا گیا ہے۔

یہ دستاویزی ثبوت جناح کے نام بمبئی کے گورنر کے ایک خط کی صورت میں تھا جس میں لکھا تھا کہ وائسرائے نے سر سکندر اور دوسرے مسلمان لیڈروں کو عظیم مسلمان قوم کے نمائندوں کے طور پر ڈیفنس کونسل کے ممبر بننے کی دعوت دی ہے سر سکندر اس دستاویزی ثبوت کو دیکھ کر لاجواب ہو گیا اور اس نے فوراً ہی ڈیفنس کونسل سے استعفےٰ کا اعلان کر دیا حالانکہ وہ اس ارادے کے ساتھ بمبئی گیا تھا کہ اگر جناح نے اس کے مؤقف کو تسلیم نہ کیا تو وہ یونینسٹ پارٹی کے 73 مسلم ارکان سمیت مسلم لیگ سے مستعفی ہو جائے گا۔ ان ممبروں کے استعفےٰ اس کی جیب میں تھے۔ آسام کے وزیر اعظم سر سعد اللہ نے بھی اس موقع پر اپنے استعفےٰ کا اعلان کر دیا لیکن بنگال کے وزیر اعظم مولوی فضل الحق نے صدر مسلم لیگ کی ہدایت کی تعمیل نہ کی۔ چونکہ وہ مجلس عاملہ کے اجلاس میں شریک نہیں ہوا تھا اس لئے اسے نوٹس دیا گیا کہ دس دن کے اندر بتاؤ کہ ڈیفنس کونسل سے مستعفی ہونے کو تیار ہو یا نہیں۔ مولوی فضل الحق کو جب یہ نوٹس موصول ہوا تو وہ بطور احتجاج آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ، مسلم لیگ کونسل اور وائسرائے کی ڈیفنس کونسل تینوں ہی سے مستعفی ہو گیا۔ اس کا الزام یہ تھا کہ صدر مسلم لیگ کا رویہ غیر آئینی اور آمرانہ ہے اور لیگ کی مجلس عاملہ مسلم اکثریت کے صوبوں کے مفاد کو نقصان نہیں پہنچا رہی ہے۔ کیونکہ اس کے ارکان کی اکثریت مسلم اقلیتی صوبوں سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن بنگال کی مسلم رائے عامہ کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ تھوڑے ہی عرصے بعد اس نے یہ الزام واپس لے لیا اور صدر مسلم لیگ سے اپنے باغیانہ رویے کی معافی مانگ لی۔ ایس۔ ایم۔ اکرام کا کہنا ہے کہ سر سکندر نے بھی پنجاب کی مسلم رائے عامہ کے خوف کی بنا پر ڈیفنس کونسل سے استعفےٰ دیا تھا۔ اس نے بمبئی سے واپسی پر اپنے ایک دوست سے کہا تھا کہ "میں جب مروں گا تو میرا جنازہ مسلمانوں نے ہی اٹھانا ہے میں انہیں کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔"[12]

صوبہ میں روزانہ مسلم لیگ کے جلسے ہوتے تھے جن میں مسلم عوام بڑے جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے تھے۔ مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن بالخصوص بہت سرگرم تھی۔ اس تنظیم نے اپریل 1941ء اور جولائی 1941ء میں دو بار اپنی کوشش سے پاکستان کانفرنس منعقد کی تھی۔ پہلی بار لاہور میں اور دوسری بار لائل پور میں۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ سر سکندر نے اور اس کے جاگیردار طبقہ نے مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کے مطالبہ پاکستان کو تسلیم کر لیا تھا۔ ایسا ہر گز نہیں ہوا تھا۔ اس نے مصلحتاً وقتی طور پر جناح کے سامنے سر تسلیم خم کیا تھا کیونکہ اس وقت تک قائداعظم محمد علی

جناح کا سیاسی مقام اس قدر بلند ہو چکا تھا اور ان کی مسلمانان ہند میں مقبولیت اتنی زیادہ ہو چکی تھی کہ سر سکندر کھلم کھلا ان سے محاذ آرائی کی جرأت نہیں کر سکتا تھا البتہ اس کے طبقے کی جانب سے ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ کی وساطت سے مسلم لیگ کی ''مغرب زدہ اور غیر اسلامی قیادت'' کے خلاف زہر افشانی جاری رہی۔

ستمبر 1941ء میں جناح۔سکندر تضاد کا ایک اور مظاہرہ ہوا جبکہ پنجاب مسلم لیگ نے شہر لاہور کے ایک ضمنی انتخاب کے لئے میاں امیر الدین کو ٹکٹ دے دیا اور وہ بلا مقابلہ منتخب ہو گیا حالانکہ جناح نے یکم ستمبر کو ملک برکت علی کے نام اپنے ایک تار میں میاں امیر الدین کے بارے میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ ملک برکت علی مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک نوجوان و سرگرم رہنما عبدالستار نیازی، جو ضلع میانوالی کے درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا، کو لاہور کے اس ضمنی انتخاب کے لئے لیگ کا ٹکٹ دینا چاہتا تھا۔لیکن سر سکندر حیات خان کا قرعۂ فال صوبائی لیگ کے صدر نواب سر شاہنواز خان آف ممدوٹ کی وساطت سے شہر کے ایک ''خاندانی رئیس'' اور یونینسٹ پارٹی کے ایک دیرینہ وفادار رکن میاں امیر الدین کے حق میں پڑا تھا۔

پھر فروری 1942ء میں ضلع جالندھر کے قصبہ پھلوار میں پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر کی مسلم لیگ اور اس کے مطالبہ پاکستان سے بیزاری کا مظاہرہ ہوا جبکہ اس ضلع کے ڈپٹی کمشنر نے مقامی مسلم لیگ کو پاکستان کانفرنس منعقد کرنے کی اجازت نہ دی۔ڈپٹی کمشنر کی شرائط یہ تھیں کہ کانفرنس میں (1) پاکستان کے موضوع پر بحث نہیں ہوگی۔(2) آل انڈیا مسلم لیگ کی قرارداد لاہور کا ذکر نہیں کیا جائے گا اور (3) اس بات کا ذکر نہیں کیا جائے گا کہ ''ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں لہٰذا جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں ہندوستان کے مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل ہے۔'' اس واقعہ کے بعد عاشق بٹالوی نے قائداعظم کو ایک خط لکھا جس میں الزام عائد کیا گیا تھا کہ ''سر سکندر حیات خان نے حال ہی میں اکالی پارٹی سے سمجھوتہ کیا ہے جس کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ پاکستان کی حمایت اور مخالفت میں ہر قسم کے جلسے بند کر دیئے جائیں گے۔اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ روایت کہاں تک درست ہے تاہم پھلوار میں جو کچھ ہوا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بیان صحیح ہے۔''[13] اس سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ پھلور کا یہ واقعہ سر سکندر کی قاہرہ سے واپسی کے فوراً بعد ہوا تھا جہاں اس نے برطانیہ کے وزیر اعظم چرچل سے

مبینہ طور پر یہ استدعا کی تھی کہ ''وفادار پنجاب اس بات کا مستحق ہے کہ اسے ایک الگ ڈومینین بنا دیا جائے یا ایسی ڈومینین میں شامل کر دیا جائے جس میں سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد بھی شامل ہوں۔''

کرپس تجاویز اور سکندر فارمولا میں مماثلت۔ کرپس مشن کی ناکامی

22 مارچ 1942ء کو برطانیہ میں ونسٹن چرچل (Winston Churchil) کی حکومت کا وزیر خزانہ سر سٹیفورڈ کرپس (Stafford Cripps) لندن سے ہندوستان پہنچا اور اپنے ساتھ ہندوستان کے نئے آئین کا ایک فارمولا لایا۔ سر سٹیفورڈ برطانیہ کی لیبر پارٹی کا ایک سرکردہ رکن تھا۔ وہ مئی 1940ء میں وزیر خزانہ بنا تھا جبکہ چرچل نے نیول چیمبرلین کی جگہ قومی حکومت بنائی تھی۔ اس حکومت میں سٹیفورڈ کرپس کے علاوہ کلیمنٹ ایٹلی ڈپٹی وزیر اعظم تھا اور ارنسٹ بیون وزیر محنت تھا۔ اب ہندوستان میں اس کے دورے کا پس منظر یہ تھا کہ دسمبر 1941ء کو جاپان نے یکا یک پرل ہاربر اور بحرالکاہل میں امریکہ، برطانیہ اور ہالینڈ کی نوآبادیات پر ہوائی اور بحری حملے کر کے جنگ عظیم کے شعلے جنوب مشرقی ایشیا میں پھیلا دیئے تھے اور اس کے ساتھ ہی جرمنی اور اٹلی نے امریکہ کے خلاف اعلان جنگ کر دیا تھا۔ جاپان کا یہ حملہ اتنا زوردار تھا کہ اس نے دیکھتے ہی دیکھتے ملایا، فلپائن، سنگاپور، انڈونیشیا اور برما پر قبضہ کر لیا تھا اور ہندوستان میں وسیع پیمانہ پر یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ اب برطانوی سامراج میں مزاحمت کی کوئی سکت نہیں رہی اس لئے جاپان عنقریب برصغیر پر بھی قبضہ کر لے گا۔ 27 جنوری کو ممتاز کانگرسی لیڈر سبھاش چندر بوس پراسرار طریقے سے کلکتہ سے غائب ہو کر برلن پہنچ گیا تھا اور اس نے وہاں سے برطانیہ کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا تھا۔ حکومت برطانیہ نے اس صورت حال کے پیش نظر فروری 1942ء میں چین کے صدر جنرل چیانگ کائی شیک کو ہندوستان بلایا تا کہ وہ کانگرسی زعما کو جاپانی جارحیت کی مزاحمت پر آمادہ کر سکے مگر اسے اپنے مشن پر کامیابی نہ ہوئی جس کی سب بڑی وجہ یہ تھی کہ مہاتما گاندھی برصغیر کے دفاع کے لئے بھی ''تشدد'' کے استعمال کے خلاف تھا۔ بالفاظ دیگر وہ ہندوستان پر جاپانیوں کے حملے کا خیر مقدم کرنے پر آمادہ تھا۔

7 مارچ 1942ء کو جاپانیوں نے رنگون پر قبضہ کیا تو اس کے چار دن بعد یعنی 11 مارچ

کو برطانوی وزیراعظم ونسٹن چرچل نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ اس کی کابینہ نے ہندوستان کے لئے ایک آئینی فارمولا مرتب کیا ہے جس کے تحت نہ تو کسی اقلیت کو اکثریت کی خواہش کے خلاف ویٹو کے استعمال کا اختیار ہوگا اور نہ ہی اکثریت کو یہ اختیار ہوگا کہ وہ ایسے فیصلے کرے جن سے داخلی امن و امان کو نقصان پہنچ سکتا ہو۔ چنانچہ چرچل کے اس اعلان کے مطابق سٹیفورڈ کرپس جو فارمولا لایا اس میں کہا گیا تھا کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ایک دستور ساز اسمبلی منتخب کی جائے گی۔ ریاستوں کو اس اسمبلی میں شریک کیا جائے گا اور جو آئین یہ اسمبلی وضع کرے گی حکومت برطانیہ اسے فی الفور منظور کر لے گی۔ مجوزہ آئینی فارمولے میں ہندوستان کے لئے ڈومینین سٹیٹس کا وعدہ کیا گیا تھا لیکن شرائط یہ تھیں (1) اگر برطانوی ہند کا کوئی صوبہ نیا آئین قبول کرنے سے انکار کرے تو اسے اپنی موجودہ آئینی حیثیت برقرار رکھنے کا حق حاصل ہے۔ بعدازاں کسی وقت اگر یہی صوبہ ڈومینین میں شامل ہونے کی خواہش کرے تو شامل ہوسکتا ہے۔ اگر ایک سے زیادہ صوبے ہندوستان کی مجوزہ ڈومینین میں شامل ہونے سے انکار کریں تو حکومت برطانیہ انہیں مجموعی طور پر الگ ڈومینین تسلیم کرنے کو تیار ہوگی۔ (2) حکومت برطانیہ نے ہندوستان کی مذہبی و نسلی اقلیتوں کی حفاظت کا جو وعدہ کر رکھا ہے اس کی پاسداری کی جائے گی تاہم ہندوستان کو مستقبل میں اس بات کی پوری آزادی ہوگی کہ برطانی دولت مشترکہ کے دیگر ممالک سے جس قسم کے تعلقات چاہے قائم کرے۔ برطانیہ کوئی مداخلت نہیں کرے گا۔ (3) جنگ ختم ہونے کے بعد جب تمام صوبائی اسمبلیوں کے نتائج برآمد ہوں گے تو ان اسمبلیوں کے ممبر دستور ساز اسمبلی کے ممبر منتخب کریں گے جن کی مجموعی تعداد تمام اسمبلیوں کے ممبروں کی ایک دہائی سے زیادہ نہیں ہوگی۔ ریاستوں کے نمائندے ریاستوں کی آبادی کے تناسب سے منتخب کئے جائیں گے۔ (4) جب تک نیا آئین وضع نہیں ہوتا موجودہ نازک حالات کے پیش نظر حکومت برطانیہ کا یہ فرض ہے کہ ہندوستان کا دفاع کرے کیونکہ اس کا تعلق بھی عالمگیر جنگ سے ہے۔ لیکن ہندوستان کے عسکری، اخلاقی اور مادی وسائل کو مرتب و منظم کرنا حکومت ہند کا فرض ہے جسے وہ اہل ہند کے اشتراک و تعاون سے پورا کرے گی۔ حکومت برطانیہ چاہتی ہے کہ ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے لیڈر اپنے ملک، دولت مشترکہ اور اقوام کے مشوروں میں شرکت کریں۔ اس طرح وہ اس کام کی تکمیل میں جو ہندوستان کی آئندہ آزادی کے لئے بے حد ضروری ہے، تعمیری حصہ لے سکیں۔''

30 رمارچ کو کرپس نے نئی دہلی سے ایک ریڈیائی تقریر میں اس فارمولے کی وضاحت کرتے ہوئے یقین دلایا کہ اگر ہندوستان کے زعماء آپس میں اتفاق کر لیں تو مجوزہ دستور ساز اسمبلی کی ہیئت میں تبدیلی ہو سکتی ہے۔ اس نے صوبوں کی علیحدگی کی تجویز کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اگر آپ کسی کمرے میں کسی شخص یا اشخاص کو بلائیں تو آپ ان پر یہ پابندی عائد نہیں کر سکتے کہ وہ اب اس کمرے سے باہر نکل ہی نہیں سکتے۔ ایک کمرے میں وہی لوگ رہ سکتے ہیں جن میں ہم آہنگی پائی جاتی ہو۔ جن لوگوں میں باہمی اختلاف و تضاد معاندانہ حد تک ہو انہیں یکجا رکھنا مناسب اور ممکن نہیں ہوتا۔

سٹیفورڈ کرپس نے اپنی اس تقریر کے بعد کانگرس اور مسلم لیگ کے لیڈروں سے تقریباً ایک ہفتہ تک گفت و شنید کی لیکن اس کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ جن دنوں وہ ہندوستانی لیڈروں سے بات چیت کر رہا تھا انہی دنوں جاپان کے ہوائی جہاز کولمبو، مدراس اور جزائر انڈیمان پر بمباری کر رہے تھے اور بنگال کے دروازے پر اس کی فوجیں دستک دے رہی تھیں۔ کانگرسی لیڈروں کا خیال تھا کہ برطانوی سلطنت کا جنازہ نکل رہا ہے ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ایسے فریق کے ساتھ سمجھوتہ کریں جس کا اپنا دیوالیہ پٹنے والا ہے۔ گاندھی کا کہنا تھا کہ کرپس کی آئینی تجاویز ایک ایسا چیک ہے جس پر مستقبل کی تاریخ درج ہے اور اس بنک کے نام جاری کیا گیا ہے جس کا دیوالیہ نکل رہا ہے۔ چنانچہ کانگرس نے 11 راپریل کو ایک قرارداد میں اس فارمولے کو مسترد کر دیا۔ اس کے استرداد کی اہم وجوہ یہ تھیں کہ ''ہندوستان کی آزادی فوراً تسلیم نہیں کی گئی۔ ڈومینین کا درجہ فوراً عطا کر دینا چاہیے۔ وزیر ہند کا عہدہ منسوخ کر دیا جائے۔ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کو ایک مکمل اور بااختیار کابینہ کا درجہ دیا جائے اور وائسرائے کا منصب ایک آئینی حکمران کا ہونا چاہیے جہاں وہ اپنی کابینہ کی رائے کا پابند ہو۔ بعض صوبوں کو یہ قابل اعتراض حق دیا گیا ہے کہ وہ ہندوستان کی مجوزہ یونین سے علیحدہ ہو سکتے ہیں۔ یہ فعل ہندوستان کے حصے بخرے کر دے گا۔''

اگلے دن یعنی 12 راپریل کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ نے بھی کرپس کی تجاویز مسترد کر دیں۔ لیگ کی جانب سے استرداد کی اصلی وجہ تو یہ تھی کہ کانگرس کی نامنظوری کی صوررت میں ان تجاویز پر عمل ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر مسلم لیگ ان تجاویز کو منظور کر لیتی تو اس سے اس کو کوئی سیاسی

فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے اپنی قرارداد میں ان تجاویز کو مسترد کرنے کی وجہ یہ بیان کی کہ ''اگرچہ بعض صوبوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ چاہیں تو مجوزہ یونین میں شریک ہونے سے انکار کر دیں لیکن پورے ہندوستان کی واحد یونین تسلیم کر کے پاکستان کو منظور نہیں کیا گیا۔ مسلم لیگ اس قسم کی دستور ساز اسمبلی کو قبول نہیں کرے گی جس کے نمائندے جداگانہ انتخاب کے تحت منتخب نہیں کئے جاتے اور جہاں ہر فیصلہ اکثریت کی رائے سے ہوگا۔''

سرسٹیفورڈ کرپس کا یہ آئینی فارمولا پنجاب کے وزیراعظم سرسکندر حیات کی ان تجاویز سے ملتا جلتا تھا جو اس نے جولائی 1939ء میں ایک پمفلٹ کی صورت میں پیش کی تھیں۔ پھر جن کا اس نے 11 رمارچ 1941ء کو پنجاب اسمبلی میں اعادہ کیا تھا اور پھر جنوری 1942ء میں قاہرہ میں اس کے اور وزیراعظم چرچل کے درمیان گفتگو میں زیر بحث آئی تھیں۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ برطانوی سامراج ہندوستان کے بارے میں اپنی پالیسی سرسکندر حیات خان کے مشورے کے مطابق وضع کرتا تھا بلکہ اس سے یہ ثابت ہوا تھا کہ حکومت برطانیہ نے 1939ء میں ہی یہ فیصلہ کرلیا ہوا تھا کہ جنگ کی صورت میں ہندوستان کے بارے میں اس کی پالیسی کیا ہوگی۔ چونکہ اسے کانگرس سے امداد و اعانت کی امید نہیں تھی اس لئے اس نے ان تمام عناصر کی حوصلہ افزائی کا پروگرام بنایا ہوا تھا جو کسی بھی نعرے کے تحت اس کی جنگی کارروائیوں میں مدد و معاون ہو سکتے تھے۔ چونکہ سرسکندر ہندوستان میں سب سے زیادہ بھرتی دینے والے صوبہ پنجاب کا وزیراعظم تھا اس لئے اس کی وساطت سے پنجابی شاونزم کو الگ ڈومینین کا لالچ دینے میں کوئی حرج نہیں تھا بلکہ اس میں بھی کوئی حرج نہیں تھا کہ پنجابیوں کو مزید یہ لالچ دیا جائے کہ جنگ کے بعد سارے شمال مغربی ہندوستان پر پنجابیوں کی حکمرانی ہوگی۔ سندھی، بلوچی اور پٹھان ان کے زیرنگیں ہوں گے لیکن جب 12 راپریل کو مسلم لیگ نے، اس حقیقت کے باوجود کہ کرپس نے برصغیر کی تقسیم کے اصول کو پہلی مرتبہ تسلیم کیا تھا، اس کے فارمولے کو مسترد کر دیا تو سرسکندر کو بہت صدمہ ہوا۔ سرسکندر برطانوی سامراج سے بھرپور اور غیر مشروط تعاون کرنا چاہتا تھا جبکہ جناح کا تعاون نیم دلانہ اور مشروط ہوتا تھا اور وہ اس کے راستے میں کوئی نہ کوئی روڑا اٹکاتے رہتے تھے۔ جناح کسی صورت یہ تاثر نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ اور ان کی پارٹی برطانوی سامراج کے پٹھو ہیں اور وہ آزادیٔ فکر و

عمل سے محروم ہیں۔

سکندر حیات کا انتقال۔ سیاسی زندگی کا مختصر خاکہ

بنابریں 1942ء کے سارے سال کے دوران صدر مسلم لیگ محمد علی جناح اور سر سکندر حیات کے درمیان جنگ سے متعلقہ مسائل کے بارے میں اختلافات کے مظاہرے ہوتے رہے تا آنکہ 26 ردسمبر 1942ء کو سر سکندر حیات خان کا 50 سال کی عمر میں یکا یک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال ہو گیا۔ اسی روز اس کے دو بیٹوں اور ایک بیٹی کی شادی کی تقریب پر بہت پر تکلف دعوت ہوئی تھی جس میں ایک ہزار کے قریب مہمانوں نے شرکت کی تھی۔ اس کے انتقال پر دو ہزار کے قریب تعزیت نامے موصول ہوئے جن میں برطانیہ کے وزیر اعظم سر ونسٹن چرچل اور وزیر ہند ایمرسن کے پیغامات بھی شامل تھے۔

سر سکندر حیات خان 1892ء میں ملتان میں پیدا ہوا تھا جہاں اس کا والد سردار محمد حیات خان ڈویژنل جج کے عہدے پر فائز تھا۔ اس کی والدہ ریاست کپورتھلہ کے وزیر اعظم میاں غلام جیلانی کی بیٹی تھی۔ 1901ء میں اس کے والد کا انتقال ہوا تو اس کے کچھ عرصہ بعد اسے برائے تعلیم علی گڑھ بھیج دیا گیا جہاں سے میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ انگلستان گیا مگر کوئی ڈگری حاصل کئے بغیر 1910ء میں واپس آ گیا۔ پہلی جنگ عظیم میں اس نے اعلیٰ فوجی خدمات سرانجام دیں لہٰذا اسے کیپٹن بنا دیا گیا اور ایم۔ بی۔ ای کا خطاب دیا گیا تھا۔ 1921ء میں وہ پنجاب کونسل کا رکن منتخب ہوا تھا لیکن بعض انتخابی بدعنوانیوں کی وجہ سے اس کا انتخاب کالعدم قرار دے دیا گیا۔ اس انتخابی مقدمے میں ملک برکت علی مخالف فریق کا وکیل تھا۔ 1924ء میں وہ پھر پنجاب کونسل کا رکن منتخب ہوا۔ 1928ء میں وہ پنجاب کونسل کی اس ریفارمز کمیٹی کا سربراہ مقرر ہوا جو سائمن کمیشن کے ساتھ اشتراک عمل کے لیے بنائی گئی تھی۔ 1929ء میں وہ حکومت پنجاب کا ریونیو ممبر نامزد ہوا اور 1932ء میں کچھ عرصے کے لئے صوبہ کا گورنر بھی مقرر ہوا۔ 1934ء میں وہ ریزرو بنک آف انڈیا کے ڈپٹی گورنر کے عہدے پر فائز ہوا اور 1936ء میں سر فضل حسین کے انتقال پر یونینسٹ پارٹی کا لیڈر منتخب ہوا اور 1937ء کے اوائل میں عام انتخابات کے بعد صوبہ کی یونینسٹ پارٹی کی مخلوط حکومت کا وزیر اعظم بنا۔ اسے اسمبلی کے 175 ارکان میں 96 کی حمایت حاصل تھی۔ اس کے

انتقال کے بعد سرگودھا کا ایک جاگیردار ملک سر خضر حیات خان ٹوانہ گورنر برٹرینڈ گلینسی (Bertrand Glancy) کی نظرعنایت سے وزیراعظم بنا۔جس کے تین سالہ عہد اقتدار میں مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے درمیان اختلافات شدید سے شدید تر ہوتے چلے گئے۔

جس سال سرسکندر کا انتقال ہوا اسی سال 8 رمارچ کو صوبہ لیگ کے صدر نواب سر شاہ نواز خان آف ممدوٹ کا انتقال ہو گیا تھا اور اس کی جگہ اس کا بیٹا نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ صوبہ لیگ کا سربراہ بنا تھا۔اس نوجوان کی تعلیم بالکل واجبی تھی اور اسے سیاست کا بھی کوئی تجربہ نہیں تھا۔تاہم یہ صوبہ لیگ کا صدر اس لئے بن گیا تھا کہ نواب شاہ نواز مرحوم کا فرزند ارجمند تھا اور اس بنا پر سرسکندر حیات خان کا منظور نظر تھا۔گویا انہوں نے صوبہ لیگ کی صدارت پر بھی جاگیرداروں کی اجارہ داری قائم کرلی تھی۔جناح ایسے معاملات میں مداخلت اس لئے نہیں کرتے تھے کہ یہ بات ان کی وسیع ترین متحدہ محاذ کی حکمت عملی کے منافی تھی۔ان دنوں وہ سرتیج بہادر سپرو، گاندھی اور راج گوپال اچاریہ اور وائسرائے لنلتھگو کے ساتھ مرکز میں نیشنل گورنمنٹ کے قیام کے مسئلہ پر سیاسی مباحثہ میں مصروف تھے۔وہ 38-1937ء میں کانگرسی وزارتوں کے تلخ تجربے کے پیش نظر ایسی قومی حکومت کے قیام کے خلاف تھے جس میں کانگرس کی مکمل بالادستی ہو۔

باب: 11

برصغیر میں نئی سیاسی صف بندی
عالمی جنگ کے پس منظر میں

کانگرس کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک

کرپس مشن کی ناکامی کے بعد ہندوستان میں زبردست سیاسی بحران پیدا ہو گیا۔ قبل ازیں اکتوبر 1940ء میں گاندھی نے انگریزوں کو بلیک میل کرنے کے لئے انفرادی سول نافرمانی کی جو تحریک شروع کی تھی وہ تقریباً ایک سال کے بعد 1940ء میں ناکام ہو گئی تھی کیونکہ انفرادی طور پر جنگ کے خلاف نعرے لگانے والے لیڈروں کی تعداد ختم ہو گئی تھی۔ چنانچہ اب جب کرپس اپنے مشن کی ناکامی کے بعد واپس لندن چلا گیا اور مرکزی حکومت پر کانگرس کے فوری طور پر مکمل کنٹرول کا مطالبہ منظور نہ ہوا تو گاندھی نے اجتماعی سول نافرمانی کا منصوبہ بنایا جبکہ جاپان کی ہوائی اور بحری افواج کلکتہ اور مدراس پر بم اور گولے برسا رہی تھیں اور لوگوں کا یہ یقین پختہ ہو گیا تھا کہ اب ہندوستان سے برطانیہ کا جنازہ اٹھنے ہی والا ہے۔ اس نے اپنے منصوبے کے تحت پہلے تو ایک اخباری بیان میں کہا کہ ''برطانیہ کو چاہیے کہ وہ فوراً ہندوستان سے نکل جائے کیونکہ جاپان کی اہل ہند سے کوئی دشمنی نہیں۔ وہ صرف انگریزوں کے دشمن ہیں۔ جونہی انگریز ہندوستان سے رخصت ہوں گے جاپانی فوجیں واپس اپنے ملک کو چلی جائیں گی اور ہندوستان کو فتح کرنے کا ارادہ ترک کر دیں گی۔'' گاندھی کا یہ بیان ہندوؤں کے بورژوا طبقے کے جنگی حالات کے بارے میں غلط اندازے اور خوش فہمی پر مبنی تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ 1942ء کے پہلے چھ ماہ میں جرمن فوجوں کے سوویت یونین پر حملے کا زور تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ جرمن فوجوں کو ماسکو کے گردونواح میں ہزیمت

اٹھانا پڑی تھی چنانچہ اب انہوں نے سٹالن گراڈ پر آخری حملہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جنوب مشرقی ایشیا میں جاپانی فوج کا محاذ شمالی چین سے لے کر پرل ہاربر اور برما تک اس قدر وسیع ہو چکا تھا کہ ان میں مزید پیش قدمی کی سکت نہیں تھی۔ مزید برآں امریکہ کے بحرالکاہل کی جنگ میں ملوث ہونے کے باعث اتحادیوں کا پلہ بہت بھاری ہو گیا تھا۔ واشنگٹن میں اقوام متحدہ کے 26 ممالک نے فسطائی بلاک کے خلاف ہمہ گیر جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ ماسکو میں سوویت یونین اور امریکہ و برطانیہ کے درمیان دفاعی معاہدے ہو گئے تھے اور برطانیہ کے امدادی فوجی ساز و سامان کی پہلی کھیپ ماسکو پہنچ گئی تھی۔

تاہم گاندھی کے اس بیان کے بعد 14 رجولائی 1942ء کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کا ایک اجلاس ہوا جس میں ''باپو'' کے اس مطالبے کی پوری تائید کی گئی۔ اس سلسلے میں جو قرارداد منظور کی گئی اس میں کہا گیا تھا کہ ''ملایا، سنگاپور، برما وغیرہ کو جاپانی فوجوں نے جس طرح ختم کیا ہے اس کا اعادہ ہم ہندوستان میں نہیں چاہتے۔ اگر برطانیہ نے بدستور ہندوستان پر اپنا قبضہ جمائے رکھا تو کانگرس کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ ہوگا کہ وہ مہاتما کی قیادت اور عدم تشدد کے اصول کی پیروی میں برطانوی حکومت کے خلاف ایک وسیع عوامی تحریک چلائے۔'' اس قرارداد کی منظوری کے بعد گاندھی نے اخباری نمائندوں سے کہا کہ اب باہمی گفت وشنید کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ برطانیہ کو چاہیے کہ ہندوستان سے رخصت ہو جائے۔ صدر مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناح نے 31 رجولائی کو غیر ملکی نامہ نگاروں سے ایک انٹرویو میں کانگرس کی اس قرارداد پر سخت نکتہ چینی کی۔ انہوں نے کہا کہ کانگرس کے اس مطالبہ کی منظوری کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں پر کانگرس کا بلاشرکت غیرے راج نافذ ہو جائے گا۔

8 راگست کو بمبئی میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں ورکنگ کمیٹی کے ریزولیوشن کی تصدیق و تائید کر کے انگریزوں سے کہا گیا کہ وہ ہندوستان چھوڑ دیں اور ہندوستانی عوام کو ہدایت کی گئی کہ وہ حصول آزادی کے لئے آخری جنگ شروع کر دیں۔ یہ قرارداد جواہر لال نہرو نے پیش کی تھی اور سردار پٹیل نے اس کی تائید کی تھی۔ صرف 13 ارکان نے اس قرارداد کی مخالفت کی تھی جن میں سے 12 کمیونسٹ تھے۔ کمیونسٹوں کی مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ جب 22 رجون 1941ء کو جرمنی نے سوویت یونین پر حملہ کر دیا تھا تو ان کی پارٹی نے

جنگ کے بارے میں یکایک اپنا موقف تبدیل کر لیا تھا۔ اب ان کی رائے میں یہ جنگ سامراجی نہیں رہی تھی بلکہ یہ عوامی جنگ بن گئی تھی۔ گاندھی نے اس قرارداد کی منظوری کے بعد 140 منٹ تک تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ میں ابھی آزادی چاہتا ہوں۔ اگر ممکن ہو تو آج رات کو ہی اور کل صبح سے پہلے۔ آزادی فرقہ وارانہ اتحاد کا انتظار نہیں کر سکتی۔ میں تمہیں ایک منتر دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ عمل کرو یا مر جاؤ۔ ہم یا تو ہندوستان کو آزاد کرائیں گے یا اس کوشش میں مر جائیں گے۔ ہم کوئی بات خفیہ طور پر نہیں کریں گے۔ یہ کھلی بغاوت ہے۔ اس میں راز داری پاپ ہے۔ آزادی آج ہی ملنی چاہیے۔ ہم کل تک انتظار نہیں کر سکتے۔ تاہم ہم فوراً تحریک شروع نہیں کریں گے۔ میں ابھی وائسرائے سے اس سلسلے میں مزید بات چیت کروں گا جس میں دو تین ہفتے لگ جائیں گے۔

لیکن حکومت ہند نے دو تین ہفتے تک انتظار نہ کیا۔ 9/اگست کو علی الصبح گاندھی سمیت کانگرس ورکنگ کمیٹی کے تمام ارکان کو گرفتار کر لیا گیا۔ جس کے بعد یو۔ پی کے مشرقی اضلاع اور بہار میں تشدد آمیز بلووں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ متعدد پولیس افسر قتل کر دیئے گئے۔ تھانے جلا دیئے گئے اور سرکاری خزانہ لوٹا گیا۔ ضلع بلیہ میں 19/اگست کو بلوائیوں نے ضلعی انتظامیہ کے سارے دفاتر پر قبضہ کر لیا اور اپنی ایک ''سوراج حکومت'' قائم کر لی جو تقریباً دو ہفتے تک قائم رہی۔ انہوں نے ضلع کے سارے سرکاری اہل کاروں کو اپنا قیدی بنا لیا تھا۔ 15/ستمبر کو حکومت ہند کے ہوم ممبر نے مرکزی اسمبلی کو بتایا کہ ایک ماہ کے عرصہ میں 250 ریلوے سٹیشن تباہ کر دیئے گئے یا انہیں نقصان پہنچایا گیا۔ ان سٹیشنوں میں سے 150 مشرقی یو۔ پی کے ضلع بلیہ اور دوسرے اضلاع میں تھے۔ 24 ریل گاڑیوں کو پٹڑی سے اتار دیا گیا جس کی بنا پر ریلوے لائن اور انجنوں کو نقصان پہنچا۔ 550 ڈاکخانوں پر حملے ہوئے جن میں 50 جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گئے۔ 3500 مقامات پر تار اور ٹیلی فون کی تاریں کاٹی گئیں۔ تاہم دو ماہ کے اندر یہ پوری تحریک ختم ہو گئی اور حالات معمول پر آ گئے۔ پنجاب اور شمال مغربی، شمال مشرقی اور جنوبی ہندوستان کے علاقے اس سے متاثر نہ ہوئے۔ کانگرس کے اندازے کے مطابق اس دو ماہ کے عرصے میں تقریباً 15000 افراد پولیس اور فوج کی گولیوں سے ہلاک ہوئے جبکہ حکومت کا بیان یہ تھا کہ 940 ہلاک ہوئے، 1630 زخمی ہوئے اور 60229 کو گرفتار کیا گیا۔ بایں ہمہ اس عرصے میں نہ تو جاپانی فوجیں

ہندوستان میں داخل ہوئیں اور نہ ہی سبھاش چندر بوس کی ''آزاد ہند فوج'' نے ''بھارت ماتا'' کو آزاد کرایا۔ بلکہ اس عرصے میں برما سے جاپانیوں کی رفتہ رفتہ پسپائی شروع ہو گئی۔

مسلم لیگ نے کانگرس کی اس بغاوت میں کوئی دلچسپی نہ لی اور مسلم عوام بالعموم اس سے الگ ہی رہے۔ البتہ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے اس دوران حکومت ہند سے عملی تعاون کر کے کانگرسیوں کی شورش کو کچلنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی کوشش سے بمبئی، کلکتہ اور دوسرے علاقوں کے بیشتر کارخانوں میں ہڑتالیں نہ ہوئیں اور ریلوے کے مزدور بدستور کام کرتے رہے۔ البتہ گجرات میں پارچہ بافی کے تقریباً ایک سو کارخانوں میں ہڑتال ہوئی جو تقریباً 3 ماہ تک جاری رہی اور اس ہڑتال سے بھی حکومت کے بجائے ہندو صنعت کاروں کو نقصان ہوا تھا۔

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے حکومت کے ساتھ اس اتحاد و تعاون کی وجہ اوپر بیان کی جا چکی ہے۔ پارٹی کی یہ نظریاتی و سیاسی قلابازی اس کی قیادت کے اپنے غور و فکر کا نتیجہ نہیں تھی۔ 22 رجون 1941ء سے پہلے یہ پارٹی اس جنگ کو سامراجی کہتی تھی اور اس نے اس کی مخالفت کے لئے کانگرس سے گٹھ جوڑ کیا ہوا تھا تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ اس وقت تک ہٹلر نے سوویت یونین پر حملہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ اس معاہدۂ عدم جارحیت پر قائم تھا جو اس نے 23 راگست 1939ء کو سوویت یونین سے کیا تھا۔ جب ہٹلر نے مغربی یورپ پر قبضہ کرنے کے بعد 22 رجون 1941ء کو اس معاہدے کی خلاف ورزی کی اور سوویت یونین پر بھرپور حملہ کر دیا تو کمیونسٹ پارٹی کی نظر میں یہ جنگ اسی دن عوامی جنگ بن گئی۔ مطلب یہ ہے کہ پارٹی اپنی نظریاتی اور سیاسی لائن از خود معین نہیں کرتی تھی بلکہ وہ اس مقصد کے لئے ماسکو کی طرف دیکھتی تھی جو اسے برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کی وساطت سے لائن دیتا تھا۔ لندن میں برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی نے بھی بالکل ایسے ہی کیا تھا۔ بالفاظ دیگر ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کا انداز فکر اور طرز عمل بھی تقریباً ایسا ہی تھا جیسا کہ یہاں کے پشتینی سامراجی پٹھوؤں کا تھا۔ جیسے یہ پٹھو اپنے سامراجی آقاؤں کی ہدایات کے پابند تھے ویسے ہی یہاں کے کمیونسٹ عناصر بھی ماسکو کی لائن کے پابند تھے۔ انہوں نے تیسرے عشرے کے معاشی بحران کے دوران کانگرس کے ساتھ گٹھ جوڑ بھی ماسکو کی لائن کے مطابق کیا تھا اور اب انہوں نے 8 راگست 1942ء کو اس جماعت سے قطع تعلق بھی وہیں سے لائن ملنے پر کیا تھا۔

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی جانب سے مطالبہ پاکستان کی حمایت

19 ستمبر 1942ء کو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے آل انڈیا مسلم لیگ کو اتحاد و تعاون کی پیشکش بھی بظاہر ماسکو کی ہدایت کے تحت ہی کی تھی۔ اس دن پارٹی کی سنٹرل کمیٹی نے ایک قرارداد منظور کی جس میں مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کو اصولی طور پر تسلیم کیا گیا تھا اور کانگرس کے متحدہ قومیت کے نظریے کو مسترد کیا گیا تھا۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ:

1۔ کمیونسٹ پارٹی ساری ذاتوں، فرقوں اور قومیتوں کے محنت کشوں کو مشترکہ طبقاتی تنظیموں (ٹریڈ یونین اور کسان سبھائیں وغیرہ) میں یکجا کرتی ہے۔ وہ انہیں اپنے ملک کی آزادی اور جمہوریت کے لئے متحدہ قومی محاذ کے ہراول دستے کی صورت میں سیاسی طور پر متحد کرتی ہے۔ فرقہ وارانہ اتحاد کے حصول کی پالیسی کا بنیادی اصول یہ ہے۔

2۔ تاہم ہندوستان کے دفاع اور اس کی آزادی کے لئے مختلف فرقوں اور قومیتوں کے عوام کا متحدہ قومی محاذ بنانے کی خاطر یہ ضروری ہے کہ ان کے باہمی شکوک وشبہات کو دور کیا جائے۔ یہ ماضی کے تاریخی جبر و استبداد کی یادوں اور عصر حاضر میں جاگیردارانہ سامراجی استحصال کے پیدا کردہ عدم مساوات کی علامت ہے۔ لہٰذا اس مقصد کے لئے یہ ضروری ہے کہ فرقوں اور قومیتوں کے بنیادوں حقوق کو متحدہ قومی محاذ کے پروگرام کا لازمی جزو قرار دیا جائے۔

3۔ متحدہ قومی محاذ کے پروگرام کے تحت یہ اعلان کرنا ضروری ہے کہ آزاد ہندوستان میں مختلف فرقوں اور قومیتوں سے مکمل طور پر مساوی سلوک کیا جائے گا۔ کوئی قومیت دوسری قومیت پر جبر نہیں کرے گی۔ ذات یا فرقہ کی بنیاد پر کسی سے غیر مساوی سلوک نہیں ہوگا اور نہ ہی اسے کسی چیز کے نااہل قرار دیا جائے گا۔ اس امر کو یقینی بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ قومی تحریک ذیل کے حقوق کو اپنے پروگرام برائے قومی اتحاد کا جزو تسلیم کرے۔

i۔ ہندوستان کے جو لوگ ایک ہی متصلہ علاقے میں رہائش پذیر ہیں، مشترکہ تاریخی روایات رکھتے ہیں، جن کی زبان، ثقافت اور نفسیات مشترکہ ہیں اور جن کی معاشی

زندگی مشترکہ ہے انہیں ایک امتیازی قومیت کے طور پر تسلیم کیا جائے گا اور انہیں یہ حق ہوگا کہ وہ ایک آزاد انڈین یونین کے اندر یا فیڈریشن میں اپنی خودمختار ریاست قائم کریں اور اگر چاہیں تو انڈین یونین یا فیڈریشن سے الگ ہو جائیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو علاقے ایسی قومیتوں کے ارکان ہیں اور جو آج کل کے برطانوی صوبوں اور نام نہاد ہندوستانی ریاستوں کی مصنوعی حد بندیوں کی وجہ سے منتشر ہیں انہیں آزاد ہندوستان میں از سر نو یکجا کر کے ان قومیتوں کے سپرد کر دیا جائے گا۔ اس طرح مستقبل کا آزاد ہندوستان مختلف قومیتوں مثلاً پٹھان، مغربی پنجابی (زیادہ تر مسلمان)، سکھ، سندھی، ہندوستانی، راجستھانی، گجراتی، بنگالی، آسامی، بہاری، اوڑیا، آندھریے، تامل، کرناٹکی، مہاراشٹری اور کیرالی وغیرہ کی خودمختار ریاستوں کی فیڈریشن یا یونین ہوگا۔

ii۔ اگر اس طرح تشکیل کردہ نئی ریاستوں میں اقلیتیں ہوں گی تو ان کی ثقافت، زبان اور تعلیم وغیرہ کے حقوق کی آئینی ضمانت دی جائے گی اور ان کی خلاف ورزی قانونی لحاظ سے قابل تعزیر ہوگی۔

iii۔ جن نا اہلیتوں، مراعات اور امتیازات کی بنیاد ذات، نسل یا فرقہ پر ہوگی (مثلاً چھوت چھات اور دوسری اسی قسم کی برائیاں) انہیں آئینی طور پر ختم کر دیا جائے گا اور ان کی خلاف ورزی از روئے قانون قابل سزا ہوگی۔

iv۔ اگر خودمختار ریاست قائم کرنے یا الگ ریاست قائم کرنے سے متعلقہ حقوق جن کی مندرجہ بالا سطور میں وضاحت کی گئی ہے اور جو ہر قومیت بشمول مسلم عقیدہ رکھنے والی قومیتوں کے لئے تسلیم کئے گئے ہیں، کا اعلان کر دیا جائے تو یہ امر نیشنل کانگرس اور لیگ کے درمیان اتحاد کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کو، جہاں کہیں بھی وہ متصلہ علاقائی وطن میں بھاری اکثریت رکھتے ہیں، خودمختار ریاستیں قائم کرنے اور اگر چاہیں تو الگ ہونے کا حق مل جائے گا۔ جہاں تک بنگال کے مشرقی اور شمالی اضلاع کے بنگالی مسلمانوں کا تعلق ہے جہاں ان کی بھاری اکثریت ہے وہاں وہ اپنا خودمختار منطقہ، ریاست بنگال۔ تشکیل کر سکتے ہیں یا ایک الگ ریاست بھی قائم کر سکتے ہیں۔

لہٰذا اس قسم کے اعلان سے مطالبہ پاکستان کی اصل روح کی منظوری ہوجاتی ہے۔ اس اعلان کا اس علیحدگی پسندانہ نظریے سے کوئی تعلق نہیں جو مذہب کی بنیاد پر ہندوستان کو دو قوموں میں تقسیم کرتا ہے۔

v۔ اگر اس شکل میں علیحدگی کے حق کو تسلیم کیا جائے تو یہ ضروری نہیں کہ یہ امر واقعی علیحدگی کا موجب بنے گا۔ اس کے برعکس اگر باہمی شکوک وشبہات دور کر دیئے جائیں تو اس سے آج کل اتحاد عمل پیدا ہوگا اور مستقبل کے ہندوستان میں عظیم تر اتحاد کی بنیاد استوار ہوگی۔ اس قسم کے اعلان کی بنیاد پر جو قومی اتحاد قائم ہوگا اور جو مادر وطن کے دفاع کے لئے مشترکہ جدوجہد کے دوران مستحکم ہوگا وہ ہندوستان کی ساری قومیتوں کے عوام کو یکجا رہنے کی ضرورت کا لازمی طور پر قائل کر دے گا اور انہیں اس امر پر بھی آمادہ کر لے گا کہ وہ آزاد انڈین یونین یا فیڈریشن کی تشکیل کریں جس میں ہر قومی ریاست کو مساوی درجہ حاصل ہوگا اور اسے الگ ہونے کا بھی حق حاصل ہوگا۔ اس طرح وہ محسوس کریں گے کہ آزادی وجمہوریت کے تحفظ کا واحد راستہ یہی ہے اور اس طریقے سے ہندوستان میں ایسے عظیم اور پرشکوہ اتحاد کی بنیاد استوار ہوگی جو قبل ازیں ہمارے ملک میں کبھی قائم نہیں ہوا۔

اگرچہ جو لوگ کانگرس یا لیگ کے پیروکار ہیں ان کے درمیان بظاہر تصادم ہے اور لاینحل مشکلات ہیں تاہم ان میں اتحاد کی زبردست خواہش روز بروز بڑھ رہی ہے۔ فسطائی حملے کے روز افزوں خطرے اور موجودہ قومی بحران کے زیر اثر دونوں جماعتوں کی قیادت بھی ایک دوسرے کے قریب اور اس حل کی جانب آ گئی ہے جو اس قرارداد میں پیش کیا گیا ہے۔ اتحاد کے مسئلہ پر شکست خوردگی کی کوئی گنجائش نہیں۔ کمیونسٹ پارٹی تمام محب الوطنوں سے اپیل کرتی ہے کہ وہ ان اصولوں کو مقبول عام بنانے کے لئے اس سے اشتراک عمل کریں اور اس طرح کانگرس۔ لیگ اتحاد کے قیام کی رفتار کو تیز کریں۔ آج کل کے خطرناک ترین حالات میں ہماری مادر وطن کی قومی نجات کا واحد راستہ یہی ہے۔''[1]

یہ تاریخی قرارداد جس کی توثیق مئی 1943ء میں کمیونسٹ پارٹی کی پہلی کانگرس میں کی گئی تھی، سوویت یونین کے اس پہلے آئین کی روشنی میں لکھی گئی تھی جس کے تحت روس کی مختلف قومیتوں

کوحق خوداختیاری دیا گیا تھااور غالباً اس کا محرک سٹالن کا 1912ء میں پیش کردہ یہ نظریہ بھی تھا کہ ''جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے وہاں بورژوا ترقی کے ساتھ غالباً ان بے شمار مختلف النوع قومیتوں میں جان پڑ جائے گی جواب تک محوخواب ہیں۔''[2] تاہم اس قرارداد پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ان دماغوں کی تخلیق تھی جو قومیتوں کے مسئلہ پر غیر مبہم اور مخلصانہ نظریے کے حامل نہیں تھے۔ یوں تو یہ قرارداد بہت سے تناقضات سے بھرپور تھی لیکن اس میں جو سب سے نمایاں تناقض تھا وہ یہ تھا کہ اس میں ایک طرف تو یہ کہا گیا تھا کہ کمیونسٹ پارٹی مذہب کی بنیاد پر دوقومی نظریے کے خلاف ہے لیکن دوسری طرف اس میں پنجاب اور بنگال کی مذہبی بنیادوں پر تقسیم کی تجاویز بھی شامل تھیں۔ اس میں نہ صرف مغربی پنجاب اور بنگال کے مشرقی اور شمال اضلاع کی مسلم اکثریت کو محض اس کے مذہب کی بنا پر حق خوداختیاری دیا گیا تھا بلکہ یہ حق مذہبی بنیاد پر مشرقی پنجاب کے سکھوں کو بھی دیا گیا تھا۔ بالفاظ دیگر پنجاب اور بنگال کی مذہبی بنیاد پر تقسیم کی تجویز سب سے پہلے ستمبر 1942ء میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا نے تسلیم کی تھی اور اس طرح یہ بھی تسلیم کیا تھا کہ محض مذہبی عقیدہ بھی کسی قوم کی بنیاد بن سکتا ہے۔ حکومت برطانیہ کا نمائندہ سرسٹیفورڈ کرپس مارچ 1942ء میں جو آئینی فارمولا لایا تھا اس میں بلالحاظ مذہب وملت صوبوں کو تو علیحدگی کا حق دیا گیا تھا لیکن کسی مذہبی فرقہ کو یہ حق نہیں دیا گیا تھا کہ وہ ان علاقوں کو ہندوستان سے الگ کرسکتا ہے جس میں اس کی اکثریت ہے۔

دراصل اس منافقانہ قرارداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ کمیونسٹ پارٹی ہندوؤں کے ان لبرل حلقوں کو بھی ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی جو دوقومی نظریہ کے خلاف تھے لیکن کانگرس کے برعکس جنگی کاروائیوں میں حکومت ہند سے تعاون کررہے تھے اور ان مسلمانوں کی بھی حمایت حاصل کرنا چاہتی تھی جو دوقومی نظریے کی بنیاد پر برصغیر کی تقسیم کا مطالبہ کرتے تھے گویا جناب شیخ کا نقش قدم یوں بھی تھا اور یوں بھی۔ منافقانہ سیاست اس قسم کے تناقضات سے مبرا نہیں ہوسکتی۔ پارٹی کی اس قرارداد کا مطلب یہ تھا کہ اب اس کی کانگرس کے ساتھ کھلم کھلا سیاسی محاذ آرائی ہوگی۔ اس کے ارکان نے 8/اگست 1942ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی تحریک کی مخالفت کی تھی اور اب 9/اکتوبر کو ایک ایسی قرارداد منظور کی تھی جو کانگرس کے متحدہ قومیت کے بنیادی نظریہ سے متصادم تھی۔ جب اپریل 1942ء میں مدراس کے لبرل کانگرسی لیڈر راج گوپال اچاریہ نے یہ کوشش کی تھی کہ کرپس فارمولا کو منظور کرلیا جائے اور اس کے تحت قومی حکومت کے

قیام کے لئے کانگرس اور مسلم لیگ میں مفاہمت کرائی جائے تو کانگرس کمیٹی نے اس کی تجویز مسترد کر دی تھی اور اس کی بجائے اس مضمون کی قرارداد منظور کی تھی کہ ''کانگرس کسی ایسی تجویز کو منظور نہیں کر سکتی جس کے تحت کسی ریاست یا علاقائی یونٹ کو انڈین یونین یا فیڈریشن سے الگ ہونے کی آزادی دی گئی ہو۔ اس طرح ہندوستان کے حصے بخرے ہو جائیں گے اور یہ بات نہ صرف مختلف ریاستوں اور صوبوں کے عوام کے مفاد کے منافی ہوگی بلکہ اس سے بحیثیت مجموعی پورے ملک کو نقصان پہنچے گا۔'' راج گوپال اچاریہ نے اس قرارداد کی منظوری کے بعد کانگرس سے استعفےٰ دے دیا تھا۔

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی مختصر تاریخ

کمیونسٹ پارٹی کی ہندوستان کے آئینی مستقبل کے بارے میں اس دوغلی پالیسی کی وجہ یہ تھی کہ اس پارٹی کی قیادت اندرون ملک طبقاتی جدوجہد کی پیداوار نہیں تھی۔ بلکہ یہ بمبئی اور دوسرے بڑے شہروں کے چند ''بابوؤں'' پر مشتمل تھی جنہیں ماسکو سے براستہ لندن لائن ملتی تھی۔ یہ قیادت اپنی پالیسی اپنے ملک کے ٹھوس حالات کو پیش نظر رکھ کر وضع نہیں کرتی تھی بلکہ اس سلسلے میں اس کا انحصار بیرونی نظریاتی رہنمائی پر ہوتا تھا۔ کمیونسٹ ''بابوؤں'' میں خود اعتمادی اور خود انحصاری کے فقدان کی وجہ یہ تھی کہ ان کی پارٹی کی تشکیل کا فیصلہ انہوں نے خود نہیں کیا تھا بلکہ یہ فیصلہ ستمبر 1920ء میں سوویت یونین کے شہر باکو میں ہوا تھا جبکہ تیسری انٹرنیشنل کے زیر اہتمام مشرق کے سامراج دشمن عناصر کے نمائندوں کی کانفرنس ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں ایم۔ این۔ رائے کی زیر قیادت ہندوستانی نمائندے بھی شریک ہوئے تھے اور کانفرنس کے صدر گریگری زینویف نے اپنی صدارتی تقریر میں انہیں مشورہ دیا تھا کہ وہ برطانوی سامراج کے خلاف جدوجہد کے لئے اپنی پارٹی بنائیں۔ زینویف کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ ''ہم ساری اقوام، سارے محنت کش عوام کی، بلا امتیاز رنگ و نسل، آزادی کے خواہاں ہیں۔ ہم ہندوستان کی بھی آزادی چاہتے ہیں جسے انگریز سرمایہ داروں نے اس قدر ظالمانہ طریقے سے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔'' اس نے مشرقی اقوام کو مشورہ دیا تھا کہ ''اپنے آپ کو سامراج کے خلاف، بالخصوص انگریزی سامراج کے خلاف، جہاد کے لئے منظم کیجئے۔'' اس کانفرنس کے بعد ایم۔ این۔ رائے

نے چند دوسرے ہندوستانی نوجوانوں کے ساتھ مل کر برلن میں ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی داغ بیل ڈالی۔ اس مقصد کے لئے برلن کا انتخاب اس لئے کیا گیا تھا کہ وہاں سے ماسکو زیادہ دور نہیں تھا اور لندن بھی نزدیک ہی تھا جہاں کی کمیونسٹ پارٹی ہندوستان کے حالات پر بڑی توجہ دیتی تھی اور اس سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم میں امداد کرے گی۔

1920ء میں ہندوستان کے حالات کمیونسٹ پارٹی کی تنظیم کے لئے خاصے موافق تھے۔ پہلی جنگ عظیم نے برطانوی سامراج کو خاصا کمزور کر دیا تھا۔ افراط زر کے باعث ضروریات زندگی کی قیمتوں میں بہت اضافہ ہو گیا تھا اور بے روزگاری بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ چنانچہ اسی سال سمرقند میں ایشیائی طلبا کی نظریاتی تعلیم کے لئے ایک سکول کھولا گیا جس کے 3500 طلبا میں سے ہندوستانیوں کی تعداد 931 تھی۔ یہ سکول کوئی خفیہ ادارہ نہیں تھا بلکہ یہ لینن کی اس پالیسی کے تحت کھلم کھلا قائم ہوا تھا کہ سوویت یونین کا بین الاقوامی فرض ہے کہ وہ ان محکوم اقوام کی امداد کرے جو سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہی ہیں۔ برطانیہ، فرانس، امریکہ اور دوسرے سامراجی ممالک نے اپنے پٹھوؤں کی تعلیم و تربیت کے لئے اپنی یونیورسٹیوں میں خصوصی انتظام کیا ہوا تھا۔ لہٰذا نوآبادیات کے حریت پسند نوجوانوں کی نظریاتی تعلیم کے لئے سوویت یونین میں سکول کھولنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ 1917ء کے انقلاب کے بعد عالمی انقلاب کی نظریاتی رہنمائی کا فرض واقعی سوویت یونین پر عائد ہوتا تھا اور لینن اپنے اس فرض کی ادائیگی کا اعلانیہ عہد کرتا تھا۔ مئی 1920ء میں لینن نے انڈین انقلابی ایسوسی ایشن کے نام ایک پیغام میں اپیل کی تھی کہ وہ برطانوی سامراج سے آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اتحاد برقرار رکھیں۔

تیسری انٹرنیشنل کی دوسری کانگرس جون 1920ء میں ہوئی تو اس میں مختلف ممالک کی قومی آزادی اور نوآبادیاتی غلامی کے مسائل پر خاص توجہ دی گئی تھی۔ چنانچہ ان مسائل کے بارے میں جو پالیسی وضع ہوئی اس کے تحت سوویت یونین نے فروری 1921ء میں ایران اور افغانستان کے ساتھ دوستی کے معاہدے کئے، جن کے تحت انہیں یقین دلایا گیا کہ ان کی آزادی و خودمختاری کے تحفظ کے لئے ان کی ہر طرح سے امداد کی جائے گی۔ ان دنوں افغانستان میں امان اللہ خان برسراقتدار تھا اور وہ برطانوی سامراج کی بالادستی قبول کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ لیکن ان

معاہدوں کے تقریباً ایک ماہ بعد یعنی 16 ر مارچ 1921ء کو سوویت یونین نے برطانیہ سے ایک تجارتی معاہدہ کیا جس میں یہ سیاسی شق بھی شامل تھی کہ ''سوویت یونین برطانوی مفادات اور برطانوی ایمپائر کے خلاف فوجی ''سفارتی'' یا کسی اور طرح سے ایشیائی عوام، بالخصوص ہندوستان اور افغانستان کے عوام کی مخالفانہ کارروائیوں کی حوصلہ افزائی نہیں کرے گا۔'' ان دنوں ونسٹن چرچل وزیر نوآبادیات تھا۔ سوویت یونین کی جانب سے اس قسم کی سیاسی شق منظور کرنے کی وجہ یہ تھی کہ ان دنوں لینن کی نئی معاشی پالیسی کے تحت سوویت یونین کی تعمیر نو کے لئے مغربی ممالک سے قرضے اور تجارت کی سخت ضرورت تھی۔ تاہم اس معاہدے کے باوجود سوویت یونین نے ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ممالک کے انقلاب پسندوں کی تائید و حمایت جاری رکھی۔ چنانچہ جب جون 1921ء میں تیسری انٹرنیشنل کی تیسری کانگرس منعقد ہوئی تو، جوزف کاربل اور دوسرے مغربی مؤرخین کے بیان کے مطابق، سٹالن نے ایگزیکٹو کمیٹی میں یہ رائے ظاہر کی کہ ''یورپ کی سامراجی طاقتوں کے سیاسی اقتدار پر ان کی نوآبادیات کے ذریعے دباؤ ڈالنا چاہیے۔'' اس کا خیال تھا کہ فروری 1921ء کے معاہدے کے تحت کابل میں جو سوویت قونصل خانہ قائم ہوا ہے اس کے ذریعے برطانوی ہندوستان سے مواصلاتی رابطہ قائم ہوسکتا ہے اور لینن نے کانگرس کے کھلے اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے اعلان کیا تھا کہ برطانوی ہندوستان میں جس رفتار سے انقلاب آگے بڑھ رہا ہے، ایک طرف تو اسی رفتار سے وہاں کا صنعتی اور ریلوائی پرولتاری طبقہ منظم ہوگا اور دوسری طرف اسی رفتار سے برطانوی سامراج کے تشدد میں بھی اضافہ ہوگا۔ پھر 4 ر مارچ 1923ء کو پراودا میں لینن کا وہ مشہور و معروف مضمون شائع ہوا جس میں اس نے لکھا تھا کہ ''ایشیائی اقوام جتنی جلدی آزاد ہوں گی اتنی جلدی ہی سرمایہ داری نظام پر کمیونزم کو فتح حاصل ہو گی۔ اس عالمی جدوجہد کا فیصلہ اس حقیقت کی بنیاد پر ہوگا کہ دنیا کی آبادی کی بھاری اکثریت روس، ہندوستان اور چین میں رہتی ہے۔''

حکومت برطانیہ نے 16 ر مارچ 1921ء کے تجارتی معاہدہ کی متذکرہ سیاسی شق کی ''خلاف ورزیوں'' کے خلاف کئی مرتبہ احتجاج کیا لیکن سوویت حکومت کا مسلسل مؤقف یہ تھا کہ تیسری انٹرنیشنل ایک آزاد و خود مختار ادارہ ہے۔ اس کی کسی کارروائی کی ذمہ داری سوویت حکومت پر عائد نہ کی جائے۔ چنانچہ اس صورت حال کے پیش نظر برطانیہ نے 8 رمئی 1923ء کو سوویت

حکومت کے نام ایک نوٹ میں مطالبہ کیا کہ برطانیہ کے مفادات کے خلاف پراپیگنڈا بند کیا جائے ورنہ مارچ 1921ء کا تجارتی معاہدہ منسوخ کر دیا جائے گا۔ اس نوٹ کے جواب میں ماسکو نے یقین دلایا کہ ایشیا میں برطانیہ کی پالیسی میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔ اس سلسلے میں 4رجون 1923ء کو جو سرکاری بیان جاری کیا گیا اس میں برطانیہ کی شکایات کا ذکر کرتے ہوئے یقین دہانی کرائی گئی کہ ''سوویت حکومت ایسے افراد، اداروں، ایجنسیوں اور انجمنوں کی حمایت یا کسی اور طریقے سے امداد نہیں کرے گی، جن کا نصب العین برطانوی ایمپائر کے خلاف عدم اطمینان پھیلانا یا بغاوت کی ترغیب دینا ہوگا۔ سوویت حکام ان شرائط پر مسلسل اور پوری طرح عمل کریں گے۔'' چنانچہ اس بیان کے بعد برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کے نوآبادیاتی شعبہ کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ ہندوستان میں ان کمیونسٹ سرگرمیوں کی نگرانی کرے جو سمرقند کے فارغ التحصیل طلبا نے واپس ہندوستان آکر شروع کر دی ہوئی تھیں۔ رجنی پالے دت اس شعبے کا انچارج تھا۔ جب اس کی نگرانی میں اور برلن میں ایم۔ این۔ رائے سے خط و کتابت کے بعد پارٹی کی تنظیم 1924ء میں مکمل ہوئی تو حکومت ہند نے اس کے لیڈروں کو کانپور میں حکومت کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں گرفتار کر لیا۔ ان گرفتاریوں کی وجہ یہ تھی کہ 24-1923ء میں پورے برصغیر میں بہت سی ہڑتالیں ہوئی تھیں اور دہشت گردی کی وارداتوں میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ کلکتہ میں دو انگریز مارے گئے تھے اور ایک بم فیکٹری کا سراغ لگا تھا۔ گرفتار شدہ کمیونسٹوں کے خلاف ایک خصوصی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا جس کے دوران حکومت ہند نے دستاویزی شہادت کے طور پر ایم۔ این۔ رائے کا تحریر کردہ ایک مینی فیسٹو پیش کیا جس میں اس نے لکھا تھا کہ ''انفرادی طور پر بم مارنے، ریوالور سے کسی کو ہلاک کرنے یا خفیہ تنظیمیں بنانے سے انقلاب نہیں آسکتا ہے۔ یہ انفرادی کارروائیاں ایسے ہی بے سود ہیں جیسے کہ برطانوی پارلیمنٹ کے قوانین، ہندوستان میں صرف عوامی بغاوت کے ذریعے ہی سیاسی اور معاشرتی انقلاب آسکتا ہے۔ ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی کا نصب العین یہ ہے کہ ہندوستان کے موجودہ معاشرتی ڈھانچے اور حکومت کو تبدیل کیا جائے۔ سارے ذرائع پیداوار اور ذرائع تبادلہ پر عوام کا قبضہ قائم کیا جائے تاکہ وہ اپنی تقدیر کے خود مالک بنیں۔ یہ کام اس طریقے سے پایۂ تکمیل کو پہنچنا چاہیے کہ سب اس میں حصہ لیں اور سب ہی اس سے مستفید ہوں۔''

تاہم حکومت کی اس تعزیری کاروائی کے باوجود کمیونسٹ پارٹی ختم نہ ہوئی۔ 1927ء میں برطانیہ کی پارلیمنٹ کا ایک ہندوستانی رکن شپورجی سکلت والا (Shapurji Saklatvala) اور برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کا ایک سرکردہ لیڈر جارج ایلی سن المعروف ڈونلڈ کیمبل (Donald Compbel) ہندوستان آئے۔ انہوں نے ملک کا دورہ کیا اور بڑے بڑے شہروں میں جلسے کر کے حاضرین کو مشورہ دیا کہ وہ کسانوں اور مزدوروں کی تنظیمیں قائم کریں۔ 1928ء میں جبکہ یورپ معاشی بحران کے کنارے پر کھڑا تھا اور ہندوستان میں مہنگائی اور بے روزگاری اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، ہڑتالوں اور مظاہروں کا ایک ملک گیر سلسلہ شروع ہو گیا اور دہشت گردی کی وارداتیں بھی پھر شروع ہو گئیں۔ حکومت ہند نے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے مرکزی اسمبلی میں ایک پبلک سیفٹی بل پیش کیا جس میں کہا گیا تھا کہ جو لوگ برطانوی ہند کے شہری نہیں ہیں اور تخریبی کارروائیوں سے حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے ہیں انہیں یہاں سے بے دخل کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ برطانیہ کی کمیونسٹ پارٹی کے جو ارکان یہاں کمیونسٹ سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں انہیں برصغیر سے نکال دیا جائے۔ مگر اسمبلی نے اس بل کی منظوری نہ دی۔ موتی لال نہرو کی سوراج پارٹی اور محمد علی جناح کی انڈیپنڈنٹ پارٹی دونوں ہی نے اس مسودۂ قانون کی مخالفت کی۔

جنوری 1929ء میں حکومت ہند نے ایک مرتبہ پھر یہ بل اسمبلی میں پیش کیا مگر اس مرتبہ بھی اسے مسترد کر دیا گیا چنانچہ وائسرائے نے اپنے غیر معمولی اختیارات کو بروئے کار لا کر اس قانون کو بطور آرڈیننس نافذ کر دیا اور مارچ 1929ء میں اس آرڈیننس کے تحت 32 لیبر لیڈروں کو گرفتار کر لیا جن میں مقامی کمیونسٹوں کے علاوہ تین انگریز کمیونسٹ لیڈر۔ فلپ سپراٹ (Phillip Spratt)، لیسٹر ہوچی سن (Lester Hutchison) اور بن بریڈلے (Ben Bradley) بھی شامل تھے۔ ان پر الزام یہ تھا کہ انہوں نے حکومت ہند کا تختہ اُلٹنے کے لئے میرٹھ میں سازش کی تھی۔ اس کاروائی کی اصلی وجہ یہ تھی کہ 29-1928 میں کمیونسٹ پارٹی نے 203 ہڑتالیں کروائی تھیں جن میں ساؤتھ انڈین ریلوے کی ہڑتال بھی شامل تھی جس میں 506,851 مزدوروں نے حصہ لیا تھا۔ ریلوے کی اس عظیم ہڑتال سے حکومت بہت پریشان ہو گئی تھی چنانچہ جن لیبر لیڈروں نے یہ ہڑتال کروائی تھی ان میں سے 15 کو دس دس سال کی قید

با مشقت کی سزا دی گئی تھی۔ پنجاب میں بھگت سنگھ کی نوجوان بھارت سبھا بھی اسی زمانے میں وجود میں آئی تھی اور اپریل 1929ء میں بھگت سنگھ کے ساتھ بی۔کے۔دت نے مرکزی اسمبلی میں دو بم مارے تھے۔ ان کا مقصد ہوم ممبر کو ہلاک کر کے اس آرڈیننس کے خلاف احتجاج کرنا تھا جو وائسرائے نے اسمبلی کی منظوری کے بغیر نافذ کر دیا تھا۔

میرٹھ سازش کیس کے ملزموں پر ساڑھے تین سال تک مقدمہ چلتا رہا۔ بالآخر جنوری 1933ء میں فیصلہ سنایا گیا جس کے تحت ایک مسلمان کمیونسٹ لیڈر مظفر احمد کو عمر قید کی سزا دی گئی اور باقی سارے ملزموں کو بھی مختلف المیعاد کی قید کی سزائیں دی گئیں۔ اس مقدمہ کی سماعت کے دوران پارٹی کی سرگرمیاں تقریباً معطل رہیں جبکہ کانگرس کی بورژوا قیادت نے فقید المثال معاشی بحران سے فائدہ اٹھا کر دو مرتبہ 1930ء اور 1932ء میں سول نافرمانی کی تحریکیں چلائیں۔ 1933ء میں کمیونسٹ لیڈروں نے اپنی پارٹی کی از سر نو تنظیم کا عمل شروع کیا تو حکومت ہند کی تعزیری مشینری فوراً حرکت میں آئی اور 1934ء میں پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا۔ برطانوی سامراج کو خطرہ لاحق تھا کہ اگر کمیونسٹوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا تو وہ معاشی بحران سے فائدہ اٹھا کر ہندوستانی عوام کو روسی طرز کے انقلاب کی طرف گامزن کر دیں گے تاہم کمیونسٹ لیڈر روپوش ہو گئے اور انہوں نے خفیہ طور پر پارٹی کی تنظیم نو کا کام جاری رکھا اور وہ اپنے 1930ء کے پروگرام آف ایکشن کے مطابق یہ پروپیگنڈا بھی کرتے رہے کہ حکومت ہند کا پر تشدد عوامی انقلاب کے ذریعے تختہ الٹ کر سوویت حکومت قائم کی جائے۔

لیکن جب 1935ء میں سوویت یونین اور برطانیہ دونوں ہی کو ہٹلر سے خطرہ لاحق ہوا تو ہندوستان کی کمیونسٹ پارٹی اپنے سیاسی نظریے میں یکا یک تبدیلی لے آئی۔ قبل ازیں 1924ء سے لے کر 1935ء تک کمیونسٹ پارٹی کانگرس کی بورژوا قیادت پر نکتہ چینی کرتی تھی اور کہتی تھی کہ گاندھی کی زیر قیادت یہ جماعت برطانوی سامراج اور مقامی سرمایہ داروں کے مفاد میں ہندوستانی عوام کے انقلابی جذبے کو کچلنے کا فرض سرانجام دیتی ہے لیکن اب اس نے انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ متحدہ محاذ بنانے کا فیصلہ کیا۔ عالمی سطح پر سوویت یونین کی پالیسی بھی یہی تھی۔ کمیونسٹ پارٹی اپنے اس فیصلے پر کامیابی سے عمل کرنے میں اس لئے کامیاب ہوگئی کہ 1933ء میں ہندوستان کی سوشلسٹ پارٹی دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی تھی۔ بائیں بازو کے دھڑے کی قیادت

جے پرکاش نارائن کے پاس تھی اور دائیں بازو کے دھڑے کا لیڈر ایم۔آر۔مسانی تھا۔کمیونسٹ پارٹی نے جے۔پرکاش نارائن کی حمایت حاصل کی اور اس طرح یہ بالاخر سوشلسٹ پارٹی اور کانگرس کے ساتھ قومی متحدہ محاذ بنانے میں کامیاب ہوگئی۔

جب ستمبر 1939ء میں ہٹلر نے دوسری جنگ عظیم کا آغاز کیا تو ہندوستانی کمیونسٹوں کو سوویت یونین اور نازی جرمنی کے درمیان 23راگست کے معاہدۂ عدم جارحیت پر کوئی اعتراض نہیں تھا حالانکہ ہٹلر کے فسطائی اور سامراجی عزائم کسی سے پوشیدہ نہیں تھے۔ہندوستانی پارٹی برطانیہ اور جرمنی کے درمیان جنگ کو سامراجی جنگ قرار دے کر اس کی مخالفت کے لئے کانگرس سے اشتراک عمل کرتی تھی۔اس کے اس رویے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہٹلر نے نہ صرف 23راگست کے معاہدے کے مطابق سوویت یونین پر حملہ نہیں کیا تھا بلکہ وہ سوویت یونین اور نازی جرمنی کے درمیان ''معاہدۂ دوستی'' کے لئے بھی بات چیت کر رہا تھا۔بعض مؤرخین کی اطلاع کے مطابق اس بات چیت کے نتیجہ میں مارچ 1941ء میں مجوزہ معاہدۂ دوستی کا جو آخری مسودہ تیار ہوا تھا اس میں یہ تسلیم کیا گیا تھا کہ خلیج فارس کا علاقہ سوویت تمناؤں کا مرکز ہے۔لیکن جب ہٹلر کے سامراجی عزائم کی لامحدودیت کی وجہ سے یہ بیل منڈھے نہ چڑھی اور اس نے 22رجون 1941ء کو سوویت یونین پر حملہ کر دیا تو چند ماہ تک ہندوستانی کمیونسٹوں کی عقل نے کام کرنا بند کر دیا۔ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ان کا عجیب وغریب مؤقف یہ تھا کہ برطانیہ سامراجی جنگ لڑ رہا ہے لیکن سوویت یونین کی جنگ جائز اور منصفانہ ہے۔لیکن جب دسمبر 1941ء میں جاپان نے جنوب مشرقی ایشیا پر بھرپور حملہ کر دیا تو ہندوستانی کمیونسٹوں نے اس جنگ کو عوامی جنگ قرار دے کر برطانیہ کی زیادہ سے زیادہ امداد کرنے کی اپیل کی۔

جنوبی ہندوستان کا ایک ممتاز کمیونسٹ لیڈر نمبو دری پد لکھتا ہے کہ پارٹی کی پالیسی میں اس یکا یک تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ 22رجون 1941ء کے بعد جنگ کی حیثیت دو معاندانہ سامراجی دھڑوں کے درمیان دنیا کو تقسیم کرنے کی جنگ کی نہیں رہی تھی بلکہ اب اس جنگ نے سوویت یونین اور عالمی سوشلزم کے لئے ایک فیصلہ کن جنگ کی حیثیت اختیار کر لی تھی تاہم پالیسی کی اس اچانک تبدیلی سے پارٹی پر بڑا اثر پڑا ہے۔قومی تحریک کی بورژوا قیادت نے، جو قبل ازیں سامراج دشمن عوام کی نظر میں ایک مصالحتی قیادت تھی، اب سامراج کے خلاف مجاہدانہ کردار

اختیار کرلیا تھا اور وہ دشمن کے خلاف آخری جنگ میں مصروف تھی۔ درآں حالیکہ کمیونسٹ، جو ہمیشہ بہترین مجاہدین آزادی تصور کئے جاتے تھے، سودا باز دکھائی دیتے تھے۔ لہٰذا بائیں بازو کا اتحاد ٹوٹ گیا تھا کیونکہ کچھ بائیں بازو کے عناصر دائیں بازو کے کانگرسیوں سے جا ملے تھے۔ اب کمیونزم دشمنی صرف دائیں بازو تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ بائیں بازو کے بعض حلقے بھی اس کی مخالفت کرتے تھے۔ اس طرح سامراج دشمنوں کی ایک نئی نسل پیدا ہوگئی تھی جو مخلصانہ طور پر اس خیال کی حامل تھی کہ کمیونسٹ پارٹی برطانوی سامراج کی تنخواہ دار ایجنٹ ہے۔''[3]

پارٹی کی اس نئی پالیسی کا یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ جولائی 1942ء میں سارے کمیونسٹ لیڈروں کو رہا کرکے ان کی پارٹی کو پھر ایک قانونی تنظیم قرار دے دیا گیا۔ اس وقت تک کرپس مشن ناکام ہو چکا تھا۔ سبھاش چندر بوس فرار ہوکر پہلے جرمنی اور پھر جاپان پہنچ گیا تھا اور اس نے سنگاپور پر جاپانیوں کے قبضہ کے بعد اپنی آزاد ہند فوج کی تشکیل بھی کر لی تھی۔ لہٰذا گاندھی اور دوسرے کانگرسی لیڈروں کو یقین ہو گیا تھا کہ اب ہندوستان سے برطانیہ کا جنازہ نکلنے ہی والا ہے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ہندوستان کی عنان اقتدار فی الفور بلاشرکت غیرے ان کے حوالے کر دی جائے۔ جب 8/اگست 1942ء کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ''ہندوستان چھوڑ دو'' کی پرتشدد تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا اور گاندھی نے اپنی تقریر میں اعلان کیا کہ میں ہندوستان کے لئے آج ہی رات آزادی مانگتا ہوں اور جب اس کے بعد دو ماہ کے اندر مشرقی یو۔ پی اور بہار میں یہ تحریک ختم ہوگئی اور برصغیر کے دوسرے سارے علاقے اس سے متاثر نہ ہوئے تو کمیونسٹ پارٹی کو اپنے جنرل سیکرٹری پی۔ سی۔ جوشی کی قیادت میں اپنی سرگرمیاں وسیع کرنے کا موقع ملا۔

مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کی تائید میں پارٹی کی 19/ستمبر 1942ء کی قرارداد اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی ایک کوشش تھی۔ لہٰذا پارٹی کی رکنیت 1942ء میں دو ہزار سے بڑھ کر 1945ء میں 40 ہزار تک پہنچ گئی۔ اس دوران پارٹی کی طبقاتی ہیئت میں بھی کچھ تبدیلی آئی کیونکہ اب اس میں بمبئی کے بابوؤں اور لکھنؤ کے دانشوروں کے علاوہ مزدور اور کسان بھی شامل ہو گئے تے اور حکومت ہند کو اس کے حلقۂ اثر میں اس توسیع پر بظاہر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اب پارٹی میں کسان ممبروں کا تناسب 36 فیصد، مزدوروں کا 26 فیصد، طلبا کا 12 فیصد اور عورتوں کا 5 فیصد تھا لیکن بدقسمتی سے سنٹرل کمیٹی کی قیادت بابوؤں ہی کے ہاتھ میں رہی۔ اس عرصے میں پارٹی نے

برطانوی ہندوستان کے علاوہ گوالیار، بڑودا، ٹراونکور، میسور اور حیدرآباد کی ریاستوں میں بھی اپنی سرگرمیاں شروع کردی تھیں۔ مزید برآں آل انڈیا سٹوڈنٹس فیڈریشن، پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن، انڈین پیپلز تھیٹر ایسوسی ایشن اور ڈیموکریٹک ویمنز ایسوسی ایشن کے علاوہ دوسری بہت سی ذیلی تنظیموں پر ان کا غلبہ ہوگیا تھا اور بہت سی کسان سبھائیں بھی ان کے زیر اثر آگئی تھیں۔

کمیونسٹ پارٹی پنجاب میں قابل ذکر کردار کیوں ادا نہ کرسکی؟

لیکن پنجاب میں پارٹی کوئی قابل ذکر پیش قدمی نہ کرسکی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صوبہ پنجاب بھرتی کا علاقہ تھا اس لئے حکومت ہند اس علاقے میں کمیونسٹوں کو اتنی کھلی چھٹی نہیں دے سکتی تھی جتنی کہ اس نے اسے ان علاقوں میں دی تھی جو کانگرس کے زیر اثر تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ نہری نظام آبپاشی کے باعث وسطی پنجاب میں چھوٹے مالکان اراضی کی تعداد خاصی زیادہ تھی اور ان کے لئے بحیثیت طبقہ پارٹی کے انقلابی پروگرام میں دلچسپی نہیں تھی۔ تیسری وجہ یہ تھی کہ 1921ء کے بعد اس صوبہ میں فرقہ وارانہ کشیدگی میں اس قدر اضافہ ہوگیا تھا کہ یہاں معاشی پروگرام کے تحت کسی غیر فرقہ وارانہ پارٹی کے پھلنے پھولنے کی گنجائش بہت کم تھی۔ یہاں تک کہ پنجابی جاگیرداروں کی غیر فرقہ وارانہ یونینسٹ پارٹی بھی فرقہ واریت سے عاری نہیں تھی۔ چوتھی وجہ یہ تھی کہ برطانوی سامراج نے ایک طے شدہ پالیسی کے تحت اس صوبہ میں صنعتکاری نہیں ہونے دی تھی اس لئے یہاں پرولتاری طبقے کا وجود نہ ہونے کے برابر تھا۔ صرف ریلوے میں مزدوروں کا ایک طبقہ تھا لیکن ان کی بھی 1942ء تک ٹریڈ یونین بنیادوں پر کوئی تنظیم نہیں ہوئی تھی اور وہ بھی فرقہ وارانہ تعصبات سے بالاتر نہیں تھے۔

پانچویں وجہ یہ تھی کہ تاریخی وجوہ کی بنا پر پنجابی مسلمان سیاسی لحاظ سے بہت پسماندہ تھے اور معاشرتی اور معاشی لحاظ سے وہ ہندو ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے استحصال کے بوجھ تلے بری طرح دبے ہوئے تھے۔ ان کی نظر میں ہندو ساہوکاروں کی حیثیت بالکل ایسی ہی تھی جیسی کہ یورپ میں یہودی ساہوکاروں کی تھی۔ لہٰذا وہ اپنے استحصالیوں کے ساتھ کسی غیر فرقہ وارانہ جماعت میں یکجا نہیں ہوسکتے تھے۔ چونکہ پنجابی ہندو بالعموم خوشحال درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ان میں جو معدودے چند ترقی پسند نوجوان پارٹی میں کام کرتے تھے انہیں بھی

غریب مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے میں بڑی مشکل پیش آتی تھی۔طبقاتی تضاد راستے میں حائل تھا۔صوبائی پارٹی کی قیادت پر زیادہ تر سکھوں کا غلبہ تھا حالانکہ صوبہ میں ان کی آبادی کا تناسب 13 فیصد سے زیادہ نہیں تھا۔ پارٹی کے سکھ لیڈر اور کارکن فی الواقعہ بڑی لگن اور خلوص سے کام کرتے تھے۔انہیں بالخصوص غریب کسانوں کی تنظیم کے کام میں خاصی مہارت حاصل تھی لیکن یہ ایک اور بدقسمتی تھی کہ تاریخی فرقہ وارانہ تضاد ان کے اور غریب مسلمان کسانوں کے درمیان غیریت کی دیوار کو پوری طرح مسمار نہیں ہونے دیتا تھا۔

چھٹی اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ 1940ء کے بعد پنجابی مسلمانوں کے لئے مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان میں بے حد دلکشی پیدا ہوگئی تھی۔ان کا قومیتی تضاد اتنا شدید ہوگیا ہوا تھا کہ ان کے طبقاتی تضاد نے وقتی طور پر ثانوی حیثیت اختیار کرلی تھی۔صوبہ کے مراعات یافتہ ہندوؤں اور سکھوں نے اپنی تنگدلی و تنگ نظری کے باعث انہیں سیاسی، معاشرتی اور معاشی لحاظ سے اس مقام پر پہنچا دیا تھا کہ وہ اپنے ہر مرض کا مداوا مطالبہ پاکستان کی تکمیل میں دیکھتے تھے۔

کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کی 19 ستمبر 1942ء کی قرارداد میں اسی تلخ حقیقت کا نیم دلانہ اعتراف کیا گیا تھا اور اس مؤقف سے بھی اتفاق کیا گیا تھا کہ کانگرس کی بورژوا قیادت کا متحدہ قومیت کا نظریہ باطل اور ناقابل عمل ہے جب تک برصغیر میں مختلف قومیتوں کو مذہبی، لسانی، نسلی اور ثقافتی بنیادوں پر حق خود اختیاری نہیں دیا جائے گا اس وقت تک یہاں پائیدار امن قائم نہیں ہوگا۔

تاہم پنجاب میں کمیونسٹ پارٹی کی ان مشکلات کے باوجود صوبائی مسلم لیگ کو اس کی 19 ستمبر 1942ء کی قرارداد سے خاصا فائدہ پہنچا۔اس لئے کہ نہ صرف ہندو اور سکھ کامریڈ اپنی سرگرمیوں کے دوران مطالبہ پاکستان کی مخالفت نہیں کرتے تھے بلکہ وہ قومیتوں کو حق خود اختیاری دینے کے اصول کی بنیاد پر اس کی بالواسطہ طور پر تائید وحمایت کرتے تھے اور جو تھوڑے بہت پنجابی مسلمان پارٹی سے وابستہ تھے انہوں نے پارٹی کی قومی متحدہ محاذ کی حکمت عملی کے تحت مسلم لیگ کے جلسوں اور جلوسوں میں شامل ہونا شروع کردیا تھا۔لہٰذا جب دسمبر 1942ء میں سر سکندر حیات خان کے انتقال کے بعد خضر حیات خان ٹوانہ کی حکومت بنی تو صوبہ کے سیاسی حالات میں خاصی تبدیلی آچکی تھی۔اب مسلم لیگ کے مطالبہ پاکستان کی حیثیت محض فرقہ پرستانہ مذہبی مطالبہ کی نہیں رہی تھی بلکہ اس کی حیثیت مسلم قومیت کے مطالبہ حق خود اختیاری کی ہوگئی تھی۔

پنجاب کے مسلم جاگیرداروں کے اہم دھڑے کی خضر حیات ٹوانہ کے خلاف بغاوت

اگرچہ خضر حیات ٹوانہ نے برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد دہلی جا کر قائداعظم محمد علی جناح سے اس امر کی یقین دہانی کرائی تھی کہ صوبہ میں اکتوبر 1937ء کے سکندر۔ جناح پیکٹ پر عمل ہوتا رہے یعنی یونینسٹ پارٹی کی مخلوط حکومت جاری رہے گی۔ تاہم اس مسئلہ پر یونینسٹ پارٹی کے مسلم ارکان میں پھوٹ کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ مسلم جاگیرداروں کے ایک دھڑے کے لئے خضر حیات کی قیادت قابل قبول نہیں تھی۔ اس کا بطور صوبائی وزیر اعظم انتخاب یونینسٹ اسمبلی پارٹی یا مسلم لیگ اسمبلی پارٹی نے نہیں کیا تھا بلکہ سر چھوٹو رام کے اعلان کے بعد گورنر سر برٹرنڈ گلینسی نے اسے وزارت سازی کی دعوت دے دی تھی۔

مسلم لیگ کے جس دھڑے کو خضر حیات خان کی اس طرح نامزدگی منظور نہیں تھی اس میں سر شاہنواز مرحوم کا بیٹا نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ، احمد یار دولتانہ مرحوم کا بیٹا ممتاز دولتانہ اور سر سکندر حیات خان مرحوم کا بیٹا شوکت حیات خان زیادہ سرگرم تھے۔ جب سر سکندر کا انتقال ہوا تھا اس وقت شوکت حیات خان فوج میں ملازم تھا لیکن اسے اپنے والد کی گرانقدر خدمات کے انعام کے طور پر فوج سے فارغ کر کے صوبائی وزارت کا رکن بنا دیا گیا تھا۔ مسلم جاگیرداروں کے اس دھڑے کی جانب سے خضر حیات خان کی مخالفت کی ایک وجہ تو جاگیرداروں کی دھڑے بندی کی سیاست میں مضمر تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اس دھڑے کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ سٹیفورڈ کرپس کے دورۂ ہندوستان کے بعد پنجاب اور برصغیر کے دوسرے علاقوں میں سیاسی ہوا کا رخ بڑی تیزی سے یونینسٹ پارٹی کے خلاف ہو رہا ہے۔ 1942ء میں کانگرس کی پرتشدد ایجی ٹیشن کی ناکامی کے بعد صدر مسلم لیگ محمد علی جناح کا سیاسی وقار بہت بلند ہو گیا تھا جگہ جگہ مسلم عوام نے خود ہی مسلم لیگ کی شاخیں قائم کر لی تھیں اور چاروں طرف سے قائداعظم زندہ باد اور ''لے کے رہیں گے پاکستان'' کے نعرے سنائی دیتے تھے۔

3 مارچ 1943ء کو سندھ اسمبلی نے سب سے پہلے یہ امتیاز حاصل کیا جب اس نے ایک قرارداد کے ذریعے اس مؤقف کا اظہار کیا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں لہٰذا ان کے لئے ایک

الگ مملکت ہونی چاہیے۔ اس کے بعد جب 1943ء میں ہی راج گوپال اچاریہ نے اپنے فارمولے میں مسلم اکثریت کے علاقوں کی بذریعہ رائے شماری علیحدگی کے اصول کو تسلیم کر لیا تو جناح کا سیاسی مقام اور بھی بلند ہو گیا۔ اس عرصے میں راج گوپال اچاریہ کی ہی خواہش کے مطابق جناح اور گاندھی کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ بھی شروع ہو چکا تھا اور اس طرح یہ حقیقت عملی طور پر تسلیم کی جا چکی تھی کہ قائداعظم محمد علی جناح اور ان کی مسلم لیگ کی منظوری کے بغیر ہندوستان کے آئینی اور سیاسی مستقبل کا مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔

فروری 1944ء میں راج گوپال اچاریہ نے جیل میں گاندھی سے ملاقات کر کے اسے اپنا فارمولا دکھایا تو اس نے بھی اس سے اتفاق کر لیا۔ اس کی بظاہر وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک جنگ عظیم کا پانسہ پلٹ چکا تھا۔ جرمنی، جاپان اور اٹلی کی فوجوں کو ہر محاذ پر پے در پے شکستیں ہو رہی تھیں اور ساری دنیا کو پتہ چل گیا تھا کہ اب فسطائی بلاک کی قطعی شکست میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ لنلتھگو کے عہدے کی معیاد اکتوبر 1943ء میں ختم ہو چکی تھی اور اس کی جگہ 1944ء کے اوائل میں ایک اعلیٰ فوجی افسر لارڈ ویول (Wavell) کے تقرر کا یہ مطلب سمجھا گیا تھا کہ اب ہندوستان کے بارے میں برطانوی سامراج کی پالیسی میں کوئی بنیادی تبدیلی ہونے والی ہے۔ لارڈ ویول نے 17 رفروری 1944ء کو مرکزی اسمبلی میں اپنی پہلی پالیسی تقریر میں کرپس فارمولا کے برعکس برصغیر کی تقسیم کو خارج از امکان قرار دیتے ہوئے کہا تھا کہ ''جغرافیہ کو بدلنا ممکن نہیں۔ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے اور اس کے دفاع، امور خارجہ اور اقتصادیات کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس کی سالمیت قائم رہے۔'' لیکن صدر مسلم لیگ قائداعظم محمد جناح نے ویول کی اس تقریر سے کوئی خاص اثر قبول نہ کیا۔ شاید اس وقت انہیں یہ احساس ہو چکا تھا کہ انہوں نے اور ان کی مسلم لیگ نے جولائی 1937ء کے بعد کانگرسی قیادت کی سیاسی کوتاہ اندیشی، رعونت اور موقع پرستی کی بنا پر جو بے پناہ سیاسی طاقت حاصل کر لی ہے اس کے پیش نظر برطانوی سامراج کی کوئی بھی نئی پالیسی برصغیر کے اس تاریخی عمل کو نہیں روک سکتی جو مارچ 1942ء میں کرپس فارمولا نے معین کر دیا تھا۔

جناح کی طرف سے خضر حیات کا لیگ سے اخراج
اور پنجاب مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا قیام

قائداعظم محمد علی جناح اسی احساس کے ساتھ اپریل 1944ء میں لاہور آئے۔ مقصد یہ تھا کہ پنجاب اسمبلی کے مسلم ارکان میں گزشتہ ایک سال سے دھڑے بندی پیدا ہوگئی ہے اس کا کوئی تصفیہ کیا جائے۔ جناح نے اس سلسلے میں وزیراعظم خضر حیات خان سے کئی ملاقاتیں کیں اور اس کی وزارت کے غیر مسلم ارکان سے بھی بات چیت کی اور بالاخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ آئندہ پنجاب میں مسلم لیگ پارٹی کا وجود ضروری ہے۔ سر سکندر نے اپنے پانچ سالہ عہد اقتدار میں یہ پارٹی نہیں بننے دی تھی کیونکہ اولاً اس کی یونینسٹ پارٹی کے غیر مسلم ارکان اس پر اعتراض کرتے تھے اور دوئم اسے خود بھی مسلم لیگ کے سیاسی نظریے سے کلی طور پر اتفاق نہیں تھا لیکن وقت آ گیا تھا کہ اسمبلی میں اس دوغلی پوزیشن کو ختم کیا جائے۔ چنانچہ جناح نے خضر حیات خان کو حکم دیا کہ مسلم لیگ پارٹی کے ممبر آئندہ کے لئے صرف مسلم لیگ کا سیاسی لیبل اختیار کریں اور غیر مسلم ممبروں کے ساتھ اپنی کولیشن کو ''مسلم لیگ کولیشن پارٹی'' کا نام دیں اور کولیشن وزارت کو بھی یونینسٹ وزارت کی بجائے ''مسلم لیگ کولیشن وزارت'' کا نام دیا جائے۔ مگر خضر حیات نہ مانا اور وہ اکتوبر 1937ء کے سکندر۔ جناح پیکٹ کی پابندی پر مصر رہا اور اس نے 26 راپریل کو شوکت حیات خان کو اپنی وزارت سے برطرف کر دیا۔ جناح نے اس سے اس حکم عدولی کی تحریری جواب طلبی کی جس کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چنانچہ اسے 27 رمئی 1944ء کو مسلم لیگ سے خارج کر دیا گیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کی مجلس عمل کی اس کاروائی کے بعد خضر وزارت کے دو پارلیمانی سیکرٹری راجہ غضنفر علی خان اور صوفی عبدالحمید اپنے عہدوں سے مستعفی ہو گئے اور صوبائی اسمبلی میں 23 مسلم لیگ ارکان کی ایک حزب اختلاف کی تشکیل ہوئی۔

جناح کی جانب سے پنجاب کے وزیراعظم کے خلاف اس تادیبی کاروائی سے صوبہ کے مسلم تعلیم یافتہ درمیانہ طبقہ میں قائداعظم کے سیاسی تدبر اور جرأت کی دھاک بیٹھ گئی۔ یہ وہی جناح تھے جنہیں 1936ء کے اوائل میں سر فضل حسین نے لیگ پارلیمانی بورڈ بنانے کی اجازت نہیں دی تھی اور انہیں کہا تھا کہ ''پنجاب کو ہاتھ مت لگاؤ'' اور یہ وہی جناح تھے جن کو سر سکندر حیات

خان نے اپنی 11 / مارچ 1941ء کی تقریر میں بالواسطہ طور پر متنبہ کیا تھا کہ پنجاب کے معاملات میں کسی غیر پنجابی کی مداخلت کو برداشت نہیں کیا جائے گا اور اب 1944ء میں یہ وہی جناح تھے جنہوں نے پنجاب کے وزیراعظم خضر حیات خان کو، جس کی پشت پناہی گورنر گلینسی اور اسمبلی کے غیر مسلم ارکان کا ایک طاقتور گروہ کر رہا تھا، اپنی جماعت سے خارج کر کے اسے سیاسی معرکہ آرائی کے لئے چیلنج کیا تھا۔

جناح نے یہ کارروائی اس لئے کی تھی کہ سب کو معلوم تھا کہ جنگ ختم ہونے والی ہے اور اس کے خاتمہ کے فوراً بعد عام صوبائی انتخابات ہوں گے جو گزشتہ دو سال سے معرض التوا میں پڑے ہوئے تھے۔ پنجاب کے ان متوقع انتخابات میں مسلم لیگ کا یونینسٹ پارٹی سے الگ جماعت کی حیثیت سے حصہ لینا ضروری تھا تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ مسلم لیگ واقعی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور اس سے تصفیہ کئے بغیر ہندوستان کے آئینی و سیاسی مستقبل کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

تحریک پاکستان میں مسلم لیگی جاگیرداروں کے کردار کی اصلیت

یونینسٹ پارٹی کے جن ارکان نے خضر وزارت سے بغاوت کر کے اپنے آپ کو مسلم لیگ سے وابستہ کیا تھا وہ سب کے سب دراصل سیاسی مرغان بادنما تھے۔ ان میں کسی ایک نے بھی مارچ 1940ء کے بعد مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کی اعلانیہ تائید و حمایت نہیں کی تھی بلکہ وہ سر سکندر کی زونل سکیم کی تائید و حمایت کر کے قرارداد لاہور میں ترمیم کا مطالبہ کرتے رہے تھے۔ نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ کے والد نواب سر شاہنواز مرحوم نے تو فروری 1941ء میں اس مقصد کے لئے مرکزی لیگ کو ایک تحریری تجویز بھی بھیجی تھی جبکہ نواب افتخار حسین نے 8 / مارچ 1942ء کو اپنے والد کے انتقال سے قبل کبھی سیاست میں دلچسپی نہیں لی تھی۔

ممتاز دولتانہ لندن سے بیرسٹری کر کے 1940ء میں واپس لاہور آیا تھا لیکن اس نے کبھی مسلم لیگ کی تحریک میں عملی دلچسپی نہیں لی تھی حالانکہ وہ 6 / اگست 1940ء کو اپنے والد احمد یار خان دولتانہ کے انتقال کے بعد ضلع ملتان کے علاقے میلسی سے یونینسٹ پارٹی کے ٹکٹ پر اسمبلی کا ممبر منتخب ہو گیا تھا۔ 1940ء سے لے کر مئی 1944ء تک اس کی اسمبلی کے اندر یا باہر کسی تقریر یا

تحریر کا حوالہ نہیں دیا جاسکتا جس سے یہ ثابت ہو کہ یہ نوجوان اپنی سیاسی زندگی کی ابتدا ہی سے مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کا خواہاں تھا۔

شوکت حیات خان 26 دسمبر 1942ء کو اپنے والد سر سکندر حیات خان کے انتقال سے قبل فوج میں کیپٹن تھا اس لیے اس کے برصغیر کی سیاست میں حصہ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ راجہ غضنفر علی خان نے 1937ء میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر اسمبلی کا انتخاب جیتا تھا لیکن فوراً ہی شرمناک قلابازی کھا کر یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو گیا تھا اور بطور انعام سکندر کی وزارت میں اس نے پارلیمانی سیکرٹری کا عہدہ قبول کر لیا تھا اور جب تک سکندر حیات زندہ رہا یہ اس کے ہر قول و فعل کی اعلانیہ تائید و حمایت کرتا رہا۔ یہ بھی سر شاہنواز کی طرح قرارداد لاہور کا مخالف تھا اور سکندر حیات کی زونل سکیم کا حامی تھا۔

اسی طرح میاں امیر الدین، چودھری نذیر احمد خان اور متعدد دوسرے ''معماران پاکستان'' اور ''فدایان اسلام'' سکندر حیات خان اور برطانوی سامراج کے چمچے تھے۔ یہ 1944ء کے اوائل میں مسلم لیگ کی بینڈ ویگن میں محض اس لئے سوار ہوئے تھے کہ اس وقت تک مسلمانوں کے درمیانہ طبقہ کے مطالبہ پاکستان نے ایک زوردار عوامی تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی۔

خضر حیات نے اس موقع پر جناح کے سامنے گھٹنے محض اس لئے نہیں ٹیکے تھے کہ وائسرائے ویول نے اپنی فروری 1944ء کی تقریر میں برصغیر کی تقسیم کو خارج از امکان قرار دیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے گورنر گلینسی کی زبردست پشت پناہی حاصل تھی جس نے شوکت حیات خان کو عین اس دن برطرف کیا تھا جس دن کہ جناح۔ خضر گفت و شنید کی ناکامی کا اعلان ہوا تھا۔ خضر حیات کی تعلیم بالکل واجبی تھی۔ وہ برطانوی سامراج کا خاندانی پٹھو تھا۔ اسے یقین تھا کہ جب تک اسے لاٹ صاحب کی سرپرستی حاصل رہے گی اس وقت تک اسے اقتدار کی گدی سے کوئی نہیں ہٹا سکے گا۔

گاندھی ہندوؤں کا نمائندہ، جناح مسلمانوں کا نمائندہ

قائداعظم محمد علی جناح پنجاب کے قضیے سے فارغ ہو کر واپس بمبئی پہنچے تو اس وقت تک گاندھی کی رہائی عمل میں آ چکی تھی۔ کیونکہ لارڈ ویول کی 17 فروری کی تقریر کے بعد برطانوی

سامراج اور کانگرس کے درمیان مصالحت کی زمین ہموار ہوگئی تھی۔ ویول نے لبرل لیڈر سر تیج بہادر سپرو وغیرہ کی سفارش پر پہلے تو گاندھی کو اپریل میں ناسازئ طبع کی وجہ سے عارضی طور رہا کیا اور پھر 6رمئی کو اسے غیر مشروط طور پر رہائی دے دی۔ گاندھی نے اپنی رہائی کے بعد وائسرائے اور جناح کے ساتھ خط و کتابت کی۔ جولائی میں راج گوپال اچاریہ نے اپنا وہ فارمولا شائع کر دیا جس میں مطالبہ پاکستان کو اصولی طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا اور گاندھی نے جس کی منظوری فروری 1944ء میں جیل میں دے دی تھی۔

9رستمبر 1944ء کو بمبئی میں گاندھی۔ جناح ملاقات ہوئی جس میں اچاریہ فارمولا زیر بحث آیا۔ بات چیت کا یہ سلسلہ 27رستمبر تک جاری رہا جس کے دوران گاندھی نے 15رستمبر کو جناح کے نام ایک خط میں بعض تجاویز پیش کیں جن میں سے ایک تجویز یہ تھی کہ سرحد، سندھ، بلوچستان، پنجاب، بنگال اور آسام کے جن علاقوں میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہے وہ اگر بذریعہ رائے شماری ہندوستان سے علیحدگی کی خواہش ظاہر کریں گے تو انہیں اپنی اس خواہش کی تکمیل کی اجازت دی جائے گی۔ لیکن یہ علیحدگی دوقومی نظریے کے تحت نہیں ہوگی بلکہ ایسے ہوگی جیسے ایک خاندان کے افراد ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں اور وہ امور خارجہ، دفاع، اندرونی مواصلات، کسٹم اور تجارت وغیرہ کے معاملات کو خوش اسلوبی سے چلانے کے لئے کوئی مشترکہ انتظام کر سکیں گے۔ جناح نے یہ تجویز مسترد کر دی کیونکہ انہیں شبہ تھا کہ گاندھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ خاندان کا نام لے کر ہندوستان کے لئے کنفیڈرل یا فیڈرل ڈھانچے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ جناح اپنے اس مؤقف پر مصر رہے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ الگ قومیں ہیں اور برصغیر کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ ان دونوں قوموں کی الگ الگ آزاد و خود مختار مملکتیں قائم ہوں گی۔

خالد بن سعید کی رائے یہ ہے کہ ''ستمبر 1944ء میں گاندھی نے مطالبہ پاکستان دراصل تسلیم کر لیا تھا اور بعد میں جو پاکستان وجود میں آیا وہ اس کی اس تجویز کے عین مطابق تھا لیکن جناح نے اس وقت گاندھی کی یہ تجویز اس لئے منظور نہیں کی تھی کہ ان کو اس وقت تک صحیح طور پر اندازہ نہیں تھا کہ ان چھ صوبوں کے مسلم عوام میں ان کا صحیح مقام کیا ہے۔ انہیں یقین نہیں تھا کہ اگر ان علاقوں میں استصواب ہوا تو مسلمانوں کی اکثریت مطالبہ پاکستان کی تائید کرے گی۔ انہیں یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ گاندھی آج جو کچھ کہہ رہا ہے کانگرس کے دوسرے لیڈر جیلوں سے باہر آ کر

اس کی تصدیق کریں گے یا نہیں۔ مزید برآں انہیں معلوم تھا کہ پاکستان کی تشکیل محض کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان مفاہمت کی بنا پر عمل میں نہیں آئے گی بلکہ اس کے لئے برطانوی حکومت کی منظوری ضروری ہوگی۔ جب تک برطانوی حکومت کسی سمجھوتے میں شریک نہیں ہوگی اس وقت تک اس کو عملی جامہ پہنایا نہیں جا سکے گا۔ تاہم جناح کے نقطۂ نگاہ سے یہ بات چیت اس لحاظ سے بہت کامیاب رہی کہ اس سے یہ ثابت ہوگیا تھا کہ گاندھی صرف ہندوؤں کا نمائندہ ہے اور جناح کو مسلمانوں کی نمائندگی حاصل ہے۔''[4] گویا گاندھی نے عملی طور پر یہ تسلیم کر لیا تھا کہ مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اس دوران جناح نے جس اعلیٰ سیاسی تدبر کا مظاہرہ کیا اس سے پنجابی مسلمان بہت متاثر ہوئے اور ان کا یہ یقین مزید پختہ ہوگیا کہ ان کا یہ سیاسی وکیل ہندوؤں اور انگریزوں کے دام فریب میں نہیں آ سکتا تھا۔

باب: 12

1945-46ء کے انتخابات، قیام پاکستان اور پنجابی شاونزم کی نمود

حمید نظامی کون تھا اور اخبار نوائے وقت کیسے جاری ہوا؟

جب 1944ء میں جناح، گاندھی، تیج بہادر سپرو، راج گوپال اچاریہ اور وائسرائے ویول کے درمیان خط وکتابت اور بات چیت کا سلسلہ جاری تھا اس زمانے میں پنجاب میں انتخابی مہم زور شور سے شروع ہوچکی تھی حالانکہ اس وقت تک جرمنی اور جاپان نے ہتھیار نہیں ڈالے تھے اور اس بنا پر حکومت برطانیہ نے نئے انتخابات کا اعلان نہیں کیا تھا۔ کمیونسٹ لیڈر سجاد ظہیر کے بیان کے مطابق وزیراعظم خضر حیات کے مسلم لیگ سے اخراج کے تقریباً دو ماہ بعد حکومت پنجاب نے صوبہ کے سارے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹوں کے نام یہ خفیہ ہدایات جاری کی تھیں کہ "(1) ان تمام سرکاری ملازموں کو برطرف کر دیا جائے جو خود یا جن کے رشتہ دار لیگ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ (2) ان سارے ٹھیکیداروں کے ٹھیکے منسوخ کردو جو مسلم لیگ میں شامل ہیں یا جن کی ہمدردیاں لیگ کے ساتھ ہیں۔ (3) اگر کوئی ارکان اسمبلی یونینسٹ پارٹی کو چھوڑ کر مسلم لیگ میں شامل ہونے کی جرأت کریں تو انہیں انتقامی کارروائی کرنے اور ان کی مراعات ورعایات واپس لینے کی دھمکی دو۔ سیالکوٹ اور فیروزپور میں پہلے ہی ایسا کیا جارہا ہے۔ (4) جو ارکان اسمبلی یونینسٹ پارٹی کے ساتھ ہیں انہیں انعام دو۔ (5) جہاں تک ممکن ہو سکے مسلم لیگ کو جلسے کرنے کی اجازت مت دو۔ لاہور، امرتسر، جالندھر اور گورگاؤں میں اسی مقصد کے تحت دفعہ 144 نافذ کر دی گئی ہے۔"[1]
چونکہ یونینسٹ پارٹی کی اس تحریص وتخویف کی پالیسی کی وجہ سے صوبہ کے بیشتر مسلم اخبارات بھی

روزنامہ ''انقلاب کی سرکردگی میں مسلم لیگ اوراس کے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کرتے تھے اس لئے 22 رجولائی 1944ء کولاہور کے ایک ہفت روزہ جریدے ''نوائے وقت'' نے قائداعظم محمد علی جناح کی ''دعاو پیغام'' کے ساتھ روزانہ اخبار کی صورت اختیار کرلی۔

اس اخبار کا ایڈیٹر ایک نوجوان حمید نظامی تھا جس کی پیدائش 3 راکتوبر 1915ء کو ضلع لائل پور (موجودہ فیصل آباد) کے ایک چھوٹے سے قصبہ سانگلہ ہل کے ایک غریب گھرانے میں ہوئی تھی۔ چونکہ یہ بچہ طبعاً محنتی تھا اس لئے اس نے اپنے والدین کی مالی مشکلات کے باوجود تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد یہ اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوا جہاں اس نے اس زمانے کے بیشتر غریب مسلم طلبا کی طرح اپنی خوراک اور تعلیم کے اخراجات خود اپنی محنت سے پورے کئے۔ وہ 1921ء سے لے کر 1937ء تک اس زمانے میں پل کر جوان ہوا تھا۔ جس زمانے میں صوبہ میں فرقہ وارانہ کشیدگی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھی اور عام مسلمان نوجوانوں کی زندگی سیاسی، معاشرتی اور معاشی محرومیوں اور تلخیوں سے بھرپور تھی۔ تیسری دہائی کے معاشی بحران نے ان نوجوانوں کی معاشی زندگی کو ناقابل برداشت حد تک دشتوار اور تلخ بنادیا تھا۔ لہٰذا ان کا خیال تھا کہ پاکستان میں ان کی زندگی کی آسودگی کا راز مضمر ہے۔ حمید نظامی ان نوجوانوں میں سے تھا جو علامہ اقبال کے اسرار خودی اور رموز بے خودی سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ وہ سمجھتا تھا کہ اگر اقبال کے اس پیغام پر عمل کیا جائے تو مسلمانان ہند کی عظمت رفتہ کا احیا ہوسکتا ہے۔ وہ اقبال کو گفتار کا امام سمجھتا تھا اور اسی نسبت سے کردار کے امام کا منتظر تھا۔ اس کی تخیل پسندی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔

1937ء کے اوائل میں وہ اسلامیہ کالج سٹوڈنٹس یونین کا سیکرٹری بنا اور پھر یکم ستمبر 1937ء کو آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا صدر بن گیا۔ مسلم طلبا کی اس نئی تنظیم کا سیکرٹری پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کے ترجمان اخبار ''انقلاب'' کے ایڈیٹر عبدالمجید سالک کا بیٹا عبدالسلام خورشید تھا۔ فیڈریشن کے زیراہتمام پہلا جلسہ عام 29 رستمبر 1937ء کو ہوا۔ 38-1937ء میں حمید نظامی اور ضلع جہلم کے ایک اور طالب علم خورشید عالم نے صوبہ کا دورہ کر کے مختلف شہروں کے مسلم طلبا کو فیڈریشن کے تحت منظم ہونے کی ترغیب دی۔ 1939ء کو اس تنظیم کے عہدیداروں میں اختلافات اور حمید نظامی کے غم ہائے روزگار کی وجہ سے فیڈریشن کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں تو اس سال ایک اور طالب علم مرزا عبدالحمید فیڈریشن کا صدر بن گیا اور چودھری نصراللہ کا انتخاب بطور سیکرٹری ہوا۔

جب مارچ 1941ء میں لاہور میں قائداعظم کی زیر صدارت فیڈریشن کا خصوصی پاکستان سیشن ہوا تو اس کے بعد قائداعظم کی خواہش کے مطابق لاہور کا ایک مسلم لیگی جاگیردار میاں بشیر احمد اس کا صدر بن گیا حالانکہ وہ طالب علم نہیں تھا۔ چنانچہ میاں بشیر احمد نے حمید نظامی اور بعض دوسرے نوجوانوں کی امداد سے فیڈریشن کی ازسرنو تنظیم کی اور اس کی مختلف شہروں میں برانچیں قائم کیں۔ اس نے فیڈریشن کی مرکزی تنظیم کی مجلس عاملہ کے ارکان اور اس کے عہدیداروں کی بھی نامزدگی کی۔ قائداعظم نے اس مقصد کے لئے میاں بشیر احمد کا انتخاب اس لئے کیا تھا کہ یہ ''خاندانی رئیس'' تھا اور آنے والے انتخابات کے لئے مسلم طلبا کی تنظیم کے لئے ضروری اخراجات برداشت کر سکتا تھا۔ اسلامیہ کالج کے غریب طلبا مطلوبہ اخراجات برداشت کرنے کی سکت نہیں تھی۔ چونکہ ضلع لائل پور میں درمیانہ طبقہ کے خوشحال مالکان اراضی کی خاصی تعداد تھی اس لئے لائل پور شہر میں مسلم طلبا کی سرگرمیاں بھی زیادہ تھیں۔ چنانچہ 42-1941 میں لائل پور میں فیڈریشن کے زیراہتمام ایک ایجوکیشنل کانفرنس اور دوسری پاکستان کانفرنس منعقد ہوئی۔

اس وقت تک حمید نظامی سلسلہ تعلیم ختم کر کے اپنے ذریعۂ روزگار کے طور پر صحافت کا پیشہ اختیار کر چکا تھا۔ اس نے اس مقصد کے لئے حکومت پنجاب کی ایک سکیم کے تحت کچھ عرصہ کے لئے صحافت کی ٹریننگ لی تھی اور صوبائی سیکریٹریٹ کی پریس برانچ میں ملازم بھی ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے ڈاکٹر ستیہ پال کے اردو روزنامہ ''نیشنل کانگرس'' میں بھی کام کیا تھا۔ حمید نظامی کے دل میں صحافت کا شوق دراصل طالب علمی کے زمانے میں ہی پیدا ہو گیا تھا چنانچہ قرارداد پاکستان کی منظوری کے ایک ہفتہ بعد 29 / مارچ 1940ء کو جب ایک پندرہ روزہ جریدے نوائے وقت کی اشاعت شروع ہوئی تو یہ اس کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ اگرچہ یہ جریدہ اسلامیہ کالج کے تعلیم یافتہ کئی نوجوانوں کی اجتماعی کوششوں سے نکلتا تھا لیکن اس میں زیادہ تر کام حمید نظامی ہی کرتا تھا۔ اس کے پہلے شمارے میں قائداعظم محمد علی جناح، مولوی عبدالحق، مولانا ابوالکلام آزاد اور سر عبدالقادر کے پیغامات شائع ہوئے تھے اور اس کا نصب العین یہ تھا کہ اس کے ذریعے اردو زبان کو فروغ دیا جائے گا اور علامہ اقبال کے پیغام کو مقبول عام بنایا جائے گا۔ لیکن جب پنجاب میں مطالبہ پاکستان نے بہت زور پکڑا تو یہ بھی رفتہ رفتہ پاکستان کا علمبردار بن گیا۔ میاں بشیر احمد اس کا سرپرست تھا اور اس حیثیت سے پیشانی پر اس کا نام تقریباً ایک سال تک چھپتا رہا جس سے عام تاثر

یہ تھا کہ علم، ادب اور مسلم لیگ کی سیاست میں دلچسپی رکھنے والا یہ خاندانی رئیس اس کے اخراجات کی کمی پوری کرتا تھا۔ اور غالباً وہ حمید نظامی کو اس کی صحافتی خدمات کو کچھ معاوضہ بھی دیتا تھا۔

15 رنومبر 1942ء کو جس دن قائداعظم کی زیر صدارت جالندھر میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کا اجلاس ہوا۔ نوائے وقت کی اشاعت ہفتہ وار کر دی گئی۔ لیکن اس کے تقریباً دو ہفتے بعد طلبا کی باہمی دھڑے بندی کے باعث حمید نظامی کو فیڈریشن کی صدارت سے الگ کر دیا گیا۔ 4 ردسمبر کو فیڈریشن کی مجلس عاملہ نے حمید نظامی کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک منظور کی اور اس کی جگہ ظہور عالم شہید قائم مقام صدر بن گیا۔ تاہم حمید نظامی ہفت روزہ نوائے وقت سے منسلک رہا جس میں مطالبہ پاکستان کے حق میں پراپیگنڈا ہوتا تھا۔

حمید نظامی کو یہ شکایت تھی کہ مسلم لیگ کی قیادت اسلام سے بیگانہ ہے۔ اس نے اپنی اس شکایت کا اظہار نواب بہادر یار جنگ کے نام اپنے 8 رفروری 1944ء اور 22 رفروری 1944ء کے خطوط میں کیا تھا۔ حمید نظامی کے یہ خطوط تو دستیاب نہیں ہیں لیکن بہادر یار جنگ کے جوابات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلم لیگ ہائی کمان کی اسلام سے بیگانگی کا کس قدر شاکی تھا۔ بہادر یار جنگ نے اپنے 12 رفروری کے جوابی خط میں لکھا تھا کہ ''قاضی عیسیٰ کی تقریر اور نوابزادہ لیاقت علی خان صاحب کی تائید کو سن کر تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ لیگ کے موجودہ تمام لیڈر اسی ملت نامسلمان کے قائل ہیں جس کو دعوائے اسلام ہے..... میں تو قاضی عیسیٰ صاحب کے اس جملہ کو کہ ''پاکستان کا نظام حکومت اس علاقے کی اکثریت طے کرے گی'' بہت غنیمت تصور کرتا ہوں۔ انہوں نے یہ تو نہیں کہا کہ مسلم لیگ کا ہائی کمانڈ طے کرے گا۔ پھر تو میرے اور آپ کے لئے مایوس ہونے ایک وجہ بھی تھی..... آپ امام کی فکر نہ کیجئے۔ خدا نے ہمیشہ مسلمانوں کے لئے اس وقت امام پیدا کیا ہے جب انتشار اپنی انتہا کو پہنچ گیا ہو۔ اگر پنجاب نے اقبال کی صورت میں گفتار کا امام پیدا کر لیا تو انشاءاللہ تھوڑے دنوں میں اس گفتار کی نسبت رکھنے والوں میں سے کوئی کردار کا امام بھی پیدا ہو جائے گا۔'' پھر اس نے اپنے 14 رمارچ 1944ء کے جوابی خط میں لکھا کہ ''خواجگان لیگ کی روش بندہ پروری سے بیگانگی اور میر کارواں کا نوائے دلنوازی سے ناآشنا ہونا مسلم۔ آپ جتنی شکایتیں لکھیں میرا تجربہ ان پر بہت زیادہ اضافہ کر سکتا ہے۔ ان کی سیاست قرآن سے دور، ان کا عمل اسلام کے سخت مخالف ہے۔ ان سب کے باوجود میرا اور آپ کا فرض کیا

ہے۔اس موضوع پر مزید روشنی ڈالے بغیر پھر یہی کہتا ہوں کہ مایوس نہ ہوجیئے اور بروں کو چھوڑ کر اپنی ساری توجہ عوام کے اندر اپنے خیالات کو پھیلانے میں صرف کیجئے۔''[2] بہادر یار جنگ کے ان جوابی خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ حمید نظامی کو اس زمانے میں مسلم لیگ کی قیادت سے دو بڑی شکایتیں تھیں۔ اول یہ کہ لیگ کے لیڈر یہ کہتے تھے کہ ''پاکستان کا نظام حکومت اس علاقے کی اکثریت طے کرے گی۔'' یعنی نظام حکومت کے بارے میں عوام الناس کی رائے کو کوئی وقعت نہیں دینی چاہیے تھی۔ وہ اس سلسلے میں ان عوام کی بجائے کسی امام کے حکم منتظر تھا اور دوئم یہ کہ ''خواجگان لیگ بندہ پروری سے بیگانہ تھے'' اور ''میر کارواں نوائے دلنوازی سے نا آشنا تھا۔'' یعنی مسلم لیگی قائدین اس کی صحافتی خدمات کے اعتراف کے طور پر اس کی کوئی مالی امداد نہیں کرتے تھے۔

تاہم دو ایک ماہ کے بعد اس کا یہ مسئلہ کسی حد تک حل ہو گیا جبکہ ایک یونینسٹ جاگیردار نواب مشتاق احمد گرمانی نے اسے اورینٹ پریس کی لاہور برانچ کا منیجر بنوا کر اس کے لئے با قاعدہ آمدنی کا کچھ بندوبست کر دیا اور پھر میر کارواں یعنی قائداعظم محمد علی جناح نے بھی اپریل 1944ء کے اواخر میں نوائے دلنوازی سے آشنائی کا مظاہرہ کیا جبکہ انہوں نے خضر حیات خان کو مسلم لیگ سے خارج کرنے کا فیصلہ کرنے کے بعد ایڈیٹر ہفت روزہ نوائے وقت کو طلب کیا اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اپنے جریدے کو روزانہ اخبار بنا کر پنجاب میں اس کے ذریعے مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی ترجمانی کرے۔ جب حمید نظامی نے اس سلسلے میں مطلوبہ سرمایہ کے فقدان کا ذکر کیا تو قائداعظم نے کہا کہ ''تم نواب ممدوٹ سے بات کرو وہ انتظام کر دے گا۔'' نواب اس وقت ملحقہ کمرے میں ہی بیٹھا تھا چنانچہ حمید نظامی اس کے پاس گیا تو اس نے بتایا کہ قائداعظم کی خواہش ہے کہ مجوزہ روزانہ اخبار ایک کمپنی کے زیر اہتمام شائع ہو جس کے پانچ حصہ دار ہوں۔ نواب ممدوٹ، ممتاز دولتانہ، میاں بشیر احمد، حمید نظامی اور اس کا کوئی اور نامزد شخص۔ حمید نظامی نے یہ تجویز فوراً منظور کر لی اور دوسرے دن اس نے اپنے ایک دوست حامد محمود کا نام پانچویں حصہ دار کے طور پر پیش کیا۔ حامد محمود ایک ایگزیکٹو انجینئر کا بیٹا ہونے کی وجہ سے آسودہ حال درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ نواب ممدوٹ نے اس کے نام پر کوئی اعتراض نہ کیا اور مجوزہ کمپنی کی حصہ داری کا عہد نامہ لکھنے کا کام ایک مقامی وکیل محمود علی قصوری کے سپرد کیا گیا۔ جب اس نے یہ کام تین چار دن میں مکمل کیا تو معلوم ہوا کہ دریں اثنا ممتاز دولتانہ نے اپنی رائے بدل

دی تھی۔ اب اس کی خواہش تھی کہ اس کمپنی کے صرف تین جاگیردار حصہ دار ہوں۔ حمید نظامی ہفت روزہ میں اپنے مفاد کا معاوضہ قبول کر لے اور پھر روزنامہ نوائے وقت میں ایک تنخواہ دار ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرے۔ دولتانہ کی یہ تجویز دراصل جاگیردار طبقہ اور درمیانہ طبقہ میں طبقاتی تضاد کی مظہر تھی۔ وہ نچلے درمیانہ طبقہ کے صحافی کو اپنے برابر کے حصہ دار کے طور پر قبول نہیں کر سکتا تھا۔ دوسری طرف چونکہ حمید نظامی نے اپنی مسلسل محنت و صلاحیت سے صوبہ کی مسلم صحافت میں ایک مقام حاصل کیا تھا اور وہ علامہ اقبال کے پیغام خودی کا دلدادہ تھا اس لئے اس کی انانیت نے اسے دولتانہ کی تجویز منظور کرنے کی اجازت نہ دی۔ چنانچہ دو اڑھائی ماہ کے بعد اس نے اپنے دوست حامد محمود کی شراکت سے 22 رجولائی 1944ء کو اپنے ہفت روزہ جریدے کو روزنامہ بنا دیا اور اس طرح پنجاب میں مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی مؤثر ترجمانی شروع ہوگئی حالانکہ اس کی پیشانی پر ''بیادگار حکیم الامت علامہ اقبال'' لکھا ہوتا تھا۔

اس وقت حمید نظامی کی عمر 29 سال کی تھی لیکن اس کی صحافت منجھی ہوئی اور پختہ ہوتی تھی اور اس کے اداریے زوردار ہوتے تھے۔ چنانچہ یہ اخبار تھوڑے ہی عرصے میں اتنا مقبول ہوا کہ اس کے ایڈیٹر کے وارے نیارے ہوگئے۔ اس کی ماضی کی غربت کی آلودگیاں دور ہوگئیں مگر اس کے مزاج میں اس سے اس کی گزشتہ زندگی کی محرومیوں اور تلخیوں کے آثار نہ مٹ سکے اور وہ اس تضاد کو بھی فراموش نہ کر سکا جس کا مظاہرہ ممتاز دولتانہ نے مئی 1944ء کے اوائل میں یہ کہہ کر کیا تھا کہ ''روزنامہ نوائے وقت کی کمپنی کے صرف تین حصہ دار ہوں گے۔ حمید نظامی محض ایک تنخواہ دار ملازم ہوگا۔'' چونکہ اس کا انداز فکر روائتی تھا اور وہ طبعاً تخیل پسند تھا اس لئے اس نے دولتانہ کے ساتھ اپنے تضاد کو نجی تضاد تصور کیا اور اس بنا پر اس کی بقیہ زندگی کا بیشتر حصہ دولتانہ سے ذاتی انتقام لینے کی کوشش میں گزرا۔ 1921ء سے لے کر 1944ء تک کی زندگی کی دشواریوں نے اسے بہت منتقم مزاج بنا دیا ہوا تھا۔ بدقسمتی سے وہ یکایک حاصل کردہ مالی خوشحالی کے باوجود وسیع النظری اور وسیع القلبی کی دولت سے محروم رہا۔

نومبر 1944ء کے پہلے ہفتے میں ممتاز دولتانہ نے اپنے بعض ترقی پسند احباب کی امداد سے صوبائی مسلم لیگ کا ایک منشور شائع کیا جس میں شہری آزادیوں، انتخابات میں سرکاری مداخلت کے سدباب اور ترقی پسندانہ معاشی پالیسی کا ذکر کیا گیا تھا۔ اس میں اسلامی نظام کے نفاذ

کا کوئی وعدہ نہیں تھا تاہم یہ منشور مقبول ہوا کیونکہ اس سے مسلمانوں کے غریب اور جمہوریت پسند حلقوں کے ذہن میں مسلم لیگ کی ایک دلکش تصویر ابھری اور یہ تاثر پیدا ہوا کہ مسلم لیگ اب تعلقہ داروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور سامراج کے خطاب یافتہ، پٹھوؤں کی جماعت نہیں ہے بلکہ یہ غریب اور درمیانہ طبقہ کے مفادات وحقوق کی علمبردار ہے۔ دولتانہ انگلستان سے بیرسٹری کرکے آیا ہوا تھا اس لئے بڑی انگریزی بولتا تھا۔ اس نے اپنے انگلستان میں قیام کے دوران یورپ کے سوشل ڈیموکریٹس کی بعض اصطلاحات بھی سیکھی ہوئی تھیں۔ اس لئے حمید نظامی، نوب ممدوٹ اور بعض دوسرے عناصر کی نظر میں اس کی جاگیرداریت کے باوجود اس کی اسلام پسندی مشکوک تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ دولتانہ بعض مسلمان ترقی پسند نوجوانوں کو اپنے ڈرائینگ روم میں کبھی کبھی گپ شپ کی اجازت دے دیتا تھا۔ جبکہ نیم تعلیم یافتہ نواب ممدوٹ کے ڈرائینگ روم میں حمید نظامی اور اس قسم کے بعض دوسرے اسلام پسند نوجوانوں کو رسائی حاصل ہوتی تھی۔ دولتانہ اور اس کے حواری اپنی تقریروں اور تحریروں میں مسلم عوام کی معاشرتی ومعاشی فلاح وبہبود کا ذکر کرتے تھے جبکہ نواب ممدوٹ اور حمید نظامی وغیرہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں صرف اسلامی نظام کا نعرہ لگاتے تھے۔ جیسا کہ بہادر یار جنگ کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ حمید نظامی کا نظریاتی ہیرو صرف علامہ اقبال تھا۔ اس کی نظر میں قائداعظم جناح کی اسلام پسندی بھی مشکوک تھی۔ بظاہر وہ مُلّا مودودی کی اس رائے سے متفق تھا کہ ”لیگ کے قائداعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہو۔“

شملہ کانفرنس کی ناکامی میں لیگ۔ یونینسٹ تضاد کا کردار

21 دسمبر 1944ء کو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے عہدیداروں کا انتخاب ہوا جس میں خان افتخار حسین خان آف ممدوٹ کو لیڈر منتخب کیا گیا۔ سردار شوکت حیات خان کو ڈپٹی لیڈر، میاں الہ یار کو چیف وہپ، میاں نوراللہ کو سیکرٹری اور رانا نصراللہ کو اسسٹنٹ وہپ بنایا گیا۔ ممتاز دولتانہ کو پارٹی میں کوئی عہدہ نہ ملا۔ 5 دسمبر کو مسلم طلبا نے صوبائی اسمبلی کے سامنے یونینسٹ پارٹی کے خلاف اور مسلم لیگ کے حق میں مظاہرہ کیا۔ اگرچہ ان مظاہرین کو پولیس نے فوراً ہی منتشر کر دیا مگر

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خضر وزارت کے مسلم ارکان کی وفاداری متزلزل ہوگئی اور عوام الناس میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی جدو جہد کا رخ دراصل برطانوی سامراج کے پٹھو جاگیرداروں کے خلاف ہے۔

جب جنوری 1945ء میں وائسرائے ویول نے بمبئی کے گورنر کی وساطت سے یہ کوشش کی کہ مرکزی اسمبلی میں کانگرس پارٹی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی اور مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر نوابزادہ لیاقت علی خان کے درمیان مرکزی حکومت کی تشکیل کے سلسلے میں جو سمجھوتہ ہوا ہے اس پر عمل ہو جائے اور جناح نے اس تجویز کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ مجھے اس سمجھوتے کا کوئی علم نہیں تو پنجاب کے مسلم درمیانہ طبقہ میں مسلم لیگ کا وقار اور بھی بلند ہو گیا اور انہیں یہ احساس ہوا کہ ان کا لیڈر نہ صرف کانگرسی لیڈروں اور وائسرائے سے سر اٹھا کر بات کر سکتا ہے بلکہ وہ ان کی تجاویز کو پائے حقارت سے ٹھکرا بھی سکتا ہے۔ پنجابی مسلمانوں کی نظر میں قائداعظم اور بھی بڑا قائداعظم بن گیا۔ اب وہ رفتہ رفتہ اپنے دیرینہ احساس کمتری سے باہر نکل رہے تھے۔

22 رمارچ 1945ء کو وائسرائے ویول اپنی حکومت سے مشورہ کرنے کے لئے لندن گیا تا کہ اکتوبر 1939ء کے بعد ملک میں پیدا شدہ سیاسی بحران کے حل کی کوئی صورت پیدا کی جا سکے۔ ویول نے لندن میں تقریباً اڑھائی مہینے قیام کیا۔ اس کی دہلی سے روانگی سے دس دن قبل 12 رمارچ کو صوبہ سرحد میں سردار اورنگزیب کی وزارت کو شکست ہوگئی تھی اور اس کی روانگی کے چھ دن بعد بنگال میں خواجہ ناظم الدین کی لیگی وزارت کو بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ان واقعات سے ثابت ہوا کہ جب جناح نے ستمبر 1944ء میں راج گوپال اچاریہ کے فارمولے کی بنیاد پر گاندھی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے سے انکار کیا تھا، اس کی بنیاد محض ان کی ضد یا غیر مصلحانہ رویے پر نہیں تھی بلکہ انہیں مسلم اکثریت والے علاقوں کی مسلم رائے عامہ کے رجحان کے بارے میں واقعی قطعی طور پر یقین نہیں تھا۔ قبل ازیں پنجاب میں بھی خضر حیات خان کی سرکشی کے باعث مسلم لیگ کی کولیشن وزارت نہیں بن سکی تھی۔ کانگرس کی ہائی کمان نے مسلم لیگ کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کی اس طرح کوشش کی کہ اس نے صوبہ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کو کانگرسی وزارت بنانے کی خصوصی اجازت دے دی حالانکہ اس نے اکتوبر 1939ء میں وزارتوں سے مستعفی ہو جانے کا جو فیصلہ کیا تھا وہ ابھی منسوخ نہیں کیا گیا تھا۔ اس کی اس نمایاں بے اصولی کا مقصد محض

مسلم اکثریت کے علاقوں میں لیگ کے سیاسی وقار کو زک پہنچانا تھا۔ تاہم پنجاب میں اس کا الٹا اثر ہوا اور یہاں کے درمیانہ طبقہ کا یہ دیرینہ احساس پختہ سے پختہ تر ہو گیا کہ کانگرس کی ہندو قیادت اپنے پٹھوؤں کے ذریعے مسلمانوں کو بحیثیت قوم نقصان پہنچانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرے گی۔ بنگال میں کانگرس کی انتہائی کوشش کے باوجود کوئی غیر لیگی وزارت نہ بن سکی لہٰذا وہاں گورنر راج نافذ کر دیا گیا جو تقریباً نو ماہ تک یعنی آئندہ عام انتخابات تک جاری رہا۔

وائسرائے ویول ابھی لندن میں ہی تھا کہ 8 رمئی کو نازی جرمنی کے جنرل کیٹل (Keitel) نے برلن میں سوویت یونین کے جنرل زوکوف (Zhukov) کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور اس کے تقریباً پانچ ہفتے بعد یعنی 14 رجون 1945ء کو وزیر ہند ایل۔ ایس۔ ایمری (L.S. Amery) نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ کی یہ انتہائی خواہش ہے کہ ہندوستان میں کوئی آئینی تصفیہ ہو جائے لیکن ہم مجبور ہیں۔ ہم وہاں ہندوستانیوں پر مشتمل ایسے حکومتی ادارے مسلط نہیں کر سکتے جنہیں ہندوستان قبول کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہے۔ تاہم ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں ہندوستانی پارٹیوں کے لیڈروں کو شامل کر کے اسے از سر نو اس طرح تشکیل دیا جائے کہ سارے بڑے فرقوں کو متوازن نمائندگی مل جائے۔ اس مجوزہ کونسل میں مسلمانوں اور اونچی ذات کے ہندوؤں کا تناسب مساوی ہوگا۔ لیکن وائسرائے بدستور اپنے خصوصی اختیارات کا حامل رہے گا اور دفاع کا محکمہ بھی بدستور برطانوی کمانڈر انچیف کے پاس ہی رہے گا۔ ویول نے اسی دن یعنی 14 رجون کو ہی واپس دہلی پہنچ کر وزیر ہند کی اس تجویز کو جامہ عمل پہنانے کے لئے 25 رجون کو شملہ میں کانگرس، لیگ اور بعض دوسری پارٹیوں کے لیڈروں کی کانفرنس بلائی اور ساتھ ہی یہ اعلان کیا کہ اس مقصد کے لئے کانگرس کی مجلس عاملہ کے ارکان کو رہا کیا جا رہا ہے۔

چنانچہ 25 رجون کو شملہ میں یہ کانفرنس ہوئی اور یہ فارمولا زیر بحث آیا کہ کونسل میں پانچ اونچی ذات کے ہندو ہوں گے، پانچ مسلمان ہوں گے، ایک سکھ ہوگا اور ایک اچھوت ہوگا۔ مگر تقریباً تین ہفتے کی بحث و تمحیص کے باوجود یہ کانفرنس نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ اس کی واحد وجہ یہ تھی کہ صدر آل انڈیا مسلم لیگ قائداعظم محمد علی جناح کا اصرار تھا کہ پانچوں مسلمان ارکان کی نامزدگی صرف مسلم لیگ ہی کرے گی۔ مزید برآں اس امر کی یقین دہانی کرائی جائے کہ

وائسرائے کے ویٹو کے باوجود کونسل کی غیر مسلم اکثریت مسلمانوں کے مفادات کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرے گی۔ وائسرائے نے چند دن کی ردوکد کے بعد جناح کا یہ مطالبہ صرف اس حد تک منظور کیا کہ مسلم لیگ کو چار مسلمان ارکان کی نامزدگی کا حق دیا جائے گا۔ پانچواں مسلمان رکن پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کا ہوگا۔ ہوڈسن لکھتا ہے کہ نوابزادہ لیاقت علی خان وائسرائے کی یہ پیشکش قبول کرنے پر آمادہ تھا لیکن جناح نہ مانے اور اس فردواحد کی ''ضد'' کی وجہ سے ویول نے 14 رجولائی کو کانفرنس کی ناکامی کا اعلان کر دیا۔

کانگرس کو اس اعلان سے بہت صدمہ ہوا۔ وہ مرکزی حکومت میں شامل ہونے کے لئے بے تاب تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس طرح برطانوی حکومت سے متحدہ ہندوستان کے نظریے کی بنیاد پر کوئی سمجھوتہ کرنے میں آسانی ہوگی۔ وائسرائے ویول اپنی 17 رفروری 1944ء کی تقریر میں کہہ چکا تھا کہ جغرافیہ کو بدلنا ممکن نہیں۔ ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت ہے اور اس کی اس وحدت کو بہرصورت قائم رہنا چاہیے۔ جناح کانگرس کے اس نصب العین کو اچھی طرح سمجھتے تھے لہٰذا ان کی کوشش یہ تھی کہ اس موقع پر کانگرس برسراقتدار نہ آنے پائے۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ اس طرح نہ صرف کانگرس کی حکومت برطانیہ کے ساتھ سودابازی کی قوت میں اضافہ ہو گا بلکہ مسلم اکثریت کے جن صوبوں میں غیر لیگی حکومتیں قائم ہیں انہیں بھی تقویت ملے گی جبکہ ان کا مؤقف یہ تھا کہ مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ ویول پلان کی منظوری کی صورت میں ان کو اپنا یہ مؤقف خطرے میں نظر آتا تھا۔

ویول جناح کے سامنے اس لئے جھک گیا تھا کہ ان دنوں (5 رجولائی سے 12 رجولائی تک) برطانیہ میں عام انتخابات ہو چکے تھے اور ان کے نتیجہ کا انتظار تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ نئی حکومت کون سی پارٹی کی ہوگی اور اگر لیبر پارٹی جیت گئی تو اس کی ہندوستان کے بارے میں پالیسی کیا ہوگی؟ جہاں تک کنزرویٹو پارٹی کا تعلق تھا اس کی پالیسی کا اسے علم تھا اور وہ یہ تھی کہ ہندوستان میں مذہبی، لسانی اور نسلی تفرقات سے فائدہ اٹھاتے رہو اور مرکز میں ہندوستانیوں کو صرف اتنے اختیارات دو جو برطانیہ کے عالمی مفادات کے لئے نقصان دہ ثابت نہ ہوں۔ 26 رجولائی کو انتخابات کے نتیجہ کا اعلان ہوا تو معلوم ہوا کہ لیبر پارٹی بھاری اکثریت سے جیت گئی ہے۔ 412 نشستیں لیبر پارٹی نے لیں، 213 کنزرویٹو پارٹی نے حاصل کیں اور صرف

12 نشستیں لبرل پارٹی کو ملیں۔ 27 رجولائی کو لندن میں کلیمنٹ ایٹلی (Clement Attlee) کی زیر قیادت لیبر پارٹی کی حکومت قائم ہوگئی۔ 6 راگست اور 9 راگست کو ہیروشیما اور ناگاساکی میں امریکی ایٹم بموں کی قیامت خیزی کے پانچ دن بعد 14 راگست کو جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے اور اس طرح دوسری جنگ عظیم اتحادیوں کی عظیم فتح پر اختتام پذیر ہوئی۔

45-46ء کے انتخابات میں پنجاب میں مسلم لیگ اور کمیونسٹوں کا اشتراک عمل

21 راگست کو وائسرائے لارڈ یول نے اعلان کیا کہ اس سال موسم سرما میں مرکزی اور صوبائی عام انتخابات ہوں گے۔ اس اعلان کے تین دن بعد وہ برطانیہ کی نئی لیبر حکومت سے مشورہ کرنے کے لئے لندن گیا جہاں سے وہ 16 رستمبر کو واپس دہلی پہنچا اور پھر 19 رستمبر کو اس نے اعلان کیا کہ موجودہ انتخابات کے بعد ایک دستور ساز اسمبلی قائم کی جائے گی اور ایسی ایگزیکٹو کونسل بنے گی جسے ہندوستان کی بڑی پارٹیوں کی حمایت حاصل ہوگی۔ چونکہ اس کے اس اعلان میں برصغیر کی تقسیم کے امکان کا کوئی ذکر نہیں تھا اس لئے یہ تاثر پیدا ہوا کہ لیبر حکومت کی پالیسی بھی ہندوستان کی وحدت کو قائم رکھنے کی ہے چنانچہ جناح نے ایک بیان میں متنبہ کیا کہ ہندوستان کا جو آئینی تصفیہ پاکستان کی بنیاد پر نہیں ہوگا وہ مسلم لیگ کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا۔ اس بیان کا مطلب یہ تھا کہ مسلم لیگ آئندہ انتخابات پاکستان کے نعرے کے تحت ہی لڑے گی اور اس نے ایسا ہی کیا۔

پنجاب میں انتخابی مہم کے دوران مسلم لیگ کی حلیف کمیونسٹ پارٹی تھی جس کے بیشتر مسلم ارکان ستمبر 1945ء میں ضلع لاہور کے ایک کانگرسی جاگیردار میاں افتخار الدین سمیت عملاً مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ افتخار الدین خود کمیونسٹ پارٹی کا رکن نہیں تھا لیکن کمیونسٹوں سے گہری ہمدردی رکھتا تھا اور بالعموم ان کے مؤقف کی تائید و حمایت کرتا تھا۔ صوبائی لیگ کا منشور کمیونسٹ پارٹی کے ایک ممتاز کارکن دانیال لطیفی نے لکھا تھا جس میں نہ صرف بنیادی زرعی اصلاحات کا وعدہ کیا گیا تھا بلکہ بڑی بڑی صنعتوں کو قومیانے کے عزم کا اعلان بھی کیا گیا تھا۔ کمیونسٹ کارکنوں نے لیگ کی انتخابی سرگرمیوں میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا کیونکہ وہ اپنی پارٹی کی 19 رستمبر 1942ء کی قرارداد کے مطابق مسلمانوں کو حق خود اختیاری دینے کے حق میں تھے۔ کانگرس نے انہیں اپنی صفوں میں سے نکال باہر کیا تھا اور لیگ نے ان کا اپنی صفوں میں خیر

مقدم کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان اس بنیاد پر کوئی سمجھوتہ ہو جائے تا کہ برصغیر کو برطانوی سامراج کے چنگل سے آزادی نصیب ہو۔ ان کا مؤقف یہ تھا کہ ''آزاد ہندوستان کے اتحاد کے لئے ضروری ہے کہ پہلے مختلف گروپوں اور یونٹوں کو آزادی دی جائے۔ ہندو۔ مسلم تنازعہ سراسر انگریزوں کا پیدا کردہ نہیں بلکہ اس کی اور بھی وجوہ ہیں مثلاً یہ کہ مسلمان فرقہ صنعت اور تعلیم وغیرہ میں پسماندہ ہے اور یہ کہ مسلمانوں کو خطرہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد انہیں ہندوؤں سے ان کا جائز حصہ نہیں ملے گا اور یہ کہ ہندوستان کی آزادی کا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ برطانوی راج کی جگہ ہندو راج نافذ ہو جائے گا۔ اگر ہندو اور مسلمان ایک ہی خاندان کے دو بھائی ہیں تو انگریز لٹیرا اس وقت تک ان کی جائیداد واپس نہیں دے گا جب تک یہ دونوں بھائی متحد و متفق نہیں ہو جاتے اور چھوٹا بھائی (یعنی مسلمان) اس وقت تک اتحاد نہیں کرے گا جب تک کہ اسے یقین نہیں ہو جائے گا کہ لٹیرے کے جانے کے بعد اس کا مستقبل تاریک نہیں ہوگا۔ ان کے برعکس گاندھی کو لالہ لاجپت رائے کی طرح پان اسلام ازم کا خطرہ لاحق تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ''ہندوؤں کا یہ خطرہ بے جا نہیں کہ جناح مسلمانوں کے لئے علیحدہ وطن اس لئے مانگتا ہے کہ وہ وہاں ہمارے دشمنوں کو پناہ دے گا اور ہندوستان پر حملہ کرے گا۔ لہٰذا وہ کسی حالت میں بھی مسلمانوں کو ایک علیحدہ خود مختار مملکت قائم کرنے کا حق دینے پر آمادہ نہیں تھا۔''[3] چونکہ ان دنوں سوویت یونین کا نظریاتی مؤقف یہ تھا کہ ساری دنیا میں مذہبی، لسانی اور نسلی قومیتوں کو حق خود ارادیت ملنا چاہیے اور جنگ کے بعد اس کے عالمی مفاد کا تقاضا بھی یہی تھا اس لئے اس کی جانب سے یا برطانیہ کی ماسٹر کمیونسٹ پارٹی کی جانب سے ہندوستانی کمیونسٹوں کی اس پالیسی پر کوئی اعتراض نہیں ہوا تھا۔ ہندوستان میں مطالبہ پاکستان ایک عوامی مطالبہ تھا اس لئے کہ یہ ان سب کے لئے قابل قبول تھا۔

انتخابی مہم میں اسلام پسند جماعتوں نے مسلم لیگ اور مطالبہ پاکستان کی بھرپور مخالفت کی

کمیونسٹوں کے برعکس ہندو سرمایہ داروں اور مسلم جاگیرداروں کے وظیفہ خوار، اسلام پسندوں نے ''اس انتخابی مہم میں مسلم لیگ اور اس کے نعرۂ پاکستان کی سرتوڑ مخالفت کی اور اس

مقصد کے لئے انہوں نے نہ صرف ان تمام غیر لیگی عناصر سے عملاً اتحاد و اتفاق کیا جو مسلم لیگ کو ہر قیمت پر انتخابی شکست دینے کے درپے تھے بلکہ انہوں نے قائد اعظم محمد علی جناح اور مسلم لیگ کے خلاف کفر کے فتوے صادر کئے۔ جماعت اسلامی کے امیر مولوی مودودی کا فتویٰ یہ تھا کہ ''جو اسمبلیاں یا پارلیمنٹیں موجودہ زمانے کے جمہوری اصول پر بنی ہیں ان کی رکنیت حرام ہے اور ان کو ووٹ دینا بھی حرام ہے''...... ''ووٹ اور الیکشن کے معاملے میں ہماری پوزیشن صاف صاف ذہن نشین کر لیجئے، پیش آمدہ انتخابات یا آئندہ آنے والے انتخابات کی اہمیت جو کچھ بھی ہو اور ان کا جیسا بھی اثر ہماری قوم یا ملک پر پڑتا ہو بہرحال ایک بااصول جماعت ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے یہ ناممکن ہے کہ کسی وقتی مصلحت کی بنا پر ہم ان اصولوں کی قربانی گوارا کر لیں جن پر ہم ایمان لائے ہیں۔''[4]

''امیر شریعت'' سید عطا اللہ شاہ بخاری کی مجلس احرار کے نزدیک بھی مذہبی نقطۂ نگاہ سے مطالبہ پاکستان کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس مجلس کی قرارداد یہ تھی ''مجلس احرار اسلام واضح کر دینا چاہتی ہے کہ اس کا نظریہ یہ نہیں کہ جغرافیائی یا نسلی یا لسانی وغیرہ حدود کو قائم کرنا اور نیکی کو رواج دینا ہی خلقت انسانی کی خداوندی حکمت و مصلحت ہے اور مجلس احرار اسلام، دنیا کے جس حصے میں بھی ممکن ہو حکومت الٰہیہ کے قیام کی خواہاں ہے تاکہ دنیا کو دکھایا جا سکے کہ اسلام کے زریں اصولوں پر کاربند ہو کر کس طرح دنیا کے مصائب کا علاج کیا جا سکتا ہے اور دنیا و آخرت میں فلاح کی صورت پیدا کی جا سکتی ہے۔ اس ضمن میں مجلس احرار اسلام یہ واضح کر دینا بھی مناسب سمجھتی ہے کہ کسی علاقے میں محض مسلمانوں کی اکثریت یا افراد کے ہاتھوں میں حکومت کا آغاز حکومت الٰہیہ کا مترادف نہیں بلکہ ایسی شخصی یا جماعتی حکومتوں نے جو اسلام کے نام پر اپنی اغراض کی تکمیل کے درپے ہیں، اسلام کے روئے روشن پر دھبہ لگایا اور دنیا کو اسلام سے متنفر ہونے کی گنجائش دی۔ مجلس کسی ایسے تجربہ کو دہرانے کے لئے مسلمانوں کے دین سے بے بہرہ کسی جماعت یا گروہ کے ہاتھ حکومت دے کر مطمئن نہیں ہو سکتی اور وہ مسلمانوں سے پرزور درخواست کرتی ہے کہ وہ اس بارے میں اپنی ذمہ داری کا فوری اور کلی احساس کریں اور اپنی نگاہ سے حکومت الٰہیہ کو اوجھل کر کے اسلام کے نام پر الحاد و زندقہ کے فروغ کا موقع نہ دیں بلکہ سب مسلمانوں کو اطاعت خدا اور رسول پر کمربستہ ہونے کی تلقین کریں۔''[5] ظاہر ہے کہ یہ قرارداد دلکش اور خوشنما الفاظ کا ایک

مجموعہ تھا جس کا مطلب صرف یہ تھا کہ تحریک پاکستان ایک اسلام دشمن تحریک ہے جس کی مخالفت کرنا ہر مسلمان کا مذہبی فریضہ ہے تاکہ الحاد و زندقہ کو فروغ پانے کا موقع نہ ملے۔

عام طور پر یہ نام نہاد علمائے دین کسی بھی مسئلہ پر ایک دوسرے سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا مسلک فی سبیل اللہ اختلاف و نزاع ہوتا ہے لیکن اس زمانے میں جہاں تک مسلم لیگ کی مخالفت کا تعلق تھا ان کے درمیان مکمل اتفاق و اتحاد تھا۔ قبل ازیں جماعت اسلامی کا مولوی مودودی یہ فتویٰ صادر کر چکا تھا کہ ''جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومت الٰہی قائم ہو جائے گی، ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ قابل لعنت''۔ مجلس احرار اور جماعت اسلامی جب اپنی تقریروں اور تحریروں میں اسلام کے نام پر مسلم لیگ کی مخالفت کرتے تھے تو اس امر کی نشاندہی کرتے تھے کہ مسلم لیگ کی 23 مارچ 1940ء کی قرارداد پاکستان یا کسی اور قرارداد میں یہ بات واضح نہیں کی گئی کہ پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم ہوگا اور ایک مشہور کمیونسٹ کے تحریر کردہ صوبائی مسلم لیگ کے انتخابی منشور میں بھی اسلامی نظام کا کوئی ذکر نہیں تھا۔ اس میں صرف مسلمانوں کی معاشرتی اور معاشی فلاح و بہبود کا پروگرام پیش کر کے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ مسلم لیگ جمہوری سیاست کو فروغ دے گی۔ اس منشور میں غیر مسلم اقلیتوں کو بھی ہر شعبۂ زندگی میں مساوی حقوق دینے کی یقین دہانی کرائی گئی تھی۔

امیر شریعت عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی حبیب الرحمن لدھیانوی، مولوی مظہر علی اظہر، تاج الدین انصاری، شورش کاشمیری اور دوسرے احراری لیڈر اس انتخابی مہم کے دوران اپنی تقریروں میں نہ صرف میاں افتخار الدین اور اس کے ساتھیوں کو ملحد اور زندیق قرار دیتے تھے بلکہ وہ قائداعظم محمد علی جناح اور دوسرے لیگی لیڈروں کو غلیظ گالیاں دیتے تھے۔ ان کے اس معاندانہ رویے کا پس منظر یہ تھا کہ اگرچہ یہ 1930ء میں کانگرس سے الگ ہوئے تھے لیکن عملاً یہ اس کے بعد بھی کانگرسی لیڈروں سے ساز باز کرتے رہتے تھے۔ مجلس احرار کا ایک اجلاس 3 مارچ 1940ء کو دہلی میں منعقد ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعے پاکستان کی تجویز کو ناپسندیدہ قرار دیا گیا اور بعد میں بعض احراری لیڈروں نے اپنی تقریروں میں پاکستان کو پلیدستان بھی کہا۔ 29 نومبر

1940ء کومولوی داؤد غزنوی نے اخباروں میں ایک بیان شائع کرایا جس میں احرار کے اس فیصلے کا اعلان کیا کہ وہ اپنے آپ کو کانگرس میں جذب کر دیں گے۔ پنجاب پراونشل احرار کانفرنس منعقدہ گوجرانوالہ (17 تا 19 رمارچ 1943ء) میں ایک قرارداد منظور کی گئی اور پھر اسی سال سہارنپور میں بھی ریزولیوشن پاس کیا گیا۔ ان دونوں موقعوں پر احرار نے برصغیر کی مجوزہ تقسیم کی مخالفت کی اور اس کو وطن کا چیر پھاڑ قرار دیا۔ احرار کے ہر لیڈر نے اپنی ہر اہم تقریر میں مسلم لیگ پر تنقید کی۔ اس کے لیڈروں پر نکتہ چینی کی۔ یہاں تک کہ قائداعظم کو بھی نہ چھوڑا جن سے وہ سخت متنفر تھے حالانکہ ان کی شخصیت ان دنوں مسلمان قوم کے واحد اور مسلمہ رہنما کی حیثیت سے قلوب عوام میں گھر کر چکی تھی۔

ملاؤں نے قائداعظم پر ''کافراعظم'' ہونے کا فتویٰ صادر کیا

چونکہ قائداعظم وسیع المشرب تھے اور مذہبی امور میں کسی نمود و نمائش کے قائل نہ تھے، اس لئے احرار نے ان کی اس خصوصیت سے ناواجب فائدہ اٹھا کر انہیں کافر کہنا شروع کر دیا۔ یہ شعر مولوی مظہر علی اظہر سے منسوب ہے جو مجلس احرار کی ایک ممتاز شخصیت تھا۔

اِک کافرہ کے واسطے اسلام کو چھوڑا
یہ قائداعظم ہے کہ ہے کافرِ اعظم

احرار نے اپنی تقریروں میں صرف یہی نہیں کہا کہ قائداعظم نے ایک پارسی خاتون سے شادی کی تھی بلکہ یہ اعتراض بھی کیا کہ وہ اب تک حج کے لئے مکہ معظمہ کیوں نہیں گئے۔ 1945ء میں احراریوں نے شیعہ سنی تنازعہ کی آگ بھڑکانے کی بھی کوشش کی اور مولوی مظہر علی اظہر اور اس کا بیٹا قیصر مصطفےٰ تحریک مدح صحابہ کے احیاء کے لئے مرکزی اسمبلی کے انتخابات سے تقریباً ایک ماہ قبل 16 رنومبر کو لاہور سے لکھنؤ بھی گئے۔''[6] جہاں ایک لکھنوی سنی مولوی ایک بیان میں یہ اعتراض کر چکا تھا کہ اسماعیلی شیعہ محمد علی جناح نے حضرت علیؓ کے یوم ولادت کے موقع پر گاندھی سے بات چیت کرنے سے انکار کیوں کیا تھا۔

واقعاتی اعتبار سے قائداعظم پر یہ الزام سراسر کذب و افترا تھا کہ انہوں نے پارسی کافرہ سے شادی کی تھی۔ انہوں نے اپنی پارسی بیوی سے اس کے مسلمان ہونے کے بعد شادی کی

تھی۔ جہاں تک حضرت علیؓ کے یوم ولادت کے موقع پر گاندھی سے بات چیت نہ کرنے کا سوال تھا، اس کے بارے میں جناح کا جواب یہ تھا کہ ''حضرت علیؓ کا مسلمانوں کے سارے فرقوں میں احترام کیا جاتا ہے۔ میں نے اس موقع پر ان سے عقیدت کا اظہار محض اسماعیلی شیعہ ہونے کی وجہ سے نہیں کیا تھا۔'' اکتوبر 1945ء میں دیوبند کے مولوی حسین احمد مدنی نے یہ فتویٰ شائع کیا تھا کہ مسلم لیگ میں مسلمانوں کی شرکت حرام ہے اور قائداعظم دراصل کافراعظم ہے۔

قبل ازیں بریلوی فرقہ کی طرف سے ایک کتاب موسومہ ''تجانب اہل السنۃ عن اہل الفتنہ'' شائع کی گئی تھی جس میں قائداعظم کے بارے میں یہ کہا گیا تھا کہ ''اور مسٹر جینا ان کا قائداعظم ہے۔ اگر صرف انہیں دو کفروں پر اکتفا کرتا تو قائداعظم کی خصوصیت ہی کیا رہتی۔ لہٰذا وہ اپنی سپیچوں، اپنے لیکچروں میں نئے نئے کفریات قطعیہ بکتا رہتا ہے۔'' اور آگے چل کر مزید لکھا گیا تھا کہ ''بحکم شریعت مسٹر جینا اپنے ان عقائد کفریہ قطعیہ، خبیثہ کی بنا پر قطعاً مرتد اور خارج از اسلام ہے اور جو شخص اس کے کفروں پر مطلع ہونے کے بعد اس کو مسلمان جانے یا اسے کافر نہ مانے یا اس کے کافر، مرتد ہونے میں شک کرے یا اس کو کافر کہنے میں توقف کرے، وہ بھی کافر، مرتد اور شرالئنام ہے اور بے توبہ مرا تو مستحق لعنت عزیز علام''[7] اور اسی فرقہ کے ایک مولوی سید شاہ اولاد رسول محمد میاں مارہروی نے ایک رسالہ ''الجوابات السنیہ'' شائع کیا تھا۔ اس میں حزب الاحناف لاہور کے مولوی ابوالبرکات سید احمد کا یہ فتویٰ درج تھا کہ ''لیگ کی حمایت کرنا، اس میں چندے دینا، اس کا ممبر بننا، اس کی اشاعت وتبلیغ کرنا منافقین اور مرتدین کی جماعت کو فروغ دینا ہے۔''[8] دسمبر 1945ء میں مولوی حشمت علی نے مسلم لیگ کے متعلق ایک سوال کے جواب میں فتویٰ صادر کیا جس میں کہا گیا کہ ''مسلم لیگ کی شرکت ورکنیت امداد واعانت بحکم شریعت مطہرہ اسی طرح گناہ وممنوع وحرام وناجائز ہے جس طرح ندوہ وکانگرس کی شرکت ورکنیت وامداد واعانت شرعاً حرام وگناہ ہے۔ اس میں شریک ہونے والا ایسے ہی فاسق ہے جیسے ندوہ وکانگرس میں شریک ہونے والا فاسق ہے'' اور مزید کہا گیا کہ ''رہا مطالبہ پاکستان یعنی تقسیم ملک کہ اتنا لیگیوں کا، اتنا ہندوؤں کا، اس صورت میں احکام کفر ملک کے بڑے حصے میں لیگیوں کی رضا سے جاری ہوں گے کہ وہی اس تقسیم پر راضی اور اس کے طالب ہیں۔ احکام کفر برضا کفر اور کم از کم سخت بے دینی ہے۔''[9]

انتخابات میں مسلم لیگ کی بے مثال کامیابی یونینسٹ پارٹی اور ملاؤں کی ناکامی

تاہم مسلم لیگ اور مطالبہ پاکستان کے خلاف ہر نوع اور ہر رنگ کے فتویٰ فروش ملاؤں کی متحدہ یلغار کے باوجود 46-1945ء کے عام انتخابات میں مسلم لیگ کو بے مثال کامیابی حاصل ہوئی۔ دسمبر 1945ء کے مرکزی اسمبلی کے انتخابات میں لیگ نے ساری کی ساری مسلم نشستیں جیت لیں۔ اس کی یہ سو فیصد کامیابی ہندوستان کے انتخابات کی تاریخ میں ریکارڈ کی حیثیت رکھتی تھی اور 1946ء کے اوائل کے صوبائی انتخابات میں لیگ نے پنجاب کے کل 86 مسلم حلقوں میں سے 75 حلقوں میں کامیابی حاصل کی۔ صوبائی وزیر اعظم ملک سر خضر حیات خان اور اس کی یونینسٹ پارٹی کا سیاسی جنازہ نکل گیا۔ اس کے کامیاب مسلمان ارکان کی تعداد دس گیارہ سے زیادہ نہیں تھی۔ جماعت اسلامی، مجلس احرار، جمیعت العلمائے ہند، آل انڈیا شیعہ کانفرنس اور اسلام فروشوں کی دوسری ساری جماعتوں کے ہوش وحواس گم ہوگئے۔ وہ تحریک خلافت کے بعد سے اس غلط فہمی میں مبتلا رہے تھے کہ مذہب مسلم رائے عامہ کا رخ معین کرتا ہے اور ''علمائے دین'' انہیں نکیل سے پکڑ کر جس طرف چاہیں لے جاسکتے ہیں۔ وہ معاشرتی ارتقا کے اس قانون سے ناآشنا تھے کہ ہر مذہب وملت کے عوام اپنے فکر و عمل کا تعین اپنے معاشرتی و معاشی تقاضوں کے تحت کرتے ہیں۔ عوام الناس کا مذہب مفاد پرست مذہبی پیشواؤں کے مذہب سے مختلف ہوتا ہے۔ عوام الناس اپنے مذہب کی تعمیر اپنی معاشرتی اور معاشی ضرورتوں کے مطابق کرتے ہیں۔ ان کے اخوت و مساوات کے تصور کا ملاؤں کے اخوت و مساوات کے تصور سے تعلق نہیں ہوتا۔ عوام الناس کا تصور مساوات صرف مسجد تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ وہ اسے دستر خوان تک بھی پہنچاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں مانتے کہ ''جو موٹر لئے ہوئے آیا ہے وہ موٹر ہی پر چلے۔ جو صرف دو پاؤں لایا ہے، وہ پیدل ہی چلے اور جو لنگڑا پیدا ہوا ہے وہ لنگڑا کر ہی چلنا شروع کر دے۔'' وہ یہ نہیں مانتے کہ ایک جاگیردار کے بیٹے اور ایک بے زمین کسان کے بیٹے میں حصول رزق کی جدوجہد میں مساوات کا حصول ممکن ہے۔ دنیا کی تاریخ میں نہ کبھی ایسا ہوا ہے اور نہ ہوسکتا ہے، وہ یہ تسلیم نہیں کرتے کہ ان کا مذہب نجی ملکیت پر کوئی حد مقرر نہیں کرتا اور ایک شخص ایک گز مربع سے لے کر ہزار ہا ایکڑ تک زمین کا مالک ہوسکتا ہے اور وہ اس فریب میں بھی نہیں آتے کہ اگر اسلام کے

قانون وراثت پر عمل کیا جائے اور زکوٰۃ وصول کی جائے تو زمینداری میں کوئی خرابی باقی نہیں رہ جاتی۔ انہیں معلوم ہے کہ اگر ذرائع پیداوار نجی ملکیت میں ہوں تو ہزاروں لاکھوں قانونی پابندیوں، تعزیزوں اور کروڑوں نصیحتوں کے باوجود ارتکاز دولت کی کوئی حد مقرر نہیں ہوسکتی۔

کانگرس۔ یونینسٹ۔ اکالی اتحاد نے مسلم لیگ اکثریتی پارٹی کو حکومت بنانے سے محروم رکھا

پنجاب میں مسلم لیگ کی اس بے مثال کامیابی کے باوجود گورنر سر برٹرنڈ گلینسی نے لیگ اسمبلی پارٹی کے قائد نواب افتخار حسین خان آف ممدوٹ کو وزارت سازی کی دعوت نہ دی۔ اس کی بجائے اس نے فروری 1946ء میں یونینسٹ پارٹی، اکالی اور کانگرس کے گٹھ جوڑ سے ایسی وزارت بنوادی جس کی حمایت پر ایوان کے کل 84 ہندو اور سکھ ممبر جمع تھے اور صرف دس گیارہ مسلمان یونینسٹ ارکان اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ ملک سر خضر حیات خان ٹوانہ اس وزارت کا سربراہ تھا۔ اس وزارت سازی کے سلسلے میں کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد نے نہایت شرمناک کردار ادا کیا۔ وہ صوبہ کے مٹھی بھر مسلم جاگیرداروں، ہندو اور سکھ فرقہ پرستوں کے ساتھ کانگرس کا گٹھ جوڑ قائم کرنے کے لئے خاص طور پر لاہور آیا تھا۔ اور اس نے محض مسلم لیگ کو اقتدار سے محروم رکھنے کے لئے گورنر گلینسی سے اشتراک عمل کرکے یہ ''کارنامہ'' سرانجام دیا۔ پینڈرل مون لکھتا ہے کہ ابوالکلام آزاد نے اپنی اس کاروائی سے پنجابی مسلمانوں کو لاحق شدہ اس خطرے کو بالکل صحیح ثابت کردیا کہ کانگرس چند مسلمان پٹھوؤں کو اپنے ساتھ ملا کر پورے برصغیر میں ہندو راج قائم کرنا چاہتی ہے۔''[10] اگر پنجابی مسلمانوں کے کسی حلقے میں مطالبہ پاکستان کے بارے میں کوئی شک وشبہ تھا تو اسے ابوالکلام آزاد نے دور کردیا۔

افتخار الدین گزشتہ دس سال سے کانگرسی تھا اور وہ ستمبر 1945ء میں مسلم لیگ میں شامل ہونے کے بعد بھی اعلانیہ طور پر کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان اتحاد وتعاون کا حامی تھا۔ لیکن 1946ء کے اوائل میں اس نے یہ دیکھا کہ کانگرس نے مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کے ساتھ مل کر مخلوط وزارت بنانے کی بجائے یونینسٹ جاگیرداروں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرلیا تھا۔ تو اسے بہت صدمہ ہوا۔ چنانچہ اس نے 28/مارچ 1946ء کو صوبائی اسمبلی کے پہلے سیشن میں

اس مسئلے پر زوردار تقریر کرتے ہوئے قوم پرست مسلمانوں پر الزام لگایا کہ وہ ہندو۔ مسلم اتحاد کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ ہیں۔" وہ آج کل پاکستان کی مخالفت میں جو کچھ کر رہے ہیں وہ کوئی ہندو بھی نہیں کر سکتا۔ آج کل جو کچھ مولانا صاحب (ڈاکٹر غزنوی) اپنے عوام کے خلاف کر سکتے ہیں وہ کچھ ان کے قائدین ڈاکٹر گوپی چندر بھارگو اور لالہ بھیم سین سچر بھی نہیں کر سکتے۔ مخالف بنچوں پر بیٹھے ہوئے میرے دوست یہ کہتے ہیں کہ انہوں نے یونینسٹ پارٹی سے اس لئے اشتراک کیا ہے کہ یہ فرقہ پرست پارٹی نہیں ہے۔ میں اس سلسلے میں والیان ریاست کی تنظیم چیمبر آف پرنسز کی مثال دے سکتا ہوں۔ ہمیں کبھی بھی اس تنظیم کے اندر فرقہ وارانہ اختلافات سنائی نہیں دیئے۔ اس لئے کہ راجوں اور نوابوں کے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ محض اپنے مفادات پر تبادلہ خیالات کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں اور پھر ان کا اجتماع برخاست ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یونینسٹ پارٹی بڑے رجعت پسند زمینداروں اور بڑے سرمایہ داروں کی پارٹی ہے۔ وہ اپنی پارٹی کے اندر صرف اپنے ہی بارے میں سوچتے ہیں ان کے دلوں میں عوام کے احساسات کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ چونکہ ان کے دلوں میں عوامی احساسات کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں اس لئے وہ ان کی ترجمانی کیسے کر سکتے ہیں۔ انہیں کسی بھی فرقہ کا اعتماد حاصل نہیں ہے۔" افتخار الدین نے مزید کہا کہ "میں پورے زور کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان مسلمانوں کا منصفانہ مطالبہ ہے اور مسلم لیگ ان کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ کوئی شخص بھی اس مسلمہ حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہندو دوست ہمارے خلاف قوم پرست مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کر رہے ہیں۔ وہ مولوی داؤد غزنوی کو بہت اہمیت دیتے ہیں...... میں اپنے قوم پرست دوست لالہ بھیم سین سچر (وزیر خزانہ) سے پوچھتا ہوں کہ اس کی سن لائٹ آف انڈیا انشورنس کمپنی میں کتنے مسلمان ہیں۔ میں ڈاکٹر گوپی چند بھارگو سے پوچھتا ہوں کہ اس کی لکشمی انشورنس کمپنی میں کتنے مسلمان ہیں۔ میں ویریندر سے پوچھتا ہوں کہ تمہارے والد مہاشہ کرشن کے روزنامہ "پرتاب" میں کتنے مسلمان کام کرتے ہیں اور کھدر بھنڈار میں کتنے مسلمان اونچے عہدوں پر فائز ہیں۔ میں تم سب کو تمہارے منہ پر یہ بتاتا ہوں کہ تم سب سرمایہ دار ہو اور اب تم رجعت پسند یونینسٹوں کی امداد کر رہے ہو۔ تم نے اس اسمبلی کے 80 مسلم ارکان کو ٹھکرا دیا ہے جو کہ مسلمانوں کے صحیح طور پر منتخبہ نمائندے ہیں اور ان چھ یا سات مسلم ارکان کے ساتھ مل کر مخلوط وزارت بنالی ہے جو کسی کی نمائندگی نہیں کرتے۔ تم

نے اس قسم کی بدنما کولیشن کی تشکیل محض اس لئے کی ہے کہ تمہیں مسلمانوں کی جماعت مسلم لیگ سے دشمنی ہے اور تم نے جو سودابازی کی ہے اس میں اسی دشمنی کی کارفرمائی ہے۔"[11]

وزارتی مشن کی ناکامی، فرقہ وارانہ قتل عام اور قیام پاکستان

ملک سر خضر حیات خان ٹوانہ کی سربراہی میں یہ مخلوط وزارت تقریباً ایک سال تک قائم رہی۔ اس عرصے میں لارڈ پیتھک لارنس کی زیر قیادت ایک وزارتی مشن ہندوستان آیا اور اس نے کانگرس، مسلم لیگ اور دوسری پارٹیوں کے لیڈروں سے گفت و شنید کرنے کے بعد 16 رمئی 1945ء کو ایک آئینی منصوبہ پیش کیا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ برصغیر کو تین علاقوں میں ترتیب دیا جائے گا۔ (1) بنگال اور آسام۔ (2) پنجاب، سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد۔ (3) باقی تمام صوبجات۔ ان تینوں علاقوں کی اپنی علاقائی حکومت ہوگی اور ملک کی مرکزی حکومت وفاقی ہوگی جس میں یہ تین علاقے منسلک ہوں گے۔ مرکزی حکومت کے اختیارات امور خارجہ، امور متعلقہ دفاع، صیغۂ مواصلات اور ان محکموں کے متعلقہ مالیات تک محدود ہوں گے۔ باقی سب امور کے اختیارات علاقائی حکومتوں کے سپرد ہوں گے۔ یہ نظام دس سال تک جاری رہے گا اور اس میعاد کے بعد اس میں ترمیم یا تبدیلی کی جاسکے گی۔ علاقہ نمبر (1) کے متعلق یہ شرط بھی تھی کہ "اگر اس کی اسمبلی مرکز سے علیحدگی کا فیصلہ کرے تو آسام کے نمائندوں کو اختیار ہوگا کہ وہ اپنی کثرت رائے سے یہ فیصلہ کریں کہ وہ اس علاقے میں شامل رہنا چاہتے ہیں یا نہیں۔ علاقہ نمبر (1) سے علیحدگی کی صورت میں وہ علاقہ نمبر (3) میں شامل ہو جائیں گے۔" یہ وزارتی مشن منصوبہ، گروپنگ سکیم کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ 1939ء کی سر سکندر کی سکیم اور 1942ء کے کرپس فارمولا سے ملتا جلتا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ برصغیر میں مسلم اکثریت والے علاقوں کو خودمختاری بھی مل جائے اور ہندوستان کی وحدت بھی قائم رہے۔

اگرچہ وزارتی مشن نے اس منصوبہ میں لیگ کے مطالبے کے مطابق برصغیر کی فوری طور پر دوٹوک تقسیم کی تجویز شامل نہیں تھی۔ تاہم 6 رجون 1946ء کو مسلم لیگ کونسل نے قائداعظم کے مشورے کے مطابق اس منصوبے کی منظوری دیدی۔ 26 رجون کو کانگرس کی مجالس عاملہ نے بھی اسے قبول کرلیا اور 7 رجولائی کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی نے ابوالکلام کی زیر صدارت مجلس عاملہ

کے اس فیصلے کی توثیق کردی۔ مگر کانگرس نے منظوری کے ساتھ اس منصوبے کی ایسی تشریح کی، جس کا مطلب تھا کہ گروپنگ قابل قبول نہیں ہے۔ گاندھی نے مشن کے ارکان سٹیفورڈ کرپس اور پیتھک لارنس کے ساتھ مل کر گروپنگ سکیم کو سبوتاژ کرنے کے لئے جو چالیں چلیں ان کا تفصیل کے ساتھ تذکرہ ''پاکستان کی سیاسی تاریخ پاکستان کیسے بنا؟ جلد اول'' میں کیا جا چکا ہے۔

8رجولائی کو کانگرس کے نئے صدر جواہر لال نہرو نے ایک پریس کانفرنس میں اس منصوبہ کی کچھ ایسی تعبیریں کیں جن سے یہ مطلب نکلتا تھا کہ کانگرس کے لئے گروپنگ سکیم قابل قبول نہیں اور وہ متحدہ قومیت کے نظریے کی بنیاد پر حسب مرضی آئین سازی کرے گی۔ ابوالکلام آزاد کے بیان کے مطابق نہرو کا یہ مؤقف سراسر غلط تھا اور اس نے اپنی اس کج روی سے برصغیر کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ چنانچہ 27رجولائی کو لیگ کونسل نے اپنے اجلاس منعقدہ بمبئی میں قائداعظم کے مشورے کے مطابق اپنا 6رجون کا فیصلہ واپس لے لیا اور اعلان کیا کہ 16راگست کو ڈائریکٹ ایکشن ڈے منایا جائے گا۔ چنانچہ اس دن برصغیر کے مسلمانوں نے لیگ کے اس فیصلے کی پرامن طریقے سے تعمیل کی لیکن کلکتہ میں امن قائم نہ رہا۔ اور ایک ایسا خوف ناک فرقہ وارانہ قتل عام شروع ہوا جو تین دن تک جاری رہا۔ ہزاروں بے گناہ لوگ ہلاک وزخمی ہوئے۔

پنجاب میں کلکتہ کے اس قتل عام کی وجہ سے فرقہ وارانہ کشیدگی میں بہت اضافہ ہوا لیکن کوئی خون خرابہ نہ ہوا۔ 24راگست 1946ء کو کانگرس نے مرکز میں عبوری حکومت کی تشکیل کی۔ پھر بھی صوبہ میں امن وامان قائم رہا البتہ مسلمانوں میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ ہندوستان میں ہندو راج قائم ہو گیا ہے۔ 15راکتوبر 1946ء کو مسلم لیگ بھی مرکزی حکومت میں شامل ہو گئی۔ مسلم لیگی ایگزیکٹو کونسلروں کی تعداد پانچ تھی جن میں راجہ غضنفر علی خان پنجاب سے تھا۔ لیکن یہ مخلوط عبوری حکومت بطور ایک ٹیم خوش اسلوبی سے کام نہ کر سکی بلکہ اس میں کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان شدید رسہ کشی جاری رہی جبکہ نواکھلی، بہار، گڑھ مکتیشر اور بعض دوسرے علاقوں میں فرقہ وارانہ قتل عام ہوتا رہا۔ اس صورت حال کے پیش نظر برطانیہ کے وزیراعظم ایٹلی نے 18ردسمبر 1946ء کو فیصلہ کیا کہ لارڈ ویول کی جگہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کا وائسرائے ہوگا۔ ایٹلی نے اس تقرر کا اعلان 20رفروری 1947ء کو کیا اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کر دیا کہ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کا آخری برطانوی وائسرائے ہوگا کیونکہ برطانیہ جون 1948ء تک ہندوستان سے بہر صورت دستبردار ہو

جائے گا۔ جب اس نے یہ اعلان کیا تھا، اس وقت پنجاب میں خضر وزارت کے خلاف مسلم لیگ کی پرامن تحریک سول نافرمانی جاری تھی۔

2 رمارچ 1947ء کو خضر حیات نے سر ظفر اللہ خان کے مشورے کے مطابق اپنی مخلوط وزارت کا استعفیٰ پیش کر دیا اور اگلے دن ایک بیان میں کہا کہ اب جبکہ انتقال اقتدار کا حقیقی سوال سامنے آ گیا ہے، صوبے کی مسلم اکثریت کی جانب سے مسلم لیگ کو اقلیتوں کے نمائندوں کے ساتھ مستقبل کے بارے میں معاملہ کرنا چاہیے۔ ملک فیروز خان نون کہتا ہے کہ خضر حیات خان نے فروری 1946ء میں کانگرس کے ساتھ مل کر مخلوط وزارت اس لئے بنائی تھی اور وہ 2 رمارچ 1947ء سے پہلے اس لئے مستعفی نہیں ہوا تھا کہ ''چند بڑے برطانوی حکام نے پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کو یقین دلایا ہوا تھا کہ برطانیہ ہندوستان نہیں چھوڑے گا...... سر خضر حیات برطانیہ گیا تھا تو وہاں اس نے چرچل اور وزیر ہند کے علاوہ اعلیٰ حضرت شاہ برطانیہ سے بھی ملاقات کی تھی اور ان سب نے فرداً فرداً اسے یقین دلایا تھا کہ ملک تقسیم نہیں ہوگا لیکن اس کی بدقسمتی تھی کہ لیبر حکومت قائم ہوگئی اور سر خضر حیات اس تبدیلی کا احساس نہ کر سکا۔''[12]

خضر حیات وزارت کے مستعفی ہونے کے اگلے دن ہندوؤں اور سکھوں نے لاہور جلوس نکالا اور ماسٹر تارا سنگھ، ڈاکٹر گوپی چند بھارگو، لالہ بھیم سین سچر وغیرہ نے اعلانات کئے کہ صوبہ میں مسلم لیگ کی وزارت کسی قیمت پر بننے نہیں دی جائے گی۔ نتیجتاً اسی دن لاہور، امرتسر، ملتان، راولپنڈی اور صوبہ کے دوسرے علاقوں میں فرقہ وارانہ خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ جس کے پیش نظر حکومت برطانیہ نے انتقال اقتدار کی تاریخ 30 رجون 1948ء کی بجائے 15 راگست 1947ء مقرر کر دی۔

تاہم پنجاب میں فرقہ وارانہ قتل عام جاری رہا اور اس کی شدت اور وسعت میں 15 راگست 1947ء کے بعد اور بھی اضافہ ہو گیا، دسمبر 1947ء میں جب کچھ امن ہوا تو یہ اندازہ لگایا گیا کہ گزشتہ نو ماہ کے عرصے میں مشرقی اور مغربی پنجاب میں تقریباً 5 لاکھ بے گناہ لوگ قتل ہوئے، تقریباً 20 ہزار عورتیں اغوا ہوئیں اور تقریباً سوا کروڑ مہاجرین اور شرنارتھی خانماں برباد ہو کر ترک وطن پر مجبور ہوئے۔ اس وقت تک ہندوستان مسلم اکثریت والی ریاست جموں وکشمیر کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کر چکا تھا اور اس بنا پر بھی ہزاروں لوگ جاں بحق ہوئے تھے اور لاکھوں

نے مجبوراً پاکستان میں پناہ لی تھی۔ ☆

پنجابی مسلم درمیانہ طبقہ کا فوج کی مدد سے پورے ملک پر بالا دستی کا خواب

مسلمانان پنجاب نے 1848ء کے بعد کی بے شمار محرومیوں اور تلخیوں کے اس طویل تاریخی پس منظر کے ساتھ پاکستان کے قیام کا خیر مقدم کیا تھا۔ یہاں کے غریب مسلم کسانوں نے جوش و خروش کے ساتھ مطالبہ پاکستان کی تائید و حمایت اس امید سے کی تھی کہ اس طرح انہیں نہ صرف غیر مسلم ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے استحصال سے نجات ملے گی بلکہ جاگیرداریت کے طوق سے بھی ان کی گلوخلاصی ہوگی۔ صوبائی مسلم لیگ کے 46-1945ء کے انتخابی منشور میں ان سے یہی وعدہ کیا گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اس انتخاب میں بڑے بڑے ''خاندانی جاگیرداروں'' کے برج الٹا دیئے تھے، ملائیت کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تھا اور قائداعظم کے ''کھمبوں'' کا انتخاب کیا تھا۔ لیکن قیام پاکستان سے ان کی یہ امید صرف اس حد تک پوری ہوئی کہ غیر مسلم ساہوکار اپنے کروڑوں روپے کے قرضوں کی رقوم وصول کئے بغیر ہی بطور شرنارتھی ہندوستان چلے گئے لیکن جاگیرداریت کا طوق بدستور ان کے گلے میں پڑا رہا اور غیر مسلم کاروباری سرمایہ داروں کی جگہ نوزائیدہ مسلم سرمایہ داروں نے لے لی۔

پنجابی مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ نے پاکستان کا مطالبہ بڑے بلند عزائم کے ساتھ کیا تھا۔ اس طبقہ کی نمود انیسویں صدی کے اواخر میں شروع ہوئی تھی اور بیسویں صدی میں نہری نظام آبپاشی، مغربی پنجاب کے صحرائی اور بنجر علاقوں میں آبادکاری کی سکیموں اور دو عالمگیر جنگوں کے باعث اس کی تعداد میں اچھا خاصا اضافہ ہوا تھا مگر اس کے لئے معاشی ذرائع کی بہت کمی تھی۔ تجارت، صنعت اور سرکاری ملازمتوں پر غیر مسلموں کا غلبہ تھا اور وہ ان شعبوں میں مسلمانوں کو پاؤں رکھنے کی بھی جگہ نہیں دیتے تھے۔ اس طبقہ کا خیال تھا کہ پاکستان قائم ہوگا تو اس مملکت خدا

☆ تقسیم پنجاب اور قیام پاکستان کی روداد اپنے داخلی اور خارجی تناظر میں پوری تفصیل کے ساتھ پاکستان کی سیاسی تاریخ کی جلد اول و دوئم بعنوان ''پاکستان کیسے بنا؟'' میں بیان کی جاچکی ہے اس لیے یہاں اس کا اعادہ نہیں کیا گیا۔ اسی طرح جلد سوم بعنوان ''پاک بھارت تنازعہ اور مسئلہ کشمیر کا آغاز'' میں ریاست جموں و کشمیر پر ہندوستان کے غاصبانہ قبضے کی داستان بیان کی جاچکی ہے۔

داد میں ہندو راج کی بجائے پنجابی راج ہوگا۔ کیونکہ اس کی 90 فیصد فوج پنجاب کی ''مارشل نسل'' کے جوانوں پر مشتمل ہوگی اور سول انتظامیہ پر اس کا غلبہ ہوگا۔ صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان اور بنگال کے مسلمانوں میں درمیانہ طبقہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ فوج میں صوبہ سرحد کی تھوڑی سی نمائندگی تھی لیکن انگریزوں نے سندھ، بلوچستان اور بنگال کے مسلمانوں کے لئے فوج میں بھرتی کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ انہیں ان ''نان مارشل نسلوں'' کی وفاداری پر اعتماد نہیں تھا۔ چونکہ ان صوبوں کے مسلمان جدید تعلیم کے میدان میں بھی بہت ہی پسماندہ تھے اس لئے ان کی سول انتظامیہ میں بھی کوئی نمائندگی نہیں تھی۔ لہٰذا پاکستان میں پنجابی راج کے قیام کے راستے میں کوئی رکاوٹ نظر نہیں آتی تھی۔

اس درمیانہ طبقہ کے ساتھ چنیوٹ، لاہور اور بعض دوسرے علاقوں کے تھوڑے سے کاروباری سرمایہ دار اور فوجی ٹھیکیدار بھی تھے جو راتوں رات ارب پتی بننے کے سہانے خواب دیکھتے تھے۔ 47-1946ء کی فرقہ وارانہ خانہ جنگی کے باعث غیر مسلم سرمایہ داروں کا جو جبری انخلا ہوا تھا اس نے مسلمان سرمایہ داروں کے لئے استحصال کا میدان بالکل خالی کر دیا تھا۔ رنگون، مشرقی افریقہ، کلکتہ، مدراس اور بمبئی سے جو میمن، بوہرے اور خوجے آئے تھے انہوں نے اپنے استحصالی مرکز کراچی اور چٹاگانگ میں قائم کئے تھے۔ اگرچہ انہیں درآمدی و برآمدی تجارت کا خاصا تجربہ تھا لیکن کاروبار حکومت سے ان کا کبھی بھی کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔ انہوں نے سرکاری سول انتظامیہ اور فوج میں کبھی کوئی دلچسپی نہیں لی تھی لہٰذا پاکستان میں ان کے سیاسی غلبہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور وہ قائداعظم محمد علی جناح کی پشت پناہی کے باوجود پنجاب کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کے ساتھ اشتراک عمل کرنے پر مجبور تھے۔ چنانچہ جب تک بابائے قوم زندہ رہے ان کے درمیان اتحاد و تعاون قائم رہا۔ ملک کا پہلا وزیر خزانہ غلام محمد حکومت کی معاشی پالیسی ان سب سے مشورہ کرنے کے بعد وضع کرتا تھا اور کسی کو اس پر اعتراض کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

پنجابی شاونسٹوں نے دوسری قومیتوں کے خلاف مرکزی حکومت کا ساتھ دیا

اسی دوران پنجاب کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں نے کراچی کے میمنوں، بوہروں اور خوجوں کے ساتھ مل کر اسلام اور حب الوطنی کے نام پر اس نوزائیدہ ملک کے پسماندہ علاقوں

کے عوام کے سیاسی، معاشرتی اور معاشی حقوق ومفادات کو بڑی بیدردی سے کچلا۔ انہوں نے سب سے پہلے صوبہ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی اکثریتی حکومت کی غیر آئینی وغیر جمہوری برطرفی اور عبدالقیوم خان کی غیر نمائندہ واستبدادی حکومت کے قیام کی پرزور تائید وحمایت کی اور اس طرح سرحدی عوام کو ان کے جمہوری حقوق سے محروم کیا۔ پھر انہوں نے کراچی شہر کی صوبہ سندھ سے علیحدگی کا خیر مقدم کیا اور جب سندھیوں نے اس دھاندلی کے خلاف احتجاج کیا تو انہوں نے ایوب کھوڑو کی اکثریتی حکومت کی برطرفی پر خوشی کے ڈھول بجائے اور اس طرح انہوں نے نہ صرف سندھیوں کو بہت معاشی نقصان پہنچایا بلکہ ان کے سیاسی حقوق بھی سلب کئے۔ پھر جب مشرقی بنگال کے عوام نے مطالبہ کیا کہ ان کی بنگالی زبان کو بھی ایک قومی زبان کا درجہ دیا جائے تو پنجاب اور کراچی کے استحصالیوں نے شور مچادیا اور الزام عائد کیا کہ جو لوگ یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ان کی اسلام پسندی اور حب الوطنی مشکوک ہے اور اس وجہ سے ان پر ہر قسم کا جبر وتشدد جائز ہے۔ اور پھر جب بلوچستان کے بدنصیب عوام کو صوبائی درجہ دینے کی بجائے ایک نامزد مشاورتی کونسل پر ٹرخا دیا گیا تو پنجاب اور کراچی کے ان ''محبان وطن'' اور ''فدایان جمہوریت'' نے تالیاں بجائیں۔ ان کا سامراجی مؤقف یہ تھا کہ بلوچستانی عوام اتنے پسماندہ ہیں کہ وہ ابھی جمہوری نظام کے اہل نہیں ہیں۔

پنجابی شاونزم اور مہاجر بالادستی کے مابین محاذ آرائی اور لیاقت علی کا قتل

لیکن جب 11 ستمبر 1948ء کو قائداعظم کا انتقال ہو گیا تو پنجاب کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقہ کو وزیراعظم نوابزادہ لیاقت علی خان اور اس کے تلیئروں سے سخت خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ تھی کہ لیاقت علی خان نے مرکزی حکومت کے مختلف محکموں میں یو۔پی، دہلی اور ہندوستان کے بعض دوسرے علاقوں کے ''اہل زبان'' مہاجرین کی اتنی زیادہ بھرتی کی کہ پنجاب کے درمیانہ اور سرمایہ دار طبقوں کو یہ محسوس ہوا کہ اب مرکزی حکومت کی پالیسیوں میں ان کا خاطر خواہ عمل دخل نہیں ہوگا۔ پھر جب اس نے سپیریئر سنٹرل سروسز کے لئے کوٹہ سسٹم نافذ کیا اور اس کے تحت ''اہل زبان مہاجرین'' کو خصوصی مراعات دیں اور تجارت وصنعت کے شعبوں میں بھی ان سے ترجیحی سلوک کیا تو پنجابی طالع آزماؤں نے یہ تاثر لیا کہ لیاقت علی خان پورے پاکستان میں ''اہل

زبان'' کا غلبہ قائم کرنے کا عزم رکھتا ہے جبکہ یہ ''حق'' صرف ان ہی کے لئے مخصوص ہونا چاہیے۔

لیاقت علی خان نے یہ کوتاہ اندیشانہ پالیسی بظاہر اس لئے اختیار کی تھی کہ اس کی جدی جاگیر اور حلقۂ انتخاب ہندوستان میں ہی رہ گیا تھا اس لئے وہ نہ صرف کراچی شہر کو اپنا محفوظ انتخابی حلقہ بنانا چاہتا تھا بلکہ وہ مختلف صوبوں کی داخلی سیاست پر بھی اپنے منظور نظر و قابل اعتماد افسروں کے ذریعے اثر انداز ہونا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے مؤخر الذکر سیاسی منصوبے پر عمل درآمد کی ابتدا پنجاب سے کی کیونکہ یہی صوبہ تھا جہاں سے اس کے اقتدار کو مؤثر طریقے سے چیلنج کیا جا سکتا تھا۔ اس نے پنجابی جاگیرداروں کے اس دھڑے کے ساتھ گٹھ جوڑ کیا جس کا صوبہ کے شہری درمیانہ طبقوں کے ساتھ بہت پرانا تضاد تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پنجابی شاونزم کا رخ، جو قائداعظم کے عہد اقتدار میں، صوبہ سرحد، سندھ، بلوچستان اور مشرقی بنگال کے پسماندہ عوام کی طرف تھا اب یکا یک تبدیل ہو کر وزیراعظم لیاقت علی خان اور اس کے منظور نظر اور مراعات یافتہ ''مطلیئروں'' کی طرف ہو گیا۔ پنجاب کے درمیانہ طبقہ نے علاقائی شاونزم کی لعنت سر فضل حسین، سر سکندر حیات خان اور سر خضر حیات خان ٹوانہ جیسے جاگیرداروں سے ورثہ میں پائی تھی اور 1948ء میں یہ ہتھیار اتنا تند و تیز ہو گیا تھا کہ اس نے اکتوبر 1951ء میں نہ صرف نوابزادہ لیاقت علی خان کو راہی ملک عدم کیا بلکہ اس نے پورے پاکستان کی سیاست کو لہولہان کر دیا۔ ☆

پنجابی شاونزم کے خلاف محاذ آرائی کرنے والے کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس مملکت خداداد کی افواج میں پنجابیوں کا غلبہ تھا۔ صرف سول انتظامیہ اور قانون ساز اداروں میں اپنے قابل اعتماد عناصر کا غلبہ قائم کر کے وہ اپنے اقتدار کو پائیدار نہیں بنا سکتا تھا۔ غالباً لیاقت علی خان کو بھی اپنی اس کمزوری کا احساس تھا لہٰذا اس نے اس کے ازالہ کے لئے یہ تدبیر اختیار کی کہ صوبہ سرحد کے ایک جونیئر جرنیل محمد ایوب خان کو بری فوج کا کمانڈر انچیف بنا دیا۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ اس نے اس فوجی افسر کو غیر معمولی ترقی دی ہے اس لئے یہ اس کا وفادار رہے گا اور اس بنا پر اس کی حکومت کو فوج کی جانب سے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ لیکن یہ اس کی زبردست بھول تھی۔ جرنیل محمد ایوب خان پشتو بولنے والا پٹھان نہیں تھا۔ وہ پنجابی زبان بولنے والے ضلع ہزارہ سے تعلق رکھتا تھا اور اس وجہ سے اس کے پنجابیوں سے گہرے مراسم تھے۔ اس نے لیاقت علی خان

☆ تفصیل کے لیے دیکھیے پاکستان کی سیاسی تاریخ جلد 4 بعنوان ''جناح۔ لیاقت تضاد اور پنجابی۔ مہاجر تضاد''

کے خلاف مرکزی حکومت کے پنجابی وزرا غلام محمد اور مشتاق احمد گرمانی وغیرہ کے علاوہ اعلیٰ پنجابی سول افسروں سے گٹھ جوڑ کرنے میں ذرا سی بھی تاخیر نہ کی اور نہ اس نے وزیراعظم سے بالا بالا امریکی سامراج سے رابطہ پیدا کرنے میں کوئی تامل کیا۔

چنانچہ اس صورت حال میں پنجابی شاونزم کی بے انتہا حوصلہ افزائی ہوئی اور اس نے بقول روزنامہ نوائے وقت لیاقت علی خان کی ''اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔'' صوبہ سندھ کا ایک پرانا سیاسی لیڈر جی۔ ایم۔ سید بہت بڑا انانیت پسند اور شاونسٹ ہے، اس لئے اس کے ہر بیان میں عموماً انتہا پسندی اور مبالغہ آرائی کا عنصر نمایاں ہوتا ہے۔ تاہم اس کا یہ بیان سراسر بے بنیاد نہیں ہے کہ ''لیاقت علی خان نے مہاجر افسروں اور دوسرے منظور نظر اہلکاروں کے ذریعے فوج اور سول سروسز پر اپنا مکمل کنٹرول قائم کر لیا تھا اور اس طرح اس نے اپنی ساری حکومت کو مہاجر مفاد پرستوں کا آلۂ کار بنا دیا تھا۔ ان مہاجر مفاد پرستوں کے استحصالی کاروبار میں سینئر حصہ دار، یعنی پنجاب کے مفاد پرست عناصر، جو ہر چیز کے بلاشرکت غیرے مالک بننے کی کوشش کر رہے تھے، اس صورت حال کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکے۔ لہٰذا انہوں نے ضروری اقدامات کر کے اس شخص کو جسمانی طور پر ختم کر دیا اور اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو اور پاکستان کے دوسرے لوگوں کو یو۔ پی (ہندوستان) کے اس پہلے نواب کے اعمال سے نجات دلا دی جو مہاجروں کی سلطنت تعمیر کر رہا تھا۔''[13]

ضمیمہ جات

ضمیمہ: 1

علامہ اقبال کا خطبہ صدارت

آل انڈیا مسلم لیگ اجلاس منعقدۂ آلہ آباد 29-30/دسمبر 1930ء

(مکمل متن کا مکمل اردو ترجمہ)

حضرات!

میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے ایک ایسے وقت میں مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کا اعزاز بخشا ہے جب کہ مسلمانان ہندوستان کی سیاسی زندگی نے ایک نہایت ہی نازک صورت اختیار کر لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس عظیم الشان اجتماع میں اُن حضرات کی کمی نہیں جن کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور جن کی معاملہ فہمی کا میں دل سے قائل ہوں۔ لہٰذا یہ بڑی جسارت ہوگی اگر میں اُن مسائل میں جن کے فیصلے کے لئے آج یہ حضرات یہاں جمع ہوئے ہیں، ان کی رہنمائی کا دعویٰ کر دوں۔ میں کسی جماعت کا رہنما نہیں اور نہ کسی رہنما کا پیرو ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا زائد حصہ اسلام اور اسلامی فقہ و سیاست، تہذیب و تمدن اور ادبیات کے مطالعہ میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس مسلسل اور متواتر تعلق کی بدولت جو مجھے تعلیمات اسلامی کی روح سے رہا ہے جیسا کہ مختلف زبانوں میں اس کا اظہار ہوا ہے، میں نے اس امر کے متعلق ایک خاص بصیرت پیدا کر لی ہے کہ ایک عالمگیر حقیقت کے اعتبار سے اسلام کی حیثیت کیا ہے۔ لہٰذا یہ فرض کرتے ہوئے کہ مسلمانان ہندوستان بہرحال اپنی اسلامی روح کو برقرار رکھنے پر مصر ہیں، میں کوشش کروں گا کہ آپ کے فیصلوں کی رہنمائی کی بجائے اسی بصیرت کی روشنی میں خواہ اس کی قدر و قیمت کچھ بھی ہو، آپ کے دل میں اس بنیادی اصول کا احساس پیدا کروں جس پر میری رائے میں ہمارے تمام فیصلوں کا عام انحصار ہونا چاہیے۔

اسلام اور قومیت

یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ بحیثیت ایک اخلاقی نصب العین اور نظام سیاست کے (اس سے میرا مطلب ایک ایسا سماجی ڈھانچہ ہے جس کا نظم و انضباط کسی نظام قانون کے ماتحت عمل میں آتا ہو لیکن جس کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح سرگرم کار ہو) اسلام ہی وہ سب سے بڑا جزو ترکیبی تھا جس سے مسلمانان ہند کی تاریخ حیات متاثر ہوئی، اسلام ہی کی بدولت مسلمانوں کے سینے ان جذبات وعواطف سے معمور ہوئے جن پر جماعتوں کی زندگی کا دارومدار ہے اور جن سے متفرق و منتشر افراد بتدریج متحد ہو کر ایک متمیز و معین قوم کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور ان کے اندر ایک مخصوص اخلاقی شعور پیدا ہو جاتا ہے۔ حقیقت میں یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ دنیا بھر میں شاید ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے جس میں اسلام کی وحدت خیز قوت کا بہترین اظہار ہوا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی اسلامی ڈھانچہ بطور معاشرہ صرف اسلام ہی کا رہین منت ہے اس لئے کہ اسلامی تمدن کے اندر ایک مخصوص اخلاقی روح کار فرما ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے اندرونی اتحاد اور ان کی نمایاں یکسانیت ان قوانین اور اداروں کی شرمندۂ احسان ہے جو تہذیب اسلامی سے وابستہ ہیں۔ لیکن اس وقت مغرب کے سیاسی افکار نے نہایت تیزی کے ساتھ نہ صرف ہندوستان بلکہ ہندوستان سے باہر تمام دنیائے اسلام میں انقلاب پیدا کر رکھا ہے۔ نوجوان مسلمانوں کی یہ خواہش ہے کہ وہ ان افکار کو عملاً اپنی زندگی کا جزو بنالیں۔ انہوں نے اس امر پر مطلق غور نہیں کیا کہ وہ کون سے اسباب تھے جن کے ماتحت ان افکار نے مغرب میں نشوونما پائی۔ یاد رکھنا چاہیے کہ سرزمین مغرب میں مسیحیت کا وجود محض ایک رہبانی نظام کی حیثیت رکھتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس سے کلیسا کی ایک وسیع حکومت قائم ہوئی۔ لوتھر کا احتجاج دراصل اسی کلیسائی حکومت کے خلاف تھا، اس کو کسی دنیوی نظام سیاست سے کوئی بحث نہیں تھی، کیونکہ اس قسم کا کوئی نظام سیاست مسیحیت میں موجود نہیں تھا۔ غور سے دیکھا جائے تو لوتھر کی بغاوت ہر طرح سے حق بجانب تھی۔ اگرچہ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ خود لوتھر کو بھی اس امر کا احساس نہ تھا کہ جن مخصوص حالات کے ماتحت اس کی تحریک کا آغاز ہوا ہے اس کا نتیجہ بالآخر یہ ہوگا کہ مسیح علیہ السلام کے عالم گیر نظام اخلاق کی بجائے مغرب میں ہر طرف بے شمار ایسے اخلاقی نظام پیدا ہو جائیں

گے جو خاص خاص قوموں سے متعلق ہوں گے اور اس وجہ سے ان کا حلقہ اثر بالکل محدود رہ جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ جس ذہنی تحریک کا آغاز لوتھر اور روسیو کی ذات سے ہوا، اس نے مسیحی دنیا کی وحدت کو توڑ کر اسے ایک ایسی غیر مربوط اور منتشر کثرت میں تقسیم کر دیا جس سے اہل مغرب کی نگاہیں اس عالمگیر مطمع نظر سے ہٹ کر جو تمام نوع انسان سے متعلق تھا، اقوام وملل کی تنگ حدود میں الجھ گئیں۔ اس نئے تخیل حیات کے لئے انہیں ایک سے کہیں زیادہ واقعی اور مرئی اساس مثلاً تصور وطنیت کی ضرورت محسوس ہوئی جس کا اظہار بالآخر ان سیاسی نظامات کی شکل میں ہوا جنہوں نے جذبۂ قومیت کے ماتحت پرورش پائی۔ یعنی جن کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ سیاسی اتحاد و اتفاق کا وجود عقیدت وطنیت ہی کے ماتحت ممکن ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر مذہب کا تصور یہی ہے کہ اس کا تعلق صرف آخرت سے ہے، انسان کی دنیوی زندگی سے اسے کوئی سروکار نہیں تو جو انقلاب مسیحی دنیا میں رونما ہوا ہے وہ ایک طبعی امر تھا۔ مسیح علیہ السلام کا عالمگیر نظام اخلاق نیست و نابود ہو چکا ہے اور اس کی جگہ اخلاقیات وسیاسیات کے قومی نظامات نے لے لی ہے۔ اس سے اہل مغرب بجا طور پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ مذہب کا معاملہ ہر فرد کی اپنی ذات تک محدود ہے۔ اسے دنیوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ لیکن اسلام کے نزدیک ذات انسانی بجائے خود ایک وحدت ہے۔ وہ مادے اور روح کی کسی ناقابل اتحاد ثنویت کا قائل نہیں۔ مذہب اسلام کی رو سے خدا اور کائنات، کلیسا اور ریاست اور روح اور مادہ ایک ہی کل کے مختلف اجزا ہیں۔ انسان کسی ناپاک دنیا کا باشندہ نہیں جس کو اسے ایک روحانی دنیا کی خاطر جو کسی دوسری جگہ واقع ہے، ترک کر دینا چاہیے، اسلام کے نزدیک مادہ روح کی ایک شکل کا نام ہے جس کا اظہار قید مکانی وزمانی میں ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مغرب نے مادے اور روح کی ثنویت کا عقیدہ بلا کسی غور وفکر کے مانویت کے زیر اثر قبول کر لیا تھا۔ اگرچہ آج اس کے بہترین ارباب فکر اپنی اس ابتدائی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں مگر سیاست دانوں کا طبقہ ایک طرح سے اب بھی مصر ہے کہ دنیا اس اصول کو ایک ناقابل انکار حقیقت کے طور پر تسلیم کر لے۔ دراصل یہ روحانی اور دنیوی زندگی غلط امتیاز ہے جس سے مغرب کے سیاسی اور مذہبی افکار بیشتر طور متاثر ہوئے ہیں اور جس سے یورپ کی مسیحی ریاستوں نے عملاً مذہب سے کلیتاً علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ اس سے چند متفرق اور بے ربط سلطنتیں قائم ہوگئی ہیں جن پر کسی انسانی جذبے کی بجائے قومی اغراض کی حکمرانی ہے۔ مگر لطف یہ ہے کہ

آج یہی سلطنتیں ہیں جو مسیحیت کے اخلاقی اور مذہبی عقائد کی پامالی کے بعد ایک متحدہ یورپ کا خواب دیکھ رہی ہیں۔ بالفاظ دیگر ان کو ایک ایسے اتحاد کی ضرورت کا احساس ہو چلا ہے جو کلیسا کے ماتحت انہیں حاصل تو تھا لیکن جس کو اخوت انسانی کے اس عالمگیر تصور کی روشنی میں تعمیر کرنے کی بجائے جو مسیح علیہ السلام کے دل میں موجود تھا انہوں نے لوتھر کی تعلیمات کے زیر اثر تباہ و برباد کر دیا۔ بہر حال دنیائے اسلام میں کسی لوتھر کا ظہور ممکن نہیں اس لئے کہ اسلام میں کلیسا کا کوئی ایسا نظام موجود نہیں ہے جو ازمنہ متوسطہ کے مسیحی نظام سے مشابہ ہو اور جس کے توڑنے کی ضرورت پیش آئے۔ دنیائے اسلام کے پیش نظر ایک ایسا عالمگیر نظام سیاست ہے جس کی اساس وحی تنزیل پر ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چونکہ ہمارے فقہا کو ایک عرصہ دراز سے عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ عہد جدید کی داعیات سے بالکل بیگانہ ہیں، لہٰذا اس امر کی ضرورت ہے کہ ہم اس میں از سر نو قوت پیدا کرنے کے لئے اس کی ترکیب و تعمیر کی طرف متوجہ ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ بالآخر تصور قومیت کا انجام ملت اسلامیہ میں کیا ہوگا۔ آیا اسلام اس تصور کو اپنے اندر جذب کر کے اس کو اسی طرح بدل دے گا جس طرح اس سے پیشتر اس نے اس سے بالکل مختلف تصورات کی ترکیب و نوعیت کو ہمہ تن بدل دیا تھا، یا یہ کہ اس سے خود اسلام کے اندر کوئی زبردست تغیر رونما ہو جائے گا۔ کچھ روز ہوئے پروفیسر ونسنگ نے مجھے لیڈن (ہالینڈ) سے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ اسلام نے اس وقت اس نازک دور میں قدم رکھا ہے جس میں داخل ہوئے مسیحیت کو ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس وقت سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ بہت سے قدیم تصورات کو ترک کر دینے کے باوجود مذہب کی بنیادوں کو تزلزل و انتشار سے محفوظ رکھنے کی صورت کیا ہے۔ پروفیسر موصوف کہتے ہیں کہ ابھی تو وہ اسی امر کا فیصلہ نہیں کر سکے کہ اس کا نتیجہ مسیحیت کے حق میں کیا ہوگا۔ اسلام کے متعلق کوئی پیشین گوئی کرنا اور بھی ناممکن ہے۔ اس وقت قوم و وطن کے تصور نے مسلمانوں کی نگاہوں کو نسل و خون کے امتیاز میں الجھا رکھا ہے اور اس طرح اسلام کے انسانیت پرور مقاصد میں عملاً حارج ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ نسلی احساسات ترقی کرتے کرتے ان معیارات کی بنیاد بن جائیں جو تعلیمات اسلامی کے مخالف ہی نہیں بلکہ ان سے بالکل متضاد ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ حضرات اس خالص علمی بحث کے لئے مجھے معاف فرمائیں گے۔ لیکن آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو اس امر سے مایوس

نہیں ہو گیا ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہن انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کر سکتی ہے۔ جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اصلیت حاصل ہے اور جسے یقین ہے کہ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے، اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جا سکتا ایسا شخص مجبور ہے کہ جس معاملہ پر غور کرے اپنے نقطۂ نظر کے ماتحت کرے۔ آپ یہ خیال نہ فرمایئے گا کہ جس مسئلے کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ محض نظری حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک زندہ اور عملی سوال ہے جس سے بطور ایک دستور حیات اور نظام عمل کے اسلام کی ساری کائنات متاثر ہو سکتی ہے۔ صرف یہی ایک مسئلہ ہے جس کے صحیح حل پر اس امر کا دارومدار ہے کہ ہم لوگ آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز و متحیر تہذیب کے حامل بن سکیں۔ اسلام پر ابتلا و آزمائش کا کبھی ایسا سخت وقت نہیں آیا جیسا کہ آج درپیش ہے۔ ہر قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے بنیادی اصولوں کی ترمیم و تاویل کرے یا ان کو یک قلم منسوخ کر دے۔ لیکن اس قسم کا قدم اٹھانے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ اس کے نتائج و عواقب کیا ہوں گے۔ میں یہ نہیں چاہتا کہ جس انداز سے میں نے اس مسئلے پر نظر ڈالی ہے اس سے کسی شخص کو یہ غلط فہمی ہو کہ جن حضرات کو میرے خیالات سے اتفاق نہیں ہے میں ان سے پیکار و مناقشت کا دروازہ کھولنا چاہتا ہوں۔ یہ اجتماع مسلمانوں کا ہے جن کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے مقاصد اور اس کی تعلیمات پر قائم رہنے کے دل سے آرزومند ہیں۔ میرا مقصود صرف اس قدر ہے کہ موجودہ حالت کے متعلق میں نے جو رائے قائم کی ہے، اس کا آزادی کے ساتھ اظہار کر دوں۔ میرے نزدیک صرف یہی ایک صورت ہے اس امر کی کہ میں آپ کی سیاسی راہوں کو اپنے عقائد کی روشنی میں منور کر سکوں۔

اختلاف میں ارتباط کی بنیاد پر اتحاد

سوال یہ ہے کہ آج جو مسئلہ ہمارے پیش نظر ہے اس کی صحیح حیثیت کیا ہے۔ کیا واقعی مذہب ایک نجی معاملہ ہے اور آپ بھی یہ چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں مسیحیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تخیل کے تو برقرار رکھیں لیکن اس کے نظام سیاست کی بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کر لیں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا؟ ہندوستان میں یہ سوال اور بھی

اہمیت رکھتا ہے کیونکہ باعتبار آبادی ہم اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہبی ارادت محض انفرادی اور ذاتی واردات ہیں، اہل مغرب کی زبان سے تو تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا کیونکہ یورپ کے نزدیک مسیحیت کا تصور ہی یہی تھا کہ وہ ایک مشرب رہبانیت ہے جس نے دنیائے مادیت سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ علم روحانیت پر جمالی ہے۔ اس قسم کے عقیدے سے لازماً وہی نتیجہ مترتب ہوسکتا تھا جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے واردات مذہب کی حیثیت جیسا کہ قرآن پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے اس سے قطعاً مختلف ہیں۔ یہ محض حیاتی نوع کی واردات نہیں ہیں کہ ان کا تعلق صرف صاحب واردات کے اندرون ذات سے ہو لیکن اس کے باہر اس کے گرد و پیش کی معاشرت پر ان کا کوئی اثر نہ پڑے۔ برعکس اس کے یہ وہ انفرادی واردات ہیں، جن سے بڑے بڑے اجتماعی نظامات کی تخلیق ہوتی ہے اور جن کے اولین نتیجے سے ایک ایسے نظام سیاست کی بنیاد پڑی جس کے اندر قانونی تصورات مضمر ہیں اور جن کی اہمیت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی بنیاد وحی والہام پر ہے۔ لہٰذا اسلام کے مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے جو خود اسی کا پیدا کردہ ہے الگ نہیں ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔ اگر آپ نے ایک کو ترک کیا تو بالآخر دوسرے کا ترک بھی لازم آئے گا۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی کسی ایسے نظام سیاست پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہوگا جو کسی ایسے وطنی یا قومی اصول پر ہو جو اسلام کے اصول اتحاد کی نفی کرنے پر مبنی ہو۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو آج مسلمانان ہندوستان کے سامنے ہے۔ مشہور فرانسیسی عالم رینان (Renan) کا قول ہے کہ انسان نہ نسل کی قید گوارا کر سکتا ہے نہ مذہب کی، نہ دریاؤں کا بہاؤ اس کی راہ میں حائل ہوسکتا ہے نہ پہاڑوں کی سمتیں اس کے دائرے کو محدود کر سکتی ہیں۔ اگر صحیح الدماغ انسانوں کا ایک زبردست اجتماع موجود ہے اور ان کے دلوں میں جذبات کی گرمی ہے تو انہی کے اندر وہ اخلاقی شعور پیدا ہو جائے گا جسے ہم لفظ ''قوم'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ مجھے اس قسم کی ترکیب واجتماع سے انکار نہیں۔ اگرچہ یہ ایک نہایت ہی طویل اور صبر آزما عمل ہے اس لئے کہ اس کا مطلب انسان کی زندگی کو عملاً ایک نئے سانچے میں ڈھالنا ہے اور اس کے جذبات و احساسات کی دنیا کو یکسر پلٹ دینا ہے۔ اگر اکبر کے دین الٰہی یا کبیر کی تعلیمات عوام الناس میں مقبول ہو جاتیں تو ممکن تھا کہ ہندوستان میں بھی اس قسم کی ایک نئی قوم پیدا ہو جاتی، لیکن تجربہ بتلاتا

ہے کہ ہندوستان کے مختلف مذاہب اور متعدد جاتیوں میں اس قسم کا کوئی رجحان موجود نہیں کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت کو ترک کر کے ایک وسیع جماعت کی صورت اختیار کر لیں۔ ہر گروہ اور ہر مجموعہ مضطرب ہے کہ اس کی ہئیت اجتماعیہ قائم رہے۔ لہٰذا اس قسم کا اخلاقی شعور جو رینان کے لئے کسی قوم کی تخلیق کے لئے ناگزیر ہے ایسی عظیم قربانی کا طالب ہے جس کے لئے ہندوستان کی کوئی جماعت تیار نہیں۔ قومیت ہند کا اتحاد ان تمام جماعتوں کی نفی میں نہیں بلکہ ان کے تعاون و اشتراک اور ہم آہنگی پر مبنی ہے۔ صحیح تدبر کا تقاضا ہے کہ ہم حقائق کا خواہ وہ کیسے ہی ناخوشگوار کیوں نہ ہوں اعتراف کریں۔ حصول مقاصد کی عملی راہ یہ نہیں ہے کہ ایک ایسی حالت کو فرض کر لیا جائے جو واقعتہً موجود نہ ہو۔ ہمارا طریق کار یہ ہونا چاہیے کہ ہم واقعات کی تکذیب کی بجائے ان سے جہاں تک ہو سکے فائدہ اٹھانے کی کوشش کریں۔ میری رائے میں ہندوستان اور ایشیا کی تقدیر صرف اس بات پر مبنی ہے کہ ہم قومیت ہند کا اتحاد اسی اصول پر قائم کریں۔ اگر ہم ہندوستان کو چھوٹا سا ایشیا قرار دیں تو غیر مناسب نہ ہوگا۔ اہل ہند کا ایک حصہ اپنی تہذیب وتمدن کے اعتبار سے مشرقی اقوام سے مشابہ ہے لیکن اس کا دوسرا حصہ ان قوموں سے ملتا جلتا ہے جو مغربی اور وسطی ایشیا میں آباد ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر ہندوستان کے اندر اشتراک وتعاون کی کوئی موثر راہ نکل آئی تو اس سے نہ صرف اس قدیم میک میں جو اپنے باشندوں کی کسی طبعی خرابی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض اپنے تاریخی مقام کے باعث ایک عرصۂ دراز سے مصائب وفتن کا تختۂ مشق بن رہا ہے، صلح و آشتی قائم ہو جائے گی بلکہ اس کے ساتھ ہی تمام ایشیا کا سیاسی عقدہ بھی حل ہو جائے گا۔

بایں ہمہ یہ امر کس قدر افسوسناک ہے کہ اب تک ہم نے باہمی تعاون و اشتراک کی جس قدر کوششیں کی ہیں، سب ناکام ثابت ہوئی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہماری ناکامی کا باعث کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شاید ہمیں ایک دوسرے کی نیتوں پر اعتماد نہیں اور باطناً ہم غلبہ واقتدار کے خواہش مند ہیں۔ یا یہ ممکن ہے کہ ہم اتحاد وتعاون کے مقاصد عالیہ کے لئے اتنا ایثار بھی نہیں کر سکتے کہ اب تک جو اجارات ہمیں کسی نہ کسی طرح حاصل ہو گئے ہیں، ان سے دست بردار ہو جائیں۔ ہم اپنی نفسانیت کو قومیت کے نقاب میں چھپاتے ہیں اور اگرچہ ظاہری طور پر ہمیں ایک نہایت ہی روادارانہ حب الوطنی کا دعویٰ ہے لیکن دلوں میں ذات پات کی تنگی اور فرقہ آرائی کی ہوس بدستور کام کر رہی ہے۔ ہم لوگ اس اصول کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ہر جماعت کو یہ

حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تہذیب وتمدن کے نشوونما میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائے۔ لیکن ہماری ناکامی کے اسباب کچھ بھی ہوں میرا دل اب بھی امید سے لبریز ہے۔ واقعات کا رجحان بہر کیف ہمارے داخلی اتحاد اور اندرونی ہم آہنگی ہی کی جانب نظر آتا ہے اور جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں کہ اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائیدار تصفیے کے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانان ہندوستان کو اپنی روایات وتمدن کے ماتحت اپنے ہندوستانی مادر وطن کے اندر رہتے ہوئے آزادانہ نشوونما کا حق حاصل ہے تو وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ یہ اصول کہ ہر فرد اور ہر جماعت اس امر کی مجاز ہے کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق آزادانہ ترقی کرے، کسی تنگ نظر فرقہ واری پر مبنی نہیں۔ فرقہ واری کی بھی بہت سی صورتیں ہیں جو فرقہ واری دوسری قوموں سے نفرت اور ان کی بدخواہی کی تعلیم دے، اس کے ذلیل اور ادنیٰ ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ میں دوسری قوموں کے رسوم وقوانین اور ان کے معاشرتی اور مذہبی اداروں کی دل سے عزت کرتا ہوں بلکہ بحیثیت مسلمان میرا یہ فرض ہے کہ اگر ضرورت پیش آئے تو احکام قرآنی کے حسب اقتضا میں ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت کروں۔ بایں ہمہ مجھے اس جماعت سے دلی محبت ہے جو میرے اوضاع واطوار اور میری زندگی کا سرچشمہ ہے اور جس نے اپنے دین اور اپنے ادب، اپنی حکمت اور اپنے تمدن سے بہرہ مند کر کے مجھے وہ کچھ عطا کیا جس سے میری موجودہ زندگی کی تشکیل ہوئی۔ یہ اسی کی برکت ہے کہ میرے ماضی نے از سر نو زندہ ہو کر مجھ میں یہ احساس پیدا کر دیا ہے کہ وہ اب بھی میری ذات میں سرگرم کار ہے۔ نہرو رپورٹ کے مصنفین تک نے بھی فرقہ واری کے اس پہلو کا اعتراف کیا ہے۔ علیحدگی سندھ کے مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:۔

''یہ کہنا کہ قومیت کے وسیع نقطۂ نگاہ کے ماتحت کسی فرقہ وارانہ صوبہ کا قیام مناسب نہیں بالکل ایسا ہے جیسے یہ دعویٰ کہ بین الاقوامی نصب العین کا تقاضا ہے کہ علیحدہ علیحدہ قوموں کا وجود قائم نہ رہے۔ ان دونوں بیانات میں ایک حد تک صداقت موجود ہے۔ لیکن بین الاقوامی نصب العین کے سرگرم سے سرگرم حامیوں کو بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ قوموں کی پوری پوری آزادی کے بغیر کسی بین الاقوامی ریاست کا وجود قائم کرنا مشکل ہے۔ اسی طرح مکمل تمدنی آزادی کے بغیر اور یاد رکھیے کہ اپنی ارفع اور اعلیٰ صورت میں فرقہ واری سوائے تمدن کے اور کچھ نہیں، ایک ہم

آہنگ اور متوازن قوم کا پیدا کرنا بھی ناممکن ہے۔''

ہندوستان کے اندر اسلامی ہندوستان

لہٰذا ثابت ہوا کہ ہندوستان میں ایک متوازن اور ہم آہنگ قوم کی نشوونما کی خاطر اپنی اعلیٰ ارفع حیثیت میں فرقہ واریت کا وجود ناگزیر ہے۔ مغربی ممالک کی طرح ہندوستان کی یہ حالت نہیں کہ اس میں ایک ہی قوم آباد ہو، وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہو اور اس کی زبان بھی ایک ہو۔ ہندوستان مختلف اقوام کا وطن ہے جن کی نسل، زبان، مذہب سب ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ ان کے اعمال و افعال میں وہ احساس پیدا ہی نہیں ہوسکتا جو ایک ہی نسل کے مختلف افراد میں موجود رہتا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو ہندو بھی تو کوئی واحد الجنس قوم نہیں۔ پس یہ امر کسی طرح بھی مناسب نہیں کہ مختلف ملتوں کے وجود کا خیال کئے بغیر ہندوستان میں یورپی جمہوریت کے اصول کا اطلاق کیا جائے۔ چنانچہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان کے اندر ایک مسلم ہند تشکیل دیا جائے پوری طرح جائز مطالبہ ہے۔ میری رائے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قراردادوں سے اسی بلند نصب العین کا اظہار ہوتا ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ مختلف فرقوں کے وجود کو فنا کئے بغیر ان سے ایک متوافق اور ہم آہنگ قوم تیار کی جائے تاکہ وہ آسانی کے ساتھ اپنی ان صلاحیتوں کو جو ان کے اندر مضمر ہیں عمل میں لاسکیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ اجتماع ان تمام مطالبات کی جو اس قرارداد میں موجود ہیں، نہایت شدومد سے تائید کرے گا۔ ذاتی طور پر تو میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔

میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست میں ضم کر دیا جائے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ سیلف گورنمنٹ، خواہ یہ سلطنت برطانیہ کے اندر ہو یا سلطنت برطانیہ کے باہر ہو، اور ایک مربوط شمال مغربی ہندی مسلم ریاست کی تشکیل بالآخر مسلمانوں کی کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کی تقدیر ٹھہرے گی۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے بھی پیش کی گئی تھی۔ اس نے اس بنا پر اس تجویز کو رد کر دیا تھا کہ اگر اس قسم کی ریاست قائم ہوئی تو یہ بے ہنگم طور پر وسیع و عریض ریاست ہوگی جس کا انتظام کرنا دشوار ہو جائے گا۔ جہاں تک رقبہ کا تعلق ہے نہرو کمیٹی کی رائے درست ہے لیکن اگر آبادی پر نظر کی جائے تو اس ریاست کے باشندوں کی تعداد

اس وقت کے بعض ہندوستانی صوبوں سے بھی کم ہوگی۔ انبالہ ڈویژن اور غالباً ایسے اضلاع جہاں غیر مسلم اکثریت میں ہیں، کو چھوڑ دیا جائے تو اس ریاست کی انتظامی مشکلات میں کمی ہو جائے گی اور آبادی کے اعتبار سے اس میں مسلمان زیادہ ہو جائیں گے۔ اس طرح مجوزہ علاقے چھوڑ دینے کے نتیجے میں یہ مربوط ریاست اپنے علاقے کے اندر آباد غیر مسلم اقلیتوں کو مؤثر طور پر تحفظ فراہم کر سکے گی۔ اس تجویز کو سن کر انگریزوں اور ہندوؤں کو خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔ ہندوستان مسلمانوں کا سب سے بڑا ملک ہے۔ اس جیتے جاگتے ملک میں اسلام کے ایک تمدنی قوت کی حیثیت سے زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک مخصوص علاقہ میں اس کی مرکزیت قائم ہو۔ مسلمانان ہند کے اس سب سے جاندار حصے کی مرکزیت کی بدولت، کہ جس نے حکومت برطانیہ کی شدید ناانصافیوں کے باوجود فوج اور پولیس کی خدمات انجام دے کر برطانوی راج کو ممکن بنایا، بالآخر نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے ایشیا کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اس سے مسلمانوں میں احساس ذمہ داری مضبوط ہوگا اور جذبۂ حب الوطنی فروغ پائے گا۔ اگر شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ بھرپور موقع دیا جائے کہ وہ ہندوستان کے نظام سیاست میں رہ کر نشوونما کر سکیں تو وہ ہندوستان کے خلاف تمام حملوں کی صورت میں چاہے یہ حملہ بزور قوت ہو یا بزور خیالات، ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔ پنجاب، جس کی 56 فیصد آبادی مسلمان ہے ہندوستان کی لڑاکا فوج کی 54 فیصد نفری مہیا کرتا ہے۔ اگر ہندوستان کی پوری فوج سے آزاد ریاست نیپال کے انیس ہزار گورکھوں کو نکال دیا جائے تو پنجاب کا حصہ تمام ہندوستانی فوج کا باسٹھ فیصد ہو جاتا ہے۔ اس اندازے میں وہ چھ ہزار جنگجو شامل نہیں جو صوبہ سرحد اور بلوچستان سے بھرتی کئے گئے ہیں۔ ان باتوں سے آپ شمال مغربی ہندوستان کی مسلم آبادی کی ان صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں جن کی بدولت وہ تمام ہندوستان کو غیر ممالک کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔ رائٹ آنریبل سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ ''شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی خودمختار ریاستوں کے قیام کے مطالبہ کا مقصد ان ذرائع کا حصول ہے جن کی بدولت ہنگامی حالات میں حکومت ہند پر دباؤ ڈالا جا سکے۔'' میں صاف طور پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے مطالبہ کی پشت پر وہ جذبہ نہیں ہے جو وہ سمجھتے ہیں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ وہ اپنی ترقی کی راہ میں آزادی کے ساتھ قدم بڑھائیں۔ لیکن یہ ایسی وحدانی حکومت کے تحت ممکن نہیں ہوگا

جس کوقوم پرست ہندو سیاستدان محض اس لئے قائم کر رہے ہیں کہ ان کو دوسرے فرقوں پر ہمیشہ کے لئے غلبہ حاصل ہو جائے۔

''ہندوؤں کے دلوں میں یہ خدشہ نہیں ہونا چاہیے کہ خودمختار مسلم ریاستوں کے قیام سے ان علاقوں میں ایک طرح کی مذہبی حکومتیں قائم ہو جائیں گی۔ میں اس سے قبل عرض کر چکا ہوں کہ اسلام میں مذہب کا مفہوم کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں ہے بلکہ ایک ایسی ریاست ہے جس کا وجود بطور تعہدی نظام، روسو کے اظہار خیال سے کہیں پہلے قائم ہوا۔ اس کا انحصار ایک اخلاقی نصب العین پر ہے جس کے مطابق انسان کسی خاص خطہ زمین سے وابستہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی ترکیب میں حصہ لیتی ہے اور اس کے زندہ جزو کی حیثیت سے چند فرائض اور حقوق کی مالک ہے۔ مسلم ریاست کی نوعیت کا اندازہ ٹائمز آف انڈیا کے ایک اداریے سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کی بنکنگ کی انکوائری کمیٹی کے سلسلے میں اخبار نے لکھا ہے کہ قدیم ہندوستان میں ریاست سود کی شرح کے متعلق قوانین بناتی تھی لیکن باوجودیکہ اسلام میں سود لینا حرام ہے، مسلم دورِ حکومت میں ہندوستانی مسلم ریاستوں نے شرح سود پر کوئی پابندیاں نہیں لگائیں۔ اس لئے میں ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفاد میں ایک مربوط مسلم ریاست کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ ہندوستان کے لئے اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ اندرونی توازن قوت کی وجہ سے امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کے لئے یہ ایک موقع ہوگا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو جائے جو عربی سامراجیت نے اس پر مسلط کئے تھے اور خود اپنے قوانین، تعلیم اور ثقافت کو وضع کرے اور انہیں اپنی حقیقی روح اور زمانہ حال کی روح دونوں کے قریب تر لے آئے۔

فیڈرل ریاستیں

پس یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہندوستان میں ان گنت قسم کی آب و ہوا، نسلوں، زبانوں، عقیدوں اور معاشرتی نظاموں کی موجودگی میں ہندوستان میں ایک مستحکم دستوری ڈھانچہ صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتا ہے کہ یہاں ایسی خودمختار ریاستیں قائم کی جائیں جو زبان، نسل، تاریخ، مذہب اور اقتصادی مفاد کی شناخت کے اشتراک پر مبنی ہوں۔ سائمن رپورٹ کے اندر وفاق کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اس کے تحت ضروری ہے کہ مرکزی مجلس قانون

ساز ایک عوامی مجلس نہ رہے بلکہ وفاقی ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو۔ مزید اس وفاق کا تقاضا یہ بھی ہے کہ علاقے کی از سرِنو حد بندی انہی خطوط پر کی جائے جن کی میں نے نشان دہی کی ہے اور اس رپورٹ میں ان دونوں تجاویز کی سفارش کی گئی ہے۔ میں ان دنوں تجویزوں کی دل سے تائید کرتا ہوں بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی کہوں گا کہ سائمن کمیشن کے مطابق علاقوں کی حد بندی کو دو شرائط ضروری پوری کرنی چاہئیں۔ اول یہ کہ حد بندی نئے دستور کے نفاذ سے قبل مکمل ہونی چاہیے۔ دوم یہ کہ اس کی نوعیت ایسی ہونی چاہیے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے۔ مناسب طور پر کی گئی نئی حد بندی سے ہندوستان کے آئینی مناقشہ میں چل رہا مخلوط اور جداگانہ نیابت کا قضیہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ یہ صوبوں کا موجودہ ڈھانچہ ہی ہے جس کی وجہ سے یہ جھگڑا جاری ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ جداگانہ نیابت کا اصول قومیت کی حقیقی روح کے منافی ہے۔ ان کے نزدیک لفظ قوم کا مفہوم یہ ہے کہ تمام باشندے آپس میں اس طرح خلط ملط ہو جائیں کہ ان کے اندر مخصوص فرقے کا انفرادی وجود باقی نہ رہے۔ تاہم ہندوستان کی صورت حال یہ نہیں ہے کہ اور نہ ہی یہ خواہش پائی جاتی ہے کہ ایسا ہو۔ ہندوستان میں مختلف النوع مذاہب اور اقوام ہیں۔ مزید برآں اگر مسلمانوں کی عمومی معاشی پسماندگی، ان پر بھاری قرضوں کا بوجھ، خصوصاً پنجاب میں، اور بعض صوبوں کی موجودہ ہیئت میں ان کی ناکافی اکثریتوں کا خیال کر لیا جائے تو یہ بات واضح طور پر سمجھ میں آجاتی ہے کہ مسلمان جداگانہ نیابت کے لئے کیوں بے چین ہیں۔ ایسے ملک میں اور ان حالات میں جو یہاں ہیں یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ علاقہ وار انتخابات سے تمام مفادات کا تحفظ ہو سکے گا۔ اس سے ناگزیر طور پر ایک گروہ کی حکومت قائم ہو جائے گی۔ لیکن اگر صوبوں کی حد بندی اس انداز سے کر دی جائے کہ نسبتاً ہم آہنگ فرقوں پر مشتمل صوبے وجود میں آجائیں جن میں لسانی، نسلی، ثقافتی اور مذہبی یکجہتی پائی جاتی ہو تو مسلمانانِ ہند کو خالصتاً علاقہ وار انتخابات کے اصول کے نفاذ پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

سائمن رپورٹ اور فیڈریشن

لیکن جہاں تک مرکزی فیڈرل ریاست کے اختیارات کا تعلق ہے ہندوستانی پنڈتوں اور انگریز پنڈتوں نے جو دستور حکومت تیار کیا ہے، اس سے اس باریک اختلاف کا صاف پتہ چل

جاتا ہے جو ان دونوں کے مقاصد میں موجود ہے۔ ہندوستان کے پنڈتوں کو یہ منظور نہیں کہ مرکزی حکومت کے موجودہ اختیارات میں سرمو بھی فرق آئے۔ ان کا مطالبہ صرف اس قدر ہے کہ ان اختیارات کو مرکزی قانون ساز اسمبلی کی رضامندی پر چھوڑ دیا جائے جس میں اس وقت بھی انہی کی اکثریت ہے اور جب اراکین کی نامزدگی کا طریق ختم ہو تو یہ اکثریت اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔ اس کے برعکس انگلستان کے پنڈتوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اگر مرکزی حکومت میں اصول جمہوریت کا اطلاق ہو گیا، تو اس کا نتیجہ ان کے مفاد کے خلاف ہو گا، کیونکہ مزید اختیارات مل جانے پر تمام قوت ان کے ہاتھ سے نکل جائے گی، یہ طے کیا ہے کہ وہ اپنے اصول جمہوریت کا تجربہ صوبائی حکومتوں میں کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے فیڈریشن کے اصول پر عمل کرنے کا خیال ظاہر کیا ہے، بلکہ اس کے متعلق کچھ تجاویز بھی پیش کر دی ہیں، لیکن انہوں نے اس اصول پر جس پہلو سے غور کیا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو مسلمانانِ ہند کے پیش نظر ہے۔ مسلمانوں نے فیڈرشن کا مطالبہ محض اس لئے کیا ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلے کے تصفیہ کی صرف یہی ایک صورت ہے۔ برخلاف اس کے شاہی کمیشن کے ارکان کے ذہن میں فیڈریشن کا جو تصور ہے وہ اصولی طور سے خواہ کتنا درست اور محکم کیوں نہ ہو، اس سے فیڈرل ریاستوں میں کسی خود اختیاری حکومت کا قائم ہونا مشکل ہے۔ ان کی غرض صرف اس قدر ہے کہ اصول جمہوریت کے نفوذ سے ہندوستان میں جو صورت حالات پیدا ہوگئی ہے اس سے فرار کی کوئی راہ نکل آئے۔ فرقہ وارانہ مسئلے پر انہوں نے کوئی غور نہیں کیا بلکہ اسے ویسے ہی چھوڑ دیا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک حقیقی فیڈریشن کا تعلق ہے، سائمن رپورٹ کی تجاویز نے اس کی پوری پوری نفی کر دی ہے۔ نہرو رپورٹ نے محض اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ مرکزی قانون ساز اسمبلی میں ہندوؤں کی اکثریت رہے وحدانی نظام کی سفارش کی کیونکہ اس سے تمام ہندوستان پر بآسانی ہندوؤں کا تغلب قائم ہو جاتا ہے۔ سائمن رپورٹ نے محض ایک لفظی فیڈریشن کی اسکیم پیش کی ہے جس کی تہ میں برطانیہ کا اقتدار بدستور قائم رہے گا۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ انگریز طبعاً اس اقتدار سے دست بردار ہونا پسند نہیں کرتے جو اب تک انہیں حاصل رہا ہے اور کچھ یہ کہ اگر فرقہ وارانہ مسئلہ کا تصفیہ نہ ہو سکا تو ان کو ہندوستان پر مستقلاً اپنا قبضہ رکھنے کے لئے ایک اچھا عذر مل جائے گا۔ میں خود اختیار (سیلف گورننگ) ہندوستان کے لئے وحدانی طرز

حکومت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ جن کو ''اختیارات مالبقیٰ'' کہا جاتا ہے، خود اختیار (سیلف گورننگ) ریاستوں کے سپرد ہونے چاہئیں۔ مرکزی وفاقی ریاست کے سپرد صرف ایسے اختیارات ہونے چاہئیں جو تمام وفاقی ریاستیں واضح طور پر بخوشی اس کے سپرد کریں۔ میں مسلمانان ہند کو ہرگز یہ تلقین نہیں کروں گا کہ وہ کسی ایسے نظام کے لئے رضامند ہو جائیں، چاہے وہ ہندوستانی ہو یا برطانوی، جو کہ وفاق کے صحیح اصول پر مبنی نہ ہو یا جس میں ان کے جداگانہ سیاسی وجود کو تسلیم نہ کیا گیا ہو۔

فیڈرل اسکیم اور راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

پیشتر اس کے کہ انگریز مرکزی حکومت میں اساسی تبدیلی کے لئے کوئی مؤثر ذریعہ پیدا کرتے اس امر کو محسوس کر لیا گیا تھا کہ اس میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آخرالامر راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں والیان ریاست کی شمولیت کو بھی ضروری قرار دیا گیا۔ اس سے باشندگان ہندوستان اور بالخصوص اقلیتوں کو بجا طور پر تعجب ہوا کہ والیان ریاست نے کس قدر تیزی کے ساتھ اپنی رائے بدل لی اور ہندوستان کی فیڈریشن میں شامل ہونے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ہندوؤں نے بھی جو اب تک وحدانی حکومت کے طرفدار چلے آتے تھے، بغیر کسی تکلیف کے فیڈریشن کے اصول سے اتفاق کر لیا۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے جب شاستری نے سر جان سائمن کی فیڈریشن والی اسکیم پر نہایت سختی سے نکتہ چینی کی تھی۔ لیکن دفعتہً وہ بھی فیڈریشن پر رضامند ہو گئے اور اپنی اس رضامندی کا اظہار کانفرنس کے ابتدائی اجلاس ہی میں کر دیا، جس سے وزیراعظم انگلستان کو موقع ملا کہ وہ اپنی آخری تقریر میں چند نہایت ہی برجستہ اشارات کر سکیں۔ یہ سب کچھ خالی از علت نہیں۔ انگریزوں نے والیان ریاست کو فیڈریشن میں شریک ہونے کی دعوت دی اور ہندو چپ چاپ اس پر رضامند ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ والیان ریاست کی شرکت سے جن میں مسلمانوں کی تعداد نہایت کم ہے دو مقصد حاصل ہوتے ہیں۔ ایک صرف وہ ہندوستان پر برطانوی اقتدار کے تسلسل میں مدد دیں گے دوسری طرف ہندوؤں کو فیڈرل اسمبلی میں ان کی بدولت اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ مرکزی حکومت کی شکل کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو اختلاف موجود ہے، انگریز مدبرین والیان ریاست

کے ذریعے نہایت چالاکی کے ساتھ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ خود والیان ریاست بھی یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس سکیم کے ماتحت ان کی مستبدانہ حکومت اور بھی زیادہ مضبوط ہو جائے گی۔ اگر مسلمانوں نے اس اسکیم کو خاموشی کے ساتھ منظور کر لیا تو ان کا سیاسی وجود تھوڑے ہی عرصے میں کالعدم ہو جائے گا۔ کیونکہ اس قسم کی فیڈریشن میں ہندو والیان ریاست کی اکثریت ہو گی اور وہی حکومت کے سیاہ و سفید کے مالک ہوں گے۔ اگر دولت برطانیہ کے مفاد کا سوال درپیش ہو گا تو وہ حکومت انگلستان کا ساتھ دیں گے۔ لیکن جہاں تک ملک کے اندرونی نظم و نسق کا تعلق ہے وہ ہندوؤں کا تسلط اور اقتدار قائم رکھیں گے۔ باتفاظ دیگر اسکیم برطانوی حکومت اور ہندو ہندوستان کے درمیان ایک قسم کی مفاہمت ہے یعنی اگر تم میرا اقتدار ہندوستان پر قائم رکھو تو میں تمہیں ایک ایسی حکومت قائم کرنے میں مدد دوں گا جس میں تمہارا یعنی ہندوؤں کا غلبہ ہو۔ لہٰذا اگر برطانوی ہندوستان کے تمام صوبے حقیقتاً خود مختار ریاستوں کی صورت اختیار نہ کر لیں تو پھر فیڈریشن میں والیان ریاست کی شرکت کا مطلب صرف اسی قدر ہو سکتا ہے کہ انگریز مدبرین اپنے اختیارات سے دست بردار ہوئے بغیر نہایت چالاکی کے ساتھ تمام جماعتوں کو خوش کر دینا چاہتے ہیں۔ مسلمانوں کو لفظ فیڈریشن سے، ہندوؤں کو مرکز میں اکثریت سے، اور انگریز حامیان سلطنت کو خواہ وہ ٹوری پارٹی سے ہوں خواہ مزدور پارٹی سے، حقیقی اختیارات کی قوت سے۔

ہندوستان میں ہندو ریاستوں کی تعداد مسلم ریاستوں سے کہیں زیادہ ہے۔ لہٰذا یہ دیکھنا باقی ہے کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ انہیں مرکزی فیڈرل اسمبلی میں 33 فیصد نشستیں حاصل ہوں، اسی ایک ایوان یا ایوانات میں کیونکر پورا کیا جائے گا، جو دیسی ریاستوں اور برطانوی دونوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان مندوبین فیڈرل حکومت کے اس مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جیسا کہ کانفرنس میں اس پر غور و خوض ہو رہا ہے۔ ابھی آل انڈیا فیڈریشن میں مسلمانوں کی نیابت کا مسئلہ پیش نہیں ہوا۔ البتہ رائٹر سے مختصراً یہ اطلاع موصول ہوئی ہے کہ اس وقت جو عبوری رپورٹ پیش ہوئی ہے، اس میں وفاقی مقننہ کے لئے دو ایوانوں کی سفارش کی گئی ہے جن میں برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کے نمائندے شریک ہوں گے لیکن ان کی تعداد کے مسئلے پر اس وقت بحث ہو گی جب کمیٹی ان عنوانات پر غور کرے گی، جن کو ابھی سب کمیٹی کے ذمہ نہیں کیا گیا۔ میری رائے میں تناسب کا سوال نہایت اہم ہے اور بہتر ہوتا کہ اسمبلی کی ہیئت ترکیبی

کے ساتھ اس پر بھی بحث ہو جاتی۔

میرے نزدیک سب سے بہتر صورت یہ ہوتی کہ صرف برطانوی ہندوستان کے علاقوں پر مشتمل وفاق قائم کر کے ابتدا کی جاتی۔ کسی وفاقی سکیم سے جو جمہوریت اور مطلق العنانیت کے ناپاک امتزاج سے قائم ہو اس کے سوا کوئی اور نتیجہ اخذ نہیں ہوسکتا کہ برطانوی ہندوستان کو بدستور وحدانی طرز حکومت کے تحت رکھا جائے۔ ممکن ہے کہ یہ وحدانی طرز حکومت انگریزوں، والیان ریاست اور اکثریتی فرقہ کے لئے مفید ہو لیکن اس سے مسلمانوں کو اس وقت تک فائدہ نہیں ہوسکتا جب تک انہیں ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے پانچ میں تمام اختیارات مالبقی کے ساتھ اکثریت کے حقوق حاصل نہ ہوں اور وفاقی مجلس قانون ساز میں انہیں 33 فیصد نشستیں نہ ملیں۔ جہاں تک کہ برطانوی ہند کے صوبوں کے لئے حاکمانہ اختیارات کا تعلق ہے، ہز ہائینس نواب بھوپال، سر اکبر حیدری اور مسٹر جناح کا رویہ سراسر حق بجانب ہے۔ چونکہ اب والیان ریاست بھی فیڈریشن میں شریک ہو رہے ہیں لہٰذا برطانوی ہند کی اسمبلی میں نمائندگی کے متعلق ہمیں اپنے مطالبے کو نئی شکل میں پیش کرنا چاہیے۔ اب یہ مسئلہ محض برطانوی ہند کی اسمبلی میں تناسب کا نہیں رہا، بلکہ اب سوال آل انڈیا فیڈریشن میں مسلمانوں کی نمائندگی کا ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہونا چاہیے کہ ان مسلم ریاستوں کے علاوہ جو فیڈریشن میں شریک ہوں، ہمیں آل انڈیا فیڈرل اسمبلی میں 33 فیصد نشستیں حاصل ہوں۔

مسئلہ دفاع

ہندوستان میں فیڈرل نظام قائم کرنے میں ایک بہت بڑی وقت دفاع وحفاظت کی ہے۔ شاہی کمیشن کے ارکان نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے تمام نقائص کو پیش نظر رکھ لیا ہے تاکہ جنگی نظم ونسق کی باگ ہمیشہ دولت برطانیہ کے ہاتھ میں رہے۔ انہوں نے لکھا ہے:۔

''ہندوستان اور برطانیہ کا تعلق کچھ ایسا ہے کہ ہندوستان کے مسئلہ دفاع کو نہ اب نہ مستقبل قریب میں محض ہندوستانی مسئلہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ دفاعی عساکر کا نظم ونسق ہمیشہ نائبین سلطنت کے ہاتھوں میں رہنا چاہیے۔ کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہیے کہ جب تک برطانی افواج اور برطانوی افسروں کی مدد کے بغیر ہندوستانی اپنی سرحدوں کی حفاظت کے قابل نہ ہو جائیں

برطانوی ہندوستان میں ذمہ دارانہ حکومت قائم نہیں ہوسکتی؟ موجودہ حالت میں اس امر سے انکار کرنا مشکل ہے کہ یہ واقعی ہندوستان کی آئینی ترقی کی راہ میں ایک رکاوٹ ہے۔ اگر نہرو رپورٹ کے اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ جب کبھی ہندوستان کو مزید اختیارات حاصل ہوں، ان کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ فوجوں کا نظم ونسق ہندوستان کی منتخبہ قانون ساز اسمبلی کے ماتحت ہوتو وہ تمام امیدیں جو اس امر سے وابستہ ہیں کہ مرکزی حکومت بتدریج اس منزل کی طرف بڑھے جس کا اعلان 20/اگست 1917ء میں ہوا تھا، معرضِ خطر میں آجائے گی۔''

اپنے بیان کی مزید تائید کے لئے ارکان کمیشن نے آگے چل کر اس امر پر خاص زور دیا ہے کہ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور مختلف نسلوں کے درمیان جن کی صلاحیتیں اور قوتیں ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں، ایک تصادم رونما ہے۔ پھر یہ کہہ کر اس مسئلے کو اور بھی زیادہ پیچیدہ بنانے کی کوشش کی ہے کہ:۔

''یہ حقیقت کہ ہمارے عام اور مروجہ الفاظ میں ہندوستانی ایک قوم نہیں ہیں اور بھی عیاں ہوجاتی ہے، جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کی جنگجو قوموں اور دوسری نسلوں میں کس قدر فرق موجود ہے۔''

اس مسئلے کے ان پہلوؤں پر زور دینے کا مقصد یہ ہے کہ انگریز صرف بیرونی حملوں ہی سے ہندوستان کی حفاظت نہیں کر رہے ہیں، بلکہ وہ اس کے اندرونی امن وسکون کے بھی ''غیر جانبدار محافظ'' ہیں۔ بہر حال فیڈریشن میں جیسا کہ میں اس کا مطلب سمجھتا ہوں، اس مسئلے کا صرف ایک پہلو باقی رہ جائے گا۔ یعنی ہندوستان کے خارجی دفاع کا۔ صوبجاتی عساکر کے علاوہ جو ہندوستان کے اندرونی امن عامہ کے لئے ناگزیر ہیں۔ ہندوستان کی فیڈرل کانگریس صوبہ سرحد میں ایک طاقتور سرحدی لشکر متعین کرسکتی ہے جس میں ہر صوبے کے سپاہی شامل ہوں گے اور جن کی قیادت ہر فرقے کے آزمودہ کار افسروں کے ہاتھ میں ہوگی۔ مجھے اس امر کا بخوبی احساس ہے کہ ہندوستان میں قابل فوجی افسر موجود نہیں اور یہی چیز ہے جس سے فائدہ اٹھا کر ارکان کمیشن یہ کہتے ہیں کہ افواج کا نظم ونسق دولت برطانیہ کے ہاتھوں میں ہونا چاہیے لیکن میں اس کے متعلق انہی کی رپورٹ سے ایک اقتباس پیش کروں گا۔ جس سے خود ان کا یہ اندازہ قابل اعتراض آتا ہے:۔

''اس وقت کوئی ہندوستانی جسے ملک معظم کی طرف سے کمیشن ملا ہو کپتان سے اونچے

عہدے پر فائز نہیں۔ ہندوستانی کپتانوں کی کل تعداد 39 ہے جن میں سے 20 معمولی رجمنٹوں میں کام کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض کی عمر اس قدر زیادہ ہے کہ اگر وہ ضروری امتحانات میں کامیاب بھی ہو جائیں، تب بھی انہیں اس سے اونچا عہدہ حاصل نہیں ہو سکے گا۔ ان کا بیشتر حصہ سینڈ ہرسٹ نہیں گیا۔ بلکہ انہیں جنگ عظیم میں کمیشن ملا تھا۔ اب یہ خواہش کہ صورت حالات میں تغیر پیدا کیا جائے کس قدر سچی کیوں نہ ہو اور اس کے لئے کیسی بھی مخلصانہ کوشش کیوں نہ کی جائے وہ شرائط جن کو اسکین کمیٹی (Skeen Committee) نے (جس کے صدر اور فوجی سیکرٹری کے علاوہ تمام اراکین ہندوستانی تھے) نہایت مؤثر طریق پر لفظ ترقی میں جمع کر دیا ہے، اس امر پر منحصر ہیں کہ ہر مرحلے پر کامیابی حاصل ہو اور جنگی قابلیت بدستور قائم رہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ترقی کی رفتار لازماً سست رہے گی، موجودہ ہندوستانی افسر معمولی عہدوں پر کام کرتے ہیں اور ان کا تجربہ محدود ہے۔ لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک قلیل عرصے کے اندر اعلیٰ مراتب حاصل کر لیں۔ جب تک ہندوستانی امیدواروں کی قلیل جماعت میں اضافہ نہ ہو جائے اور ہم اس اضافے کے دل سے خواہش مند ہیں، جب تک ہندوستانیوں کی ایک کافی تعداد اس قدر تجربہ اور مہارت حاصل نہ کر لے کہ جس سے سب نہیں تو کم از کم کچھ رجمنٹوں کے تمام افسر صرف ہندوستانی ہوں، جب تک یہ رجمنٹیں عملاً اس آزمائش میں کامیاب نہ ہو جائیں جو ان کی قابلیت کا اندازہ کرنے کا ایک ہی ذریعہ ہے، اس وقت تک یہ ممکن نہ ہوگا کو فوج کے نظم و نسق کو ہندوستانیوں کے ذمہ سپرد کیا جائے اور یہ عمل اس حد تک پہنچ جائے کہ ساری فوج کلیتہً ہندوستانی ہو جائے۔ اس حالت میں بھی اس کام کی تکمیل کے لئے ساٹھ سال کی ضرورت ہوگی۔''

اب یہ عرض کرنے کی جرأت کروں گا کہ اس صورت حالات کا ذمہ دار کون ہے۔ اس کی وجہ ہماری جنگجو قوموں کی کوئی فطری خرابی ہے یا فوجی تعلیم کی سستی رفتار؟ ہماری جنگجو قوموں کی صلاحیت مسلمہ ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ بہ نسبت تعلیم کے دوسرے شعبوں کے، جنگی تعلیم کا عمل سست ہو۔ میں عسکریت کا ماہر نہیں لیکن عام آدمی کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ اس دلیل کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ عمل ہمیشہ جاری رہے گا۔ گویا ہندوستان کی غلامی کبھی ختم نہیں ہوگی۔ لہٰذا ضروری ہے کہ نہرو رپورٹ کی تجویز کے مطابق سرحدی افواج کا نظم و نسق ایک دفاعی کمیٹی کے ذمہ کر دیا جائے اور اس کے ارکان کا فیصلہ باہمی تصفیہ سے ہو۔

ایک عجیب بات یہ ہے کہ سائمن رپورٹ میں ہندوستان کی بری سرحدوں کوتو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے لیکن اس کے بحری تحفظ کے متعلق صرف سرسری اشارات کئے گئے ہیں۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان پر ہمیشہ خشکی کے راستے سے حملے ہوتے رہے ہیں،لیکن یہ امر بھی مسلم ہے کہ ہندوستان کے موجودہ حاکم اس کے غیر محفوظ سواحل کی وجہ سے اس پر قابض ہوئے تھے۔ایک آزاد اور خودمختار ہندوستان کے لئے ازبس ضروری ہے کہ وہ خشکی کی بجائے اپنی بحری سرحدوں کی زیادہ حفاظت کرے۔

مجھے یقین ہے کہ وفاقی حکومت کے قیام کی صوررت میں مسلم وفاقی ریاستیں ہندوستان کے دفاع کی خاطر غیر جانبدار بری اور بحری فوجوں کو قائم کرنے کے لئے بخوشی رضامند ہو جائیں گی۔ہندوستان کے دفاع کے لئے اس قسم کی غیر جانبدار فوجی طاقت مغلیہ دور حکومت میں موجود تھی۔اکبر کے زمانہ میں ان تمام سرحدی فوجوں کے افسر ہندو تھے۔ مجھے کامل یقین ہے کہ ہندوستان کے وفاق پر مبنی ایک غیر جانبدار ہندوستان فوج کے قیام سے مسلمانوں کی حب الوطنی میں اضافہ ہوگا اور اس سے اس بدگمانی کا بھی ازالہ ہو جائے گا کہ بیرونی حملہ کی صورت میں مسلمان،حملہ آور مسلمانوں کے ساتھ مل جائیں گے۔

متبادل

میں نے مختصراً اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ ہندوستان کے دو آئینی مسئلوں کے متعلق ہم مسلمانوں کو کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔مسلمانان ہند کا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے مستقل حل کے لئے برطانوی ہندوستان کے صوبوں کی از سر نو حد بندی کی جائے۔تاہم اگر فرقہ وارانہ مسئلے کے علاقائی حل کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے تو میں پورے شد و مد سے ان مطالبات کی تائید کرتا ہوں جن کا آل انڈیا مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ نے بارہا اعلان کیا ہے۔ مسلمانان ہندوستان کسی ایسی آئینی تبدیلی کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔جس کے ماتحت وہ بنگال اور پنجاب میں جداگانہ انتخابات کے ذریعہ اپنی اکثریت حاصل نہ کر سکیں یا مرکزی قانون ساز اسمبلی میں 33 فیصد نشستیں نہ مل جائیں۔اب تک مسلمانوں کے سیاسی راہنما دو گڑھوں میں گر چکے ہیں۔پہلا گڑھا لکھنؤ کا مسترد شدہ میثاق ہے جسے قومیت ہند کے غلط تصور پر مرتب کیا گیا تھا۔

اور جس کے ماتحت مسلمان ان تمام مواقع سے محروم رہ جاتے تھے کہ وہ اس ملک میں کوئی سیاسی طاقت پیدا کر سکیں۔ دوسرا گڑھا پنجاب کی نام نہاد دیہاتی آبادی کی خاطر اسلامی اتحاد و اتفاق کی وہ عاقبت نااندیشانہ قربانی ہے جس کا اظہار ایک ایسی تجویز میں ہوا ہے جس سے پنجاب کے مسلمان اقلیت میں رہ جاتے ہیں۔ لیگ کا فرض ہے کہ وہ میثاق اور اس تجویز دونوں کی مذمت کرے۔

سائمن رپورٹ نے مسلمانوں کے ساتھ ایک بہت بڑی ناانصافی کی ہے اور وہ یہ ہے کہ انہوں نے بنگال اور پنجاب میں ان کے لئے آئینی اکثریت کی سفارش نہیں کی۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمان یا تو میثاق لکھنؤ کے پابند رہیں یا مخلوط انتخابات کو اختیار کر لیں۔ حکومت ہند نے سائمن رپورٹ کے متعلق جو یادداشت بھیجی ہے اس میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ رپورٹ کی اشاعت کے بعد مسلمانوں نے ان دونوں تجویزوں میں سے کسی ایک کو بھی پسند نہیں کیا۔ یادداشت میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کی یہ شکایت بجا ہے کہ انہیں بنگال اور پنجاب میں تناسب آبادی کے لحاظ سے نمائندگی کا حق کیوں نہیں دیا گیا۔ محض یہ امر کہ انہیں دوسرے صوبوں میں ''پاسنگ'' حاصل ہے، اس نقصان کی تلافی نہیں کرتا لیکن تعجب خیز بات تو یہ ہے کہ کہ اس یادداشت میں بھی مسلمانوں کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے حکومت ہند نے بھی اسی ''نہایت احتیاط سے تیار کی ہوئی متوازن اسکیم'' کی حمایت کی ہے جس کو پنجاب کونسل کے سرکاری ممبروں نے مرتب کیا تھا اور جس کے ماتحت مسلمانان پنجاب کو پوری مجلس میں صرف 49 فیصد نشستیں ملتی ہیں اور ہندوؤں اور سکھ اراکین پر صرف دو کی اکثریت حاصل ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ پنجاب کی مثال بجائے خود اس قدر فیصلہ کن ہے کہ اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مسلمانان پنجاب کسی ایسی اسکیم کو تسلیم نہیں کر سکیں گے جس کی رو سے انہیں پوری مجلس میں قطعی اکثریت حاصل نہ ہو جائے۔ بہر حال لارڈ ارون اور ان کی حکومت کو اس امر سے اتفاق ہے کہ جب تک حق رائے دہندگی اس قدر وسیع نہ ہو جائے کہ ہر ملت کا تناسب آبادی واضح طور پر اس کے نمائندوں سے ظاہر ہو سکے اور جب تک تمام مسلمان بالاتفاق رائے جداگانہ نمائندگی کے حق سے دست بردار نہ ہو جائیں، ہندوستان کی اقلیتیں اس امر کی مجاز ہوں گی کہ فرقہ وارانہ انتخابات کو قائم رکھیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب حکومت ہند کے نزدیک مسلمانوں کی شکایت بجا ہے تو اسے اتنی جرأت کیوں نہیں ہوئی کہ وہ پنجاب اور بنگال میں

مسلمانوں کے لئے آئینی اکثریت کی سفارش کرتی۔

مسلمانان ہندوستان کو کسی ایسی تبدیلی سے بھی اتفاق نہیں ہوگا جس کے ماتحت سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ نہ کر دیا جائے یا شمال مغربی سرحدی صوبہ کا سیاسی درجہ وہی نہ ہو جائے جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں کا ہے۔ سندھ اور بلوچستان کو باہم ملا کر ایک نیا صوبہ قائم کر دینا چاہیے۔ احاطہ بمبئی اور سندھ میں کوئی چیز بھی تو مشترک نہیں۔ ارکان کمیشن کو بھی اعتراف ہے کہ اہل سندھ کی زندگی اور ان کا تمدن عراق اور عرب سے مشابہ ہے نہ کہ ہندوستان سے۔ مشہور اسلامی جغرافیہ داں مسعودی نے آج سے بہت پہلے عرب اور سندھ کی اسی باہمی مشابہت کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ مسعودی نے لکھا ہے کہ ''سندھ وہ ملک ہے جو مملکت اسلامی سے قریب تر ہے۔'' سب سے پہلے اموی خلیفہ کا قول تھا کہ مصر کی پشت افریقہ کی جانب ہے اور منہ عرب کی جانب۔ مناسب ردو بدل کے ساتھ یہی بات سندھ کے متعلق بھی کہی جا سکتی ہے۔ سندھ کی پیٹھ ہندوستان کی طرف ہے اور منہ وسط ایشیا کی جانب۔ علاوہ ازیں اگر سندھ کے ان زراعتی مسائل کا جن سے حکومت بمبئی کو مطلق ہمدردی نہیں، اور اس کی بے شمار تجارتی صلاحیتوں کا لحاظ رکھ لیا جائے، اس لئے کہ کراچی بڑھتے بڑھتے ایک روز لازماً ہندوستان کا دوسرا عروس البلاد بن جائے گا تو صاف نظر آ جاتا ہے کہ اس کو احاطہ بمبئی سے ملحق رکھنا مصلحت اندیشی سے کس قدر دور ہے۔ بے شک اس وقت بمبئی کا رویہ دوستانہ ہے لیکن ممکن ہے کہ وہ کل ہی اس کا حریف بن جائے۔ کہا جاتا ہے کہ اس راہ میں کچھ مالی مشکلات حائل ہیں۔ ابھی تک اس کے متعلق کوئی مستند بیان میری نظر سے نہیں گزرا لیکن فرض کر لیجئے کہ اس قسم کی مشکلات موجود ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں کہ حکوت ہند امید افزا صوبہ کو اپنی آزادانہ ترقی کی جدوجہد میں عارضی طور پر مدد نہ دے۔

رہا شمال مغربی سرحدی صوبہ سو یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ ارکان کمیشن نے عملاً اس امر سے انکار کر دیا ہے کہ اس صوبے کے باشندوں کو بھی اصلاحات کا حق حاصل ہے۔ ان کی سفارشات برے (Bray) کمیٹی سے بھی کم ہیں۔ اور وہ جس کونسل کی تجویز پیش کرتے ہیں وہ چیف کمشنر کی مطلق العنانی کے لئے محض ایک آڑ کا کام دے گی۔ افغانوں کا یہ پیدائشی حق کہ وہ سگریٹ روشن کر سکیں، محض اس لئے سلب کر لیا گیا ہے کہ وہ ایک بارود خانے میں رہتے ہیں۔ ارکان کمیشن کی دلیل کسی قدر لطیف کیوں نہ ہو اس سے کسی جماعت کا اطمینان نہیں ہو سکتا۔ سیاسی

اصلاحات کی مثال روشنی کی سی ہے نہ کہ آگ کی اور ہمارا فرض ہے کہ تمام انسانوں تک یہ روشنی پہنچائیں۔خواہ وہ خانہ بارود میں رہتے ہوں یا کوئلے کی کان میں۔افغان ایک بہادر اور ذہین قوم ہے۔ وہ اپنے مقاصد کے لئے ہر قسم کی تکلیف برداشت کر سکتے ہیں۔ وہ ایسی کوشش کی شدت سے مزاحمت کریں گے جو ان کو آزادانہ ترقی کے حق سے روک دے۔ ان لوگوں کو مطمئن رکھنا ہندوستان اور انگلستان دونوں کے لئے مفید ہے۔ گزشتہ ایام میں اس بدقسمت صوبے میں جو المناک واقعات پیش آ چکے ہیں، وہ محض اس امتیازی اور غیر ہمدردانہ سلوک کا نتیجہ ہیں جو ہندوستان میں اصول حکومت خود اختیاری کے نفاذ سے لے کر اب تک اس سے روا رکھا گیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ برطانوی مدبرین صحیح حالات کا اندازہ کرنے میں غلطی نہیں کریں گے اور وہ اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا نہیں رکھیں گے کہ اس صوبہ میں جو کچھ پیش آ رہا ہے، خارجی اثرات کا نتیجہ ہے۔

حکومت ہند نے بھی یاداشت میں صوبہ سرحد کے لئے جن اصلاحات کی سفارش کی ہے وہ ناکافی ہیں۔ بے شک ان کا دائرہ کمیشن کی سفارشات سے وسیع تر ہے کیونکہ اس میں ایک طرح کی منتخب کونسل اور نیم منتخب کابینہ کی تجویز پیش کی گئی ہے لیکن حکومت ہند نے بھی اس صوبے کو وہ سیاسی درجہ نہیں دیا جو دوسرے صوبوں کو حاصل ہے حالانکہ افغان جبلتاً اس بات کے کہیں زیادہ اہل ہیں کہ ہندوستان کے دوسرے باشندوں کی نسبت جمہوری ادارات میں حصہ لیں۔

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

میرا خیال ہے کہ مجھے اب راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے متعلق چند سرسری اشارات کر دینے چاہئیں۔ذاتی طور سے مجھے اس کانفرنس سے کوئی امید وابستہ نہیں۔البتہ یہ ضرور تصور کیا جاتا تھا کہ فرقہ وارانہ تنازعات کی رزم گاہ سے دور ایک بدلی ہوئی فضا میں لوگ کہیں زیادہ ہوش مندی سے کام لیں گے۔لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ واقعات اس کے بالکل برعکس ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مسائل پر جو بحث لندن میں ہوئی ہے اس سے مسلمانوں اور ہندوؤں کا تمدنی اختلاف اور بھی زیادہ واضح ہو گیا ہے۔ بایں ہمہ وزیر اعظم انگلستان کو اس امر سے انکار ہے کہ ہندوستان کا مسئلہ بین الاقوامی ہے، قومی نہیں۔انہوں نے کہا ہے کہ ''یہ ایک دشوار بات ہوگی کہ میری حکومت پارلیمنٹ کے سامنے جداگانہ انتخاب کی تجویز پیش کرے۔ اس لئے کہ مخلوط

انتخابات انگریزوں کے جذبات جمہوریت پسندی کے زیادہ قرین ہیں۔" انہوں نے اس امر پر غور نہیں کیا کہ ایک ایسے ملک میں جہاں متعدد قومیں آباد ہوں، برطانوی جمہوریت کی صورت قائم نہیں ہوسکتی۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ اس مسئلے کو جغرافیائی اصول پر حل کیا جائے۔ جداگانہ انتخاب کو قائم رکھنا اس کا کوئی عمدہ بدل نہیں ہے۔ مجھے یہ بھی امید نہیں کہ اقلیتوں کی سب کمیٹی کسی صحیح نتیجے پر پہنچے۔ آخرالامر سارا مسئلہ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش ہوگا۔ ہمیں امید ہے کہ انگریز قوم کے بالغ نظر نمائندے اس مسئلہ کو محض سطحی نگاہوں سے نہیں دیکھیں گے جیسا کہ اب تک ہندوستان کے اکثر ارباب سیاست نے کیا ہے۔ بلکہ ان کی نگاہیں اس معاملے کی تہہ تک پہنچ جائیں گی اور وہ محسوس کر لیں گے کہ ہندوستان کے اندر امن وسکون کے قیام کا طریق کیا ہے۔ ہر وہ دستور جو ایک ہمہ گیر ہندوستان کے تصور پر مرتب کیا جائے گا جس کا مقصد یہ ہوگا کہ یہاں ایسے اصولوں کا نفاذ کیا جائے جو برطانیہ کے جذبہ جمہوریت کی پیداوار ہوں تو اس کا مطلب تسلیم نہ کر لیا جائے کہ ہندوستان میں بسنے والے مختلف لوگوں کو ماضی سے یک قلم اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر جدید اصولوں پر اپنی نشوونما کے مواقع میسر ہوں گے۔ اس وقت تک ہندوستان میں امن وامان قائم نہیں ہوسکتا۔

مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ہمارے مسلمان مندوبین کو اس مسئلے کے صحیح حل کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہے۔ جس کو ہم نے ہندوستان کا بین الاقوامی مسئلہ کہا ہے۔ ان کا یہ اصرار بالکل بجا ہے کہ مرکزی حکومت میں ذمہ داری کا مسئلہ طے کرنے سے پہلے فرقہ وارانہ تنازعات کا تصفیہ ہوجانا ضروری ہے۔ کسی مسلمان سیاسی راہنما کو اس طعن آمیز الفاظ (یعنی لفظ "فرقہ واری") کا مطلق خیال نہیں کرنا چاہیے۔ جسے ہندو محض پروپیگنڈا کی خاطر استعمال کر رہے ہیں تاکہ بقول وزیراعظم وہ انگلستان کے جذبات جمہوریت پسندی سے فائدہ اٹھاسکیں اور انگریز غلطی سے یہ فرض کرلیں کہ وہ ہندوستان کے دوسرے باشندوں کی نسبت کہیں زیادہ یک رنگ قوم ہیں بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ہندوستان میں کوئی قوم بستی ہے تو وہ مسلمان ہی ہیں، اگرچہ ہندو ہر بات میں ہم سے آگے ہیں لیکن ابھی ان کو وہ یک رنگی حاصل نہیں ہوئی جو ایک قوم بننے کے لئے ناگزیر ہے اور جو اسلام نے از خود آپ کو عطا کی ہے۔ بیشک ہندو اس امر کے لئے مضطرب ہیں کہ وہ ایک قوم بن جائیں۔ مگر قوموں کی ترکیب گویا ایک نئی زندگی میں قدم رکھنا ہے اور جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام نظام معاشرت کو یک قلم بدل دیں۔ ایسے ہی مسلمان

رہنماؤں اور ارباب سیاست کو اس لطیف مگر مغالطہ انگیز دلیل سے بھی متاثر ہونا نہیں چاہیے کہ ترکی، ایران اور دوسرے مسلم ممالک قوم پسندی کے اصولوں پر گامزن ہیں۔ مسلمانان ہندوستان کی حالت ان سے بالکل مختلف ہے۔ ان ممالک کی ساری آبادی تقریباً مسلمانوں کی ہے اور جو اقلیتیں باقی رہ جاتی ہیں ان کا تعلق باصطلاح قرآنی اہل کتاب سے ہے۔ مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان کوئی معاشرتی دیوار حائل نہیں۔ اگر کوئی یہودی، عیسائی، یا زرتشتی (یعنی پارسی) کسی مسلمان کا کھانا چھولے تو وہ نجس نہیں ہو جاتا۔ شریعت اسلامی کی رو سے ان میں باہم مناکحت جائز ہے۔ حقیقت میں یہ وہ اولین قدم تھا جو اسلام نے عملاً اتحاد نوع انسانی کی خاطر اٹھایا۔ اس نے ان لوگوں کو جن کا اخلاقی نصب العین تقریباً ایک سا تھا، باہم مل جانے کی دعوت دی۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے ''اہل الکتاب تعالوعلیٰ کلمۃ (یعنی توحید) صواء بیننا وبینکم۔'' یہ الگ بات ہے کہ مسلمان اور عیسائی اقوام کے باہمی جنگ وجدل اور پھر مغرب کی چیرہ دستیوں نے اس امر کا موقع نہیں دیا کہ دنیائے اسلامی اس آیت کے لاانتہا معنوں کو عمل میں لاتی۔ بہر حال آج بلادِ اسلامی میں یہ مقصد مسلم قومیت کی شکل میں پورا ہو رہا ہے۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہم مندوبین کی کامیابی کا اندازہ صرف اس ایک امر سے کر سکتے ہیں کہ وہ کانفرنس کے غیر مسلم مندوبین سے قرارداد دہلی کے مطالبات کہاں تک منوا لیتے ہیں۔ اگر ان مطالبات کو مسترد کر دیا گیا تو ایک نہایت ہی اہم اور عظیم الشان سوال پیدا ہوگا۔ اس وقت ضرورت ہوگی کہ ہندوستان کے مسلمان ایک ہو کر کوئی آزادانہ سیاسی قدم اٹھائیں۔ اگر آپ اپنے مقاصد اور اپنے نصب العین پر واقعی سنجیدگی سے قائم ہیں تو آپ کو اس قسم کے عمل کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ ہمارے سر برآوردہ لوگوں نے کافی غور وخوض سے کام لیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک حد تک یہ انہیں کے غور وفکر کا نتیجہ ہے کہ ہم لوگ ان قوتوں سے آشنا ہوئے ہیں جو ہندوستان کے اندر اور اس کے باہر ہماری آئندہ قسمتوں کی تشکیل میں کارفرما ہیں لیکن میں آپ سے اس قدر پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا اس غور وفکر نے ہم میں اتنی قابلیت پیدا کر دی ہے کہ اگر مستقبل قریب میں ضرورت پیش آئے تو ہم اپنے آپ کو اسی قسم کے عمل کے لئے تیار پائیں جو حالات کے مقتضی ہو؟ مجھے آپ سے بلاتکلف کہہ دینا چاہیے کہ ہندوستان کے مسلمان اس وقت دو عوارض کا شکار ہو رہے ہیں۔ پہلا عارضہ یہ ہے کہ اہم شخصیتوں کا وجود نہیں، سر مالکم ہیلی اور لارڈ ارون کی

تشخیص بالکل صحیح تھی، جب انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ملت اسلامیہ نے کوئی رہنما پیدا نہیں کیا۔ رہنماؤں سے میرا مطلب وہ افراد ہیں جن کو عنایت ایزدی یا اپنے وسیع تجربات کی بدولت ایک طرف یہ ادراک حاصل ہو کہ اسلامی تعلیمات کی روح اور اس کی تقدیر کیا ہے۔ دوسری طرف ان میں یہ صلاحیت موجود ہو کہ وہ جدید حوادث کی رفتار کا اندازہ صحت کے ساتھ کر سکیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر کسی قوم کی قوت عملی کا انحصار ہوتا ہے۔ دوسرا مرض جو مسلمانوں کے اندر گھر کر چکا ہے یہ ہے کہ ان میں اطاعت کا مادہ باقی نہیں رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آج متعدد افراد اور متعدد جماعتیں الگ الگ راہوں پر گامزن ہیں اور اس سے قوم کے عام افکار اور اس کی عام سرگرمیوں پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ جو طرز عمل ہم نے مذہب میں اختیار کر رکھا ہے، اب وہی سیاسیات میں ہو گیا ہے۔ لیکن مذہبی فرقہ بندیوں سے اتنا نقصان نہیں پہنچتا۔ اس لئے ان سے کم از کم اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ ہمیں اس اصول سے دلچسپی ہے۔ جس پر ہماری ترکیب کا انحصار ہے۔ مزید برآں یہ اصول اس قدر وسیع ہے کہ کسی فرقہ کو اس قدر جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ اسلام کے حدود ہی سے باہر نکل جائے۔ برعکس اس کے اگر سیاسی زندگی میں اختلافات کو جائز رکھا گیا، بالخصوص اس وقت جس مفاد کی خاطر اتحاد عمل کی ضرورت ہے، تو اس کا نتیجہ سوائے ہلاکت کے اور کچھ نہیں ہو گا۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ ان دونوں امراض کے علاج کی صورت کیا ہے۔ اول الذکر کا تدارک ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ البتہ جہاں تک دوسری بیماری کا تعلق ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم اس کا دفعیہ کر سکتے ہیں۔ میں نے اس موضوع پر ایک خاص رائے قائم کر رکھی ہے۔ لیکن بہتر ہو گا کہ میں اس وقت تک اس کا اظہار نہ کروں جب تک کہ ایسی صورت حالات پیدا نہ ہو جائے جس کا خطرہ ہے۔ خدانخواستہ اگر ایسا ہوا تو تمام سربرآوردہ مسلمانوں کا خواہ ان کے خیالات کچھ بھی ہوں، فرض ہو گا کہ وہ ایک جگہ جمع ہوں اور صرف قرار دادیں ہی منظور نہ کریں بلکہ اپنے مقاصد میں حقیقی کامیابی کے حصول کے لئے مسلمانوں کے سامنے کوئی راہ عمل پیش کریں۔ میں نے اس امر کا تذکرہ صرف اس لئے کر دیا ہے کہ آپ نہایت سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں۔

خاتمۂ سخن

حضرات مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا کر چکا۔ آخر میں میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ

مسلمانِ ہند اس وقت اپنی زندگی کے جس نازک دور میں سے گزر رہے ہیں، اس کے لئے کامل تنظیم اور اتحادِ عزائم و مقاصد کی ضرورت ہے۔ ہمارے ملی وجود کی بقا اور ہندوستان کا مفاد صرف ایک اسی امر سے وابستہ ہے۔ ہندوستان کی سیاسی غلامی تمام ایشیا کے لئے لا متناہی مصائب کا سرچشمہ ہے۔ اس نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اسے اظہارِ ذات کی اس مسرت سے محروم کر دیا ہے جس کی بدولت کبھی اس میں ایک بلند اور شاندار تمدن پیدا ہوا تھا۔ ہم پر ایک فرض ہندوستان کی طرف سے عائد ہوتا ہے جو ہمارا وطن ہے اور جس میں ہمیں جینا اور مرنا ہے اور ایک فرض ایشیا بالخصوص مسلم ایشیا کی جانب سے اور چونکہ ایشیا کے دوسرے مسلم ممالک کی نسبت ایک ہی ملک میں سات کروڑ مسلمانوں کی موجودگی اسلام کے لئے ایک بیش بہا سرمایہ ہے، لہٰذا ہمیں چاہیے کہ ہم ہندوستان کے مسئلے پر محض اس زاویۂ نگاہ ہی سے نہیں بلکہ ہندی مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے بھی غور کریں۔ ایشیا اور ہندوستان کی طرف سے ہم پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں، ان کی بجا آوری اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم اپنے ارادوں کو ایک مخصوص مقصد پر جمع نہ کر لیں گے۔ بشرطیکہ آپ ہندوستان کی دوسری ملتوں کے درمیان اپنا وجود قائم رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں۔ ہماری بے نظم اور منتشر حالت کے باعث بہت سے ایسے سیاسی مصالح جو ہماری زندگی کے لئے ناگزیر ہیں، دن بدن پیچیدہ ہو رہے ہیں۔ میں فرقہ وارانہ مسائل کے تصفیہ سے خوش نہیں ہوں لیکن میں آپ سے اپنے اس احساس کو پوشیدہ نہیں رکھ سکتا کہ موجودہ نازک حالات کے تدارک کے لئے ہماری ملت کو مستقبل قریب ہی میں آزادانہ جدوجہد کرنا پڑے گی۔ لیکن کسی سیاسی طرزِ عمل کے لئے آزادانہ جدوجہد کرنا اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے، جب پوری قوم اس پر آمادہ ہو اور ان کے تمام عزائم اور ارادے ایک ہی مقصد پر مرکوز ہو جائیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم لوگوں کے اندر بھی وہ اشتراک عزم پیدا ہو جائے جس کا از خود نشوونما ہوتا ہے؟ کیوں نہیں؟ فرقہ بندی کی ہوس اور نفسانیت کی قیود سے آزاد ہو جایئے اور پھر اس نصب العین کی روشنی میں جو آپ کی طرف منسوب ہے، اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال کی قدر و قیمت کا اندازہ کیجئے، خواہ وہ مادی اغراض ہی سے متعلق کیوں نہ ہوں۔ مادیات سے گزر کر روحانیت میں قدم رکھیے۔ مادہ کثرت ہے، لیکن روح نور ہے، حیات ہے، وحدت ہے۔ ایک سبق جو میں نے تاریخ مسلم سے سیکھا ہے، یہ ہے کہ صرف اسلام تھا جس نے آڑے وقتوں میں مسلمانوں کی زندگی کو قائم

رکھانہ کہ مسلمان۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں پھر اسلام پر جمادیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں، تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرنو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔ قرآن مجید کی ایک نہایت معنی خیز آیت یہ ہے کہ ہمارے نزدیک ایک پوری ملت کی موت و حیات کا سوال ایسا ہی ہے جیسے ایک نفس واحد کا۔ پھر کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم مسلمان جو بجا طور پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ یہ ہم ہی تھے جو سب سے پہلے انسانیت کے اس بلند اور ارفع تصور پر عمل پیرا ہوئے، ایک واحد کی طرح زندہ رہیں؟ جب میں یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان کی حالت وہ نہیں ہے جیسی کہ نظر آتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں کسی شخص کو حیرت میں ڈالنا چاہتا ہوں۔ بہر حال اس کے صحیح معنی آپ پر اسی وقت آشکارا ہو سکیں گے جب آپ ان کے مشاہدے کے لئے ایک صحیح اجتماعی "انا" پیدا کر لیں گے۔

علامہ کا اصل خطبہ انگریزی میں تھا۔ اس کے مکمل انگریزی متن کے لیے دیکھئے۔

Foundations of Pakistan, All India Muslim League Documents: 1906 - 1947, Vol. 2 (1924 - 194) Edited by Syed Sharifuddin Pirzada, National Publishing House Karachi 1970, pp. 153-171

ضمیمہ: 2

اقبال کا مکتوب

آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ای۔ جے۔ تھامپسن کے نام ☆

Dr. Sir Mohd. Iqbal Kt.
M. A., Ph.D
Barrister-at-Law

Lahore
4th March 1934

My dear Mr. Thompson

I have just received your review of my book. It is excellent and I am grateful to you for the very kind things you have said of me. But you have made one mistake which I hasten to point out as I consider it rathehr serious. You call me (a) protagonist of the scheme called "Pakistan." Now Pakistan is not my scheme. The one that I suggested in my address is the creation of Muslim Province - i. e; a province having an overwhelming population of Muslims in the North west of India. This new province will be, according to my scheme, a part of the proposed Indian Federation. Pakistan scheme proposes a separate federation of Muslim Provinces directly related to England as a separate dominion. This scheme originated in Cambridge. The authors of this scheme believe that we Muslim Round Tablers have scarificed the Muslim nation on the altar of Hindu or the so called Indian Nationalism.

Yours sincerely,

Mohammmad Iqbal

☆ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ایڈورڈ جان تھامپسن (Edward John Thompson) اور اقبال کے مابین 34-1933ء کے دوران خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ ای۔ جے۔ تھامپسن کے بیٹے پروفیسر ای۔ پی۔ تھامپسن نے 1977ء میں اپنے دورۂ بھارت کے دوران یہ خطوط شعبۂ تاریخ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر عرفان حبیب کے حوالے کر دیئے اور ان کی تاریخی اہمیت کے پیش نظر ان کی اشاعت کی اجازت بھی دے دی۔ چنانچہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ سیاسیات کے پروفیسر ایس۔ حسن۔ احمد نے ان خطوط پر اپنا تبصرہ شامل کر کے انہیں کتابی صورت میں 1979ء میں علی گڑھ سے شائع کر دیا۔ ان خطوط کے عکس Facsimile ہمراہ ہیں۔ مذکورہ خط کے لیے دیکھیے ص 80، عکس کے لیے دیکھیے ص 94

حوالہ جات

حوالہ جات

باب 1: پنجاب پر برطانوی قبضہ کے محرکات اور اثرات

1- S.M.Ikram, *Modern Muslim India And The Birth of Pakistan*, Sh. Mohammad Ashraf Lahore, 1970, p. 194

2- Bimal Prasad, *Indo-Soviet Relations* 1947-72, Allied Publishers, New Delhi, 1973, p.4

3۔ مولانا الطاف حسین حالی، حیات جاوید، آئینہ ادب لاہور 1966ء، ص 77-576

4- Bimal Prasad, *op. cit.* p.5

5- S. S. Thorburn, *The Musalmans And the Moneylenders in the Punjab*, London, 1886, pp. 1,3,14,15

باب 2: پنجاب میں مسلم سیاست کا آغاز

1- Ikram Ali Malik, *A Book of Readings on The History of the Punjab* 1799-1947, Research Society of Pakistan, Lahore, 1970, pp. 294-96.

2- Bimal Prasad, *op. cit.* p. 17

3۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی۔ اقبال کے آخری دو سال۔ اقبال اکادمی پاکستان۔ کراچی 1961ء۔ ص 30

4- W. Noman Brown, *The United States And India & Pakistan*, Revised and Enlarged Ed. Harvard University Press, Cambridge Massachusetts 1963, pp. 87-88.

5۔ محمد ظفر اللہ خان۔ تحدیث نعمت۔ ڈھاکہ بے نیولینٹ ایسوسی ایشن ڈھاکہ۔ 1971ء ص 187

6۔ ایضاً۔ص ص181-180, 185-183

7- Ram Gopal, *How India Struggled For Freedom*, The Book Centre (Pvt.) Bombay 1967, pp. 309-11

8- *Ibid* p. 314

9- Ikram Ali Malik, *op. cit.* pp. 415-16

10۔ عاشق حسین بٹالوی۔ص ص67-58

11- M. H. Saiyed, *Mohammad Ali Jinnah, A Political Study*, Elite Publishers Karachi, 2nd Ed. Reprinted 1962, p. 87

12۔ فیروز خاں نون۔چشم دید۔فیروز سنز لاہور1974ء۔ص ص26 -125

13۔ عاشق حسین بٹالوی۔ص ص17-116

14۔ محمد ظفر اللہ خان۔ص186

15۔ سید نور احمد۔مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔لاہور1968ء ص22

16۔ عاشق حسین بٹالوی۔ص131

17۔ فیروز خان نون۔ص ص71 - 69

باب 3: تحریک خلافت۔مسلم درمیانہ طبقے کی جذباتیت

1- Chaudhri Khaliq-uz-Zaman, *Pathway to Pakistan*, Lahore 1961, p.33

2۔ خطبات محمد علی۔ مرتبہ رئیس احمد جعفری۔ ایوان اشاعت کراچی1950ء ص ص 20-22

3- Khaliq uz Zaman, *op. cit.* p. 58

4- Mulana Abul Kalam Azad, *India Wins Freedom*, Orient Longmans, Calcutta 1959, pp. 7-8.

5- *Ibid.* p.10

6- Quoted in Khalid Bin Sayeed, *Pakistan The Formative Phase* 1857-1948, Oxford University Press Karachi 1968, p. 49

7- Khalid Bin Sayeed, *op. cit*. p. 51

8- Ram Gopal, *Indian Muslims, A Political History* (1858-1947), Bombay 1959. p.114

9- Khalid Bin Sayeed, *op. cit*. p. 50

10- M. H. Saiyed, *op. cit*. p. 96.

11۔ محمد یامین خان۔ نامۂ اعمال۔ (2 جلدیں)۔ آئینۂ ادب۔ لاہور 1970ء ص ص 100-101۔ جلد اول۔

12۔ ایضاً۔ ص ص 164-65۔ جلد اول

13۔ ایضاً۔ ص 90۔ جلد اول

14- Ram Gopal, *op. cit*. p. 156

15- Jawaharlal Nehru, *Glimpses of World History,* Lindsay Drummond, London 1939, pp. 720-21

16- *Some Recent Speeches And Writings of Mr. Jinnah.* Collected and Edited by Jamil-ud-Din Ahmad, Sh. Muhammad Ashraf Lahore 1943, pp. 70-71, 458-59.

باب4: فضل حسین، یونینسٹ پارٹی اور ہندو۔مسلم تضاد

1۔ عاشق حسین بٹالوی۔ محولہ بالا، ص ص 139-140, 142-43, 149, 152-53

2- S. M. Ikram, *op. cit*. p. 209.

3- *Ibid* p. 212

4۔ سید نور احمد۔ محولہ بالا، ص ص 62-63

5۔ محمد ظفراللہ خاں۔ محولہ بالا، ص ص 231-34

6۔ فیروز خاں نون۔ محولہ بالا، ص ص 145-47, 149-150

7۔ عاشق حسین بٹالوی۔محولہ بالا، ص ص165-68

8- Sir Lepel H. Griffin and Col. Charles Francis Massy, *Chiefs And Families of Note in The Punjab* 2 Vols. Civil And Military Gazette Press, Lahore 1909, pp. 255, 258-59 Vol. I

9- *Ibid.* p. 207- Vol. I

10- *Ibid.* p. 202, Vol. II

11- *Ibid.* p. 204, Vol. II

12- *Ibid.* p. 207-09, Vol. II

13- *Ibid.* p. 233, Vol. II

14- *Ibid.* p. 333-35, Vol. II

15- *Ibid.* p. 338-39, Vol. II

16- *Ibid.* p. 351, Vol. II

17- *Ibid.* p. 404, Vol. II

18- *Dawn*, January 21, 1952

19۔ اے۔آر۔شبلی۔پاکستان کے دیہہ خدا۔پیپلز پبلشرز، لاہور 1973ء
ص ص107-08

20۔ ایضاً۔ص96

21- Sir Lepel H. Griffin & Charles F. Massy, *op. cit.* p. 36, Vol. II

22۔ رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے تحقیقات فسادات پنجاب 1953ء۔
گورنمنٹ پرنٹنگ پریس پنجاب۔لاہور۔1954ء۔ص ص208-09

23۔ اے۔آر۔شبلی۔محولہ بالا، ص ص138-39

24۔ ایضاً۔ص143

25۔ ایضاً۔ص۔148

26۔ فیروز خاں نون۔محولہ بالا، ص126

27۔ سیدنور احمد۔ محولہ بالا، ص64

28۔ فیروز خاں نون۔ محولہ بالا، ص151

29۔ ایضاً ص ص169, 174

30۔ مشتاق احمد وجدی۔ ہنگاموں میں زندگی۔ فیروز سنز لاہور 1974ء۔ ص ص58-59

31- Ram Gopal, How India Struggled For Freedom *op. cit.* p. 348-49

32- (i) M. H. Saiyed *op. cit.* p. 111

(ii) سیدنور احمد۔ محولہ بالا، ص ص66-67

33۔ عاشق حسین بٹالوی۔ محولہ بالا، ص ص189-90

34۔ محمد ظفر اللہ خان۔ محولہ بالا، ص ص240, 242-44

35- S. M. Ikram, *op. cit.* pp. 209, 211

36- Jamil-ud-Din Ahmad, *op. cit.* pp. 149-51

37- M. H. Saiyed, *op. cit.* p. 109

38- *Ibid.* p. 108

39۔ فیروز خاں نون۔ محولہ بالا، ص169

40۔ ایضاً۔ ص149

باب 5: پنجابی مسلم درمیانہ طبقہ کی سیاسی پیش قدمی کی کوشش

1۔ سیدنور احمد۔ محولہ بالا، ص83

2۔ محمد ظفر اللہ خان۔ محولہ بالا، ص256-57

3۔ سیدنور احمد۔ محولہ بالا، ص83-84

4۔ عاشق حسین بٹالوی۔ ص203-04, 218-19

5- M. H. Saiyed. *op. cit.* pp. 131-32

6- *Foundations of Pakistan*, All India Muslim League

Documents: 1906-1947 Edited by Syed Shariffuddin Pirzada in 2 vols. National Publishing House Karachi 1970. pp. 159-68, Vol. II

7- M. H. Saiyed, *op. cit*. pp. 154-55

باب6: احراری۔قادیانی تضاد اور پنجاب کی سیاست پر ملاؤں کا غلبہ

1۔ جامعی عزیز الرحمن لدھیانوی۔ رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی اور ہندوستان کی جنگ آزادی۔ تعلیمی سماجی مرکز، دہلی 1968ء ص ص 153-54

2۔ عاشق حسین بٹالوی۔محولہ بالا، ص ص 251-52

3- Jawahar Lal Nehru, *An Autobiography,* The Bodley Head, London 1953, p. 269.

4۔ عاشق حسین بٹالوی،محولہ بالا، ص ص 218-19, 203-04

5۔ افضل حق۔تاریخ احرار۔مکتبہ مجلسِ احرار اسلام پاکستان، لاہور۔ملتان 1968ء ص ص 94-95

6۔ ظفراللہ خان،محولہ بالا،ص 289

7- (i) *The Pakistan Times*, Lahore, November 4,1953.

(ii) روزنامہ نوائے وقت، لاہور۔12 نومبر 1953ء

8۔ رضیہ فرحت بانو۔خطبات اقبال۔سندھ اُردو اکیڈمی کراچی۔ص ص 97-98

9۔ نیاز فتح پوری۔باب الاستفسار۔ماہنامہ نگار کراچی ستمبر 1961ء۔ص 32

10- *Thoughts And Reflections of Iqbal*, Edited with Notes by Syed Abdul Vahid, Sh. Muahmmad Asraf, Lahore, 1964 Reprinted 1973, pp. 297-98.

11- *The Pakistan Times*, Lahore, November 4, 1953

12۔ محمد ظفراللہ خاں۔محولہ بالا، ص 314

13- Khalid Bin Sayeed, *op. cit*. p. 105

14- Ram Gopal, *op. cit.* p. 269-70

15۔ مشتاق احمد وجدی۔محولہ بالا، ص132

16۔ محمد ظفراللہ خاں۔محولہ بالا، ص ص45-344

17۔ ایضاً۔ص347

18۔ عاشق حسین بٹالوی۔محولہ بالا، ص ص71-270

19۔ سید نور احمد۔ محولہ بالا، ص ص171-166

20۔ عاشق حسین بٹالوی۔محولہ بالا، ص ص300-298

باب 7: 1937ء کے انتخابات میں لیگ کی ناکامی کے بعد سکندر۔جناح معاہدہ اور اقبال۔جناح تضاد

1- S. M. Ikram, *op. cit.* p. 226

2- M. H. Saiyed, *op. cit.* p. 156

3۔ (i) نور احمد۔ محولہ بالا، ص178
(ii)M. H. Saiyed, *op. cit.* p. 171

4۔ عاشق حسین بٹالوی۔محولہ بالا، ص ص7-306 ,16-314

5۔ ایضاً۔ص۔321

6- *Letters of Iqbal To Jinnah*, Sh. Muhammad Ashraf Lahore. First Ed. 1942, Reprinted 1974, pp. 11-12

7۔ عاشق حسین بٹالوی۔محولہ بالا، ص292

8۔ ایضاً۔ص91-290

9۔ ایضاً۔ص۔369

10۔ ایضاً۔ص۔347۔بحوالہ Sir Reginald Coupland, *India: A Restatement, p.* 152

12- S. M. Ikram, *op. cit.* p. 231

13۔ عاشق حسین بٹالوی۔ محولہ بالا، ص۔357

14۔ ایضاً۔ص۔481۔بحوالہ Beni Parshad, *India's Hindu- Muslim Question*, p. 76

15- S. M. Ikram, *op. cit.* p. 249

16۔ عاشق حسین بٹالوی۔ص۔ 490بحوالہ Sir Reginald Coupland, *Indian Politics (1936 to 1940)* p. 183

17۔ ایضاً۔ص ص۔76-475

18- Jahan Ara Shah Nawaz, *Fahter And Daughter, A Political Autobiography*, Nigarishat, Lahore, 1971... p. 164

19۔ سیدنوراحمد۔محولہ بالا، ص ص89-188

20- *Letters of Iqbal to Jinnah, op.cit.* pp. 28-32

21- Jawalarlal Nehru, *The Discovery of India* Asia Publishing House, Bombay, First Published 1945, Reprited 1966. pp. 372-73.

22۔ عاشق حسین بٹالوی۔محولہ بالا، ص ص82-550

23- *Letters of Iqbal to Jinnah, op. cit.* pp. 17-19

24۔ عاشق حسین بٹالوی۔محولہ بالا، ص ص74-373

25۔ ایضاً۔ص ص 02-401بحوالہ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ، لاہور۔ 10 21مارچ1937ء

26- Ishiaq Hussain Qureshi, *The Struggle For Pakistan*, University of Karachi, Karachi, First Ed. 1965, Reprinted 1974, p. 87

27- M. H. Saiyed, *op. cit.* p. 181

28۔ عاشق حسین بٹالوی۔ص406۔ بحوالہ روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور 10جولائی1937ء

باب8: علامہ اقبال۔پنجابی مسلم درمیانہ طبقہ کا دردمند شاعر

1۔ رضیہ فرحت بانو۔محولہ بالا، ص62

2۔ باقیات اقبال۔ترتیب اول سید عبدالواحد معینی۔ترمیم واضافہ محمد عبداللہ قریشی آئینہ ادب لاہور 1978ء۔ص ص 72-92

3۔ ایضاً۔ص ص 97-102

4۔ (i) غلام رسول مہر، صدیق دلاوری۔سرودرفتہ۔شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور 1959ء ص ص 55-57

(ii) باقیات اقبال۔محولہ بالا، ص ص 216-19

5۔ عبدالمجید سالک۔ذکر اقبال۔بزم اقبال لاہور 1955ء۔ص 89

6۔ غلام رسول مہر، صدیق علی دلاوری۔محولہ بالا، ص 73

7۔ عبدالمجید سالک۔محولہ بالا، ص ص 94-95

8۔ ایضاً۔ص 91

9- *India office Library And Records*, London, MSS-EUR-f 137/34

10- *Ibid*

11- Syed Abdul - Vahid, *op. cit.* pp. 317-21, 341

12- Allama Mohammad Iqbal, *The Recostruction of Religious Thoughts in Islam*, Sh. Mohammad Ashraf Lahore, Reprinted 1971, pp. 168-69, 173-74

13۔ ماہنامہ طلوع اسلام لاہور۔جنوری 1978ء۔"پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔" ص 22

14۔ عبدالمجید سالک۔محولہ بالا، ص ص 128-29

15۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم۔اقبال اور ملا۔بزم اقبال لاہور 4-5,12-13, 17, 22

16۔ عبدالمجید سالک۔محولہ بالا، ص 137

17۔ ایضاً۔ص ص 49-148

18- *Foundations of Pakistan, All India Muslim League Documents: 1906-1947*, Vol II, *op. cit.* pp. 159-68

19- S. Hassan Ahmad, *Iqbal: His Political Ideas at Cross roads*, Printwell Publications, Aligarh 1979, p. 80

20۔ عبدالمجید سالک۔محولہ بالا، ص ص 55-154

21۔ ایضاً۔ص ص 58-157

22۔ ایضاً۔ص 161

23۔ فقیر سید وحیدالدین۔روزگار فقیر۔نفیس آرٹ پریس کراچی 1963ء ص ص 49-48

24۔ عبدالمجید سالک۔محولہ بالا، ص 259

25۔ فقیر سید وحیدالدین۔محولہ بالا، ص ص 50-49

26۔ ایضاً۔ص 78

27۔ عبدالمجید سالک۔محولہ بالا، ص ص 63-162

28- Dr. B. R. Ambedkar, *Pakistan or Partition of India*, Thacker Bombay 1945, p. 329

29- *Letters of Iqbal to Jinnah*, *op. cit.* p. 23

30۔ عبدالمجید سالک۔محولہ بالا، ص 184

31۔ فقیر سید وحیدالدین۔ محولہ بالا، ص ص 62-161

32۔ عبدالمجید سالک۔محولہ بالا، ص ص 98-196

33- S. M. Ikram, *op. cit.* p. 177

34- *Some Recent Speches And Writings of Mr. Jinnah op. cit.* p.66

باب 9: قرارداد لاہور کس طرح قرارداد پاکستان بنی؟

1- Ishtiaq Hussain Qureshi, *op. cit.* pp. 121-23

2- *Ibid.* p. 127

3۔ محمد یامین خان۔محولہ بالا، ص ص725-26۔جلد اول

4- Ishtiaq Hussain Qureshi, *op. cit.* pp. 120-21

5- Khalid Bin Sayeed, *op. cit.* p. 111

6- *Ibid.* p. 107

7- Jamil-ud-Din Ahmad, *op. cit.* pp. 57-64

8- Ishtiaq Hussain Qureshi, *op. cit.* p. 114

9- Jamil-ud-Din Ahmad, *op. cit.* p. 86-87

10- Khalid Bin Saeed, *op. cit.* p. 99

11- Jamil-ud-Din Ahmad, *op. cit.* p.96

12- V. P. Menon, *op. cit.* p. 77

13- Jamil-ud-Din Ahmad, *op. cit.* p. 105

14- *Ibid.* pp. 111-119

15۔ محمد یامین خان۔محولہ بالا، ص ص838-39

16- Jamil-ud-din Ahmad, *op. cit.* pp. 150, 153, 155

17۔ عاشق حسین بٹالوی۔ہماری قومی جدوجہد۔میجر الطاف حسین لاہور1975ء۔ص18

18- Chaudhri Khaliquzzaman, *op. cit.* pp. 233, 235

19۔ عاشق حسین بٹالوی۔ہماری قومی جدوجہد۔ص22

20۔ محمد یامین خان۔محولہ بالا، ص871۔جلد دوم

21۔ سید نور احمد۔محولہ بالا، ص ص200-01

22۔ عاشق حسین بٹالوی۔محولہ بالا، ص ص33-34۔بحوالہ

"*From Puredah To Parliament*" by Begum Shaistah Ikramullah, The Cresent Press, London, 1963, p. 100

23۔ روزنامہ نوائے وقت۔لاہور۔14راگست1977ء

24- Wali Khan, *Facts Are Facts*, Vikas Publishing House, New Delhi, 1987, p. 29

25- *India Office Library And Records*, MSS EUR F/125/9 Also Quoted in
(i) *The Pakistan Times,* Lahore, Januaryy 23, 1982
(ii) Ikram Ali Malik, *Truth Is Truth*, Book Services Lahore 1990, pp. 50-51

26- "Zafrullah Khan's Note on Dominion Status." *India office Library And Records,* Linlithgow Papers, Papers, MSS EUr F/125/135, Full Text Also Quoted in, (i) *The Pakistan Times,* Lahore, January 23, 1982. (ii) Ikram Ali Malik, *op. cit.* pp. 75-113

باب10: مطالبہ پاکستان کی مخالفت۔سرسکندراور جماعت اسلامی کی قدرمشترک

1۔ عاشق حسین بٹالوی۔محولہ بالا، ص ص66-67

2- *The Punjab Legislative Assembly Debates*, March 11, 1941, pp. 348-62

3۔ سیدنوراحمد۔محولہ بالا، ص ص203-04

4۔ غلام احمد پرویز۔ اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش۔ ماہنامہ طلوع اسلام لاہور۔دسمبر 1976ء۔ص ص26-27

5۔ ابوالاعلیٰ مودودی۔اسلام اور جدید معاشی نظریات۔اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور۔ طبع نہم1976ء۔ص127 تا130

6۔ ابوالاعلیٰ مودودی۔ اسلام کا نظام حیات۔ مکتبہ جماعت اسلامی لاہور۔ طبع اول1948ء۔ص46

7۔ ایضاً۔ص47

8۔ غلام احمد پرویز۔محولہ بالا، ص ص31-38

9۔ ایضاً۔ص38

10۔ ایضاً۔ص ص38-39

11۔ شبلی نعمانی۔خطبات شبلی۔معارف پریس اعظم گڑھ 1941ء۔ص28-34

12- S. M. Ikram, *op. cit*. p. 250

13۔ عاشق حسین بٹالوی۔محولہ بالا، ص91

باب11: برصغیر میں نئی سیاسی صف بندی۔عالمی جنگ کے پس منظر میں

1- Tariq Ali, *Pakistan: Military Rule or People's Power*, Jonathen Cape, London 1970, pp. 252-54

2- Khalid Bin Sayeed, *op. cit*. p. 102

3- Frank Moraes, *India Today*, The Macmillan Company New York 1960, pp. 115-16

4- Khalid Bin Sayeed, *op. cit*. pp. 125-26

باب12: 46-45ء کے انتخابات، قیام پاکستان اور پنجابی شاونزم کی نمود

1- S. M. Ikram pp. 261, 333 quoted in Sajjad Zaheer, *Light On League-Unionist Conflict*, People's Publishing House, Bombay, July 1994, p. 33

2۔ بہادر یار جنگ۔مکاتیب بہادر یار جنگ۔بہادر یار جنگ اکادمی۔کراچی 1967ء۔ ص ص 547-48, 522-23

3- Mian Iftikhar-ud-Din, *Selected Speeches and Statements*, Edited by Abdulllah Malik, Nigarishat, Lahore 1971, pp. 10-11

4۔ غلام احمد پرویز۔ محولہ بالا، ص41

5۔ افضل حق۔محولہ بالا، ص46

6۔ رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے تحقیقات فسادات، پنجاب 1953ء ص11

7۔ مولانا نور محمد۔ بریلوی فتوے۔ انجمن ارشاد المسلمین، لاہور 1979۔ ص ص 152-53۔بحوالہ تجانب اہل السنۃ ص ص 122-199

8۔ (i) مولانا نور محمد۔ محولہ بالا، ص ص 31۔32, 207-08 (مکمل متن مع استفتاء)

(ii) غلام احمد پرویز۔ طلوع اسلام۔ جنوری 1978ء۔ ص ص 22-21

9۔ مولانا نور محمد۔ محولہ بالا، ص 157 بحوالہ اجمل انوار الرضا مطبوعہ انتظامی پریس کانپور بار اول ماہ دسمبر 1945ء جسے جماعت اہلسنت پیلی بھیت کی جانب سے شائع کیا گیا۔

10- Penderal Moon, *Divide And Quit*, Chatto and Windus, London 1964, pp. 71-72

11- Mian Iftikhar-ud-Din, *op. cit.* pp. 42-43

12۔ فیروز خان نون۔ محولہ بالا، ص ص 285 ,274

13- G. M. Sayed, *A Nation In Chains-Sindhu Desh*, September 1974. Sann Distt. Dadu, p. 22

کتابیات

کتب (انگریزی)

Ahmad, S. Hasan, *Iqbal: His Political Ideas At Crossroads*, Printwell Publications, Aligarh, 1979

Ali, Tariq, *Pakistan: Military Rule or People's Power,* Jonathen Cape, London 1970

Ambedkar, Dr. B. R., *Pakistan or Partition of India,* Thacker Bombay 1945.

Azad, Maulana Abdul Kalam, *India wins Freedom*, Orient Longmans Calcutta 1959.

Beni Parshad, *India's Hindu-Muslim Question.*

Brown, W. Norman, *The United States And India & Pakistan*, Revised and Enlarged Ed. Harvard University Press, Cambridge Massachuscus 1963.

Gopal, Ram, (1) *How India Struggled For Freedom*, The Book Centre (Pvt.), Bombay 1967.

(2) *Indian Muslims, A Political History* (1858-1947), Bombay 1959

Griffin, Sir Lepel H., and Massy, Col. Charles Francis, *Chiefs And Families of Note in The Punjab*, (2 Vols), Civil And Military Gazette Press, Lahore, 1909

Ikram, S. M., *Modern Muslim India And The Birth of Pakistan,* Sh. Mohammad Ashraf, Lahore, 1970

Iqbal, Allama Mohammad, *The Reconstruction of Religious Toughts In Islam,* Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, Reprinted 1971

Jehan Ara, Shah Nawaz, *Father And Daughter, A Political Authobiography,* Nigarishat, Lahore, 1971

Khaliquzzaman, Chaudhri, *Pathway to Pakistan,* Lahore, 1961

Khan, Wali, *Facts Are Facts,* Vikas Publishing House, New Delhi, 1987

Malik, Ikram Ali, (1) *A Book of Readings on the History of the Punjab* (1799-1947), Research Soicety of Pakistan, Lahore, 1970

(2) *Truth Is Truth,* Book Services, Lahore, 1990

Memon, V. P. *The Transfer of Power In India,* Princeton Uniersity Press, Princeton, N. J., 1957

Moon, Penderal, *Divide And Quit*, Chatto And Windus, London, 1964

Morace, Frank, *India Today*, The Machmillan Company, New York, 1960

Nehru, Jawaharlal, (1) *Glimpses of World History*, Lindsay Drummond, London, 1939.

(2) *The Discovery of India,* Asia Publishing House, Bombay, First Published 1945, Reprinted 1966

(3) *An Authobiography*, The Bodley Head, London, 1953

Prasad, Bimal, *Indo-Soviet Relations, 1947-72,* Allied Publishers, New Delhi, 1973

Qureshi, Ishtiaq Hussain, *The Struggle for Pakistan,* University of Karachi, Karachi, First Ed. 1965 Reprinted, 1974

Sayed, G. M., *A Nation In Chains-Sindhu Desh,* Sann Distt. Dadu, 1974

Sayeed Khalid Bin, *Pakistan The Fomative Phase* 1857-1948, Oxford University Press Karachi, 1968

Thorburn, S. S., *The Musalmans And the Moneylenders in the Punjab*, London, 1886

کتب (اردو)

افضل حق۔تاریخ احرار۔مکتبہ مجلس احرار اسلام پاکستان۔لاہور۔ملتان۔1968ء

اقبال،علامہ محمد(1) باقیات اقبال۔ترتیب اول سید عبدالواحد معینی۔ترمیم واضافہ عبداللہ قریشی۔
آئینہ ادب لاہور۔1978ء

(2) سرود رفتہ۔مرتبہ غلام رسول مہر۔صدیق علی دلاوری۔شیخ غلام علی اینڈ سنز
لاہور۔1959ء

بانو،رضیہ فرحت۔خطبات اقبال۔سندھ اردو اکیڈمی۔کراچی۔1960ء

بٹالوی،ڈاکٹر عاشق حسین۔(1) اقبال کے آخری دو سال۔اقبال اکادمی پاکستان۔
کراچی۔1961ء

(2) ہماری قومی جدوجہد۔میجر الطاف حسین۔لاہور۔1975ء

پرویز،غلام احمد۔احمدیت اور اسلام۔ادارہ طلوع اسلام۔کراچی۔1952ء

جامعی،عزیز الرحمن لدھیانوی۔رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمن لدھیانوی اور ہندوستان کی جنگ
آزادی۔تعلیمی سماجی مرکز۔دہلی 1961ء

جعفری،رئیس احمد۔خطبات محمد علی۔ایوان اشاعت۔کراچی۔1950ء

جنگ،بہادر یار۔مکاتیب بہادر یار جنگ۔بہادر یار جنگ اکادمی۔کراچی۔1967ء

حالی،مولانا الطاف حسین۔حیات جاوید۔آئینہ ادب۔لاہور۔1966ء

خان۔محمد ظفر اللہ۔تحدیث نعمت۔ڈھاکہ بے نیولینٹ ایسوسی ایشن۔ڈھاکہ۔1971ء

خان،محمد یامین۔نامہ اعمال۔(2 جلدیں)۔آئینہ ادب۔لاہور۔1970ء

سالک،عبدالمجید۔ذکر اقبال۔بزم اقبال۔لاہور۔1955ء

شبلی،اے۔آر۔پاکستان کے دیہہ خدا۔پیپلز پبلشرز۔لاہور۔1973ء

شبلی نعمانی۔خطبات شبلی۔معارف پریس۔اعظم گڑھ۔1941ء

عبدالحکیم،ڈاکٹر خلیفہ۔اقبال اور ملا۔بزم اقبال۔لاہور

مودودی، ابوالاعلیٰ۔(1) اسلام اور جدید معاشی نظریات۔اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ لاہور طبع نہم 1976ء

(2) اسلام کا نظام حیات۔مکتبہ جماعت اسلامی۔لاہور۔طبع اول۔1948ء

نوراحمد،سید۔مارشل لاء سے مارشل لاء تک۔لاہور۔1967ء

نورمحمد،مولانا۔بریلوی فتوے۔انجمن ارشادالمسلمین۔لاہور۔1979ء

نون، فیروز خاں۔چشم دید۔فیروز سنز۔لاہور۔1974ء

وحیدالدین،فقیر سید۔روزگار فقیر۔نفیس آرٹ پریس۔کراچی۔1963ء

وجدی،مشتاق احمد۔ہنگاموں میں زندگی۔فیروز سنز۔لاہور۔1974ء

خطبات،خطوط اور دستاویزات

Foundations of Pakistan, All India Muslim League Documents: 1906-1947, 2 Vols. Edited by Syed Sharifuddin Prizada, National Publishing House, Karachi, 1970

Iftikhar-ud-Din, Mian, *Selected Speeches And Statements,* Edited by Abdullah Malik, Nigarishat, Lahore, 1971

India Office Library And Records, London *MSS EUR F/137/34, F/125/9, F/125/135*

Letters of Iqbal to Jinnah, Sh. Mohammad Ashraf, Lahore, First Ed. 1942, Reprinted 1974

Some Recent Speeches And Writings of Mohammad Ali Jinnah, Collected And Edited by Jamil-ud-Din Ahmad, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1943

The Punjab legistative Assembly Debates, 1941

Thoughts And Reflections of Iqbal, Edited with notes by Syed Abdul Vahid, Sh. Muhammad Ashraf, Lahore, 1964 Reprinted 1973

رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے تحقیقات فسادات پنجاب 1953ء۔ گورنمنٹ پرنٹنگ پریس پنجاب۔لاہور۔1954ء

اخبارات وجرائد

The Pakistan Times, Lahore, Files 1953, 1982

روزنامہ نوائے وقت۔لاہور فائلیں۔1953ء، 1977ء

ماہنامہ طلوع اسلام لاہور۔جنوری 1978ء، دسمبر 1976ء

ماہنامہ نگار کراچی۔ستمبر 1961ء

اشاریہ

آ

ا

ت

ص

ض

ط

ظ

ع

غ

ف

ق

ن

و